خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

مارچ
2007

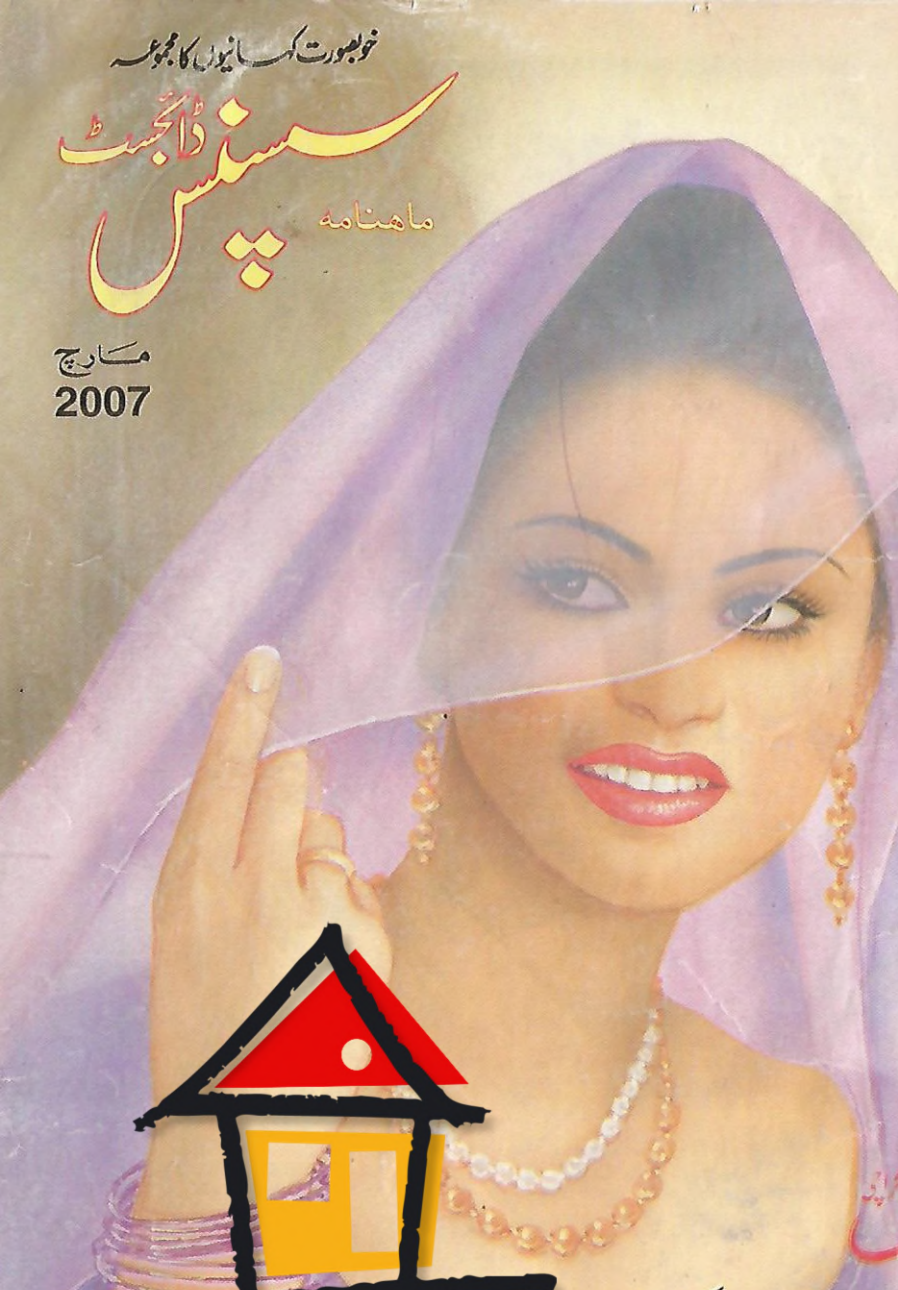

جاسوسی ڈائجسٹ
مدیر اعلیٰ: معراج رسول
مدیر: جعفر رضا

11 انشائیہ — جون ایلیا
حال سے ماضی میں جانے والوں کا قصہ جون ایلیا کے قلم سے ایک لافانی تحریر

12 آپ کے خط — مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور مشورے جو انجمن آرائی ہیں ہمارے لئے مشعل راہ ہیں

18 زن کا زور — محی الدین نواب
ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے ایسے واقعات جو بیتاؤں کی رہنمائی کیلئے کتابوں میں محفوظ کردیئے گئے ہیں

63 علاج — مریم کے خان
اس نوعمر دوشیزہ کا قصہ جس کے بچپن کے تصورات حقیقت کی صورت اس کے روبرو آگئے تھے

70 دیوتا — فرہاد علی تیمور
ایک فسوں کار کی خود نوشت ایک عالم جس کے خون کا پیاسا تھا، سسپنس کا مقبول عام سلسلہ جو 362 ماہ سے جاری ہے

109 سولہ مارچ — منظر امام
ہوس کے غلیظ کیچڑ میں کھلنے والے محبت کے پاک و صاف کنول کی عبرت اثر و چشم کشا کتھا

121 بے اماں — امر جلیل/ جمالی
گزرے وقتوں کو اچھا کہنے والوں کی تائید کرتا ایک انوکھا فسانہ، سندھی ادب سے منتخب کٹیلی تحریر

129 خواب — ایس ایم شجاع رضوی
اس عورت کا قصہ جسے طویل سفر پر جانے کا شوق تھا اور وہ اس کے لیے زادِ راہ جمع کر رہی تھی

132 الجھی ڈور — مرزا امجد بیگ
بدی پر نیکی کے غلبے کی سچی کتھا، زندہ کرداروں اور سچے واقعات کی عبرت ناک کہانی، وکیل کی ڈائری سے انتخاب

167 اُترن — رنجنی پلیل
ہندی ادب کے افق پر نمودار ہونے والا ایک اور شاہکار سسپنس کے قارئین کے لیے خصوصی سوغات

جلد 36 • شمارہ 03 • مارچ 2007 • زرِ سالانہ 450 روپے • قیمت فی پرچہ [illegible] سعودی عرب 12 ریال یا مساوی
E-mail:jdpgroup@hotmail.com [illegible] (021) 5895313 • فون: 74200 • پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی
خط کتابت کا پتا:

MEMBER APNS CNE

اس فن کار کی فن کاری کا قصہ جسے قصہ گوئی کا فن بھی اچھی طرح آتا تھا مغرب سے درآمد مختصر کہانی

مشہور و معروف شاعروں کے اشعار سے منتخب آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

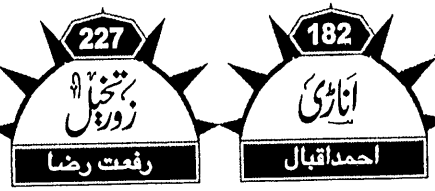

اس اناڑی کی داستان حیات جسے حالات کھلاڑی بننے پر مجبور کر رہے تھے، سسپنس کا تہلکہ خیز سلسلہ

خوابوں حقیقت کو ایک رنگ میں رنگنے والی دوشیزہ کے خوابوں کا خونچکاں فسانہ اور رقابت کا شاخسانہ

عالم خوف میں گزرے پرافیت لمحوں کی کہانی نفسیاتِ انسانی کی پیچیدگی کا قصہ

اس شخص کا قصہ جسے اپنے رابطے پر ناز تھا، غیر متوقع انجام کی دلچسپ کتھا

روایتوں اور رواجوں کی خاطر اپنا آپ داؤ پر لگانے والے روایت پرستوں کی ستم گری کا قصہ مغرب سے تازہ درآمد

عہد حاضر کے فتنہ پرور عاقبت نااندیش فسادیوں کی تازہ فتنہ گری کا سبق آموز احوال

فطرت کی بوالعجبیوں اور محبت کی خود فراموشیوں کی داستان گل رنگ، آخری صفحات کا توشہ خاص

دین اسلام کی روشنی میں مسائل کا حل، سائلین کے سوالوں کا ایس ایم قادری کے جواب

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

نجات

جون ایلیا

بوڑھے قدموں سے چل کر میں بچپن کی طرف گیا۔ انجام کی طرف جاتے ہوئے میں نے آغاز کا رخ کیا۔ میری تھکی ہوئی پنڈلیاں' میرے ناقص اور ناہنجار وجود کو بستیوں اور بازاروں میں' کوچوں اور کلبۂ احزان میں گھسیٹتی پھریں۔

میں سودائی اپنی گلیوں میں چلتے چلتے تھک گیا۔ میں خوغائی اپنے جنگلوں میں چیختے چیختے ہار گیا۔

میں نے راحت کو پکارا اور رنج کمایا۔

میں نے آرام کو آواز دی' آلام میرے حصے میں آیا۔

وہ تاریخ میں نے جس میں پہلا سانس لیا' وہ جغرافیہ میں جس میں عرصہ دراز سے رہتا ہوں' انہوں نے مجھے مایوس کیا' مغموم کیا۔

تاریخ اور جغرافیے کے حوالے سے میرے چاروں طرف وحشتوں کا بہاؤ ہے اور خبروں کا اندھیاؤ ہے۔ افسوس کہ تاریخ نے حکمت سے ہاتھ اٹھایا۔ صد افسوس کہ جغرافیے نے دانائی فراموش کی۔

اچھے دنوں کی نوید دینے والے کہاں ہیں؟ کہاں چلے گئے؟

سب ہی کے دلوں سے خوش امیدی کوچ کر گئی کیا؟

کور چشموں اور بد باطنوں کو' احمقوں اور احدیوں کو نوشتہ دیوار سنانے والا کوئی نہیں رہا کیا؟

وہ آنکھیں بستیوں سے کوچ کر گئیں کیا جو اس تحریر کو پڑھ سکیں جسے دانائی نے اپنی انگلیوں سے لکھا اور جسے حکمت نے اپنے ہاتھ سے نصب کیا؟

لوگو! کیا تمہیں یاد نہیں کہ حکمت زور سے پکارتی ہے اور دانائی اپنی آواز بلند کرتی ہے ''وہ راہ میں اونچے مقاموں کی چوٹیوں پر اور رستوں کے بیچ میں کھڑی ہوتی ہے۔ وہ پھاٹکوں کے نزدیک شہر کے مدخل کے پاس یعنی دروازوں میں داخل ہونے کی جگہ زور سے پکارتی ہے۔''

وہ کہتی ہے ''اے آدمیو! میں تم کو بلاتی ہوں اور بنی آدم کے ساتھ میری بات ہے۔ اے نادانو! دانائی کو سیکھو۔ اے جاہلو! فہمید کو پہچانو۔ سنو! کیونکہ میں بڑی باتیں بولوں گی اور میرے لب درست باتوں کے لیے کھلیں گے کیونکہ میرا منہ حق بیان کرتا ہے اور میرے لب شرارت سے نفرت رکھتے ہیں۔ میرے منہ کی سب باتیں صداقت ہیں' ان میں کچھ ترچھا اور ٹیڑھا نہیں۔ وہ سمجھنے والے کے نزدیک سب کی سب درست ہیں اور علم رکھنے والے کے نزدیک راست ہیں۔ میری تادیب کو قبول کرو نہ کہ چاندی کو اور علم کو کندن پر فوقیت دو کیونکہ حکمت لعلوں سے بہتر ہے اور کوئی دل پسند چیز اس کے برابر نہیں۔

میں حکمت مشورت کے ساتھ رہتی ہوں۔ میں علم اور بصیرت رکھتی ہوں۔ ہر غرور اور شیخی اور بدراہی اور ضدی زبان والے منہ سے مجھے نفرت ہے۔ مشورت اور مہارت میرے ساتھ ہیں۔ میں فہمید ہوں توانائی میری ہے۔ سلاطین میرے ذریعے سے مسلط ہیں اور حاکم انصاف سے عدالت کرتے ہیں۔ امرا میرے ذریعے امارت کرتے ہیں اور رئیس زمین پر حکمران ہیں۔

میں ان کو پیار کرتی ہوں جو مجھ کو پیار کرتے ہیں اور جو میری تلاش کرتے ہیں وہ مجھے پالیں گے۔ دولت اور عزت اور پائیداری سرمایہ اور اقبال مندی میرے پاس ہیں۔ میرا پھل سونے اور کندن سے بہتر اور میرا حاصل نفیس چاندی سے افضل ہے میں صداقت کی راہ میں اور عدل کے رستوں کے درمیان چلتی ہوں تاکہ ان کو جو مجھے پیار کرتے ہیں' اچھے مال کے وارث بناؤں اور ان کے خزانے بھر دوں۔

میں ازل سے نصب کی گئی۔ قدیم سے یعنی اس سے بیشتر کہ زمین بنائی گئی۔ پس اے لوگو! میری سنو مبارک ہیں وہ جو میری راہوں کو مانتے ہیں۔ تادیب کو سنو اور دانشمند بنو اور اس سے انکار نہ کرو۔ مبارک ہے وہ انسان جو میری سنتا ہے۔

کہاں گئے وہ مبارک انسان جو حکمت کی مشورت سنیں؟ دانائی کے موتی چنیں! میری تاریخ' میرا جغرافیہ کیا بانجھ ہوئے؟

لوگو! دانائی کیوں نہیں سیکھتے؟ کیوں نہیں فہمید کو پہچانتے؟ کہ تمہاری اور میری اور آنے والوں کی نجات اسی میں ہے۔

قارئین کرام!
السلام علیکم!

کہنے کیسے ہیں بہار کی آمد ہو چکی لہٰذا گمان ہے کہ اچھے ہوں گے بلکہ بہت اچھے ہوں گے۔ یقیناً بھئی ہر طرف سبزہ و گل بکھر رہا ہو تو اداسی کیسی ہی کیوں نہ ہو ایسے مناظر طبیعت میں جولانی لے ہی آتے ہیں۔ مارچ کا مہینہ آن پہنچا گویا تجدید عہد کا مہینہ آ گیا ہی ہاں اسی عہد کی تجدید کا دن جب لاہور کے منٹو پارک میں ہندوستان کے مسلمانوں نے متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کی قرارداد منظور کرتے ہوئے طے کیا تھا کہ پاکستان کو امن و سلامتی اور اسلامی اصولوں کے نفاذ کا بہترین ملک بنا دیں گے۔ وطن کو آزاد ہوئے ساٹھ سال ہونے لگے ہیں اور یہ وعدہ ابھی ایفا کا منتظر ہے اس میں زیادہ قصور کس کا ہے یہ الگ بحث تاہم اس میں ہمارا حصہ کتنا ہے اس پر ضرور غور کریں لیکن ہاں اس سے پہلے اس ماہ کا سسپنس ضرور پڑھ لیں تو آپ یہ دونوں کام کریں اور ہمیں اجازت دیں۔

☆ آصف محبوب کی بدگمانی پشاور سے ''کافی عرصے سے سسپنس پڑھ رہا ہوں مگر خط لکھنے کی جسارت پہلی بار کر رہا ہوں۔ امید ہی نہیں یقین بھی ہے کہ یہ خط شائع نہیں ہوگا کیونکہ کئی دفعہ اشعار بھیج کر اس تجربے سے گزر چکا ہوں۔ بہرحال میرا خط شائع ہو نہ ہو میں صرف اپنے خیالات، جذبات اور احساسات آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ فروری کا شمارہ خلاف معمول تھوڑا سا لیٹ ملا۔ سرورق کو دیکھا تو کچھ دیر تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ میرے خیال میں اس دفعہ سرورق کے لیے صرف خوب صورت کا لفظ استعمال کرنا کافی نہیں ہوگا۔ بہرحال اشتہارات پر سے LONG JUMP لگاتے ہوئے کہانیوں میں تلاش کرنے لگے ملک صفدر حیات اور مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ کو۔ میں ان کی کہانیاں سب سے پہلے پڑھتا ہوں۔ اس دفعہ ان کی کہانی ایک نہ شد بہت زبردست رہی آخر وقت تک پتا نہیں لگ رہا تھا کہ شکیلہ اور نادر علی میں مجرم کون تھا۔ اس شمارے کا نام سسپنس جس نے بھی رکھا ہے خوب رکھا ہے۔ کاشف زبیر صاحب کی کفارہ دوسرے نمبر پر پڑھی۔ کہانی بہت ہی اچھی تھی لیکن چوہدری اشرف علی کے کردار کے انجام کے حوالے سے کچھ تشنگی لیے ہوئے تھی۔ میرے خیال میں ایسے چوہدریوں کی فصل کو آگ لگا نے کی بجائے وہ اسے ہی مار دیتا یا اس کے بیٹے کو مار دیتا تو اس کا انتقام پورا ہو سکتا تھا۔ حالانکہ جان محمد نے خود اسے اپنے کیے کی سزا بھگتنے کے لیے تیار رہنے کو کہا تھا۔ جمع تفریق دیس کو چھوڑ کر پردیس میں بس جانے والوں کے بارے میں اچھی کہانی تھی۔ کہانی کا انجام پڑھ کر اداس بھی ہوئے اور خوش بھی۔ اداس اس لیے کہ وہ اپنا سب کچھ ہار گیا تھا اور خوش اس لیے ہوئے کہ سب کچھ ہار کے بھی کچھ نہ کچھ اس کے پاس تھا۔ میرا مطلب ہے مرزا کا بیٹا نعمان جو واپس اپنی مٹی کو لوٹ آیا تھا۔ شاید ایک بات پڑھ کر آپ حیران ہو جائیں اور وہ یہ کہ میں دیوتا اور اناڑی نہیں پڑھتا۔ جو کہانیاں مدتوں چلتی رہتی ہیں ان کو پڑھتے ہوئے مزہ نہیں آتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ پھر دوسری قسط کا انتظار نہیں ہوتا مجھ سے۔ اس لیے پڑھتا ہی نہیں ہوں ہاں اگر کبھی کتابی شکل میں مل جائے تو ضرور پڑھوں گا۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ اور اب کچھ ایسے سوالات اور تجاویز جو میرے ذہن میں مدت سے موجود ہیں۔ ان کا جواب ضرور دیجیے گا صرف میرے لیے نہیں بلکہ تمام قارئین کے لیے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ نے کیا کوئی ایسا کیس بھی لڑا ہے جس میں فتح فریق مخالف کی ہوئی ہو؟ یا ملک صفدر حیات کے پاس کوئی ایسی کہانی ہے جس کا وہ سراغ لگانے میں ناکام رہے ہوں۔ اگر ہوں تو ان میں سے بھی کوئی کہانی ضرور شائع کر دیجیے گا۔ (آپ کی فرمایش وکیل صاحب اور ڈی ایس پی صاحب تک پہنچا دی گئی ہے) دوسرا سوال خط بلیک لسٹ میں شامل ہونے کی وجہ کیا ہے۔ کیا رسالے کے معیار کے مطابق نہ ہونا یا خط کا دیر سے پہنچنا۔ (اس کے علاوہ بھی کئی باتیں ہو سکتی ہیں)۔ تیسرا سوال آپ صرف مستقل لکھنے والوں کے خطوط ہی کیوں شامل کرتے ہیں؟ NEW COMERS کو کم ہی خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ (اس کا جواب اب آپ کے ذمے ہے) چوتھا سوال پہلے تین انعام یافتہ اشعار بھیجنے والوں کو انعام کیا ملتا ہے؟ (حافظ کا سوہن حلوہ)۔ پانچواں سوال کیا خط اور شعر ایک ہی لفافے میں بھیج سکتے ہیں؟ (جی ہاں تاہم کاغذ علیحدہ ہوں)۔ میری پہلی تجویز یہ ہے کہ اگر کوپن کے دوسری طرف ان شعر بھیجنے والوں کے نام بھی دیں جن کے شعر شاملِ محفل نہیں ہوتے۔ کم از کم اتنا تو پتا چلے گا کہ شعر آپ کو ملا تھا۔ یعنی ایک عدد بلیک لسٹ اس محفل میں بھی۔ فائدہ بھی ہوگا۔ اضافی کاغذ بھی نہیں لگے گا۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ محفل دوستاں کی منصب صدارت کے لیے جھگڑے کو اگر اس طرح ختم کیا جائے کہ ایک بار صنف و جاہت کی نمایندگی ہو تو اگلی بار صنف نازک کی باری ہو۔ کیا خیال ہے؟'' (ہمارا خیال اور رائے محفوظ ہے دیگر قاری اس بارے میں رائے دیں)

☆ محمد عزیز مگے کی حاضری لندن و ہاڑی سے ''ان دنوں سرگزشت اور سسپنس زیرِ مطالعہ ہیں۔ ہر بار خط لکھنے کا ارادہ کرتا لیکن وقت پر بھیجنے میں ہر بار ناکام رہا۔ اب دیکھیں اس بار کیا رزلٹ نکلتا ہے۔ محسن بھوپالی صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ایک عظیم شاعر ہم سے بچھڑ گیا۔ ایک عہد ختم ہو گیا۔ وہ جن کے اشعار ضرب المثل بن گئے۔ منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے'' آہ! اللہ مرحوم کو غریقِ رحمت کرے اور لواحقین کو یہ صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے، آمین۔ دیوتا کے ابتدا میں جناب محی الدین نواب کے بارے میں پڑھ کر بے ساختہ ہاتھ ان کی تندرستی اور درازیٔ عمر کی دعا کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور اٹھ گئے۔ اللہ تعالیٰ نواب صاحب کو تندرستی اور شفائے کاملہ عطا فرمائے اور ہماری زندگی بھی نواب صاحب کو لگ جائے، آمین! ویسے نواب صاحب کی آپ بیتی پڑھنے کا تجسس بڑھ گیا۔ پلیز نواب صاحب! یہ قرض جلد از جلد چکائیں۔ دیوتا میں اس مرتبہ ایک نیا کردار بے باک مومن سامنے آیا ہے۔ یقیناً دشمنوں کی نیندیں حرام کرے گا۔ الپا کے مسلمان ہونے کی بہت خوشی ہوئی۔ احسان فراموش ایک کم عقل لڑکی کی داستان جو محبت اور ہوس میں فرق نہ کر سکنے کی وجہ سے گھر سے بے گھر ہوئی۔ نشان کا انجام بالکل غیر متوقع تھا۔ بے چارہ اسلم بالاج بے قصور مارا گیا اور اصل قاتل یعنی استاد شیدا بچ گیا۔ یک نہ شد ملک صاحب کی ڈائری سے انتخاب۔ رشتوں کی لڑائی جس میں کسی کی بھی تمنا پوری نہ ہوئی یعنی نادر خاں سوتیلی ماں سے جان چھڑوانے کے چکر میں اپنے حقیقی باپ کا قاتل بن گیا۔ دوسری طرف شکیلہ قادر خاں سے بچنے کے چکر میں اپنا حقیقی بیٹا گنوا بیٹھی۔ جشنِ قحط نے افسردہ کر ڈالا۔ افسوس! یہ بھوک کفارہ پڑھ کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک بتا تا ہوں۔ عبدالقیوم شاد مرحوم کے بعد کاشف زبیر میرے پسندیدہ ترین رائٹر بن گئے ہیں۔ ایسی ہی خوب صورت کہانیوں اور جاسوسی میں لکھی جانے والی سرورق کے رنگ کی بدولت۔ کاشف صاحب کو خصوصی مبارک باد۔ چنگیز شرانگیز فاتح اعظم کی ناکامی کی کامیاب داستان تھی۔''

☆عروج خان کی دھواں دھار آمد ملتان سے "با ادب باملاحظہ ہوشیار.....ہم تشریف لا رہے ہیں ہر طرح کے حملوں اور جوابوں کے اسلحے سے لیس ہو کر۔ ارے رے رے یہ کیا یہ صنف کرخت کہاں بھاگ رہے ہیں۔ اوہو بھئی ہم نے آپ کو حکومت کرنے کے لیے تین مہینے دیے اور خود پیچھے ہٹ گئے کہ چلو کچھ آپ بھی خوش ہو جائیں مگر ہم اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتے۔ چلو بہنو! اپنے اپنے محاذ سنبھال لو۔ اب ان حضرات سے بدلہ لینے کا وقت آ گیا ہے۔ ارے بھئی آرزو..... اوہ میرے دل کی آرزو۔ آ بھی جاؤ یار ایسی کیا مصروفیت کہ تمہیں ہماری یاد ہی نہیں آتی۔ جلدی حاضری دو ورنہ دوستی ختم۔ یونس خان روغنی اوہ آئی مین روغانی صاحب کرسئ صدارت پر بیٹھ کر اتنا نہ اتھلیں ارے بھئی آرام سے دیکھیں کیا کر رہے ہیں آپ۔ آآآآآہ۔ دیکھا گر گئے نا۔ اس لیے منع کر رہی تھی کہ اگر کرسئ صدارت مل ہی گئی ہے تو سکون سے تو بیٹھ جاؤ۔ چلو بھئی سعدیہ ہما، بھاگو تم نزدیک ہو۔ کرسی سنبھالو اور پھر ہٹنا نہیں۔ محمد صدیق عباسی صاحب ویلکم ان محفل یاراں۔ ویسے اب آپ کو کسی کلاس میں ہیں اور یہ تانکا جھانکی شرفا کا کام نہیں۔ وہ ایک شعر ہے نا کہ

اونچے جھروکوں سے نہ جھانکو صنم
تلے ڈگ کے سٹ کھاؤ گے

وہ آپ جیسوں کے لیے ہی ہے اور یہاں ہاہا کار اسی لیے ہے کہ یہاں سب زندہ دل لوگ ہیں اور سب ایک فیملی کی طرح ہیں اور وہ گھر ہی کیا جہاں تو تو میں میں نہ ہو۔ صوبیدار اقبال انکل سلام قبول کریں اور ہمیں اپنے خوب صورت تبصروں سے نوازتے رہیں۔ ارے یہ کیا ایک اور صوبے دار انکل احمد شیر ملک۔ ویلکم جی، ویسے عمر کے اس حصے میں آپ کو اناڑی میں اللہ اللہ کرنی چاہیے۔ یہ سعدیہ ہما شیخ کو کھسن کیوں لگ رہا ہے کیا کوئی کیس SOLVE کروانا ہے۔ سعدیہ سسٹر فیس پوری لینا چاہے کچھ بھی ہو جائے او کے۔ اویس سلمان اینڈ طارف ادیب فرام ملتان ویلکم جی ویلکم۔ طارف صاحب اب اگر قلم اٹھانے کی جرأت کر ہی لی ہے تو تھوڑی سی توجہ پڑھائی پر بھی دے لو میٹرک کے امتحان نزدیک ہیں۔ واہ جی واہ دوستی ہو تو ایسی ڈاکٹر صبا نے مجھے یاد رکھا تھینکس سسٹر آپ نے اتنے پیار سے یاد کیا اور ہم سب چھوڑ چھاڑ کے حاضر ہو گئے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ اف انکل احمد اقبال نے تو اب کی بار دل کی دھڑکنیں روک دیں کہ نواب رفیق احمد شیرازی کو رانا رجب علی جتال نے قید کر لیا ہے مگر شکر ہے کہ ایک گھنٹے بعد رہائی ہو گئی اور سب سے انٹرسٹنگ کیریکٹر راجا کا ہے اتنی سیریس چوئیشن کو فنی بنا دیتا ہے۔ لاسٹ ملتھ مرزا امجد بیگ کی کہانی گریٹ تھی۔ محفل شعر و سخن میں اول انعام یافتہ شعر بہت اچھا لگا۔ اس کے علاوہ یونس خان روغانی، جھرنا علی، عبدالرؤف شبنم اور صداقت کھٹانہ کے اشعار بے حد پسند آئے۔ آخر میں ایک چھوٹی سی خوشی آپ لوگوں کے ساتھ شیئر کرنا چاہوں گی۔ دسمبر میں ملتان میں ویمن رائٹس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ایک سیمینار ہوا تھا۔ "YOUTH CAN END VOILANCE AGAINST WOMEN" یہ ڈیبیٹ کا مقابلہ تھا وہاں گورنمنٹ ڈگری کالج و یونیورسٹی برائے خواتین کی طرف سے میں نے ڈیبیٹ کی اور سیکنڈ پرائز شیلڈ حاصل کی۔ اب آپ سب مجھے مبارک باد دیں۔" (بھئی بہت بہت مبارک باد)

☆اسما حسین کا تبصرہ لاہور سے "فروری کے سرورق پر آپ نے ویلنٹائن ڈے کا خوب خیال رکھا۔ اب وہ لاکٹ تو اکثر بیویاں اپنے شوہروں سے لانے کا حکم دیں گی مگر وہ بھی چالاکی سے کسی اور کو تحفتاً دے دیں گے۔ خیر لاکٹ کی قیمت کی مہنگائی، مہنگائی نہیں لگتی مگر موسم نے خود ہی سے معتدل ہو کر گرم کپڑوں کی خرید و فروخت سے ضرور ہماری جان چھڑائی۔ اب دکاندار مہنگے بیچیں یا سستے، ہماری بلا سے۔ فرہاد کہتا ہے میں ڈھونڈ رہا ہوں اپنے جسم کو..... اپنے دماغ کو۔ درحقیقت آج کے معاشرے نے ایسی صورت حال اختیار کر لی ہے کہ دل مل جاتا ہے تو دماغ نہیں ملتا۔ لوگ اپنے جسمانی اور روحانی تقاضوں سے بیک وقت فیض یاب نہیں ہو پاتے، اسی لیے تو ملک صغدر حیات کی یک نہ شد جیسے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اناڑی صاحب بھی کیا خوب ہیں۔ بڑے باہرانہ انداز میں ہر پھڈے میں ٹانگ اڑاتے ہیں اور اناڑی بن کر نکل آتے ہیں۔ جسٹن قطع نے تو ادب کا حق ادا کر دیا۔ چنگیز شر انگیز کی تاریخ انسانیت کی حرماں نصیبی پر روتی رہی۔ احتیاط پسندی کے متعلق کہنا پڑے گا کہ مختصر مگر موثر۔ کاشف زبیر کا عشق کی راہ میں کنارہ اچھا رہا۔ آخر میں اپنے چچا ڈاکٹر اعجاز حسین کو سلام۔ بچا! سسپنس لاہور میں پڑھنے کا زیادہ مزہ آتا ہے کہ رحیم یار خان میں؟ خدا کرے زور بازو اور۔"

☆اسد ملک کی چھیڑ چھاڑ ڈی جی خان سے "یہ خط میرا دوسرا خط ہے پہلے بھی خط شامل ہو چکا ہے امید ہے اس بار بھی ہوگا۔ خط نہ لکھنے کی وجہ یہ تھی کہ میرے تقریباً تمام خیالات ہی کسی نہ کسی طرح محفل خطوط طاں میں بذریعہ دوسروں کے خطوط سامنے آ جاتے تھے لیکن ہائے ری مجبوری پہلے والے دوست احباب نجانے کیوں اس محفل سے کنارہ کش ہو چکے ہیں کبھی کبھی جھلک دکھاتے ہیں تڑپا کر پھر گم ہو جاتے ہیں۔ نئے دوست بھی اچھے ہیں لیکن پہلے والی بات نہیں رہی۔ ہر طرف سے (ممی ڈی) ہی قسم کے فقرے نظر آتے ہیں۔ اس لیے سوچا دشت ظلمت میں، میں بھی گھوڑے دوڑا لوں شاید کہ اتر جائے کسی کے دل میں میری بات۔ اس بار اپنا محبوب رسالہ مجھے 27 تاریخ کو ہفتہ والے دن ہنڈی کے ذریعے موصول ہوا۔ ہنڈی کے ذریعے اس لیے کہ مجھے اپنی ایک بہت پیاری سی بھتیجی نے اپنے بابو سے چرا کر دیا۔ وہ بھی اسی دن لائے تھے لیکن ان کی قسمت کہ پڑھ نہ سکے۔ جیسے ہی سرورق پر نظر پڑی بے اختیار مجھے یہ شعر یاد آیا۔

میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ میری بات
خوشبو کی طرح اڑ کے ترے دل میں اتر جائے

پھول کے پیچھے اور غباروں جھالروں کے آگے حسینہ صاحبہ نجانے کس کو دیکھ رہی تھیں حالانکہ ہم بھی تو پڑے تھے راہوں میں۔ خیر ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں والی دل کو نصیحت کرتے آگے بڑھے تو ہم سے حسب روایت ہم سے استہزار اور نجانے کیا کیا کھاتے لیکن میں بھی کسی بیجک بال کی طرح ٹپے مارتا بالآخر اپنی محفل تک پہنچا جس میں وکیل صاحبہ اپنے مقدمے میں بحث کرتے نظر آئیں۔ لیکن بڑی چالاکی سے اپنا یوم برتھ بتا گئیں محترمہ کیا کسی نے آپ سے اس بارے میں پوچھا ہے؟ نجانے کیوں یہ یوم برتھ تو بتا گئیں لیکن یہ نہیں بتایا کہ ان کا تو نیا یوم پیدائش ہے 62 واں یا 52 واں۔ کبھی، کبھی، کبھی۔ نمبر 3 صوبے دار صاحب ملے جن کے لیے بس یہی مشورہ ہے کہ ہے جذبہ جنوں تو ہمت نہ ہار، جگہ خود ہی بن جائے گی چاہے وہ سینگوں پر ہی کیوں نہ بنے۔ ویسے وہ بھی کوئی بری جگہ تو ہے نہیں سب سے اونچے نظر آئیں گے۔ نمبر 4 پر بشریٰ افضل صاحبہ واز بٹھنگ۔ مبارک باد کے لیے خیر مبارک باد کس بات پر مبارک ہو میرے تمام تیور ترش کو موڈ ٹھیک ہو گیا تو آپ کی اچھی خبر لیتا کیونکہ آپ ایک تو بہت پرانی قاری اور لکھاری دوسری بڑی غلطی یہ ہے کہ آپ نے بار بار لکھ کر بار عباس کو نہیں بلایا۔ نجانے حضرت کہاں غائب جب سے شادی ہوئی ہے۔ وہ تو ایسے گم ہیں کہ..... اب بھی اگر جناب ظاہر نہیں ہوئے تو یہ خالی جگہ خالی نہیں رہے گی۔ خط خصوصاً آپ کی وجہ سے لکھا، ہمدردی بشریٰ صاحبہ موقع ملاقات پر ایمبولینس بھجوا دوں گا۔ نجانے کیا ہو جائے۔ اب میں تبصرہ کرتا ہوں تمام رسالے پر۔ میرے رسالہ پڑھنے کے

جاتا ہے کہ میں پڑھتا نہیں بلکہ دیکھتا ہوں۔ کیوں رسالہ صبح ملے شام کو ختم ہو جاتا ہے لیکن مجھے سب کچھ یاد ہوتا ہے چاہے پورا رسالہ کوئی سن لے۔ بس یہ مسلسل پڑھتے پڑھتے عادت ہی بن گئی ہے کہ اپنے آپ پڑھائی تیز ہونے لگی ہے۔ کہانیوں میں اپنے طریقہ کے مطابق سب سے پہلے والی پڑھی۔ مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے وہ اس طرح ہے کہ اس چنگیز خان کے بارے میں میرے محبوب مصنف جناب الیاس سیتاپوری نے بھی پہلے لکھا تھا لیکن مجھے نواب صاحب کی کہانی اور ان کے علم میں آنے والی تاریخ مختلف لگی ہے۔ خصوصاً چنگیز خان کی جس طرح پیدائش ہوئی۔ ہو سکتا ہے میں غلط ہوں ابھی میں خط پوسٹ کرنے کے بعد اپنی تصحیح کے لیے پرانے ڈائجسٹوں کو دوبارہ سے کھولوں گا۔ باقی کہانی پر لحاظ سے ایک طرح کا سحر طاری کر دینے والی تھی اللہ تعالیٰ نواب صاحب کو صحت کاملہ عاجلہ عطا فرمائے۔ ان کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ قارئین مدتوں نہیں بھلا سکیں گے۔ اس کے بعد فرماں بردار پڑھی جس کے ذریعے شراب خانہ خراب کا ایک اور نقش سامنے آیا وگرنہ میں نے سن رکھا تھا کہ شراب آدمی کو غصہ بہت دلاتی ہے یہاں معلوم ہوا کہ یہ بزدل بھی بہت بناتی ہے۔ اس کے بعد دیوتا پڑھی میرے قلم میں اس قدر طاقت نہیں کہ اس کو اچھا لکھ سکوں دیوتا کو بس میں ایک سرد دن کا چمکتا ہوا سورج لکھوں گا جو سب کو اچھا لگتا ہے۔ کہانی میں نئے کرداروں کی آمد پرانے کرداروں کے نئے روپ اور پرانوں کے چھپنے سے کہانی نے اچانک ایک دلچسپ اور سنسنی خیز موڑ لیا ہے دیکھیں کیا ہوتا ہے؟ پھر بھی بھی پڑھی جس سے مغرب کا ایک اور تاریک پہلو نہ صرف ہم پر واضح ہوا بلکہ بچوں کی نفسیات کے بارے میں بھی علم ہوا۔ اللہ سب کو ہدایت دے۔ ڈاکٹر ساجد امجد آتے تو بھی کھا رہی ہیں لیکن جب بھی آتے ہیں ایک ہمارے لیے تحفہ بھی لاتے ہیں جیسے احسان فراموش انجمن کا انجام بالکل ٹھیک ہوا۔ جب بندہ خود ہی کنویں میں چھلانگ لگائے گا تو نتیجہ کے طور پر کنویں میں ہی گرے گا کسی بیڈیا نوم کے گڈے پر تو گرنے سے رہا۔ اناڈی اچھی جا رہی ہے بس نواب صاحب کی پگا بازی پر پیشان کر رہی ہے معلوم نہیں انہیں آرام سے بیٹھنے کو دل کیوں نہیں کرتا۔ جشن قسط نے واقعی متاثر کیا، کیونکہ پاک و بھارت کے حالات تقریباً ایک ہی جیسے ہیں یہاں کی سیاست بھی ملتی جلتی ہے سوچ کا ناسور دوسری عورت اور احتیاط پسند اچھی نہیں لگیں جبکہ جمع تفریق میں مریم جی نے باپ اور بیٹے کا درد اچھی طرح بیان کیا کہ کس طرح ایک فرماں بردار بیٹا اپنے والدین کی اشیا سے محبت کرتا ہے اور اولاد کو بھٹکتا دیکھ کر ایک باپ دیار غیر میں بھی جیل کی پروا نہیں کرتا۔"

☆ **نظر کی شبیر کے احوال لالہ موسیٰ سے** "ساتھیو کیا حال ہے؟ کن چکروں میں الجھے رہتے ہیں۔ سسپنس کے آتے ہی ہم نے اپنی محفل کا رخ کیا اور سعدیہ ہما صابعہ کو کرسیٔ صدارت پر پایا۔ ایک بات جو ہم سعدیہ صابعہ کو بصد احترام بتانا چاہتے ہیں کہ ٹیچر چاہے کوئی پرائمری کا ہو یا کسی اعلیٰ تعلیمی یونیورسٹی میں تدریسی فرائض کی بجا آوری میں مشغول ہو۔ بے حد محترم ہوتا ہے کیونکہ اس کا پیشہ انبیا کا پیشہ ہے ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی معلم بنا کر بھیجے گئے تھے۔ امید ہے آپ برا نہیں مانیں گی۔ انکل صوبے دار احمد شیر ملک صاحب آپ تو اپنے سینگ غائب کروا چکے ہمیں کیوں ڈھونڈتے ہیں۔ آپ کی حوصلہ افزائی فرمانے والوں کی حوصلہ افزائی کون فرمائے گا۔ بشریٰ آپی ہمیں آپ کا مشورہ پسند آیا اسی لیے آج ہی سے ہم چھیڑ چھاڑ شروع کر دیتے ہیں بلکہ چھیڑ چھاڑ تو ہم کب کے شروع کر چکے مگر انکل کی گیند کو پسند نہیں آتا اس لیے یہ آپ تک نہیں پہنچ پاتی۔ زرتاج قطیر صاحبہ! حضرات کا تو پتا نہیں البتہ خواتین بالکل بھی بیچ تاب نہیں کھا رہیں۔ نسیم اختر عادل صاحب بہاولپور میں آپ کی اطلاع کے مطابق ہو سکتا ہے کہ بہت سے جل گگڑ ہوں۔ میری اطلاعات کے مطابق بستی عطر میں بھی ایک عدد جل گگڑ پایا جاتا ہے اور یہ بات دلائل و براہین سے پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ اس پر مزید بحث کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ بھئی اگر ہم انگریزی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو آپ کو اس سے کیا آپ بھی کر لیا کریں۔ بصد شوق پوں Complex میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں اور رہی بات پڑھا کو ہونا تو یہ بھی کوئی خوبی نہیں جب تک آپ کا عمل بھی ساتھ نہ ہو۔ اب ذرا آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ تاریخی کہانی کچھ خاص متاثر کن نہ تھی انکل ایک گزارش کہ تاریخی کہانی میں انگریز مصنفین کے تاریخی ناولوں کا ترجمہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے پھر تاریخی کہانیوں میں ایک بات جو ہمیں اتنی اچھی نہیں لگتی کہ اس میں صرف بادشاہوں اور حکمرانوں کو موضوع بنایا جاتا ہے یا پھر ان لوگوں کو جو ان سے براہ راست منسلک ہوتے ہیں۔ ایک عام آدمی پر ان تاریخی واقعات کے دوران کیا بیتتی ہے یہ موضوع بھی اضافی کیا جانا چاہیے۔" (بی بی تاریخ تو لکھی ہی بادشاہوں اور سلاطین کی جاتی ہے عام آدمی تو ہر دور میں عام آدمی رہتا ہے)۔ نشان اپنے اندر ایک اہم سبق لیے ہوئے تھی۔ جلدی کا کام شیطان کا اور قتل تو پھر ہے ہی شیطان کا کام۔ یہ درست ہے کہ اس نے معصوم جانیں لیں اب اگر قانون سزا دیتا تو ٹھیک وگرنہ معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ یک نشد کہانی ملک صاحب کی سابقہ کہانیوں سے ذرا مختلف تھی۔ ہمیں تو آخر تک سمجھ نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ شاید اسی کو سسپنس کہتے ہیں۔ اناڑی زبردست جا رہی ہے۔ پہلے ہم سسپنس موت کے سوداگر کی وجہ سے لیا کرتے تھے اور اب اناڑی کی وجہ سے۔ رفیق احمد شیرازی کے جد امجد عزت علی بیگ جب بھی نمودار ہوتے ہیں بڑے شاندار طریقے سے۔ گھر کے برتن بیچنے پر اس کی پٹائی ہونی ہی چاہیے تھی۔ دادی جان کو بھی اس میں حصہ لینا چاہیے تھا۔ جشن قسط و ادب عالیہ سے انتخاب بہت ہی اچھا افسانہ تھا۔ ہر کوئی اپنا الو سیدھا کرنے کی فکر میں ہے کسی غریب کے دو نوالوں سے کسی کو کیا واسطہ۔ قسط سے کسی آئیٹم نمبر کو کیا لینا دینا، اس کی تو وزارت بنتی چاہیے۔ سوچ کا ناسور بھی اچھی کہانی ہے۔ جمع تفریق محض ایک روایتی کہانی تھی۔ احتیاط پسند رائٹر کی احتیاط پسندی کا ثبوت ہے جس نے صرف دو صفحات میں جمع تفریق کرتے ہوئے کہانی کو انجام تک پہنچا دیا۔ کاشف زبیر کی کہانی کفارہ بھی اچھی کہانی ہے اور ہم نے آدمی پڑھی ہے اس لیے اس پر تبصرہ نہیں ہو سکتا۔ آخر میں ہم ایک فرمایش کریں گے۔ تاریخی کہانیوں میں انقلاب فرانس کے واقعات کو بھی جگہ دی جائے تو یہ بھی درس عبرت ہوگا۔"

☆ **عبدالرزاق پٹھان** کی چمن سے قدرے تاخیر سے آمد "جاسوسی اور سسپنس سے میرا ناتا شعور کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھنے کا ہے۔ پہلے تعلیم و تربیت، نونہال اور آنکھ مچولی جیسے رسائل پھر جاسوسی اور سسپنس پڑھنا شروع کیا اب تو ماشاءاللہ پاکیزہ، سرگزشت اور دلکش کا بھی باقاعدہ قاری ہوں لیکن میرا پسندیدہ ڈائجسٹ جاسوسی ہے کیونکہ میں اکثر ہم جوئی کرتا ہوں شاید اب بھی میں خاموش قاری ہی رہتا لیکن سرفرازی جیسی تحریر کی تعریف نہ کرنا میرے خیال میں نواب صاحب کے ساتھ بددیانتی ہوگی باقی کہانیاں رنگ لاتی ہے حنا، زیر و زبر، کیٹ واک اور فیصلہ بہت پسند آئی۔ دوسرے قارئین کو سلام۔ امید ہے وہ مجھے اس محفل میں خوش آمدید کہیں گے۔"

☆ **مس جاسوسی** کی آمد گوجرانوالہ سے "جی سنائیے کیا حال چال ہے آپ کا یقیناً ٹھیک ٹھاک اس کا اندازہ ہمیں ہر ماہ کی 23 تاریخ کو بخوبی ہو جاتا ہے ویسے جتنے رائٹ ٹائم پر مسٹر سسپنس ہم سے ملنے آتے ہیں شاید ہی کسی اور کو ملتے ہوں لیکن ہماری بے مروتی اور مصروفیت اتنی نامعقول ہیں کہ چاہنے کے باوجود ہم دوسرے لوگوں کی طرح ہر ماہ تو بڑی دور کی بات ہے کبھی کبھار بھی اسکا حال نہیں پوچھتے نجانے کیوں۔ ویسے لوگوں کے پاس نجانے اتنی مصروفیت میں بھی کیسے اتنا ٹائم نکل آتا ہے جو ہر ماہ بڑی باقاعدگی سے ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ ہے نا عجیب بات جبکہ ہم سوچتے ہی رہ جاتے ہیں اور مہینا گزر جاتا ہے خیر کوئی بات

نہیں۔ ویسے سعدیہ صاحبہ آپ بھی استاد جیسی محترم اور معزز ہستی سے ہی تعلیم حاصل کر کے اس مقام تک پہنچی ہیں اور استاد جیسے قابل پروفیشن کو ہی آپ مذاق نہیں بلکہ بہتک آمیز پروفیشن سمجھ رہی ہیں محترمہ ذرا خود پسندی اور غرور کی سیڑھی سے نیچے اتریئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ استاد کا رتبہ کتنا اونچا ہے۔ دیوتا کی اس بار 361 نمبر قسط پڑھنے کو ملی۔ اناڑی اچھی ہے لیکن اس میں بھی نواب صاحب کو کیا ضرورت ہے ہر کام میں اپنی ٹانگیں اڑانے کی اب کا سوا دو مسز کا سوا اس غلامانہ زندگی سے نجات حاصل کرنا ہی نہیں چاہتے تو چھوڑ دیں ان کے حال پر اب ذرا ملاحظہ کیجیے اب پرشامی صاحب تشریف لے آئے ہیں اور وہ بھی کاسو کے بلانے پر کیا پاٹ ہے بھائی پارے کی اب دیکھتے ہیں کیا گل کھلاتے ہیں سب اناڑی ملک کر، ویسے احمد انکل کا اناڑی لکھنے کا اسٹائل بالکل شکاری جیسا ہے۔ آخر میں چلتے ہیں چنگیز اور شرانگیز کی شرانگیز باتوں سے دو دو ہاتھ کرنے زبردست طریقہ کار تھا ان کا حکومت کرنے کا۔ لیکن عیاشیوں نے ان حکمرانوں کو کہیں کا نہ رہنے دیا۔"

☆ **بشریٰ الفضل** کی امیدیں بہاولپور سے "22 جنوری کو سسپنس ہمارے حسین اور نازک ہاتھوں میں ہیرے کی مانند جگمگا رہا تھا ریڈ رنگ کی میچنگ گرل اگر مگلے کے لاکٹ کو بھی ریڈ کر دیتے تو نائل کیا سے کیا بن جاتا ہم تو ایک ہی نظر میں گھائل ہو گئے تو صنف مخالف کے تو چھکے چھوٹ گئے ہوں گے۔ بڑی بے چینی سے جلدی سے اپنی محفل میں قدم رنجہ فرمایا تو پہلی کرسی پر دیکھ کر پہلے تو چونکے پھر مسکرا کر دیکھا یہ تو اپنی سعدیہ ہما بیٹھی نظر آئیں۔ ان کا تبصرہ اچھا تھا مگر تھوڑا سا اور ہو گیا تھا کرسئ صدارت سعدیہ جی مبارک ہو آپ کے ساتھ لوک جھوک کو میں خوب انجوائے کر رہی ہوں جب مل بیٹھیں گے ہم دیوانے دو تو لوک جھوک ختم ہو جائے گی۔ (وہ دن کب آئے گا) چوہدری ظفر اقبال صاحب بہت شکریہ اتنی پذیرائی نصیب ہوئی آپ کی گزارش پر تو عمل ہو چکا اور اب دوبارہ حاضری بھی گلوار ہی ہوں سرگرشت میں! صوبے دار احمد ہم نے حقیقت بیان کی! او ویسے سچ ہمیشہ کڑوا لگتا ہے سیکورٹی انسپکٹر نذر حسین انکل آپ کی بیٹی شکر ہے کہ ٹیچنگ کو مقدس پیشہ سمجھ کر بچوں کو سکھیئر ہو کر پڑھا رہی ہوں ویسے بھی نرسری کے بچے بہت معصوم ہوتے ہیں ان کو اچھے برے کی تمیز تو نہیں ہوتی اچھی باتیں ہم بتائیں گے تو ان کی تربیت بہتر ہو گی۔ میں اس فرض کو بخوبی نبھا رہی ہوں انکل میری کلاس میں 70 بچے ہیں۔ ذوالفقار علی جم جم آؤ ڈاکٹر صابوا نواز بھٹی تبصرے کی پسندیدگی پر شکریہ ویسے محمد ظفر اقبال صاحب آپ سے کس نے کہہ دیا کہ رانا محمد نثار ہمارا دل بہت بڑا ہے ابن مقبول آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ معزز اعوان بہت تھینکس بس ہمارے لیے دعا کرتے رہا کریں عبدالغفار ساگر واقعی بچے بہت تنگ کرتے ہیں اب تو پڑھانے میں مزہ آنے لگا ہے۔ اب کہانیوں کے بخیے ادھیڑ دیں نا آپ جم کی فرمانبرداری دیکھی ایون کی بیوی کو پرواہ بھی نہیں جبکہ شوہر نے بیوی کے لیے اتنا خرچہ کیا بچی کی نادانی بھی کبھی میں دیکھی بے چارا کیتھ بچی کو بچاتے بچاتے بھی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا نشہ نہ کرتا تو مونا کیا جاتا۔ یک نہ شد دو شد اس نشست میں تمام کی بہت مزہ آیا اتنا سسپنس ہوتا ہے کہ پڑھتا ہی جائے قسط والوں کو مختلف قسط میں مبتلا جشن قسط میں پایا مزہ نہیں آیا۔ مرزا کی جمع تفریق دیکھی کہ عمر بھر اولاد کے لیے کولہو کے بیل کی طرح محنت کی اور بڑھاپے میں کچھ ہاتھ نہ آیا سوائے ایک بیٹے کے! دوسری عورت نے کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا فرید میتگل کو جلدی میں نشان کی نشاندہی دیکھی اگر سکون سے دیکھ لیتا کہ دونوں میں سے کس کے جسم پر نشان ہے تو بے گناہ قتل ہونے سے بچ جاتا۔ دیوتا سے پہلے نجی الدین نواب کی صحت کے بارے میں پڑھا اللہ ان کو صحت کاملہ عطا فرمائے اور ان کو دیوتا کی قسطوں پر کہانی لکھنے کا موقع عطا فرمائے۔ سب سے لمبی قسط وار کہانی ہو رہی ہیں انکل میری کلاس میں 70 بچے ہیں۔ ذوالفقار علی جم جم آؤ ڈاکٹر صابوا نواز بھٹی تبصرے کی پسندیدگی پر شکریہ ویسے محمد ظفر اقبال صاحب آپ سے کس نے کہہ دیا کہ رانا محمد نثار ہمارا دل بہت بڑا ہے ابن مقبول آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ معزز اعوان بہت تھینکس بس ہمارے لیے دعا کرتے رہا کریں عبدالغفار ساگر واقعی بچے بہت تنگ کرتے ہیں اب تو پڑھانے میں مزہ آنے لگا ہے۔ اب کہانیوں کے بخیے ادھیڑ دیں نا آپ جم کی فرمانبرداری دیکھی ایون کی بیوی کو پرواہ بھی نہیں جبکہ شوہر نے بیوی کے لیے اتنا خرچہ کیا بچی کی نادانی بھی کبھی میں دیکھی بے چارا کیتھ بچی کو بچاتے بچاتے بھی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا نشہ نہ کرتا تو مونا کیا جاتا۔ یک نہ شد دو شد اس نشست میں تمام کی بہت مزہ آیا اتنا سسپنس ہوتا ہے کہ پڑھتا ہی جائے قسط والوں کو مختلف قسط میں مبتلا جشن قسط میں پایا مزہ نہیں آیا۔ مرزا کی جمع تفریق دیکھی کہ عمر بھر اولاد کے لیے کولہو کے بیل کی طرح محنت کی اور بڑھاپے میں کچھ ہاتھ نہ آیا سوائے ایک بیٹے کے! دوسری عورت نے کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا فرید میتگل کو جلدی میں نشان کی نشاندہی دیکھی اگر سکون سے دیکھ لیتا کہ دونوں میں سے کس کے جسم پر نشان ہے تو بے گناہ قتل ہونے سے بچ جاتا۔ دیوتا سے پہلے نجی الدین نواب کی صحت کے بارے میں پڑھا اللہ ان کو صحت کاملہ عطا فرمائے اور ان کو دیوتا کی قسطوں پر کہانی لکھنے کا موقع عطا فرمائے۔ سب سے لمبی قسط وار کہانی پر مبارک باد انشاء اللہ کیتھ بک میں بھی نام آئے گا پہلا مرحلہ تو طے ہو گیا ہے سب سے زیادہ شدت سے دیوتا کا انتظار تھا پہلے صفحے سے آخر تک جہاں باقی آئندہ تک پڑھا کہ فرہاد علی تیمور زندہ نکل آئے گا امید تو بندھی لیکن انتظار ہنوز باقی ہے۔"

☆ **ریحانہ سعید** کی تشریف آوری گجری ساگھڑ سے "اس بار شمارہ کچھ دیر سے موصول ہوا جس کی وجہ لانے والا کوئی نہیں تھا بہرحال جب ملا تو کھل کر خوش آمدید کہا سرورق نائل پر ایک خوب صورت ساچہرہ لیے ایک پیارا سا پاپ اسٹک کا گلاب ہونٹوں سے لگائے کسی کو ترچھی نگاہ سے دیکھ رہی ہے سرخ گلاب سرخ کپڑے سرخ لپ اسٹک بہت اچھی لگ رہی ہے۔ حسینہ کی عمر میک اپ سے چھپانے کی کوشش میں چہرہ زیادہ اچھا نہیں لگا پھر بھی بہت خوب صورت ہے نائل دلکش لگا۔ اس بار پہلے کہانیاں بعد میں خطوں پر تبصرہ۔ چنگیز شرانگیز جب دیوتا بنا تو احسان فراموش کر دیا۔ ہمارے مرزا ظفر بیگ نے فرمانبرداری دکھاتے ہوئے نشان چھوڑا اور بھی بھی، یک نہ شد کی مثال بن گئے۔ دوسری عورت نے جمع تفریق کر کے احتیاط پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کفارہ ادا کیا۔ اناڑی کا جشن قسط سوچ کا ناسور بن گیا۔ آخر میں محفل شعر و سخن سجائی اور خوب داد وصول کی۔ تو جناب پھر ہم نے پڑھنے شروع کیے اپنے خط۔ خطوں میں اس بار اپنا خط شامل نہ تھا کیونکہ مصروفیت کی وجہ سے خط لکھنا ہی بھول گئے تھے مگر ہر بار تو نہیں بھولیں گے۔ اس بار صدارت صنف نازک کے سپرد ہے بھئی مبارک ہو سعدیہ ہما آپ نے ہمیں یاد کیا شکریہ ہمیں ایسا لگا کہ جیسے میں ہی پہلے نمبر پر آئی ہوں خیر امید پر دنیا قائم ہے انکل کو کبھی تو ہمارا خط بھی اچھا لگے گا۔ ارے واہ ہماری محفل میں ایک صوبے دار کا اور اضافہ ہو گیا ہے جناب آپ حاضر دماغ ہو کر خط لکھا کریں اور پڑھتے وقت اپنے ناخنوں سے دماغ نکال کر اپنے سر میں رکھ لیا کریں تا کہ آپ کو خط اچھے لگنے شروع ہو جائیں۔ بشریٰ آپ اب یہ فضول بحث چھوڑ بھی دیں آپ تو بمبل کی طرح چمٹ ہی گئی ہیں۔ زرتاج قطیر آپ کو ویلکم آپ کا خط تو کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا مگر آپ کا نام اچھا لگا۔ نسیم اختر عادل خط پسند کرنے کا شکریہ ویسے شکر ہے کسی کو تو میرا خط پسند آیا۔ جمرنا علی آپ نے بہت اداس اداس کر دینے والی باتیں لکھی ہیں کیوں؟ اگلی بار حاضری ضرور دینا ہم آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ آخر میں جون ایلیا کی حاصل کلام یہ ایک پیغام ہے جو ہم سمجھنے کے باوجود سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ محفل شعر و سخن میں تبسرے نمبر کا شعر پسند آیا۔ کترینیں بھی بس اچھی تھیں اسے اور اچھا بنانے کی کوشش کی جائے۔"

☆ **قندیل رضوان ملک** کا استعجاب تلہ گنگ جھنگی سے "فروری کا شمارہ 24 جنوری کی صبح موصول ہوا اور سرورق کو دیکھتے ہوئے حیرت و استعجاب میں مبتلا ہوئے اف اتنی دلکش حسینہ گڈ ذاکر انکل۔ حاصل کلام۔ ۲ جون صاحب کے خیالات اور بیگ جزیئن سے پیار کا آئینہ دار تھا۔ سعدیہ ہما شیخ کو صدارتی کرسی پر دیکھ کر دل کو دھچکا لگا کیونکہ پورے تبصرے میں سوائے اپنی تعریف کے کوئی مقصد کی بات نہ تھی محترمہ بی ایس سی اور ایل ایل بی کر لینے سے انسان میچور نہیں ہو سکتا بلکہ عمر اور تجربات انسان کو PERFECT بناتے ہیں۔ ظفر اقبال وڑائچ آپ کی سسپنس میں آمد دل کو بھائی اور بشریٰ باجی کو آپ نے اچھا مشورہ دیا تھینکس۔ صوبیدار احمد شیر ملک کی آمد اچھی لگی اور آتے ہی چھا گئے ٹھہ کر کے صوبیدار صاحب آپ کہیں انکل میں تو سروس نہیں کرتے اگر آپ وہی ہیں تو شاید میں آپ کو کچھ کچھ جانتا ہوں۔ بشریٰ باجی کا تبصرہ بہت سنجیدہ تھا سعدیہ شیخ اگر آپ سے سبق لینا شروع کریں تو شاید کچھ بہتر لکھنے لگیں گی محترمہ میں تو آپ کو ہر دفعہ یاد کرتا لیکن بدقسمتی سے مجھے کافی عرصہ محفل میں انٹری نہ مل سکی اور اس دفعہ بھی ہم بلیک لسٹ رہے معلوم نہیں ماجرا کیا ہے۔ تحسین فاطمہ، کاجل کھرجی، رومانہ سحر، حفظ اور بابر عباس بھئی کہاں غائب ہیں انٹری دیں۔ محفل شعر و سخن میں پہلا اور دوسرا شعر لائق تحسین ہیں اس کے علاوہ امبرین اے شیخ، بابر عباس، سعدیہ

ادیب الرحمٰن اور عقیل بٹ کے شعر پسند آئے محی الدین نواب صاحب نے چنگیز شر انگیز میں تموچین کے بچپن سے لے کر موت تک حالات وواقعات بڑے دلچسپ اور حیرت انگیز انداز میں تحریر کیے چنگیز خان کی آخری حسرت اور موت اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھی۔

☆ رضا نوید کی رائے کراچی سے ''اس دفعہ کا سرورق باقی تمام شماروں کی نسبت مختلف ومنفرد تھا بہترین لگا۔ خطوں کی محفل میں مسراج کمل کی تھوڑی ہی کو بہت جانا اور گرہ سے لگالیا۔ سعدیہ شیخ اپنی خوش فہمیوں کے اسراء ہمارا قیمتی وقت برباد کرنے کے لیے پہلے نمبر پر تھیں ویسے آپ کی بشریٰ افضل سے ملاقات کی بھنک ہمیں پہلے سے مل چکی ہے لہٰذا نو لوکا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ظفر اقبال آپ کو تو شہر خیال کے مہمان خانے کا انچارج ہونا چاہیے تھا جس کو دیکھیں اسے شہر خیال میں آنے کی دعوت دے دیں۔ ارے بشریٰ جی کچھ تو اپنی عمر کا لحاظ کریں ایڈوکیٹ سے مل کر اپنا سکون کیوں غارت کروانا چاہ رہی ہیں۔ نذر حسین آصف آپ کو تو واقعی دن میں خواب نہیں دیکھنے چاہیے سکیورٹی انسپکٹر جو ٹھہرے۔ بشریٰ باجوہ، دیوتا کی اینڈنگ کیوں چاہ رہی ہیں ابھی تو محی الدین نواب صاحب کو اور ریکارڈ بنانے ہیں بس اللہ تعالیٰ انہیں صحت وتندرستی عطا فرمائے (آمین) ڈاکٹر رویینہ نفیس کہیں آپ نے ثاقب جی کا حلیہ تو بیان نہیں فرمادیا۔ رانا محمد شارنگ رہا ہے کہ تبصرہ آپ نے کجرارے اور کالے کالے نینوں والا گاتا دیکھتے ہوئے لکھا ہے تبھی تو... جاوید احمد صدیقی آپ نے کہاں سے صنف نازک کی عقل کا مسکن ان کی گدی بتایا ہے جبکہ ہمارا تجربہ انہیں اس نادرشے سے کوسوں میل دور بتاتا ہے۔ جھمر نا علی، آپ کے بارے میں تو میں بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار اں رکھ

عبدالغفار ساغر، آپ کی خالہ کی اللہ مغفرت فرمائے اور انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے (آمین) کہانیوں میں دیوتا حسب معمول بہترین جارہی ہے۔ سونیا کے پرسکون ہونے کی وجہ پہلے سے ہمارے ذہنوں میں موجود تھی لہٰذا ہم بھی پرسکون ہی رہے۔ بے باک مومن نے تو فرہاد کے دشمنوں کو خوف کے شکنجے میں کس لیا ہے جس کی وجہ سے کہانی تشنگی خیز ہوتی جارہی ہے۔ اناڑی میں حالات تیزی سے رنگ بدل رہے ہیں رفیق کے سامنے پردے میں پڑے ہوئے واقعات بے نقاب ہو رہے ہیں اور کہانی سے دلچسپی بڑھتی جارہی ہے۔ یک نہ شد دو شدوں اور دولت کی کشمکش کا احوال نظر آئی جسے ملک صاحب نے اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی بدولت خوش اسلوبی سے انجام کو پہنچایا۔ آخر میں کچھ ذکر ہو جائے اپنے پسندیدہ کہانی نگار کا شف زبیر کا، جن کی کفارہ ان کہانیوں میں سے ایک تھی جن کا انجام پڑھ کر جذبات کی شدت سے آنسو از خود رواں ہو جاتے ہیں کفارہ بلاشبہ ان کی سبق آموز تحریر تھی اور اس نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ واقعی آخری صفحات کے قابل تھی۔''

☆ فرید احمد خان کی ڈانٹ پھٹکار سکھر سے ''فروری کا شمارہ 22 جنوری کو ہماری نظروں کے سامنے پہنچا۔ عجلت میں سرورق پر غور ہی نہ کیا اور سیدھے اپنی محفل میں پہنچ کر دم لیا۔ خود کو بلیک لسٹ میں دیکھ کر اپنے آپ کو بہت ڈانٹا کہ ہم ادھر کیا کر رہے ہیں۔ خیر پھر واپس ہو لیے سرورق پر۔ دیکھا کہ ایک پانچ بچوں کی ماں، جو ہر بچے کی بیچ میں دو سال کا وقفہ رکھتی ہے، کی عمر کے جنتی عورت سرورق پر گلاب کا پھول لیے براجماں ہے۔ کیا اس کی تعریف میں اور بھی کچھ کہیں؟..... نہیں؟..... چلو چھوڑ دیا۔ تو ایک بار پھر محفل میں آئے۔ اپنی سعدیہ ہما صدارت کی کرسی پر بیوقوفوں کی طرح آنکھیں مٹکا مٹکا کر ادھر ادھر کی ہانک رہی تھیں۔ ہم، یعنی راجا ثاقب، طاہر جاوید، قاضی زین، صوبیدار محمد اقبال، عبدالروف تبسم، یونس روغانی وغیرہ یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ جو محفل سعدیہ کی صدارت میں ہو اس میں شرکت کریں، لہٰذا ہم نے بلیک لسٹ کو ترجیح دی۔ اپنی جھمر نا علی اور بشریٰ افضل بھی بے مروت نکلیں۔ گو کہ صنف کے لحاظ سے ہم ان دونوں کے روایتی حریف ہیں، پر سعدیہ کے ساتھ جنگ میں تو ہم بشریٰ کے اہم اتحادیوں میں شامل تھے، پر کم ظرفی نمایاں ہے کہ اپنے ایک خط میں بھی ہم کو جھوٹے منہ شکریہ بھی نہ کہا۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ اپنی وفاداریاں تبدیل کر دیں۔ وڑائچ صاحب، گویا آپ کے دبلے ہونے کی وجہ بشریٰ کی سرگزشت میں غیر حاضری ہے؟ بھئی، بی بی جی کو ہم کہہ دیں گے کہ وہ شامل سرگزشت ہو جائیں۔ ڈاکٹر صبا نواز بھئی صاحبہ سچ سچ بتادیجیے گا کہ ہم نے آپ کو بہت یاد کیا تھا پر قلم کی زبان سے اظہار نہ کر سکے، کیونکہ آپ زیادہ ترکسی سے مخاطب نہیں ہوتیں نہ، اس لیے۔ اب آپ نے شکوہ کیا ہے تو آئندہ ایسا نہ ہوگا۔ محمد ظفر اللہ بھائی ان دونوں خواتین کے بارے میں جو تجویز آپ نے دی ہے میں صد فیصد اس کی حمایت کروں گا۔ زرتاج کنول کی ملاقات بعد میں ہوگی۔ آپ کے نام اور تبصرے سے ہم آپ کی صنف جاننے سے قاصر ہیں پلیز ہماری پہلے یہ الجھن سلجھادیں۔ نسیم بھائی آپ کے سرورق پر تبصرے بہت پسند آتے ہیں جو میں سب دوستوں کو پڑھ کر سناتا ہوں۔ آمنہ افضل جی کہاں ہیں آپ؟ اگلے مہینے میں نے بتانا چاہا تھا کہ میرے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے جس کا نام آمنہ خان رکھا ہے پر خط شائع نہیں ہوسکا تھا۔ ابن مقبول بھائی، کیا آپ جانتے ہیں کہ اپنے دوستوں میں ایک وکیل ہے جس کا شعری مجموعہ چھپ کر آچکا ہے۔ کیا خرید کر پڑھنا پسند کریں گے؟ جھمر نا علی جی، آپ بس اپنی ہی کہتی جائیں، ویسے آپ کی باتوں میں ہوتا کچھ نہیں، صرف ٹیں ٹیں پھس..... ساغر صاحب، الیکٹرک چیئر کا یہاں کوئی تصور نہیں، جو مقصد آپ سمجھ رہے ہیں اس کے لیے یہاں پندرہ فٹ کا ایک رسا ہی کافی ہوتا ہے۔ بڑی کہانیاں یعنی بلواسکل کی تاریخی سوغات چنگیز شر انگیز، دیوتا، ملک صفدر حیات کی یک نہ شد، احمد اقبال کی اناڑی بکاشف زبیر کی کفارہ پڑھ چکا ہوں جن کی مشترکہ تعریف میں صرف اتنا کہوں گا کہ ان کی تعریف میں الفاظ نہیں ملتے۔''

☆ محمد عتیق ناز کی چھینا جھپٹی ٹبن وال سے ''شمارہ اس دفعہ پچیس تاریخ کو ''شانی بک سیلرز'' پر جگمگاتا نظر آیا تو فوراً اس پر جھپٹا مارا۔ سرورق کی حسینہ پھول سونگھتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ

اب کے رت بدلی تو خوشبو کا سفر دیکھے گا کون
زخم پھولوں کی طرح مہکیں گے پر دیکھے گا کون

جون ایلیا کے حاصل کلام کو پڑھتے ہوئے خطوط کی محفل میں چھلانگ لگائی تو سعدیہ ہما شیخ کر کرسی صدارت پر بیٹھے دیکھا اللہ کی شان ہے۔ باقی خطوط بھی بہت دلچسپ اور نمکین تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے دیوتا پڑھی جو کہ بہت خوبصورتی کے ساتھ عالمی ریکارڈ قائم کرتی جارہی ہے ویل ڈن نواب صاحب۔ اناڑی کی یہ قسط بھی سنسنی سے بھرپور تھی۔ یک نہ شد ملک صاحب کی ڈائری سے اچھا انتخاب تھی۔ احسان فراموش ڈاکٹر ساجد امجد کی متاثر کن تحریر تھی۔ جلد بازی کے فیصلے کرنے والوں کے لیے نشان باعث عبرت تھی۔ محفل شعر وسخن میں انعام یافتہ اشعار کے علاوہ شوکت حیات تبسم عبدالروف تبسم صوبیدار محمد اقبال اور فیصل ندیم کوندل کا انتخاب پسند آیا۔ اپنا وطن چھوڑ کر پردیس میں گھر بسانے والوں کے لیے جمع تفریق ایک عبرت ناک تحریر تھی۔ راہ عشق میں خود کو فنا کر لینے اور گناہوں کا کفارہ ادا کرنے والوں کے لیے آخری صفحات میں کا شف صاحب کفارہ کے ساتھ آئے اور چھا گئے واقعی یہ آخری صفحات کے لائق تحریر تھی۔''

☆ حفظہ غزل کی فرمائش راولپنڈی سے ''اس دفعہ سسپنس کچھ دیر سے ملا ڈائجسٹ ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے نظر سرورق پر پڑی ایک گلاب سی

زن کا زور

محی الدین نواب

چنگیز خان ..... دہشت و بربریت کی علامت اس دنیا سے رخصت ہوا۔ تاریخ کا سفر اور آگے بڑھا، اس کی اولادوں نے اس کے شروع کیے کام کو جاری رکھا۔ دور دراز کے علاقے ان کے گھوڑوں تلے روندے جاتے رہے۔ مرنے والا بھی جوع الارض کے مرض میں مبتلا تھا یہی عارضہ اس کی اولادوں کو بھی لاحق تھا..... جنگ و جدل، قتل و غارت گری اور دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک حکمرانی کرنے کا خواب انہیں بے چین و بے قرار ادھر ادھر پھرائے پھرتا تھا..... ایک طرف یہ سب ہو رہا تھا دوسری طرف ایک جنگ ایک مناقشہ ان کے اندر بھی جاری تھا، ایک ایسا مسئلہ جس نے ان فاتحین کو مفتوح کردیا تھا اور وہ مسئلہ تھا "عورت"۔ دنیا کے ہر مسئلے پر باہمی اتفاق رکھنے والے اس مسئلے میں بری طرح منتشر ہوئے۔ صورت حالات اس طرح تھی گویا ایک انار ہو اور کئی بیمار اور ہر ایک کی بیماری کی شفا کا راز اسی انار میں پنہاں تھا۔ منگول جو بعد کو مغل کہلائے ان کے خیموں میں کھیلے جانے والے محبت و رقابت کے کھیل اس کہانی کے ذریعے آپ کی خدمت میں پیش کیے جارہے ہیں کیوں کہ بہرحال وہ بھی انسان تھے اور جہاں انسان ہو وہاں جذبات و احساسات بھی ضرور ہوتے ہیں۔

ماضی کا آئینہ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے وہ واقعات جن میں درس عبرت بھی ہے اور لذتِ فسانہ بھی

وہ لوگ جیسے عجیب اور بے تکے تھے' ویسی ہی ان کی سفری گاڑیاں بھی تھیں۔ وہ گاڑیاں بیس فٹ چوڑی اور تیس فٹ لمبی ہوتی تھیں۔ بائیس بیٹے کئے بیل میلوں دور تک انہیں کھینچ کر لے جاتے تھے۔ گنبد نما بڑے بڑے خیمے گاڑیوں پر رکھے رہتے تھے۔ ان کے اندر خیموں کے مکین تو ہوتے ہی تھے۔ ان کے ساتھ زندگی گزارنے کے تمام ضروری ساز و سامان بھی موجود رہا کرتے تھے۔ فولادی ہتھیاروں کا وزن بھی اچھا خاصا ہوتا تھا۔ چلتے وقت ان کے پہیے چڑ چڑ اہٹ کی آواز کے ساتھ شور مچاتے جاتے تھے۔ زیادہ سامان لادنے کے باعث وہ گاڑیاں احتجاجاً چڑ چڑاتی رہتی تھیں۔ ''چو... چو... چواچو اں... چواں، چواں چو چو۔''

وہ وحشی خانہ بدوش برسابرس سے ایسی ہی آوازیں سنتے آرہے تھے۔ وہ چڑ چڑ اہٹ ایسی بھلی لگتی تھی' جیسے سرسنگیت سنتے جارہے ہوں۔

مسلح پیدل اور سوار سپاہیوں کا ایک قافلہ رواں دواں تھا۔ وہ چند گاڑیوں کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں چل رہے تھے۔ لوٹ مار کے دوران جس قدر اناج' کپڑے' ہتھیار' سونا' چاندی اور جواہرات ہاتھ لگے تھے' وہ سب ان گاڑیوں پر رکھے گئے تھے۔ صرف درمیانی گاڑی ایسی تھی۔ جس پر کوئی سامان نہیں تھا۔ صرف ایک تابوت رکھا ہوا تھا اور اس تابوت میں تموچین خان اعظم چنگیز خاں ابدی نیند سو رہا تھا۔

اس نے مکریت قبیلے کے باغیوں کو کچلنے کے لیے ان پر حملہ کیا تھا۔ اپنے فاتحانہ اصولوں کے مطابق اس نے انہیں تو کچل ہی دیا تھا لیکن موت نے اسے بھی نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اسے کچلتی ہوئی گزر گئی تھی۔ بے شک یہ اس کی فاتحانہ شان تھی۔ کہ کسی دشمن کے تیر تلوار نے اس کا بال بھی بیکا نہیں کیا تھا۔ ہزاروں انسانوں کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتارنے والا طبعی موت مرا تھا۔

مکریت قبیلے کے لوگوں کو معلوم ہوگیا تھا کہ چنگیز مر چکا ہے۔ لہٰذا اس کی فوج نے غلبہ پاتے ہی اُس قبیلے کے ایک ایک جوان' ایک ایک بوڑھے اور بچے کو قتل کر ڈالا۔ کسی کو زندہ نہیں چھوڑا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان میں سے کوئی زندہ بچ کر دشمن قبیلوں تک جائے اور خان اعظم کی موت کی خبر دور تک پھیلائے۔

ایک شیر ببر کے مردہ ہونے کی خبر ملتی تو سارے ہی دشمن شیر ہوجاتے اور حملہ کرنے میں دیر نہ کرتے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ دشمن ان کے خان اعظم کی میت پر حملہ کریں۔ آگے جاتے ہوئے کتنے ہی لوگوں نے پوچھا کہ یہ کس کی میت ہے؟

جس نے بھی پوچھا، اسے تابوت کا ڈھکن ہٹا کر چنگیز خاں کی لاش دکھائی گئی۔ پھر اسے قتل کر دیا گیا تاکہ وہ آگے جا کر یہ خبر دوسروں تک نہ پہنچا سکے۔

وہ خان اعظم اپنی زندگی میں ہزاروں جانثاروں کے ساتھ موت کا فرشتہ بن کر شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک جاتا رہا تھا۔ اپنی موت کے بعد بھی وہ عذاب جان بن گیا تھا۔ اس کی میت کے قریب سے گزرنے والے راہ گیر اپنی جان سے جارہے تھے۔ اس کی دہشت کوئی معمولی اور عارضی نہیں تھی۔ اس کے بعد بھی تاریخ کے صفحات اس کی دہشت دلوں میں بٹھا رہے ہیں۔ آج بھی جو لوگ ظالم' جابر اور دہشت گرد ہوتے ہیں۔ وہ بڑے فخر سے خود کو چنگیز خاں کہتے ہیں۔

وہ جس نے تقریباً ساری دنیا فتح کی تھی اور اپنی خواہش پوری کی تھی۔ وہ مرتے وقت ایک حسرت اپنے دل میں لے کر گیا تھا اور وہ حسرت تھی شینا.... وہ بہت ہی حسین و جمیل تھی۔ اس کے سوتیلے بیٹے جوجی کی بیوی تھی۔ وہ تقریباً بارہ برس تک اس حسینہ کو چھونے کی خواہش کرتا رہا مگر اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوسکی۔

اس نے کئی بار اپنے سوتیلے بیٹے سے سودے بازی کی کہ وہ جو چاہے اپنے خان اعظم سے طلب کرے اور شینا کو اس کے لیے آزاد کر دے۔ لیکن اس سوتیلے نے مرتے دم تک اس سے سمجھوتا نہ کیا۔ اس کی وہ ایک خواہش پوری نہیں کی۔

قبیلے کے بڑے بڑے سردار یہ بات جانتے تھے کہ خان اعظم کا دل اس حسینہ پر اٹکا ہوا ہے۔ لیکن جب تک بہو کا رشتہ رہے گا تب تک وہ اسے ہاتھ بھی نہیں لگائے گا اور نہ ہی اپنی بیوی بورتائی کو دیے ہوئے وعدے سے پھرے گا۔ وہ زبان کا سچا تھا۔ اپنی اس ایک خواہش کو اندر ہی اندر کچلتا رہا لیکن کبھی اس نے اپنی بورتائی کا دل نہیں دکھایا۔

رداروں نے سفر کے دوران شینا کو اس کے تابوت کے پاس بٹھا دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا خان اعظم زندگی میں جسے حاصل نہ کر سکا' وہ موت کے بعد اس کے قریب رہے۔ اس طرح اس کی روح کو سکون حاصل ہوتا رہے گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ عورت جونک کی طرح ہوتی ہے۔ چمٹ جائے تو ساری زندگی پیچھا نہیں چھوڑتی مگر مرد تو اس سے بھی سوا ہوتا ہے۔ وہ تو مرنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑ رہا

تھا۔ اسے اپنی میت کے ساتھ لے جا رہا تھا۔

وہ بیچاری اپنے شوہر کی موت کا صدمہ بھول گئی تھی۔ دل میں دھڑکا لگا ہوا تھا کہ پتا نہیں اب اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ جب قبیلے کے بڑے بڑے سردار مارے جاتے تھے اور ان کی تدفین ہوتی تھی تو ان کی قبر بہت ہی وسیع وعریض بنائی جاتی تھی۔ کیونکہ ان مرنے والوں کے ساتھ وہ تمام چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ جن سے انہیں زندگی میں بہت پیار رہا تھا۔ تلوار' تیر' کمان' نیزے' ڈھالیں اور جانوروں کا گوشت جسے وہ بڑی رغبت سے کھاتے تھے۔ وہ تمام چیزیں بھی قبر میں لا کر رکھی جاتی تھیں۔ جو پالتو اور چہیتا جانور سردار کی موت کے بعد بھی زندہ رہتا تھا۔ اسے بھی مار کر سردار کے ساتھ سلا دیا جاتا تھا۔

وہ فوجی قافلہ جا رہا تھا۔ گاڑیوں کے پہیے چڑ چڑاہٹ کے ساتھ گھوم رہے تھے اور تابوت سے لگی ہوئی شینا کا سر بھی گھوم رہا تھا۔ دل میں حسرت لے کر مرنے والے کی ہیبت طاری تھی۔ یہ خیال دہلا رہا تھا کہ خان اعظم کی حسرت پوری کرنے کے لیے اس بدنصیب بیوہ کو بھی ہلاک کر کے اس کے ساتھ سلایا جا سکتا ہے۔ تاکہ وہ قبر کے اندر رہتی دنیا تک خان اعظم کی حسرت پوری کرتی رہے۔

وہ رو رہی تھی۔ اس کے آنسو دیکھ کر قبیلے کے سردار اور جانثار یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ وہ خان اعظم کی موت کا صدمہ اٹھا رہی ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ اپنے شوہر کی موت پر آنسو بہا رہی ہے۔ ویسے قبیلے کی عورتیں اپنے مردوں کی موت کا محض رسمی طور پر ماتم کرتی تھیں۔ حقیقتاً یہ سوچ سوچ کر ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے کہ شوہر کے بعد پتا نہیں کون دوسرا تیسرا آ کر ان پر جھپٹنے والا ہے؟ مگر شینا کو کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ تابوت میں پڑا ہوا مردہ اسے جھپٹ کر لے جا رہا ہے۔

اسے اس بات پر بھی رونا آ رہا تھا کہ جادوانی آسمان نے اسے اس قدر حسین کیوں بنایا؟ اس کے سراپا میں ایسی غیر معمولی کشش کیوں پیدا کی کہ ہر دیکھنے والا لپکنے لگتا تھا! ایک تو عورت کے نام اور اس کے وجود میں ہی کشش ہوتی ہے۔ اوپر سے وہ اوپر والا غیر معمولی حسن وشباب کی سوغات عطا کرے تو وہ سوغات لیے پھرنے والی کی زندگی کانٹوں پر بسر ہوتی ہے۔ اسے ہر قدم پر چھپنے والے ہی ملتے رہتے ہیں۔

چنگیز خان کے چار بیٹے تھے۔ پہلا بیٹا جوجی سوتیلا تھا۔ باقی تین بیٹے چغتائی' اوغدائی اور تولوئی اس کے اپنے نطفے سے تھے۔ وہ تینوں اپنے سوتیلے بھائی جوجی کو گری ہوئی نظر سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ وہ ایک دشمن سے پیدا ہوا تھا۔ چنگیز کو بھی سوتیلے بیٹے سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ محض اپنی چہیتی بیوی بورتائی کی دلجوئی کی خاطر اپنے سگے بیٹوں کے برابر اسے تمام حقوق دیتا رہتا تھا۔

اس وقت وہ تینوں چغتائی' اوغدائی اور تولوئی ہتھیاروں سے لیس تھے۔ زرہ بکتر پہنے ہوئے گھوڑوں پر سوار تھے اور اپنے باپ کے تابوت والی گاڑی کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ انہیں اپنے باپ سے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ وہ جواں مردوں کی طرح اس کا صدمہ برداشت کر رہے تھے۔ محبت اور عقیدت کا تقاضا تھا کہ موت کے بعد وہ باپ کی ہر چیز کو اچھی طرح سنبھال کر رکھیں۔ لہٰذا وہ فرمانبردار اولاد کی طرح صرف باپ کے تابوت کے ساتھ ہی نہیں' شینا کے ساتھ بھی چل رہے تھے۔ آگے چل کر اس حسن وشباب کے بارود سے بھرے ہوئے مجسمے کو بھی سنبھالنا تھا۔

بارہ برس پہلے جب جوجی شینا کو بیوی بنا کر قبیلے میں لایا تھا تب ان تینوں سوتیلے بھائیوں نے اس کی دلہن کو دیکھا تھا اور چپ چاپ آہیں بھر کر رہ گئے تھے۔ کیونکہ ان کے باپ نے اس حسینہ کے لیے اپنی دیوانگی ظاہر کی تھی۔ اس وقت چغتائی نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا۔ ''بڑی زبردست عورت ہے۔ جی چاہتا ہے' جوجی کو قتل کر کے اسے اٹھا کر لے جاؤں۔''

دوسرے بھائی اوغدائی نے کہا۔ ''جادوانی آسمان کی قسم.... اس وقت میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اس عورت کے لیے خون کی ندیاں بہائی جا سکتی ہیں۔''

تیسرے بھائی تولوئی نے کہا۔ ''میں تو انگوری شراب کا رسیا ہوں۔ اس کے آگے عورت کو بھول جاتا ہوں۔ بہتر ہے' اسے دل و دماغ سے نکال دو۔ اسے حاصل نہیں کر سکو گے۔ کیونکہ ہمارا باپ اس کا طلب گار ہے۔''

ان تینوں بھائیوں کو یقین تھا کہ ان کا باپ زیادہ عرصے تک شینا سے محروم نہیں رہے گا۔ اسے حاصل کرنے کے لیے اپنے سوتیلے بیٹے جوجی کو ٹھکانے لگا دے گا۔ لیکن اس کی ماں بورتائی بہت مضبوط چٹان تھی۔ اگرچہ خان اعظم اس چٹان کو توڑ سکتا تھا مگر تھک کر اسی کے سائے میں بیٹھ جاتا تھا۔

اس طرح بارہ برس گزر گئے تھے۔ پھر تقدیر اپنا فیصلہ سنانے لگی۔ جوجی طبعی موت مر گیا تو خان اعظم کے دن پھر گئے۔ شینا کو اس کے یورت میں پہنچایا گیا۔ لیکن مقدر کے

تماشے کو کون سمجھتا ہے؟ وہ تموچین' وہ چنگیز خاں جو اپنی مٹھی میں لہو کا جما ہوا لوتھڑا لے کر پیدا ہوا تھا۔ وہ اس ہاتھ سے شینا کو چھو بھی نہ سکا۔ چھونے سے پہلے ہی بے دم ہو گیا۔

باپ مر چکا تھا۔ لہٰذا اس کے بعد بھائی کی بیوہ پر تینوں بھائیوں کا حق تھا۔ ان میں سے کوئی ایک اسے اپنی بیوی بنا سکتا تھا۔ انہیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔ ماں مر چکی تھی۔ باپ بھی مر چکا تھا۔ وہ تینوں بھائی مغل قبیلے کے مالک و حکمران تھے اور انہی میں سے کوئی آئندہ خان اعظم بننے والا تھا۔

جب وہ تابوت قبیلے میں پہنچا تو وہاں بھی راز داری سے کام لیا گیا۔ اس قبیلے میں پچیس ہزار جانباز تھے۔ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ مسلح رہ کر قبیلے کے چاروں طرف محتاط اور مستعد رہیں۔ دوسرے قبیلوں کے سردار اگر اپنی فوج کے ساتھ تعزیت کے لیے آنا چاہیں تو انہیں وہیں روک دیا جائے۔ صرف سرداروں کو قبیلے میں آنے کی اجازت دی جائے۔

پھر اس کی موت کا اعلان کیا گیا تو دور دور کے قبیلوں کے سردار تعزیت کے لیے آنے لگے اور کہنے لگے ... وہ جو مضبوط چٹان تھا' کیسے ٹوٹ گیا...؟ وہ جو ہمارے سامنے شہباز کی طرح اُڑتا تھا' اس شہپر کے پر کیسے جل گئے...؟

پھر وہ کہتے تھے۔ ''ہمیں یقین نہیں ہو رہا ہے کہ خان اعظم چنگیز خاں کو موت آسکتی ہے۔ وہ جب تک زندہ رہا' زندوں کے لیے موت بنتا رہا۔ اسے کوئی نہیں مار سکتا تھا۔ اس لیے جاودانی آسمان نے اسے اپنے پاس بلا لیا ہے۔''

بورتائی کی موت کے بعد چنگیز کی چار بیویاں رہ گئی تھیں۔ دستور کے مطابق چار دنوں تک روزانہ ایک بیوی کے یورت کے سامنے تابوت کو لا کر رکھا جاتا تھا۔ روزانہ ایک ایک بیوی کے بین کرنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔

''اے میرے خاقان...! تو مجھے خشک قبیلے سے اٹھا کر ہری بھری چراگاہوں میں لے کر آیا۔ تو نے مجھے ہری بھری زندگی دی۔ تیرے بعد اب میرا کیا ہوگا؟ اے میرے خان...!

تو مجھے شیریں دریاؤں کا پانی پلاتا تھا۔ تو میرے سر پر آسمان کی طرح چھایا رہتا تھا۔ طوفانی موسموں میں مجھے تحفظ دیتا تھا اور برف باری کی سرد ہواؤں میں مجھے گرم رکھتا تھا۔ اب تیری حرارت کہاں پاؤں گی؟ میرے خان!''

چار دنوں تک چار بیویوں کے یورت میں ماتم ہوتا رہا اور وہ تینوں بھائی شینا کے پاس آتے جاتے رہے۔ انہوں نے حکم دیا تھا کہ اسے ایک الگ یورت میں رکھا جائے۔ کھانے پینے اور اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھا جائے۔ کئی خادماؤں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس کی خدمت کے لیے ہمہ وقت موجود رہا کریں۔

چار دنوں کے بعد خان اعظم کی تدفین ہونے والی تھی۔ شینا کا ذہن بری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی کہ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟ یہ سننے میں آیا تھا کہ چنگیز کی تلوار' تیر' کمان اور ڈھالیں ایک یورت میں لا کر رکھی جا رہی ہیں۔ اس کی جتنی پسندیدہ چیزیں تھیں ان سب کو وہاں پہنچایا جا رہا تھا۔ ایک شہباز اور دو شکاری کتے شکار کے وقت ہمیشہ اس کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ انہیں بھی اسی یورت میں پہنچا دیا گیا تھا۔

ایک بار چغتائی تنہائی میں شینا کے پاس آیا تو وہ رونے لگی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ کیا یہاں تجھے تکلیف پہنچ رہی ہے؟''

اس نے روتے ہوئے پوچھا۔ ''میرا انجام کیا ہوگا؟ تیرا باپ میرا دیوانہ تھا۔ اپنی زندگی میں مجھے حاصل نہ کر سکا' کیا مجھے اس کے ساتھ قبر میں سلایا جائے گا؟''

چغتائی نے کہا۔ ''قبیلے کے شامان یہی کہہ رہے ہیں لیکن میں نے سختی سے اعتراض کیا ہے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔''

وہ اچانک اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر اس سے لپٹ کر بولی۔ ''تو میرے بدن کو دور سے دیکھتا ہے۔ لے اِسے قریب سے محسوس کر۔ اس سرد موسم میں کتنی گرم ہوں اور تجھے آئندہ کس طرح گرم رکھوں گی؟ بس تو میری جان بچا لے۔''

چغتائی کو یوں لگ رہا تھا' جیسے آگ کا بھڑکتا ہوا شعلہ اس سے لپٹ گیا ہے۔ اس نے بدن کی ایسی گرمی' ایسی نرمی اور پاگل کر دینے والی ایسی کشش کسی میں نہیں دیکھی تھی۔ قدرت نے اسے مکھن سے تراش کر اس کے اندر انگارے بھر دیے تھے۔ اس سرد علاقے میں ایسی انگیٹھی کسی ہاتھ تاپنے والے قدردان کو ہی مل سکتی تھی۔

وہ فوراً ہی تڑپ کر الگ ہو گیا۔ پھر بولا۔ ''میرے دوسرے بھائی بھی تیرے طلب گار ہیں۔''

اس نے پوچھا۔ ''تو پھر...؟''

''ہم تینوں بھائی کسی معاملے میں ایک دوسرے سے جھوٹ نہیں بولتے۔ کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیتے۔ تیرے معاملے میں بھی ہم تینوں فیصلہ کر رہے ہیں کہ تو کس کے

یورت میں آئے گی؟ جب تک یہ فیصلہ نہیں ہوگا تب تک میں تجھے ہاتھ نہیں لگاؤں گا مگر تیری تمنا کرتا رہوں گا اور وعدہ کرتا ہوں کہ تجھے اپنے لیے زندہ رکھوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ شینا نے ایک ذرا اطمینان کی گہری سانس لی۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ خان اعظم کے تینوں جانشینوں کو اپنی طرف مائل کر کے ہی اپنی عمر بڑھا سکتی ہے۔

چنگیز خان اپنی زندگی کے آخری چند برسوں میں ایک چینی دانشور لیو چت سائی سے بہت متاثر تھا۔ اس کی ذہانت اور عملی صلاحیتوں کے پیش نظر اسے اپنا مشیر خاص بنا کر رکھتا تھا۔ ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اس سے مشورہ طلب کرتا رہتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹوں کو اور قبیلے کے بڑے بڑے سرداروں کو ہدایت کی تھی کہ وہ کسی بھی اہم معاملے میں لیو چت سائی کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کریں۔ اب اس کی موت کے بعد شینا ایک مسئلہ بن گئی تھی۔

قبیلے کے بزرگ اور جادو دانی آسمان سے باتیں کرنے والے شامان کہہ رہے تھے کہ دستور کے مطابق خان اعظم کی ہر پسندیدہ چیز کو اس کے ساتھ قبر میں جانا چاہیے اور شینا تو اس کی سب سے پسندیدہ چیز تھی' جسے وہ حاصل نہ کر سکا تھا۔ وہ عورت اس کے ساتھ قبر میں رہے گی تو اس کی روح کو سکون ملتا رہے گا۔

دوسری طرف اس کے تینوں بیٹے شینا کی زندگی چاہتے تھے۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ آئندہ ہم میں سے کوئی ایک خان اعظم بنے گا' اس وقت تک ہم تینوں بھائیوں کے حکم کے مطابق یہاں کے معاملات نمٹائے جائیں گے اور شینا کے متعلق یہ فیصلہ ہے کہ اسے ہلاک نہیں کیا جائے گا۔ وہ ہم تینوں میں سے کسی ایک بھائی کے یورت میں رہے گی۔

ان تینوں نے قبیلے کے بزرگوں' شامانوں اور سرداروں کے اجلاس میں کہا۔ ''خان بابا نے ہدایت کی تھی کہ کسی بھی اہم مسئلے میں لیو چت سائی کا مشورہ ضرور قبول کیا جائے۔ لہٰذا ہم اسی دانشور سے کہتے ہیں کہ وہ اس معاملے میں اپنا فیصلہ سنائے۔''

لیو چت سائی ایک دراز قد چینی دانشور تھا۔ اس کے قد کی طرح اس کی مونچھیں بھی لمبی لمبی تھیں اور اس کی باچھوں کے اطراف لٹکتی رہتی تھیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کس قدر ذہین اور حاضر دماغ ہے۔ وہ ان تمام شمال مغربی علاقوں کے جغرافیہ کی پیائش کرتا رہتا تھا اور جڑی بوٹیوں سے ہر بیماری کی دوا تیار کرتا

قارئین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

تھا۔ جب مغلوں میں کسی بیماری کی وبا پھیلتی تھی تو وہ ان دواؤں سے ان کا علاج کرتا تھا۔ وہ صحت یاب ہوتے تھے۔ اور اس کی حکمت کے قائل ہو کر اس کی ہر بات مانتے تھے۔

چنگیز خان اس سے بہت متاثر تھا۔ جس طرح سکندر اعظم کو ارسطو جیسا فلسفی ایک مشیر کی حیثیت سے مل گیا تھا۔ اسی طرح لیو چت سائی بھی مشیر کی حیثیت سے ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا اور خان اعظم اس کے ہر مشورے پر عمل کرتا تھا۔

اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر قبیلے کے بزرگوں' سرداروں' شامانوں اور نجومیوں سے کہا۔ ''تم سب جانتے ہو کہ میں خان اعظم کا بہت ہی قابل اعتماد مشیر رہ چکا ہوں۔ تم نے دیکھا ہے' اس کی ہر بات پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔ وہ جو کہہ دیتا تھا وہ کرتا ضرور تھا۔ لیکن جب میں مشورہ دیتا تھا اور اسے کسی اقدام سے باز رہنے کو کہتا تھا تو وہ فوراً میری تجویز مان لیتا تھا۔ کسی ملک پر حملہ کرنے سے پہلے میری ہدایات پر عمل کرتا تھا۔ وہ گرم ملکوں میں مجھے سرد ہواؤں کی طرح ساتھ رکھتا تھا اور سرد موسموں میں مجھے کمبل کی طرح لپیٹے رہتا تھا۔ کبھی میرا ساتھ نہیں چھوڑتا تھا۔''

اس نے ایک ذرا رک کر قبیلے کے بوڑھوں اور سرداروں کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''کیا اس نے یہ حکم نہیں دیا تھا کہ اس کی موت کے بعد کسی بھی اہم مسئلے پر مجھ سے رجوع کیا جائے پھر میں جو بھی مشورہ دوں' اس پر عمل کیا جائے؟''

ان سب نے کہا۔ ''بے شک، ہمارے خان اعظم نے یہی حکم دیا تھا۔''

اس نے اپنی انگلیوں سے لانبی مونچھوں کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا وہ میرا مشورہ سنتے ہی اپنے آباؤ اجداد کے رسم و رواج کو بدل نہیں دیتا تھا؟''

سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ ''بے شک، مہذب دنیا کے ساتھ چلنے کے لیے وہ تیرے مشورے کے مطابق اپنے قبیلے کے دستور بدل دیتا تھا۔''

وہ بڑے ہی مستحکم لہجے میں بولا۔ ''آج بھی ایک دستور بدل دیا جائے۔ کسی زندہ انسان کو مار کر مرنے والے کے

ساتھ قبر میں نہ سلایا جائے۔ خان اعظم کے مشیر کا یہ فیصلہ اور مشورہ ہے کہ شینا کو ہلاک نہ کیا جائے۔''

وہ سب خاموش تھے مگر اس کی یہ بات سنتے سب ہی کچھ نہ کچھ بولنے لگے۔ کوئی حمایت میں بول رہا تھا، کوئی مخالفت میں۔ قبیلے کے بزرگ اور جادوانی آسمان سے باتیں کرنے والے شامان اس چینی دانشور کے خلاف بولنے لگے۔

چغتائی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر گرجتے ہوئے کہا۔ ''خاموش ہو جاؤ۔ یہ ہمارے خان بابا کا قابل اعتماد مشیر رہ چکا ہے۔ جو بھی اس کے خلاف بولے گا۔ میں اس کی گردن شانے سے اتار دوں گا۔''

سب ہی سہم کر خاموش ہو گئے۔ لیو چت سائی نے کہا۔ ''ہم دنیا والوں کو یہ کہنے کا موقع کیوں دیں کہ ہم پہلے کی طرح وحشی' ان پڑھ اور غیر مہذب ہیں۔ اس قبیلے کے بڑے بوڑھے، نوجوان اور بچے سب ہی لکھنا پڑھنا سیکھتے رہتے ہیں۔''

اس نے سرداروں اور جانثاروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم سب جنگیں لڑنے کے لیے مہذب ملکوں کی طرف جاتے ہو تو وہاں کتنے ہی مذہب کے لوگوں کو دیکھتے ہو۔ ہندوؤں' مسلمانوں اور عیسائیوں سے ملتے رہتے ہو۔ تم نے دیکھا ہے' سب کے مذہب الگ الگ ہیں۔ لیکن ایک خیال پر سب متفق ہیں کہ ان کا خدا یا بھگوان یا گاڈ کسی سے نہیں بولتا۔ آج تک اس کی آواز کسی نے نہیں سنی۔ وہ خدا بڑی خاموشی سے اپنی دنیا کو جاری و ساری رکھے ہوئے ہے۔''

ایک بڑے سردار نے کہا۔ ''بے شک، تو درست کہتا ہے۔''

لیو چت سائی نے کہا۔ ''تو پھر یہ بھی مان لو کہ ہمارے یہ قبیلے کے شامان جادوانی آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی آواز سنتے ہیں۔ جو خدا' بھگوان یا گاڈ ہے۔ وہ نہ کسی کی سنتا ہے، نہ کسی سے بولتا ہے۔ یہ شامان اور جادوگر ڈھونگی ہیں۔ طرح طرح کی باتیں بنا کر گرجتے ہوئے بادلوں سے اور کڑکتی ہوئی بجلیوں سے ڈراتے ہیں۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ کڑکتی ہوئی بجلیاں اور گرجتے ہوئے بادل ہمارے خدا نہیں ہیں اور نہ یہ خدا کا قہر بن کر نازل ہوتے ہیں۔ یہ قدرتی معاملات ہیں۔ یہ بجلیاں اور یہ بادل ہر سال' ہر مہینے بدلتے ہوئے موسم کے مطابق رونما ہوتے ہیں۔''

اس نے قبیلے کے شامانوں اور جادوگروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ جھوٹے اور فریبی ہیں۔ برسوں سے دن رات پیٹ بھرنے اور آرام سے رہنے کے لیے غیر مہذب قبیلوں کو دھوکا دیتے آئے ہیں۔ اب ہمیں ان کے فریب میں نہیں آنا چاہیے۔ ان سے کہا جائے کہ اپنے جادو کی ہتھکنڈے ختم کریں اور محنت مزدوری کا کام کریں یا پھر اس قبیلے سے چلے جائیں۔''

اس بات پر سب ہی ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ دھیمی آواز میں بولنے لگے۔ لیو چت سائی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''میں نے اپنا فیصلہ نہیں سنایا ہے۔ صرف مشورہ دیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب خان اعظم نہیں رہا۔ میرے مشوروں پر کون عمل کرے گا؟''

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر خان اعظم کے تینوں بیٹوں کو دیکھا۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ بڑے بیٹے چغتائی نے کہا۔ ''اس معزز دانشور نے ہمارے خان بابا کو مہذب دنیا کا راستہ دکھایا ہے۔ یہ جب بھی کوئی بات کہتا ہے' وہ ہماری بہتری کے لیے ہوتی ہے۔ ہم اس کے ایک ایک مشورے پر عمل کرتے رہیں گے۔''

دوسرے بیٹے اوغدائی نے کہا۔ ''یہ دانشور ہمارے باپ کی جگہ ہے۔ پہلے ہم اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر چلتے تھے اب اس کی انگلی پکڑ کر چلتے رہیں گے۔''

تیسرے بیٹے تولوئی نے کہا۔ ''آئندہ ہم تینوں بھائیوں میں سے کسی ایک کو خان اعظم بنایا جائے گا اور ہم اس سلسلے میں لیو چت سائی سے مشورہ چاہتے ہیں۔''

وہ پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنی لانبی مونچھوں کو دو انگلیوں کی قینچی سے سہلاتے ہوئے بولا۔ ''خدا تم تینوں جانشینوں کو ساری دنیا کی بادشاہت عطا کرے۔ یہ پورا قبیلہ جانتا ہے کہ تم تینوں میں کتنی محبت اور کس قدر اتحاد ہے؟ کہیں سے بھی کوئی دشمن آ کر تم میں پھوٹ نہیں ڈال سکتا۔ دولت کے لیے' زمین کے لیے اور عورتوں کے لیے باپ بیٹے سے اور بھائی بھائی سے لڑتا ہے مگر تم تینوں میں زن' زر' زمین کی ہوس نہیں ہے۔ تم متحد ہو کر اپنے پورے قبیلے پر حکمرانی کر سکتے ہو۔''

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ ''لیکن یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ایک ملک یا ایک قبیلے کا ایک ہی بادشاہ ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں بھی ایک خان اعظم کا ہونا لازمی ہے۔''

اس نے ان تینوں کی طرف دیکھا پھر کہا۔ ''میرا مشورہ ہے کہ خان اعظم کے انتخاب میں جلدی نہ کی جائے۔ برس دو برس تک تینوں بھائی متحد ہو کر قبیلے کے حکمران بن کر رہیں۔ اس دوران میں یہ دیکھا اور پرکھا جائے گا کہ تینوں

میں سے کس نے زیادہ فتوحات حاصل کی ہیں؟ کس نے اپنے قبیلے کی شان وشوکت میں اور رعب و دبدبے میں اضافہ کیا ہے؟ پھر ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ ہمارا خان اعظم تینوں بیٹوں میں سے کسے ذہانت کے معاملات میں لائق سمجھتا تھا؟ کسے میدان جنگ کا سورما کہتا تھا اور کسے کہتا تھا کہ وہ مختلف قبیلوں کو متحد رکھنے اور انہیں اپنا مطیع و فرمانبردار بنائے رکھنے کے ہتھکنڈے جانتا ہے؟''

دوسرے بیٹے اوغدائی نے کہا۔ ''بے شک، یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم خان بابا کی عدم موجودگی میں اس کی فتوحات کو کہاں تک آگے بڑھا سکتے ہیں اور اپنے مغل خاندان کا نام کتنی دور تک روشن کر سکتے ہیں؟''

تیسرے بیٹے تولوئی نے پوچھا۔ ''اب تُو ہمیں یہ بتا کہ ہمارے خان بابا کی تدفین کہاں کی جائے؟''

اس نے کہا۔ ''ہماری آبادی سے دور چراگاہوں کے اس پار طاقت کے پہاڑ برخان کالدون کی پہاڑیاں ہیں۔ ایک بار میں خان اعظم کے ساتھ وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ جگہ اسے بہت پسند ہے۔ یہاں سر بلند صنوبر کے درخت کے سائے ہیں۔ جب وہ مر جائے گا تو اس کے بوڑھے اور بے جان جسم کو یہاں بہت آرام ملے گا۔''

چنگیز خان کی میت کو وہاں پہنچایا گیا۔ پھر ایک بہت بڑے سایہ دار درخت کے نیچے زمین کھودی گئی۔ اس درخت کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے جڑ در جڑ کو نہیں کاٹا۔ بلکہ اس کے نیچے زمین کھود کر وہاں ایک چھوٹا سا خیمہ نصب کیا۔ وہاں چنگیز خان کی لاش کو لا کر بٹھایا گیا۔ پکا ہوا اناج اور گوشت ایک تلوار، ایک کمان، اس کا ایک جنگی گھوڑا جو مر چکا تھا اس کی ہڈیاں سب ہی وہاں لا کر رکھی گئیں۔ اس کی زندگی میں کتنی ہی خوبصورت اور نازک بدن لڑکیاں اس کے آس پاس رہا کرتی تھیں۔ ناچ گا کر اس کا دل بہلایا کرتی تھیں۔ اب وہ پرانے سمور کے نمدے پر تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بولتی ہوئی اور ناچتی گاتی ہوئی لڑکیاں اس کے ساتھ نہیں تھیں۔

جب اس کی آخری رسوم ادا کی جا رہی تھیں تو وہاں سے بہت دور شینا اپنے خیمے میں خوشی کے مارے دہاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ خان اعظم کے تینوں بیٹوں نے اسے مردہ باپ کے ساتھ قبر میں جانے نہیں دیا تھا۔ اسے اپنے لیے بچا کر رکھ لیا تھا۔ آگے پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟ وہ کس کے حصے میں آنے والی تھی؟ اب اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ جاودانی آسمان کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اسے ایک نئی زندگی مل رہی ہے۔

چنگیز خان کی قبر بند کر دی گئی۔ کچی مٹی کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے اچھی طرح دبا دبا کر ہموار کر دیا گیا۔ تابوت کی گاڑی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے جلا دیا گیا۔ وہاں آس پاس ہری بھری اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ ان جھاڑیوں میں عود اور کافور جلائے گئے۔ مختلف قبیلے کے سرداروں کو حکم دیا گیا کہ ان کے قبیلے کے مسلح سپاہی باری باری اس قبر کی حفاظت کرتے رہیں گے۔ وہاں چاروں طرف سخت پہرا رہے گا۔ کسی جانور کو قبر کھودنے نہیں دی جائے گی۔ جب جھاڑیاں اور درخت اتنے بڑے اور سایہ دار ہو جائیں گے۔ کہ قبر چھپ جائے گی تو وہاں سے پہرا ہٹا لیا جائے گا۔

تمام قبیلوں کے بزرگوں اور سرداروں نے تدفین کے بعد لیو چت سائی سے پوچھا۔ ''کیا اب چنگیز خان کی روح اس کے بدن سے نکل گئی ہوگی؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ہاں، نکل چکی ہے۔''

انہوں نے پوچھا۔ ''روح نکل کر کہاں گئی ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''اس کی روح مغل قبیلے کے پرچم میں سما گئی ہے۔''

مغل خاندان کے لوگ یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہ ان کے خان اعظم کی روح نو دموں والے اس پرچم کے ساتھ رہے گی، جو فوج کے ساتھ ساتھ جاتا ہے۔ اس طرح وہ خان اعظم موت کے بعد بھی ان کی رہنمائی اور حفاظت کرتا رہے گا۔

متبادل

بازار میں چھ بچوں نے ماں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کبھی کوئی ایک بازو کھینچتے ہوئے چلاتا ''ممّا.....!'' کبھی کوئی دوسرا بازو جھنجوڑتے ہوئے منمناتا ''ممّا.....!'' کسی کی فرمائش جاری تھی اور کسی کی شکایت۔

آخر ماں نے تنگ آکر غصے سے ڈانٹا ''اب میں دس منٹ تک کسی کے منہ سے لفظ ''ممّا'' نہ سنوں۔''

چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر ایک بچہ اس خاتون کی قمیص کھینچتے ہوئے بولا ''مس! ذرا سنیے...''

☆☆☆

لیو چت سائی خاندان خطا کے ایک شاہی خانوادے کی نسل سے تھا۔ وہ بڑی وفاداری سے چین کے کن خاندان کی خدمت انجام دیتا رہا تھا۔ اس وفاداری اور خدمت گزاری کے پیچھے سیاسی سازشیں چھپی ہوئی تھیں۔ لیو چت سائی انتہائی ذہین اور سازشی سیاستدان تھا۔ وہ کن شہنشاہ کا اعتماد حاصل کر کے اس کا قابل اعتماد مشیر بن گیا تھا۔ وہ اکثر اس شہنشاہ کو بہترین مشورے دیا کرتا تھا لیکن ایک آدھ مشورے ایسے بھی ہوتے تھے جو اندر ہی اندر اس کی جڑیں کھوکھلی کرتے رہتے تھے۔

وہ کن شہنشاہ سے اپنے خاندان خطا کی تباہی و بربادی کا انتقام لے رہا تھا۔ مغلوں نے بھی اس کے خاندان اور قبیلے پر حملے کیے تھے۔ اناج اور مویشیوں کے علاوہ ان کی حسین عورتوں کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ اس پہلو سے وہ دل ہی دل میں چنگیز خان سے بھی عناد رکھتا تھا۔ جب چنگیز خان نے کن شہنشاہ پر فتح حاصل کی۔ اسے اور اس کے خاندان کو تباہ و برباد کر دیا تو اس دوران لیو چت سائی اپنی ذہانت سے اس خان اعظم کو متاثر کرتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کا مشیر خاص بن گیا۔

وہ جانتا تھا' چنگیز خان دشت سے نکل کر بیرونی ملکوں پر حملہ کرتا رہے گا تو مہذب دنیا سے متاثر ہوتا رہے گا۔ اس سے پہلے ہی وہ چنگیز خان کو اپنے تہذیبی اور اخلاقی مشوروں سے متاثر کرتا رہا۔ اس کی وحشت اور بربریت کو کم کرتے ہوئے اس گرم مزاج جنگجو کو نرم مزاج بناتا رہا۔

اس سازشی سیاستدان کی نظریں اس کے چاروں بیٹوں پر لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک سوتیلا اور ناجائز تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آگے چل کر زیادہ سے زیادہ زمین کے لیے' دولت کے لیے اور زیادہ سے زیادہ حسین عورتیں حاصل کرنے کے لیے یہ آپس میں لڑیں گے' مریں گے اور اگر ایسا نہیں کریں گے تو وہ اپنی سیاسی چالوں سے ان کے درمیان پھوٹ ڈالے گا۔ جس طرح اس کا خاندان تباہ و برباد ہوا' اسی طرح وہ مغل خاندان کو تباہ و برباد کرے گا اور ان کی آئندہ نسل کو دوسروں کا غلام بنا دے گا۔

سیاسی سازشیں کئی سالہ منصوبوں کے تحت پنپتی ہیں۔ وہ ایک دو دن میں نہیں کئی برسوں کے بعد اب کامیابی کے آثار دیکھ رہا تھا۔ اس کی شطرنج کی بساط پر چار بھائی تھے۔ ان میں سے ایک سوتیلا مر چکا تھا لیکن مرنے کے باوجود اپنی بیوہ کو متنازعہ بنا گیا تھا۔

ان تینوں کے درمیان اختلافات اور عداوتیں پیدا کرنی تھیں۔ پھر یہ کہ ان تینوں بھائیوں کی بیویاں تھیں۔ جو ملکہ بننے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ ان کا یہ خواب اسی وقت پورا ہوتا جب ان میں سے کسی ایک کا شوہر خان اعظم بن جاتا۔

یعنی صرف شینا ہی نہیں۔ ان تینوں کی بیویاں بھی اس چینی سیاستدان کی شطرنج کا مہرہ بننے والی تھیں۔ یہ اس کا آزمودہ نسخہ تھا کہ عورتوں کی خواہشات اور جذبات سے کھیل کر بڑی بڑی حکومتوں کا تختہ کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام عورتوں کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے اچھا خاصا وقت لگنے والا تھا۔ اسی لیے لیو چت سائی نے ان تینوں جانشینوں کو مشورہ دیا تھا کہ خان اعظم کے انتخاب میں جلدی نہ کریں۔ اگلے ایک دو برس تک تینوں بھائی متحد ہو کر حکومت کرتے رہیں۔ اس نے اپنا سیاسی کھیل کھیلنے کے لیے برس دو برس کی مہلت حاصل کی تھی۔

چنگیز خان نے آخری شادی اس وقت کی تھی۔ جب وہ بہت ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔ بیماریاں اور کمزوریاں غالب آ گئی تھیں۔ ایسے وقت بھی ہوس رہتی ہے کہ کچھ ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ لیکن پہلو گرم کرنے کے لیے ایک نیا بدن ہونا چاہیے۔ وہ آخری بیوی بہت ہی کم سن اور نازک سی تھی۔ اس کا نام گولان تھا۔

ان تینوں بیٹوں نے باپ کی موت کے بعد اپنی سوتیلی ماؤں کو حکم دیا تھا کہ وہ آزاد ہیں۔ کسی سے بھی شادی کر کے اس کے ساتھ جا سکتی ہیں۔ لیکن جو سب سے چھوٹی گولان تھی۔ اس پر تینوں بیٹوں کا دل آ گیا تھا۔ باپ کی موت کے بعد گولان نہ ان کی ماں رہی تھی اور نہ ہی وہ اس کے بیٹے رہے تھے۔ آئندہ ان تینوں میں سے کوئی بھی اسے اپنے یورت میں لے جا کر رکھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ازدواجی زندگی گزار سکتا تھا۔

گویا شینا کی طرح گولان بھی متنازعہ تھی۔ آئندہ اس کے حصول کے لیے بھی تنازعہ ہو سکتا تھا۔ لیو چت سائی دیکھ رہا تھا' سمجھ رہا تھا کہ اور کتنی عورتیں اس کی آلہ کار بن سکتی ہیں؟ تیسری عورت سیورقوقطنی تھی۔

سیورقوقطنی جتنا مشکل نام ہے۔ وہ عورت اتنی ہی مشکلات سے کھیلنے اور مشکلات پیدا کرنے کی عادی تھی۔ وہ چنگیز خان کے تیسرے بیٹے تولوئی کی بیوی تھی۔ وہ ترک نسل کی ایک دلیر اور ذہین عورت تھی۔ اس میں دشت کی عورتوں جیسی غیر معمولی قوت برداشت تھی۔

اس کے اندر ایک ہی بات گونجتی رہتی تھی کہ اسے مغل

قبیلے کی ملکہ بن کر حکومت کرنا ہے اور یہ تب ہی ممکن تھا جب اس کے شوہر تولوئی کو خان اعظم بنایا جاتا۔

اور ایسے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ کیونکہ تولوئی اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ دستور کے مطابق بڑا بیٹا ولی عہد ہوتا ہے۔ اگر وہ بڑا نااہل ہو یا اسے موت آجائے تو پھر دوسرے بیٹے کی باری آتی ہے۔ تولوئی تیسرا اور آخری تھا۔ اس کی باری آنے کی کوئی امید نہیں تھی۔

البتہ تینوں بیٹوں کے کارناموں کا حساب کیا جاتا تو تولوئی ان سب سے برتر ہوتا۔ کیونکہ اس نے چنگیز خان کے ساتھ رہ کر زیادہ جنگیں لڑیں تھیں اور زیادہ فتوحات حاصل کی تھیں۔ اس کے لیے کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ زین پر ہی بیٹھے بیٹھے چھوٹے سے بڑا ہوا تھا۔ اپنے دونوں بھائیوں کے مقابلے میں تولوئی کی برتری یہ تھی کہ چنگیز خاں خطرناک سے خطرناک مہم کے لیے اسی کا انتخاب کیا کرتا تھا اور وہ اپنے خان بابا کے حفاظتی دستے کا سپہ سالار رہ چکا تھا۔ چنگیز خاں بڑی محبت سے اس بیٹے کو اپنا وفادار نوکر کہا کرتا تھا۔

سیورقوقطنی مایوس نہیں تھی۔ ایک دلیر فاتح کی حیثیت سے اس کے شوہر تولوئی کا پلڑا بھاری تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کسی طرح اس چینی دانشور لیو چت سائی کو اپنی طرف مائل کرے اور تولوئی کو خان اعظم بنانے کے سلسلے میں اسے قائل کرے۔ اس طرح ملکہ بننے کا خواب پورا ہو سکے گا۔

لیو چت سائی جڑی بوٹیوں کے ذریعے دوائیں تیار کیا کرتا تھا۔ اس نے یہ ہنر کتنے ہی مغلوں کو بھی سکھایا تھا۔ ایک بار تولوئی بیمار ہوا تو وہ اس کا علاج کرنے کے لیے یورت میں آیا۔ سیورقوقطنی ایسے ہی موقع کے انتظار میں تھی۔ یورت میں ان تینوں کے سوا کوئی چوتھا نہیں تھا۔ وہ اس چینی حکیم اور دانشور سے بولی۔ ''تولوئی اپنے تمام بھائیوں سے افضل اور برتر ہے۔ اس نے اپنے باپ کے ساتھ رہ کر بے شمار جنگوں میں دلیری اور جانبازی کا ثبوت دیا ہے اور ہمیشہ فتوحات حاصل کرتا رہا ہے۔ اگر تو چاہے تو اس کی حمایت میں بول کر اسے خان اعظم بنا سکتا ہے۔''

وہ دل ہی دل میں خوش ہوا۔ جسے اپنا آلہ کار بنانا چاہتا تھا وہ خود ہی اس کے دام میں آرہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''میرے اور تیرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ تولوئی کے دل میں یہ خواہش نہیں ہے، یہ اپنے دونوں بھائیوں کو بہت چاہتا ہے۔ یہ کسی وقت بھی ان کے حق میں دستبردار ہو سکتا ہے۔ میں حمایت کروں گا تو بات نہیں بنے گی۔ پہلے اپنے شوہر کو راضی کر۔''

تولوئی بیماری کی حالت میں بھی اس قدر پی چکا تھا کہ مدہوش ہو کر بستر پر غافل پڑا تھا، ان کی باتیں نہیں سن رہا تھا۔ چینی دانشور نے کہا۔ ''یہ پہلے جیسا جنگ باز نہیں رہا۔ بہت زیادہ پی کر مدہوش رہنے لگا ہے۔ پورے قبیلے میں اس کی مدہوشی کا چرچا ہے۔ سب ہی کہتے ہیں کہ اس کے منہ سے کھانا چھڑایا جا سکتا ہے لیکن شراب نہیں چھڑائی جا سکتی۔ میں ایسی حالت میں کس طرح اس کی حمایت کر سکتا ہوں؟''

وہ قائل ہو کر بولی۔ ''تو درست کہتا ہے۔ میں اس کی شراب چھڑاؤں گی اور اسے سمجھاؤں گی کہ خان اعظم بننے کے لیے تیرے مشورے پر عمل کرتا رہے۔''

''ایک بات یاد رکھ۔ میں براہ راست اس سے کبھی نہیں کہوں گا کہ یہ خان اعظم بننے کے لیے میری انگلی پکڑنے آئے۔ اگر ایسا کھل کر کہوں گا تو چغتائی اور اوغدائی اعتراض کریں گے۔ مجھے الزام دیں گے کہ میں نا انصافی کر رہا ہوں۔ لہٰذا میں تینوں میں سے کسی کی حمایت میں کھل کر نہیں بولوں گا۔ جب قرولتائی منعقد ہوگی تو میں اچانک تیرے شوہر کی حمایت میں بول کر اسے خان اعظم بنانے کا مشورہ دوں گا۔''

وہ وہاں سے جاتے ہوئے بولا۔ ''تجھے یہ سمجھنا چاہیے کہ عورت بظاہر جتنی کمزور ہوتی ہے۔ اندر سے اتنی ہی طاقتور ہوتی ہے۔ تو نے دیکھا تھا کہ تیری ساس بورتائی نے کس طرح خان اعظم جیسے سنگدل انسان کو ساری زندگی اپنی مٹھی میں رکھا تھا۔ اپنے ناجائز بیٹے کے حق میں اس سے باتیں منواتی تھی اور سگے بیٹوں کے برابر اس سوتیلے کو تمام حقوق دلواتی تھی۔ تُو بھی اپنے شوہر کو مٹھی میں رکھ کر اسے بھائیوں کے خلاف بھڑکائے گی۔ ان کے درمیان اختلافات پیدا کرے گی تب ہی تولوئی کے دل میں خان اعظم بننے کی ضد پیدا ہوگی۔ پھر وہ اس عہدے کو حاصل کرنے کے لیے اپنے کسی بھائی کا لحاظ نہیں کرے گا، عقلمند کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے۔ میں اس سے آگے کچھ نہیں بولوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ یورت سے باہر چلا گیا۔ بڑی چالبازی سے سیورقوقطنی کو بھائیوں کے درمیان عداوتیں پیدا کرنے کا نسخہ بتا گیا۔ وہ مایوس ہو کر اپنے بیمار شوہر کو دیکھنے لگی۔ اس کی صحت پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ شراب اس کا لہو نچوڑ رہی تھی اور وہ پینے سے باز نہیں آتا تھا۔

پھر وہ دیکھتی آئی تھی کہ تینوں بھائی ایک دوسرے سے

بہت محبت کرتے ہیں۔صرف محبت نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے پر اندھا اعتماد بھی کرتے ہیں۔وہ کسی بھی معاملے میں کسی سے سبقت لے جانا چاہتے تھے اور نہ ہی کسی بھی طرح کسی کا دل توڑتے تھے۔یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ تولوئی اپنے دونوں بڑے بھائیوں کے مقابلے میں کبھی خان اعظم بننا نہیں چاہے گا۔

وہ ڈوبنا نہیں جانتی تھی۔پار اُترنے کے لیے تنکے کا بھی سہارا ڈھونڈ لیتی تھی۔ابھی اس کی ایک اُمید باقی تھی۔اس کا بڑا بیٹا منگو خان بچپن ہی سے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھنا اور ہتھیار چلانا سیکھتا رہا تھا۔وہ اپنے باپ اور دادا کی طرح سفاک ، بے رحم اور جنگجو تھا۔تینوں بھائیوں کی بے شمار اولادوں میں وہ سب سے آگے تھا۔سیور قوقطنی اسے لکھنا پڑھنا سکھا رہی تھی۔جنگی مہارت اور ذہانت کا مظاہرہ کرنے میں وہ کسی سے پیچھے نہیں رہتا تھا۔

یہ آس بندھی تھی کہ تولوئی آیندہ خان اعظم نہ بن پایا تو کچھ عرصے بعد اس کے بیٹے منگو خان کو یہ عہدہ حاصل ہوسکتا ہے۔آیندہ چغتائی اور اوغدائی ' خان اعظم بنتے رہیں گے کوئی بات نہیں لیکن ان پر جلد ہی زوال آسکتا ہے۔انہیں موت آسکتی ہے۔وہ جنگ میں مارے جاسکتے ہیں۔بیماریاں ان پر غالب آسکتی ہیں۔کچھ بھی ہوسکتا ہے اور کچھ نہ ہو تو بہت کچھ کیا بھی جاسکتا ہے۔وہ خود تعلیم یافتہ نہیں تھی۔سیاستدان بھی نہیں تھی لیکن جانتی تھی کہ اقتدار حاصل کرنے کے لیے سیاسی سازشیں لازمی ہوتی ہیں۔

ان تینوں میں سے دوسرے بھائی اوغدائی کی بیوی کا نام تورا کینہ تھا۔پہلے وہ ایک دشمن قبیلے کے سردار کی بیوی تھی۔اوغدائی نے اس سردار کو قتل کرنے کے بعد اسے حاصل کیا تھا۔اگرچہ وہ بہت خوبصورت اور پرکشش تھی لیکن اسکی بد صورتی یہ تھی کہ وہ حلق پھاڑ کر بولتی تھی۔بہت ہی بدمزاج اور لڑاکا تھی۔اپنا جائز حق حاصل کرنے کے لیے دوسروں کو چیرنے اور پھاڑ ڈالنے والی خاتون تھی۔

وہ بھی پورے قبیلے کی ملکہ بننے کے لیے بے چین تھی۔اپنے شوہر اوغدائی سے لڑتی رہتی تھی۔اس سے کہتی تھی۔''تجھے اپنے بھائیوں سے اتنی محبت کیوں ہے؟ کیا تُو اتنا نادان ہے۔یہ نہیں سمجھتا کہ جو بھی خان اعظم بنے گا' اس کے سامنے تجھے سر جھکانا ہوگا' گھٹنے ٹیکنے ہوں گے۔اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنی ہوگی؟ ایک طرح سے تو غلام بن کر رہ جائے گا۔لیکن مجھے کنیز بننا گوارا نہیں ہے۔میں خان اعظم چنگیز خاں کی بہو ہوں اور اسی شان وشوکت سے ملکہ بن کر یہاں رہنا چاہتی ہوں۔تجھ سے کہہ دیتی ہوں کہ خان اعظم بننے کے لیے اپنے بھائیوں پر سبقت حاصل کر۔نیچے گرنے والی بات نہ کر...''

اوغدائی نے کہا۔''کبھی کبھی نیچے گرنے سے زمین پر پڑا ہوا سونا مل جاتا ہے۔ضروری نہیں کہ گرنے سے نقصان ہو، اکثر فائدہ بھی پہنچتا ہے۔کیا میں تیرے حسن و شباب کا خزانہ حاصل کرنے کے لیے تیرے آگے نہیں گرتا ہوں؟''

وہ بڑے فخر سے مسکرانے لگی۔وہ بولا۔''اگر یہ درست ہے تو ہم تینوں بھائیوں کو ایک دوسرے کے آگے گرنے دے۔ہماری فکر نہ کر۔''

''کیوں نہ کروں؟ تو کچھ نہیں چاہتا مگر میں تو ملکہ بننا چاہتی ہوں۔کیا تُو میری یہ خواہش پوری نہیں کرے گا؟''

''ہم تینوں بھائیوں نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا ہے۔چینی دانشور لیو چت سائی اور قبیلے کے تمام بڑے سردار جو فیصلہ کریں گے۔اسی کے مطابق کوئی خان اعظم بن جائے گا پھر اسی کی بیوی ملکہ کہلائے گی۔ہوسکتا ہے کہ یہ تیرے ہی نصیب میں لکھا ہو۔تجھے صبر کرنا اور انتظار کرنا چاہیے۔''

ان تینوں میں سب سے بڑا چغتائی تھا۔اس نے دو شادیاں کی تھیں اور دونوں بیویاں مر چکی تھیں۔یوں تو داشتاؤں کی کمی نہیں تھی لیکن اولاد پیدا کرنے کے لیے بیویاں لازمی ہوتی ہیں۔اب وہ باپ کی چھوڑی ہوئی بیوہ گولان سے شادی کرنا چاہتا تھا۔گولان بہت ہی کمسن اور نازک اندام تھی۔تینوں بھائیوں کا دل اس پر آیا ہوا تھا۔

ایک رات ان تینوں بھائیوں نے الاؤ کے گرد بیٹھ کر فیصلہ کیا۔اوغدائی نے کہا۔''فیصلہ کیا کرنا ہے؟ دستور کے مطابق چغتائی ہم سے بڑا ہے۔پہلا حق اسی کا بنتا ہے۔ہم گولان سے دستبردار ہوتے ہیں۔اس کی کوئی بیوی نہیں ہے۔جو تھیں وہ مر چکی ہیں۔اس لیے چغتائی کو اس سے شادی کرنی چاہیے۔''

ان تینوں بھائیوں کے درمیان محبت اعتماد اور اتحاد بے مثال تھا۔اسکول کی درسی کتابوں میں بچوں کے لیے ایک کہانی شائع ہوتی ہے۔اس کہانی میں ایک بوڑھا باپ اپنے چار لڑکوں کو بلا کر کہتا ہے۔''یہاں چار لکڑیاں رکھی ہوئی ہیں۔انہیں یکجا کر کے رسی سے باندھو۔''

انہوں نے رسی سے باندھ کر لکڑیوں کا ایک گٹھا بنا دیا۔باپ نے کہا۔''تم میں سے جو شہزور ہے۔وہ ان لکڑیوں کو توڑ کر دکھائے۔''

ان لڑکوں نے انہیں باری باری توڑنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے پھر باپ نے کہا۔ ''رسی کھول دو اور ان لکڑیوں کو الگ کرو۔''

انہوں نے رسی کھول دی۔ چاروں لکڑیاں الگ الگ ہوگئیں۔ باپ نے کہا۔ ''اب ان میں سے ایک لکڑی اٹھا کر توڑو۔''

سب نے ایک ایک لکڑی اٹھا کر توڑی تو وہ چاروں آسانی سے ٹوٹ گئیں۔ باپ نے کہا۔ ''یہ سبق حاصل کرنے کا مقام ہے۔ جب تک تم تینوں متحد رہو گے تب تک کوئی دشمن تم میں سے نہ کسی کو توڑ سکے گا' نہ کبھی شکست دے سکے گا اور نہ کبھی ذلیل کر سکے گا۔ تم تینوں دنیا کے بڑے بڑے شہزوروں پر غالب آتے رہو گے۔ اگر تمہارا اتحاد ٹوٹے گا۔ تم ایک دوسرے سے الگ ہو جاؤ گے تو کمزور سے کمزور دشمن بھی تم میں سے ایک ایک کو بڑی آسانی سے زیر کر لے گا۔''

دراصل چنگیز خاں نے اپنے تینوں سگوں بیٹوں کو یہ نصیحت کی تھی۔ یہ تاریخی کتابوں میں درج ہے کہ چغتائی' اوغدائی اور تولوئی نے اپنے باپ کی اس نصیحت کا بہت اثر لیا تھا اور ساری عمر ایک دوسرے سے اتنے متحد رہے تھے اور ایک دوسرے پر ایسا اندھا اعتماد کرتے تھے کہ لیو چت سائی جیسا شاطر سیاستدان بھی ان کے اتحاد کو کبھی نہ توڑ سکا۔

کہتے ہیں' جس پتھر کو فولادی ہتھوڑے نہیں توڑ سکتے' اسے عورت اپنی باتوں سے' گھاتوں سے اور اداؤں سے توڑ ڈالتی ہے۔ یہ عجیب بات دیکھنے میں آئی کہ ان تینوں کی بیویاں اور ان کی زندگی میں آنے والی حسین عورتیں بھی ان کے درمیان عداوت کا بیج نہ بو سکیں۔

ان تینوں کے درمیان الاؤ کی آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ بھنا ہوا گوشت کھا رہے تھے اور شراب پی رہے تھے۔ باہر الاؤ کی گرمی تھی اور اندر شراب کی آگ اتر رہی تھی۔ اس کے باوجود ان کے دماغ گرم نہیں تھے۔ وہ بڑے سکون سے اپنے الجھے ہوئے معاملات پر گفتگو کر رہے تھے اور کسی بھی معاملے میں ایک دوسرے سے متفق ہو کر کسی مثبت نتیجے پر پہنچ رہے تھے۔

خان اعظم بننے اور اقتدار حاصل کرنے کا مسئلہ بہت ہی سنگین تھا۔ حکمران بننے کے لیے بیٹا باپ کا اور بھائی بھائی کا خون بہاتا ہے لیکن وہ تینوں ایک دوسرے کے خلاف اقتدار کی ہوس میں مبتلا نہیں تھے۔ وہ کسی بھی بھائی کی برتری قبول کرنے کو تیار تھے۔ اب لے دے کر شینا کا معاملہ رہ گیا تھا۔ فی الوقت وہ ایک انار تھی اور تین بیمار تھے۔

تولوئی نے ایک چلّو شراب الاؤ پر پھینکی تو شعلے اور زیادہ بھڑکنے لگے۔ اس نے بڑے بھائی سے کہا۔ ''چغتائی...! سچ بتاؤ تو نے اسے دور ہی دور سے دیکھا ہے یا اس کا ہاتھ بھی پکڑا ہے؟ بات اس سے بھی آگے بڑھی ہو تو ہم سے نہ چھپانا۔''

اوغدائی نے کہا۔ ''وہ الاؤ کی آگ سے بھی زیادہ گرم ہے۔ اس کے بارے میں کھل کر بات ہونی چاہیے۔''

چغتائی نے لوہے کی سلاخ سے الاؤ کی آگ بھڑکاتے ہوئے کہا۔ ''پتا نہیں اس میں کیسی عجیب و غریب سی کشش ہے۔ ہم سب اسی کی طرف کھینچے جاتے ہیں۔ میں ایک بار اس کے یورت میں گیا تھا۔ اس وقت وہ بُری طرح سہمی ہوئی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ اسے بھی ہلاک کر کے ہمارے خان بابا کے ساتھ دفن کر دیا جائے گا۔''

دونوں نے تائید میں سر ہلایا۔ ''ہاں، ان دنوں وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔''

چغتائی نے کہا۔ ''جب میں اس کے پاس پہنچا تو وہ رو رہی رہی تھی۔ رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں چاہوں تو اسے ہلاکت سے بچا سکتا ہوں۔ پھر وہ ایک دم سے مجھ پر آ کر میری گردن میں بانہیں ڈال کر مجھ سے لپٹ گئی تھی۔''

وہ شراب کے پیالے کو فضا میں بلند کرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جاودانی آسمان کی قسم... ان لمحات میں یوں لگا جیسے الاؤ کے شعلے مجھ سے لپٹ گئے ہیں۔ وہ ایک تھی مگر اس نے چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا تھا۔ میں ایسے شکنجے میں آ گیا تھا' جہاں سے ہم رہائی پانا بھول جاتے ہیں۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس میں کتنی گرمی اور کتنی نرمی تھی۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا چیز ہے جو میرے بازوؤں میں آ کر سما گئی ہے۔ وہ یوں سحر زدہ کر رہی تھی کہ عقل کسی کام کی نہیں رہی تھی۔ میں سیکڑوں دشمنوں کو قتل کرنے اور اسیر کرنے والا اس کا اسیر ہو کر رہ گیا تھا۔ اگر باہر آقا بابا کی میت رکھی نہ ہوتی تو شاید میں بہکتا ہوا بہت دور نکل جاتا۔ شکر ہے اس سے پہلے ہی میں اس کے یورت سے نکل آیا۔''

اوغدائی نے گوشت کے ساتھ ہڈیاں بھی چباتے ہوئے کہا۔ ''بے شک، وہ ایسی ہی ہے جیسا کہ تو بیان کر رہا ہے۔''

تولوئی نے پوچھا۔ ''تو کیسے جانتا ہے کہ وہ چغتائی کے بیان کی طرح بھڑکتی ہے اور بھڑکا دیتی ہے؟''

''میرے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہو چکا ہے۔''

دونوں نے چونک کر اوغدائی کو دیکھا۔ وہ دو گھونٹ پینے کے بعد بولا۔ ''ہمارا وہ سوتیلا (جوجی) بہت ہی خوش نصیب تھا۔ دنیا کی سب سے حسین اور جذباتی فساد پیدا کرنے والی عورت اس کے حصے میں آئی تھی۔ ایک بار میں اس کے یورت میں گیا۔ تو وہ مجھ سے بھی لپٹ کر اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔ میں کیا بتاؤں کہ وہ کس طرح میرے اندر فساد برپا کر رہی تھی؟ جی چاہتا تھا کہ جذبات کی ایک ایک تحریک سے لڑتا رہوں اور اسے کچلتا چلا جاؤں لیکن ایسے وقت آقا بابا کی روح میرے اندر کہہ رہی تھی' یہ غلط ہے تم تینوں بھائی اس حسینہ کے طلب گار ہو۔ اتحاد اور اتفاق رائے کو نہ بھولو، پہلے فیصلہ کرو کہ یہ کس کے حصے میں آئے گی؟''

اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے دونوں بھائیوں کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ''میں ان لمحات میں بڑی مشکل سے اپنے جذبات کو کچلتا ہوا اس یورت سے باہر آ گیا پھر اس شعلہ بدن کی تنہائی میں آج تک نہیں گیا۔''

تولوئی نے کچھ سوکھی لکڑیاں الاؤ میں ڈالیں۔ پھر ان پر ایک چلّو شراب اچھالی۔ وہ لکڑیاں بھی آگ پکڑنے لگیں۔ شعلے بھڑکانے لگیں۔ چغتائی نے کہا۔ ''میں نے اور اوغدائی نے اپنی اپنی بات کہہ دی۔ اب تو بول.....؟''

تولوئی نے کہا۔ ''میں کیا بولوں...؟ تم دونوں اس کے یورت میں گئے تھے۔ لیکن میں نہیں گیا۔ اس نے اپنی ایک خادمہ کے ذریعے مجھے بلایا تھا... ہائے۔ ہائے تم میں سے کوئی سوچ سکتا ہے کہ وہاں کیا ہوا ہوگا؟''

اوغدائی نے کہا۔ ''ظاہر ہے۔ وہ تم سے بھی لپٹ گئی ہو گی۔ اس نے تم سے بھی اپنے بدن کا تعارف کرایا ہوگا؟''

تولوئی نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''نہیں برادر..! ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں اپنے باپ کی قسمت لے کر آیا ہوں۔ ہمارا باپ اسے پا لینا چاہتا تھا، مگر صرف اسے چھو لینے کی بھی حسرت پوری نہ کر سکا۔ یہی میرے ساتھ ہوا۔ اس کے یورت میں گیا۔ اس کے بالکل قریب بیٹھا رہا مگر ہاتھ نہ لگا سکا۔''

چغتائی نے حیرانی سے پوچھا۔ ''ایسی کیا بات ہو گئی تھی؟''

''وہ بہت چالاک ہے۔ اسے میری یہ کمزوری معلوم ہو گئی کہ میں انگوری شراب کا رسیا ہوں۔ میرے وہاں پہنچتے ہی اس نے میرے سامنے ایک پیالہ رکھ دیا۔ میں نے وہ پیالہ خالی کیا تو اس نے دوسرا بھر دیا۔ تم دونوں حسن و شباب کے رسیا ہو۔ لیکن میں تو انگور کی بیٹی پر مرتا ہوں۔ میں نے تیسرا پیالہ بھی خالی کر دیا۔ چوتھے کی نوبت نہیں آئی۔ میری بیوی وہاں پہنچ گئی۔ مجھے پکڑ کر وہاں سے اپنے یورت میں لے آئی۔''

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ وہ ان کے ساتھ ہنستے ہوئے بولا۔ ''مجھے بھی اپنی حالت پر ہنسنا چاہیے۔ بہت زیادہ پینے کے بعد میری بیوی مجھے سنبھالتی ہے اور کوئی سنبھال نہیں پاتا۔''

وہ تینوں ہنس رہے تھے۔ آہنی سیخوں پر چڑھی ہوئی بوٹیاں نوچ رہے تھے اور شراب پی رہے تھے۔ پھر تولوئی نے کہا۔ ''شینا کا معاملہ رہ گیا۔ وہ کس کے حصے میں آئے گی؟''

اوغدائی نے کہا۔ ''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کسی بھی چیز پر پہلے بڑے بھائی کا حق ہوتا ہے۔ وہ چغتائی کے حصے میں آئے گی۔''

چغتائی نے کہا۔ ''ہرگز نہیں۔ گولان جیسی کمسن اور نازک اندام لڑکی میرے حصے میں آ رہی ہے۔ پھر بھی یہی کہہ رہے ہو کہ شینا پر پہلے بڑے بھائی کا حق ہے؟ اس کا مطلب ہے کہ میں بڑا بھائی بن کر تم دونوں سے ناانصافی کر رہا ہوں۔ ہر چیز میں ہی چھین کر لے جاؤں گا تو کیا تم دونوں میرا منہ تکتے رہو گے؟ ہمیشہ میری فرمانبرداری کرتے رہو گے اور مجھے شرمندہ کرتے رہو گے؟''

تولوئی نے کہا۔ ''زیادہ جذباتی نہ بن .... جاودانی آسمان نے تجھے بڑا بنایا ہے تو ہم کیا کریں؟ اس دنیا میں حسین عورتوں کی کمی نہیں ہے۔ گولان اور شینا نہ سہی، ہمیں اور بہت سی مل جائیں گی۔''

چغتائی نے کہا۔ ''میں صاف صاف کہتا ہوں کہ گولان مل گئی یہی بہت ہے۔ مجھے شینا کی آرزو نہیں ہے۔''

وہ دونوں اسے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اس نے پوچھا۔ ''کیوں ہنس رہے ہو؟''

اوغدائی نے کہا۔ ''ابھی تُو نے کہا تھا کہ جب وہ تیری گردن میں بانہیں ڈال کر کمبل بن گئی تھی، تو تُو اس کے لیے پاگل ہو رہا تھا اور اب ہماری خاطر اس سے دستبردار ہونا چاہتا ہے؟''

وہ بولا۔ ''جب عورت بہکاتی ہے تو مرد بہکتا ہے۔ جب وہ بہکانے والی تیری ہو جائے گی تو کبھی اس کا خیال بھی میرے دل میں نہیں آئے گا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو بھی چیز اچھی لگے اسے ہم حاصل کر لیں... نہیں... کبھی ہمیں کسی چیز کو ٹھکرانا بھی چاہیے، کبھی اس سے کترانے، کبھی نفس کو مارنے اور کبھی صبر کرنے کی مشق بھی کرنی چاہیے۔''

تولوئی نے کہا۔ ''تو باتیں بہت اچھی کرتا ہے لیکن کوئی ایسی بات کر کہ کسی کا حق بھی نہ مارا جائے اور سب کی دلی مرادیں بھی پوری ہو جائیں۔''

دونوں بھائیوں نے اسے چونک کر دیکھا۔ وہ بولا۔ ''کیا ضروری ہے کہ شینا جس کے بھی حصے میں آئے' وہ اسے اپنی بیوی بنا کر رکھے؟ کیا داشتہ بنا کر نہیں رکھا جا سکتا؟ اور داشتہ کسی ایک کی نہیں ہوتی۔ کبھی اِس کے پاس چلی آتی ہے اور کبھی اُس کے پاس چلی جاتی ہے۔''

چغتائی نے کہا۔ ''تولوئی! کیا بات ہے تیری...؟ جو بات میرے دل میں تھی اور زبان پر نہیں آ رہی تھی۔ وہ تُو نے کہہ دی۔''

تولوئی نے اوغدائی کو دیکھا پھر پوچھا۔ ''تو کیا کہتا ہے؟''

اوغدائی نے کہا۔ ''جوجی کی موت کے بعد ہم نے اس کے تمام مال اسباب پر قبضہ جما لیا۔ اس کی بیوہ کو بھی ہم تینوں کے پاس باری باری رہنا چاہیے۔ سوتیلے کا مال لوٹنے کی خوشی سب سے الگ ہی ہوتی ہے۔''

لیو چت سائی یہ نہیں جانتا تھا کہ تینوں بھائیوں نے الاؤ کے گرد بیٹھ کر اپنے تمام اہم معاملات کو کس طرح نمٹانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس قبیلے کے عظیم المرتبت آقا چنگیز خاں کی تدفین کے بعد دو سال گزر چکے تھے اور وہ چینی سیاسی بازی گر دیکھ رہا تھا کہ اس طویل عرصے میں ان بھائیوں کے درمیان ایک ذرا سا بھی اختلاف پیدا نہیں ہوا ہے۔ اگرچہ وہ تینوں ایک دوسرے سے سیکڑوں میل دور اپنے اپنے علاقوں میں رہتے تھے۔ لیکن ان کی روحیں جیسے ہمہ وقت ایک ساتھ رہتی تھیں۔ کوئی بھی اہم مسئلہ ہوتا اور ایک بھائی پکارتا تو باقی دو بھائی دوڑے چلے آتے تھے۔

اس سیاسی شطرنج کے کھلاڑی نے دیکھا تھا کہ شینا کو پہلے چغتائی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ پھر ایک ماہ بعد معلوم ہوا کہ اسے اوغدائی کے پاس پہنچا دیا گیا ہے۔ اس کے ایک ماہ بعد یہ دیکھنے میں آیا کہ وہ کسی روک ٹوک کے بغیر تولوئی کے پاس پہنچا دی گئی تھی۔

ان تینوں کا اتحاد اور آپس کا اتفاق بتا رہا تھا کہ دنیا کی حسین سے حسین عورت ان تینوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر پائے گی۔ ان کی بیویاں بھی ملکہ بننے کی سازشیں کر رہی تھیں لیکن تینوں بھائیوں کے اتحاد نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ وہ مایوس ہو رہی تھیں۔ اب اس انتظار میں تھیں کہ آئندہ لیو چت سائی اور دوسرے بڑے بڑے سردار اُن تینوں میں سے کس کے حق میں فیصلہ کرتے ہیں؟ اور کسے خان اعظم بناتے ہیں؟

اس چینی سیاست دان نے اپنی زندگی میں پہلی بار یہ تماشا دیکھا تھا کہ ایک بھائی اقتدار کے لیے دوسرے بھائی سے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک پیچھے ہٹ رہا تھا اور حکومت کے لیے اپنے دو بھائیوں کو آگے بڑھا رہا تھا۔ اس چینی نے ایک دوسرے پر قربان ہونے والے ایسے بھائی پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں تسلیم کر لیا کہ وہ اپنی زندگی میں انہیں کبھی توڑ نہیں سکے گا۔ اس مغل خاندان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ اس کا مقصد پورا نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں یہ طے کر لیا کہ خان اعظم کا انتخاب ہونے کے بعد وہ اپنے وطن واپس چلا جائے گا۔

چنگیز خاں نے بیٹوں کو سختی سے تاکید کی تھی کہ وقتاً فوقتاً قرولتائی طلب کرتے رہیں۔ اس طرح آپس میں مل بیٹھ کر ایک دوسرے کی خامیاں دور کرتے رہیں اور خوبیوں کو اپناتے رہیں۔ اس نے بیٹوں سے اور تمام سرداروں سے کہا تھا۔ ''جو کوئی دور کے ملکوں میں جا کر رہ جائے گا اور قرولتائی میں حاضر نہیں ہوگا' وہ تمہارے لیے ایک ایسا پتھر ہوگا جو گہرے پانی میں جا کر گر جاتا ہے پھر کسی کو نظر آتا اور نہ ہی کسی کے کام کا رہتا ہے۔ اسے اپنا دشمن سمجھنا اور اس کی سرکوبی کرنا۔

چنگیز خاں کی موت کے دو برس بعد 1229ء میں تولوئی نے پہلی قرولتائی طلب کی۔ ان دنوں سردی کا موسم جا رہا تھا اور بہار کی آمد آمد تھی۔ ہر سو رنگ برنگے پھول کھل رہے تھے اور دور تک ہریالی نظر آتی تھی۔ ہر خطے سے سردار' سپہ سالار اور مسلح جانباز چلے آ رہے تھے۔ شمالی چین سے جانباز جنگجو سوار آنے لگے۔ منچوریا سے تاتاریوں کا ہجوم رواں دواں تھا۔

خان اعظم کے سوتیلے اور ناجائز بیٹے جوجی کی بیوہ شینا بانجھ تھی۔ اس سے کوئی اولاد نہ ہوئی تھی۔ لیکن دوسری بیویوں سے کئی اولادیں تھیں۔ اس سوتیلے کے بڑے بیٹے کا نام باطو خان تھا۔ اسے دشت روس کا مغربی علاقہ دیا گیا تھا۔ باطو خان بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ قرولتائی میں شامل ہوا تھا۔

چغتائی جنوب مغربی پہاڑوں میں التائی سے لے کر شمر قند تک پھیلے ہوئے علاقوں کا مالک تھا۔ وہ ایغوروں' قراختائیوں اور ترکمان سرداروں کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ وہ سب لانبے لانبے لہردار لبادے پہنے ہوئے تھے۔ ان کا سامان قطار در قطار اونٹوں پر لدا ہوا تھا اور تبت کے یاک ان

کی گاڑیوں کو کھینچ رہے تھے۔

چغتائی کے معنی ہیں' جنگی گھوڑا۔ وہ اپنے باپ چنگیز خاں کی طرح پکا خانہ بدوش تھا۔ وہ کم بولتا تھا اور فطرتاً بہت ہی بے رحم اور سفاک قاتل تھا۔ صرف اپنے بھائیوں کے ساتھ نرمی سے بولتا تھا اور ان کے آگے سر جھکاتا تھا۔ دوسرے سردار اس کے سامنے سر اٹھا کر بولنے کی جرات نہیں کرتے تھے۔ لوگ اس کے غصے سے ڈرتے تھے۔

دوسرا بھائی اوغدائی دریائے ینی سی کے ساحلی علاقوں کا مالک تھا۔ وہ کرغیز اور ترک قبائلیوں کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے تمام ساتھی بھیڑیے کے کھالیں پہنے ہوئے تھے۔ جن پر چاندی کا کام کیا ہوا تھا۔ ان کی گاڑیوں پر سونے کا ملمع تھا۔ وہ سب بڑے طمطراق سے' بڑے شاہانہ انداز میں آئے تھے۔

جب تمام لوگ آپہنچے تو تیسرے بھائی تولوئی نے تمام قبیلوں کی میزبانی کے فرائض انجام دیئے۔ سیکڑوں گاڑیوں پر شراب کے بڑے بڑے مٹکے رکھے ہوئے تھے۔ گوشت کھانے کے لیے ہزاروں بکرے اور بھیڑیں منگوائی گئی تھیں۔ وہاں چالیس دنوں تک کھیل تماشے ہوتے رہے۔ ناچنے گانے کی محفلیں منعقد ہوتی رہیں۔ صبح کو گھڑ دوڑ ہوتی تھی۔ شام کو اکھاڑوں میں پہلوان کشتیاں لڑتے تھے۔ رات کو دور دور تک الاؤ اور مشعلیں اس طرح روشن ہوتی تھیں کہ میلوں دور تک تاریکیاں چھٹ جاتی تھیں اور جیسے دن نکل آتا تھا۔

رات سے صبح تک کھیل تماشے جاری رہتے تھے۔ بازی گر طرح طرح کے تماشے دکھاتے تھے اور حسین عورتیں ناچتی گاتی رہتی تھیں۔ تمام مغل مستی کے عالم میں جھوم جھوم کر شراب پیتے رہتے تھے۔ ان تینوں بھائیوں کی بیویاں اور داشتائیں بھی تھیں لیکن تمام عورتوں کو قرولتائی سے دور رکھا جاتا تھا۔

چغتائی کی بیوی 'کولان' اوغدائی کی بیوی تورا کینہ اور تولوئی کی بیوی سیورقوقطنی اپنے اپنے یورت میں بے چینی سے اپنے اپنے شوہروں کا انتظار کرتی تھیں۔ وہ معلوم کرنا چاہتی تھیں کہ خان اعظم بنانے کے سلسلے میں کیا فیصلے کیے جا رہے ہیں؟ انتظار کرتے کرتے رات سے صبح ہو جاتی تھی۔ پھر صبح کے وقت وہ سب شراب کے نشے میں چور اپنے جانبازوں کے سہارے چل کر یورت میں آتے تھے پھر بستر پر گر کر خراٹے لینے لگتے تھے۔

چالیس دنوں کے بعد لیو چت سائی نے تولوئی سے کہا۔ ''کل آٹھویں چاند کی بائیسویں تاریخ ہے اور یہ خان اعظم کو منتخب کرنے کے لیے بڑا ہی مبارک دن ہے لیکن...''

تولوئی نے پوچھا۔ ''لیکن کیا...؟''

چینی دانشور نے کہا۔ ''تم میں سے کوئی بھائی خان اعظم بننے کو تیار نہیں ہے۔ سب ایک دوسرے کے کاندھوں پر اقتدار کا بوجھ ڈال رہے ہیں۔''

دوسری صبح قرولتائی کا اجلاس شروع ہوا تو تولوئی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر تمام حاضرین کے رُوبرو بڑی تمکنت سے کہا۔ ''جاودانی آسمان نے ہمارے باپ کو خان اعظم کا مرتبہ دیا تھا۔ آنجہانی خان اعظم کے حکم کے مطابق اب میرے دو بڑے بھائیوں میں سے کسی ایک کو یہ عہدہ سنبھالنا ہے۔''

کسی کو سردار بنانے کے سلسلے میں مختلف سرداروں کی مختلف رائے تھی۔ کئی سردار تولوئی کے حق میں تھے۔ کیونکہ چنگیز خاں نے اپنی زندگی میں فوج کا بیشتر حصہ تولوئی کے سپرد کیا تھا۔ سب ہی کہتے تھے کہ وہی سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ جنگ جیتنے کے ہتھکنڈے اس سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔

دوسرے کہتے تھے کہ چغتائی سب سے بڑا ہے۔ اس میں جنگلی ہرن جیسی پھرتی ہے۔ ایک سردار نے کہا۔ ''جب خان اعظم چنگیز خاں اپنے بیٹوں کے مزاج اور کارناموں پر غور کرتا تھا تو کہتا تھا کہ خاقان کی ذمے داریاں بہت ہوتی ہیں۔ اوغدائی کو چاہیے کہ وہ میرے بعد یہ فرائض انجام دے۔''

چنگیز خان کی یہ بات پتھر کی لکیر تھی۔ کوئی اس حکم سے پھر نہیں سکتا تھا۔ چغتائی اور تولوئی اپنی جگہ سے اٹھ کر اوغدائی کے دائیں بائیں آکر کھڑے ہو گئے پھر اس کے دونوں بازوؤں کو پکڑ لیا۔ تولوئی نے کہا۔ ''چل اٹھ رے بیل...''

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ اوغدائی کسی ریچھ کی طرح دزنی تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک اور سردار نے آکر اس کی کمر پکڑ لی۔ ان سب نے مل کر اسے اٹھایا پھر بھورے چمڑے کی ایک مسند پر لا کر اسے بٹھا دیا۔ چغتائی بڑا بھائی تھا۔ اس نے اس کے روبرو ہو کر اپنی ٹوپی اتاری اپنی پیٹی ڈھیلی کر کے اسے کاندھے پر ڈالا، پھر تین مرتبہ اوغدائی کے آگے دو زانو ہوا۔ اس کے بعد گرجتی ہوئی آواز میں اعلان کیا۔ ''اوغدائی...! اب تو خاقان ہے۔ ہمارا خان اعظم ہے۔''

یہ اعلان سنتے ہی تمام سرداروں نے اپنی ٹوپیاں اور پیٹیاں اتاریں اور نئے خاقان کے سامنے سر جھکایا۔ سب نے باری باری بلند آواز سے کہا۔ ''ہم اپنے نئے خان اعظم

اوغدائی کے مطیع اور فرمانبردار ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔''

ہزاروں سرداروں نے اپنی اپنی تلواریں نکال کر ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ یوں تلوار بازی کا مظاہرہ کرتے رہنے سے لوہے سے لوہا ٹکرا رہا تھا۔ رات کے وقت دور دور تک چنگاریاں اُڑ رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آتش بازی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہو۔ سب ہی خوشی سے چیخ رہے تھے۔ ادھر سے ادھر اچھلتے ہوئے رقص کے انداز میں تلوار سے تلوار ٹکراتے جا رہے تھے۔ چنگاریاں اُڑاتے جا رہے تھے۔

بے شمار شامانوں اور جادوگروں نے اوغدائی کے آگے سجدہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اے خاقان! ہم انصاف چاہتے ہیں۔ چینی دانشور لیو چت سائی نے ہمیں جھوٹا اور دھوکے باز کہہ کر ہماری توہین کی ہے۔ ہم تیرے آباواجداد کے زمانے سے معزز سمجھے جاتے ہیں لیکن اس چینی دانشور نے ہمیں سب کی نظروں سے گرا دیا ہے۔ ہم اپنے پیشے کا تحفظ اور سلامتی چاہتے ہیں۔''

اس قبیلے کے سب ہی لوگ توہم پرست تھے۔ انجانی اور ان دیکھی قوتوں سے ڈرتے تھے۔ مشرقی اور مغربی ممالک کو فتح کرنے کے بعد وہاں کے مہذب لوگوں سے ملنے جلنے کے باوجود ضعیف الاعتقاد تھے۔ کبھی کوئی بیماری ان کے قبیلے میں ایک وبا کی طرح پھیلتی یا ان پر ناگہانی مصیبتیں آتیں اور ایسے میں بادل گرجتے اور بجلیاں کڑکتیں تو وہ یہی سمجھتے کہ کوئی پُراسرار قوت ان سے ناراض ہوگئی ہے اور ان پر عذاب نازل کر رہی ہے۔ ایسے وقت شامان اور جادوگر اپنے منتروں سے اور عجیب وغریب حرکتوں سے انہیں قائل کرتے تھے کہ وہ جادوئی آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور ان کی مصیبتوں کو دور بھگاتے رہتے ہیں۔

اوغدائی اور اس کے دونوں بھائی بھی توہم پرست تھے۔ انہوں نے ہینا کو باپ کے ساتھ دفن ہونے سے بچانے کے لیے عارضی طور پر چینی دانشور کی یہ بات مان لی تھی کہ ایک زندہ عورت کو ہلاک کر کے مردے کے ساتھ دفن نہیں کرنا چاہیے۔ شامانوں اور جادوگروں کے وحشیانہ طور طریقوں پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔

ادھر شامان اور جادوگر اس چینی دانشور کے خلاف بولتے رہے تھے کہ وہ اپنا الوسیدھا کر رہا ہے، پچھلے دو برس سے پورے مغل قبیلے کو ایک خان اعظم کے وجود سے محروم کرتا آرہا ہے اور تینوں بھائیوں کے پیچھے رہ کر در پردہ حکومت کر رہا ہے۔ اپنی الٹی سیدھی باتوں سے قائل کر کے آباواجداد کے پرانے دستور بدل رہا ہے۔

اوغدائی نے اعلان کیا۔ ''ہم اپنے آباواجداد کے دستور اور طور طریقے تبدیل نہیں کریں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ لیو چت سائی جڑی بوٹیوں کے ذریعے ہمارا کامیابی سے علاج کرتا ہے۔ ہماری بیماریاں دور کرتا ہے اور ہمیں بہت اچھے مشورے دیتا ہے مگر آئندہ ہم اپنے پرانے اصول اور طور طریقے بدلنے والے مشورے تسلیم نہیں کریں گے۔ قبیلے کے درجنوں شامان اور جادوگر پہلے کی طرح معزز کہلائیں گے۔ کیونکہ وہ بھی اپنے منتروں سے اور جادوئی آسمان سے باتیں کر کے بیماریوں کو بھگاتے ہیں اور ہمیں ناگہانی مصیبتوں سے نجات دلاتے ہیں۔''

ان شامانوں اور جادوگروں کی کھوئی ہوئی عزت اور وقار بحال ہوگیا۔ توہم پرستی کے معاملات میں لیو چت سائی کو ان کے سامنے کم تر بنا دیا گیا۔ چنگیز خاں کی زندگی میں اس چینی دانشور کی جو عزت تھی، احترام تھا، وہ اب نہیں رہا تھا۔

وہ تینوں بھائیوں میں پھوٹ ڈالنے اور مغل خاندان کو تباہ و برباد کر دینے کی سازشوں میں ناکام رہا تھا۔ اس نے اوغدائی کے سامنے حاضر ہو کر کہا۔ ''اب تُو خان اعظم بن چکا ہے، اس قبیلے کا بہت بڑا مسئلہ حل ہو چکا ہے۔ میں اپنے وطن واپس جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔''

اوغدائی نے انکار میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہرگز نہیں! ہمارے باپ نے ہم تینوں بھائیوں کے لیے اور پورے قبیلے کے لیے جتنی بہترین چیزیں چھوڑی ہیں، ان میں سے ایک تُو ہے۔ ہم تجھ سے محروم ہونا نہیں چاہیں گے۔ تُو مرتے دم تک ہماری خدمت کے لیے پیدا ہوا ہے۔ اس لیے یہیں رہے گا۔''

اس نے دست بستہ عرض کیا۔ ''خان اعظم کا حکم اٹل ہے۔ میں انکار کی جرأت نہیں کروں گا۔ لیکن اپنے خاندان والوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ تجھ سے التجا کرتا ہوں، مجھے کم سے کم ایک ماہ کی چھٹی دے دے۔''

اوغدائی نے اسے ایک ماہ کی چھٹی دے دی۔ وہ فوراً ہی اپنا بوریا بستر باندھ کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی شامانوں اور جادوگروں نے اپنے منتروں سے اور مختلف جادوئی ہتھکنڈوں سے یہ کوششیں شروع کر دیں کہ اس جانے والے کی واپسی کا راستہ کسی بھی طرح بند ہو جائے۔ انہوں نے متحد ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ موجودہ خان اعظم کو اپنے منتروں اور جادوئی کمالات سے متاثر کریں اور زیادہ سے زیادہ اس کا اعتماد حاصل کرتے رہیں۔

ایسے وقت اوغدائی نے شامانوں کو بلا کر کہا۔ ''میں نے

کل رات خواب میں خان بابا کو دیکھا ہے۔ وہ ایک ویرانے میں تنہا دکھائی دیے۔ ان کے سامنے شراب کے مٹکے رکھے ہوئے تھے۔ لیکن وہ خالی تھے اور آس پاس عورتوں کے ملبوسات پڑے ہوئے تھے۔ لیکن انہیں پہننے والی عورتیں نہیں تھیں۔ وہ تنہا دشت میں بھٹک رہے تھے۔ مجھے بتاؤ اس خواب کا مطلب کیا ہے؟''

شامانوں نے سر جوڑ کر ایک دوسرے سے مشورہ کیا۔ پھر ایک نے کہا۔ ''اے خاقان...! تیرے باپ کی قبر میں اس کی پسند کی ہر چیز پہنچائی گئی ہے۔ اس کی تلوار، کمان، نیزے، ڈھال اور اس کے پسندیدہ جانور کا گوشت، حتیٰ کہ شراب بھی پہنچائی گئی ہے مگر تو نے خواب میں شراب کے مٹکے خالی دیکھے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قبر میں جو مٹکا رکھا گیا تھا۔ وہ خالی ہو چکا ہے اور تیرا باپ پیاسا ہے۔''

دوسرے شامان نے کہا۔ ''بے شمار ناچنے گانے والی حسین عورتیں تیرے باپ کے آس پاس رہا کرتی تھیں لیکن اب وہ قبر میں بالکل تنہا ہے۔ اس کا دل بہلانے والی کوئی نہیں ہے۔''

تیسرے شامان نے کہا۔ ''شینا تیرے باپ کی حسرت تھی۔ وہ اسے کبھی حاصل نہ کر سکا اور اس کی موت کے بعد تم تینوں بیٹوں نے اس عورت کو اپنے لیے رکھ لیا۔ کوئی بات نہیں۔ باپ کے مال پر بیٹوں کا ہی حق ہوتا ہے۔ اب بیٹوں کا فرض ہے کہ وہ باپ کی حسرت پوری کریں۔ ورنہ وہ قبر میں تنہا رہے گا اور اس کی روح دشت میں تنہا بھٹکتی رہے گی۔''

اوغدائی نے پوچھا۔ ''تم لوگوں کا مشورہ کیا ہے؟ کیا شینا کو اس کی قبر میں پہنچایا جائے؟''

ایک شامان نے پوچھا۔ ''کیا تم تینوں اس سے دستبردار ہونا چاہو گے؟''

اوغدائی نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''نہیں! پتا نہیں، اس کم بخت میں کیسی کشش ہے کہ اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ میرے دونوں بھائی بھی اس سے دستبردار ہونا نہیں چاہیں گے۔''

ایک شامان نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ تم تینوں ہی اپنے باپ کی چھوڑی ہوئی چیز کو سنبھال رہے ہو۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس کی قربانی دی جائے پھر تُو نے خواب میں عورتوں کے ایک نہیں کئی ملبوسات دیکھے ہیں جو تیرے باپ کے آس پاس پڑے ہوئے تھے لیکن انہیں پہننے والیاں نہیں تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ تیرے باپ کی روح ایک نہیں کئی ناچنے گانے والیوں کے بغیر دشت میں بھٹک رہی ہے۔ ہمارے بزرگ خان اعظم کی قبر میں جن چیزوں کی کمی ہے۔ وہ چیزیں وہاں پہنچا دے۔ اس کی بھٹکنے والی روح کو قرار آجائے گا۔''

یہ سن کر اس نے سب سے پہلا یہ حکم صادر کیا کہ چنگیز خان کی برسی ہے لہٰذا اس سلسلے میں مائی ضیافت کی جائے گی۔ ہر شخص کے سامنے اُبلا ہوا گھوڑے کا گوشت' بکرے اور گائے کا بھنا ہوا گوشت' گھوڑیوں کا دودھ اور شراب پیش کی جائے گی۔

پھر اس نے حکم دیا کہ اس کی باپ کی روح کو خوش کرنے کے لیے چالیس حسین کنواری لڑکیاں پیش کی جائیں۔ انہیں رنگا رنگ ریشمی لباس اور بیش قیمت جگمگاتے ہوئے زیورات پہنائے جائیں۔

اور یہ بھی حکم دیا کہ پچاس گاڑیوں میں شراب کے مٹکے رکھ کر اس کے باپ کی قبر کے پاس پہنچائے جائیں۔ حکم کے مطابق اس کے سامنے چالیس کنواری لڑکیوں کو زرق برق لباس میں جگمگاتے ہوئے زیورات کے ساتھ پیش کیا گیا۔ وہ اپنے باپ اور اپنے دونوں بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ عیاش تھا۔ حسین اور پرشباب لڑکیوں کو دیکھ کر للچانے لگتا تھا۔ اس وقت بھی اس کی یہی حالت تھی۔ وہاں ایسی کتنی ہی لڑکیاں تھیں جو اس کی عیاش فطرت کو پکار رہی تھیں جیسے للکار رہی تھیں کہ آؤ اور ہمیں چھو کر دیکھو۔

اس کا جنون کہہ رہا تھا کہ ان میں دو چار لڑکیوں کو اٹھا کر اپنے یورت میں لے جائے لیکن وہ سب اس کے باپ کے نام سے لائی گئی تھیں۔ وہ باپ کی امانت میں خیانت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے منہ پھیر کو ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''ان سب کو برخان کالدون لے چلو۔''

اس کے باپ خان اعظم کو برخان کالدون کے مقام پر ایک گھنے درخت کی جڑوں کے نیچے دفن کیا گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر قربانی کی رسم ادا کی گئی۔ تینوں بھائیوں نے حکم دیا کہ شراب کے مٹکے اتار کر اس کے باپ کی قبر کے اطراف رکھے جائیں اور قبر پر شراب کا چھڑکاؤ کیا جائے۔

تمام لڑکیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ناچنا گانا شروع کریں تاکہ اس کے باپ کا دل بہلتا رہے۔ اس وقت وہ بیچاری لڑکیاں نہیں جانتی تھیں کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے آئندہ پیش آنے والے حالات کا علم انسان کو نہیں دیا۔ اگر انسان کو یہ معلوم ہونے لگے کہ آئندہ کس دن کس گھڑی موت آنے والی ہے یا کوئی جان لیوا حادثہ پیش آنے والا ہے تو ایسا وقت آنے سے پہلے ہی وہ

ہیبت سے مر جائے گا۔ اس کی عمر جتنی لکھی گئی ہے۔ اتنی عمر گزار نہیں پائے گا۔

ان لڑکیوں کو قربان ہونا تھا۔ لیکن اپنی بدبختی سے انجان رہنے کے باعث اتنا تو ہو رہا تھا کہ وہ آخری لمحات میں ہنس رہی تھیں، بول رہی تھیں اور ناچتے ناچتے گا رہی تھیں۔ یوں آخری لمحات میں زندگی کی مسرتوں کو گلے لگا رہی تھیں۔ پھر ان تین بھائیوں نے اپنے اپنے نیام سے تلواریں نکالیں۔

اوغدائی نے گرجتی ہوئی آواز سے کہا۔ ''بس بہت ہو چکا۔ اب انہیں خان بابا کے پاس پہنچاؤ۔''

سپاہیوں نے تلواریں اور کلہاڑیاں نکال لیں۔ لڑکیوں نے یہ منظر دیکھا تب ان کی سمجھ میں آیا کہ انہیں چنگیز خاں کی قبر پر کیوں لایا گیا ہے؟ وہ گھوڑے دوڑاتے ان کی طرف آرہے تھے۔ وہ رونے لگیں۔ چیخیں مار کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگیں مگر بھاگ کر کہاں جا سکتی تھیں؟ وہ وحشی تو اپنے شکار کو دوڑا دوڑا کر مارتے تھے۔ ایسے وقت دلی اور روحانی مسرتیں حاصل کرتے تھے اور مست ہو کر ''ہو ہو... ہا ہا...'' کی آوازیں نکالتے رہتے تھے۔ تلواروں کے ایک ایک وار سے نازک بدن کٹ رہے تھے جو کنواریاں سیج پر پھول کی طرح کھلنے والی تھیں۔ ان کی ہڈیاں کلہاڑیوں کی ضربوں سے ٹوٹ رہی تھیں۔ وہ بڑے آرام سے انہیں آگے آگے بھگا کر اور مزے لے لے کر ہلاک کر رہے تھے۔

وہ تینوں بھائی بھی انہیں ہلاک کرتے ہوئے بہت لطف حاصل کر رہے تھے۔ اپنے باپ کی روح کو خوش کر رہے تھے۔ اوغدائی نے اس قتل گاہ میں ایک انتہائی حسین و جمیل لڑکی کو دیکھا۔ اسے وہ قرولتائی میں بھی دیکھ چکا تھا۔ اس کے لیے پہلے ہی نیت ڈانواں ڈول ہو چکی تھی۔ وہ اس کی طرف گھوڑا دوڑاتے ہوئے جانے لگا۔ ایسے وقت اس لڑکی نے اپنے گریبان کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر لباس کو پھاڑ ڈالا۔ اوپر سے برہنہ ہو گئی۔

اوغدائی ایک دم سے گڑبڑا گیا۔ اس پر تلوار کا ہاتھ مرنا بھول گیا۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنی بے باکی سے اپنے بدن کا تعارف پیش کرے گی۔ وہ تعارف تو کیا، تمہید سے بھی آگے نکل چکی تھی۔ جوانی کی آدھی کتاب کھول چکی تھی۔

اس نے تلوار کو نیام میں رکھ کر گھوڑے کی لگام موڑی۔ پھر جھک کر اس لڑکی کو ایک بازو سے اٹھا کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا اس بھیڑ سے دور نکلتا چلا آیا۔ بدنصیب لڑکیوں کی چیخ و پکار اور قاتلوں کی 'ہو ہو ہا ہا' کی آوازیں دور ہوتی جا رہی تھیں۔

وہ گھوڑے پر سوار ہو کر جب بھی کہیں جاتا تو اس کا محافظ دستہ پیچھے پیچھے ضرور آتا تھا۔ اس نے بہت دور نکل آنے کے بعد گھوڑے کو روکا۔ اس لڑکی کو ہری بھری گھاس پر پھینکتے ہوئے گھوڑے کی لگام موڑتے ہوئے اپنے جانبازوں کو دیکھا۔ وہ سب کچھ فاصلے پر رک گئے تھے۔ اس نے کہا۔ ''یہ لڑکی خان بابا کے نام سے لائی گئی تھی۔ اسے میں لے آیا ہوں۔ میں نے باپ کی امانت میں خیانت کی ہے۔ اس کی تلافی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ فوراً یہاں سے واپس جاؤ اور کسی بھی قبیلے سے دو لڑکیاں لا کر اس کی جگہ قربان کرو۔ اس طرح خان بابا کی روح کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں رہے گی۔''

وہ سب حکم کی تعمیل کے لیے واپس چلے گئے۔ اس نے گھوڑے سے اُتر کر لڑکی کو بڑے اشتیاق سے بڑے جذبوں سے دیکھا۔ وہ ہری بھری گھاس پر دسترخوان کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''تم لڑکیاں کیا ہوتی ہو؟ جب تک حاصل نہ کرو، دوسری عورتوں سے الگ کوئی دوسری دنیا کی مخلوق دکھائی دیتی ہو۔ جب تک حاصل نہیں ہوتیں تب تک ہمارے شوق کو بھڑکاتی رہتی ہو۔ ہماری مردانگی کو للکارتی رہتی ہو۔ تو نے تو ایسے للکارا ہے، ایسے بھڑکایا ہے کہ میں اپنے باپ کا مال اٹھا کر لے آیا ہوں۔''

وہ اس کے پاس آ کر گھاس پر گر پڑا۔ لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی مسکراہٹوں سے اور اپنی اداؤں سے اس کے شوق کو بھڑکاتی رہی۔ اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ اس نے بروقت بے لباس ہو کر بے حیا بن کر اپنی عمر بڑھالی ہے۔

وہ حد سے زیادہ عیاش تھا اور حد سے زیادہ شراب پینے کا عادی تھا۔ پہلے اس کی حرم میں بیس پچیس لڑکیاں تھیں۔ اب ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی کوئی رات خالی نہیں رہتی تھی۔ اس کے باوجود اس کی طاقت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ مغل کھلی چراگاہوں میں رہ کر گوشت اور شراب کے علاوہ جڑی بوٹیاں کھا کر گویا جنگل کے شیروں کی طرح طاقتور رہتے کہ جیسے کبھی زوال نہیں آتا۔

چنگیز خان نے مغلوں کو آئندہ زندگی گزارنے کے لیے کتنے ہی قوانین ظلم بند کروائے تھے۔ ان قوانین کو یاسا کہا جاتا تھا۔ اس خان اعظم نے کہا تھا کہ میرے بعد میری اولاد میری نسلیں یاسا کی پابندیاں کرتی رہیں گی تو گیارہ ہزار سال تک جاودانی آسمان ان کا نگہبان رہے گا اور انہیں طاقت اور امداد فراہم کرتا رہے گا۔

یاسا کی روح سے ہر مغل کے لیے یہ حکم تھا کہ اگر کسی کے سامنے کھانا کھائیں تو اسے اپنے ساتھ کھانے میں شریک کریں۔ اگر کوئی مغل سوار ہو کر کسی جگہ پہنچے اور لوگ کھانا کھا رہے ہوں تو اس کا حق ہے کہ وہ گھوڑے سے اتر کر کسی کی اجازت کے بغیر اور کسی روک ٹوک کے بغیر ان سے اپنا کھانا مانگ لے یا چھین لے۔

چونکہ وہاں سال بھر سرد موسم رہتا تھا اور کئی کئی ماہ تک برف باری ہوتی رہتی تھی۔ اس لیے وہ لوگ غسل نہیں کرتے تھے، ان کے لیے یہ حکم تھا کہ کپڑے دھوئے نہ جائیں اور ان کپڑوں کو اس وقت تک پہنا جائے۔ جب تک وہ کپڑے پھٹ کر چیتھڑوں میں بدل نہ جائیں۔ یہ حکم ان کی پرانی عربت یاد دلانے کے لیے بھی تھا۔ اب تو وہ گرم ملکوں میں جا کر غسل بھی کرتے تھے اور چمڑوں کے بھاری بھرکم لباس اتار کر ہلکے پھلکے لباس بھی پہننے لگے تھے۔ جب تک وہ غسل نہیں کرتے تھے تب تک بہت ہی گندے رہتے تھے۔ ان کے لباسوں سے اور جسموں سے ناقابل برداشت بدبو کے بھبکے اٹھتے رہتے تھے۔

یاسا کی رو سے اگر کسی یورت پر بجلی گرتی تو اس یورت کے سارے افراد کو تین سال کے لیے جلا وطن کر دیا جاتا تھا۔ ایک رسم کے مطابق جب وہ دو جلتے ہوئے الاؤ کے درمیان سے گزرتے تھے تب انہیں واپسی کی اجازت ملتی تھی۔

کسی کو بھی بڑے بڑے خطابات اختیار کرنے اور اپنے عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی جو خطاب انہیں دیا جاتا تھا اسی خطاب سے انہیں مخاطب کیا جاتا تھا۔ حتیٰ کے خان اعظم بھی اپنے پیدائشی نام سے پکارا نہیں جاتا تھا۔ سب اسے خاقان کہتے تھے۔

اگر کسی شخص پر کسی طرح کا الزام ہو تو اسے اپنے گناہ گار یا بے گناہ ہونے کا اعلان کرنا پڑتا تھا۔ اسے خود اپنے لیے فیصلہ صادر کرنے کا حکم دیا جاتا۔ اگر بعد میں پتا چلتا کہ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ غلط تھا تو اسے دروغ گوئی کے جرم میں سزائے موت دی جاتی تھی۔

ایک مرتبہ چغتائی اور اوغدائی دونوں نشے میں مست تھے۔ انہوں نے نشے کی ترنگ میں گھوڑے دوڑاتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ وہ ایک دوسرے سے آگے نکل جائیں گے۔ گھڑ دوڑ کے اس مقابلے میں چغتائی اپنے بھائی سے آگے نکل گیا اور اوغدائی ہار گیا۔

شام کو جب نشہ اترا تو چغتائی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے نشے کی حالت میں خان اعظم کو مقابلے کی دعوت دی تھی اور اس مقابلے میں اسے شکست دی تھی۔ اس طرح اس نے خان اعظم کی توہین کی تھی۔ وہ اس غلطی کو سمجھ رہا تھا کہ اس نے اپنے بھائی کے رتبے کی تحقیر کی ہے۔

وہ تمام رات سوچتا رہا کہ اس نے نشے میں ایسی غلطی ایسا جرم کیوں کیا؟ اب اسے یقیناً خود ہی سزا پانا چاہیے۔ وہ صبح ہوتے ہی اپنے بیٹے اپنے سپاہیوں اور اپنے نوکروں کے ساتھ اوغدائی کے خیمے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

اوغدائی نے خیمے سے باہر آ کر حیرانی سے دیکھا۔ چغتائی کا سر برہنہ تھا اور اس کی پیٹھ اس کے کاندھے پر پڑی ہوئی تھی، اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''بردار! تم ایسے حال میں کیوں آئے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''کل میں نے تیری توہین کی ہے۔ پہلے تو مجھے گھڑ دوڑ کے لیے للکارا۔ پھر تجھ سے آگے نکل کر خود کو برتر ثابت کرنے کا جرم کیا ہے۔ اب تو مجھے ہی نہیں، میرے بیٹوں کو، میرے سپاہیوں کو اور میرے نوکروں کو بھی لاٹھیوں سے مار سکتا ہے اور موت کی سزا دے سکتا ہے۔''

اوغدائی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''احمقانہ باتیں نہ کرو میرا بڑا بھائی ہے۔ اس وقت ہم نشے میں تھے اور گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ اس وقت میں خان اعظم نہیں تھا۔ تیرا چھوٹا بھائی تھا۔ تیرے پاؤں کی دھول تھا۔ تو نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ تجھے کوئی سزا نہیں ملے گی۔''

اگرچہ اسے کوئی سزا نہیں ملی۔ پھر بھی اس نے اوغدائی کے آگے گھٹنے ٹیک کر سر کو جھکایا اور اسی گھوڑوں کا تحفہ پیش کیا پھر کہا۔ ''تو اپنے سپاہیوں کو حکم دے کہ وہ پورے قبیلے میں گشت کریں اور یہ اعلان کریں کہ تو نے میری غلطی کو میرے جرم کو معاف کیا ہے اور میری جان بخشی ہے۔ اس طرح لوگوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ خان اعظم کے بڑے اور سگے بھائی کو بھی غلطیوں کی سزا مل سکتی ہے۔ چونکہ اسے معافی دی گئی ہے۔ اس لیے وہ رشتے میں بڑا ہونے کے باوجود اپنے خاقان کو سجدہ کر رہا ہے۔''

وہ تینوں بھائی پیار و محبت اور اتحاد و اتفاق کے حوالوں سے اس قدر مضبوط ستون تھے کہ کوئی دشمن انہیں کسی پہلو سے بھی کمزور نہیں کر پاتا تھا۔ یوں مغل خاندان بڑھتا اور پھیلتا جا رہا تھا اور اپنی طاقت کا لوہا منواتا جا رہا تھا۔ وہ جس ملک کی طرف رخ کرتے تھے، وہاں اتحاد کی برکت سے فتح و کامرانی حاصل کرتے تھے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور ان کی اولادیں جوان ہوتی جا رہی تھیں۔

اوغدائی زیادہ شراب پینے کے باعث ایک مہلک مرض میں مبتلا ہوگیا تھا۔ جڑی بوٹیوں کے ذریعے اس کا علاج ہو رہا تھا۔ لیکن اسے شامانوں پر زیادہ بھروسا تھا اور شامانوں نے دعویٰ کیا تھا کہ اس کے اندر سے بیماری کے آسیبوں کو نکال کر باہر پھینک دیں گے۔

ایک شامان اونچے پہاڑی ٹیلے پر جادوانی آسمان سے باتیں کرنے کے لیے چلا گیا۔ دوسرے شامان خیمے کے آس پاس بیٹھ کر ڈھول بجانے لگے۔ وہ چشمے سے پانی بھر کر لاتے تھے اور منتر پڑھ پڑھ کر اس خیمے پر پانی کا چھڑکاؤ کرتے تھے۔ کنواریوں کے بال کاٹ کر ان بالوں سے یورت کے اندر جھاڑو دیتے تھے۔ یہ تاثر دیتے تھے کہ بُری بلاؤں کو جھاڑو مار کر باہر نکال رہے ہیں۔

پھر اس شامان نے پہاڑی ٹیلے سے واپس آ کر کہا۔ ''جادوانی آسمان سے بات ہو چکی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ہمارا خاقان جس انسان کو سب سے زیادہ چاہتا ہے یا جس جانور کو ایک عرصے سے پال رہا ہے اگر اسے زہریلی شراب پلائی جائے۔ اس کی قربانی دی جائے تو ہمارے خاقان کو شفا حاصل ہوگی۔''

زہر کا پیالہ تیار کیا گیا اور پوچھا گیا کہ اوغدائی سب سے زیادہ کسے چاہتا ہے؟ وہ کس رشتے دار یا کس دوست کی یا کس جانور کی قربانی دینا چاہے گا؟

اوغدائی نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تولوئی نے اس کے پاس آ کر کہا۔ ''میں جانتا ہوں اور قبیلے والے بھی جانتے ہیں کہ اوغدائی سب سے زیادہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں اپنے خاقان بھائی کو مرنے نہیں دوں گا۔''

یہ کہتے ہی اس نے زہر کا پیالہ اٹھا کر منہ سے لگا لیا پھر اس سے پہلے کہ چغتائی آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑتا' اس نے غٹاغٹ سارا زہر اپنے حلق سے اتار لیا۔ اس کے بعد چکرا کر زمین پر گرنے لگا۔ بڑے بھائی نے آ کر اسے سنبھالا۔ اسے بستر پر لا کر لٹایا۔ اس وقت تک اس کی روح جسم سے پرواز کر چکی تھی۔

اس کے کچھ روز بعد اوغدائی رفتہ رفتہ صحت یاب ہونے لگا۔ شامان بہت خوش تھے۔ ان کی ساحری کا بھرم رہ گیا تھا۔ انہوں نے اوغدائی سے کہا۔ ''اے خاقان...! تجھے نئی زندگی مبارک ہو۔ تیرے بھائی نے تیرے حصے کی موت پی لی ہے۔''

اسے اپنے بھائی کی موت کا بہت صدمہ تھا۔ وہ صحت یاب ہونے کے بعد غم غلط کرنے کے لیے پھر پینے لگا۔ چغتائی نے ایک لوہے کے برتن میں شراب رکھی تھی۔ کچھ روز بعد اس نے اوغدائی کے سامنے وہ شراب پھینک دی۔ پھر اس برتن کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھ! یہ برتن زنگ آلود ہو چکا ہے۔ شراب ایسی خبیث شے ہے کہ لوہے کو بھی زنگ لگا دیتی ہے پھر سوچ کہ تیرے جگر اور پھیپھڑوں کو کیا حال ہوگا؟''

بڑے بھائی نے بہت اچھی مثال دے کر اسے سمجھایا تھا۔ وہ متاثر ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے شراب کم سے کم کر دی۔

سیورقوقطنی اپنے شوہر تولوئی کا ماتم کر رہی تھی۔ بیوہ کو ماتمی لباس میں دیکھ کر اوغدائی کا دل دُکھتا تھا۔ وہ شرمندہ تھا کہ اس کی خاطر تولوئی اپنی بیوی کو بیوہ بنا کر چلا گیا ہے۔

اس نے قوقطنی سے کہا۔ ''اگر میں اس وقت ہوش میں ہوتا تو کبھی تولوئی کو زہر پینے نہ دیتا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ اب کیا کر سکتا ہوں؟ جو تیرا جی چاہے مجھ سے مانگ۔ میں تجھے دینے سے انکار نہیں کروں گا۔''

وہ بولی۔ ''بیویاں اپنے شوہروں سے محبت کرتی ہیں۔ لیکن میں تو تولوئی سے عشق کرتی تھی۔ اس نے تیرے لیے اپنا گھر برباد کیا۔ تیرے لیے اپنی جان دے دی۔''

وہ بولا۔ ''تو ٹھیک کہتی ہے۔ میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں۔ ایک بھائی کے لیے میری محبت کو آزمانا چاہتی ہے تو مجھ سے میری جان مانگ' میں ابھی دے دوں گا۔''

قوقطنی نے پوچھا۔ ''کیا میں جو مانگوں گی وہ دے گا؟''

''تو مانگ کر دیکھ۔ میں زبان سے نہیں پھروں گا۔ تیری طلب کی ہوئی چیز میرے اختیار میں ہوگی تو میں ضرور دوں گا۔''

''وہ چیز تیرے اختیار میں ہے۔''

''ایک اور بات ہے۔ اگر وہ چیز میں کسی کو دے چکا ہوں تو پھر تجھے نہیں دے سکوں گا۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر مطالبہ کر۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ چیز تو نے کسی کو نہیں دی ہے اور وہ ابھی تیرے اختیار میں ہے۔''

''تو پھر صاف صاف بول... کیا چاہتی ہے؟ وہ ابھی تیرے نام ہو جائے گی۔''

''میں چاہتی ہوں کہ تو اپنے بعد میرے بیٹے منگو کو خان اعظم کے لیے نامزد کرے اور اس کا اعلان بھی کرے۔''

''یہ تو نے کیسا مطالبہ کیا ہے؟ کیا یہ نہیں جانتی کہ

میرے بعد بڑا بھائی چغتائی اس عہدے کا حق دار ہے؟''

''جانتی ہوں۔ تیری عمر درازی کی دعا مانگتی ہوں تُو ہزاروں سال جیے لیکن تیرے بعد اس کی باری آنے تک چغتائی بہت بوڑھا ہو چکا ہوگا۔ اس پر تو ابھی سے بڑھاپا طاری ہو چکا ہے اور وہ بہت کم گھڑ سواری کرتا ہے۔ خاقان کی ذمے داریاں سنبھال نہیں سکے گا۔''

''پھر بھی ہمارے جد امجد یاسا کی رو سے اور تمام سرداروں کی حمایت سے وہی خان اعظم بنے گا۔''

سیورقوقطنی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس سے ذرا دور جاتے ہوئے کہا۔ ''تو میرے مطالبے کو ٹالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا یہ نہیں جانتا کہ یاسا کی رو سے موجودہ خان اعظم اپنی موت سے پہلے کسی کو بھی نامزد کر سکتا ہے۔ تُو تمام سرداروں کے سامنے تحریری طور پر میرے بیٹے منگو کو خان اعظم کے لیے نامزد کر سکتا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''قوقطنی...! میں تجھ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جو چیز میں کسی کو دے چکا ہوں۔ اب وہ تجھے نہیں دے سکوں گا۔''

وہ اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولی۔ ''کیا تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ تو اپنے بیٹے قویوق کو نامزد کر چکا ہے؟ جو کہ بہت ہی لاغر اور کمزور ہے اور ہمیشہ بیمار رہتا ہے۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''نہیں، میں اتنا نادان نہیں ہوں کہ خان اعظم کی بھاری ذمے داریاں ایک بیمار اور کمزور کے کاندھے پر ڈال دوں۔ میں نے قویوق کے بیٹے اپنے پوتے شیرامُون کو نامزد کیا ہے۔''

''تو جھوٹ کہتا ہے۔ مجھے ٹال رہا ہے۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تُو یہاں کے بڑے بڑے سرداروں سے پوچھ سکتی ہے۔ وہ تجھے بتائیں گے کہ میں اس سلسلے میں اپنا تحریری بیان دے چکا ہوں۔''

سیورقوقطنی نے اسے ناگواری سے دیکھا پھر کہا۔ ''تُو خوامخواہ میرے قربان ہو جانے والے شوہر کا احسان کیوں مان رہا ہے؟ اور دکھاوے کے لیے کیوں کہتا ہے کہ ہمارے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہے؟ تو بولتا بہت ہے مگر کرتا کچھ نہیں ہے۔''

ایسے وقت اوغدائی کی بیوی تورا کینہ خیمے میں داخل ہوئی۔ اس نے سیورقوقطنی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا کر کہا۔ ''ہم دونوں ہی تو لوئی کی قربانی کے عوض تیرے لیے اور تیری اولاد کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن تُو تو دشمن ہے۔ اپنا مطالبہ منوا کر میرے بیٹے اور میرے پوتے کا حق مارنا چاہتی ہے۔''

وہ بولی۔ ''دشمن تو تم لوگ ہو۔ یاسا کی رُو سے سب سے چھوٹے بیٹے کو خان اعظم بنایا جاتا ہے۔ میرا تو لوئی اپنے باپ (چنگیز خاں) کے ساتھ بیس بائیس جنگیں لڑ چکا تھا اور تنہا سپہ سالار رہ کر بھی کئی جنگیں جیت چکا تھا۔ اس کا باپ تمام سرداروں سے کہا کرتا تھا کہ یہ چھوٹا بیٹا میرا جانشین ہے لیکن خان اعظم کی موت کے بعد تم لوگوں نے سازش کی اور اوغدائی کو مغل قبیلے کا مالک و مختار بنا دیا۔''

وہ پاؤں پٹخ کر جاتے ہوئے بولی۔ ''میرے شوہر کے ساتھ جو ہو گیا سو ہو گیا لیکن میں اپنی اولاد کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دوں گی۔''

وہ خیمے کے پردے کو ایک جھٹکے سے پھاڑتی ہوئی اپنے لیے راستہ بناتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو تورا کینہ نے اس کی طرف تھوکتے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت خطرناک ہے۔ میرے بچوں کے خلاف زہر اگلتی رہے گی اور موقع ملا تو انہیں ڈسنے سے باز نہیں آئے گی۔ میں اس کی کوئی چال، کوئی سازش کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔''

اوغدائی بڑی پریشانی سے اس پردے کو دیکھ رہا تھا، جسے سیورقوقطنی پھاڑتی ہوئی گئی تھی۔ وہ پردہ کہہ رہا تھا کہ اب مغل خاندان کے اندر رشتوں کی توڑ پھوڑ شروع ہو چکی ہے۔

تورا کینہ نے اس کی طرف پلٹ کر غصے سے کہا۔ ''تُو خان اعظم ہے۔ تیرے سامنے کسی کو اونچی آواز سے بولنے کی اجازت نہیں ہے۔ کوئی تجھ سے بدتمیزی نہیں کر سکتا۔ اس عورت نے تیرے اعلیٰ رتبے کی توہین کی ہے اور تو چپ کھڑا ہوا ہے؟''

وہ بولا۔ ''وہ میرے اس بھائی کی بیوہ ہے جو مجھ پر احسان کر گیا ہے۔ تُو مجھے اس کے خلاف نہ بھڑکا۔ میں اس کے لیے سات خون معاف کر چکا ہوں۔''

''میں تو ہرگز معاف نہیں کروں گی۔ اگر اس نے میری طرف ایک کنکر بھی اچھالا تو میں اس کے سر پر پتھر دے ماروں گی۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''ہم تینوں بھائیوں نے کبھی اپنے درمیان شک و شبہے کو اور بے اعتمادی کو ہوا نہیں دی۔ سب مانتے ہیں کہ ہمارے اتحاد کو کوئی بھی چالباز دشمن نہیں توڑ سکتا۔ لیکن آثار بتا رہے ہیں کہ تم عورتیں ہمارے درمیان فسادات برپا کراؤ گی مگر میں ایسا ہونے نہیں دوں

گا۔ میں تجھے محبت سے بھی سمجھا رہا ہوں اور سختی سے بھی تاکید کر رہا ہوں' تو قطتی کے خلاف کبھی کچھ نہ بولنا۔ اس سے ہمیشہ محبت اور نرمی سے پیش آنا۔ تُو خان اعظم کی بیوی ہے۔ اس قبیلے کی ملکہ ہے۔ تجھے سخی اور فراخ دل ہونا چاہیے۔ اگر وہ تجھ سے ایک گھوڑا ایک سپاہی مانگے تو تجھے چاہیے کہ اسے دس گھوڑے اور دس سپاہی دے۔ ہم تینوں بھائی ایک دوسرے کے آگے جھکتے رہے ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے کو جھکاتے رہے ہیں۔ اسی طرح تو قوقطتی کے آگے جھکے گی تو وہ نادم ہو کر تیرے سامنے سر جھکایا کرے گی۔''

تو را کینہ 'اونہہ' کہہ کر سر جھٹک کر وہاں سے چلی گئی۔ اوغدائی صحیح اندازہ لگا رہا تھا کہ ان عورتوں کی وجہ سے ان تینوں بھائیوں کے بچوں میں اور بچوں کے بچوں میں پھوٹ پڑنے والی ہے اور مغل خاندان کا شیرازہ بکھرنے والا ہے۔

اوغدائی نے دوسرے دن چغتائی کو وہ تمام باتیں بتاتے ہوئے کہا۔ ''ہم اپنی اپنی بیویوں کو کسی نہ کسی طرح لگام دے لیں گے۔ لیکن تو قطتی کو کون قابو میں کرے گا؟ شوہر مر چکا ہے۔ وہ آزاد ہے۔ تولوئی کی زمینوں کی' جائداد کی' اس کی سپاہیوں کی اور اس کے بچوں کی مالک ومختار ہے۔ وہ ہمارے بھائی کی بیوہ ہے۔ ہم کبھی اس پر جبر نہیں کریں گے لیکن کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔''

چغتائی نے کہا۔ ''میرے بھائی...! تجھ سے بھی غلطی ہوئی ہے۔ تُو نے تو را کینہ کی باتوں میں آ کر اپنے سات برس کے پوتے شیرامُون کو آئندہ خان اعظم کے لیے نامزد کر دیا ہے۔ جادوئی آسمان تیری عمر دراز کرے اور تیری زندگی میں ہی شیرامُون جوان ہو کر خان اعظم کی ذمے داریاں سنبھالنے کے قابل ہو جائے لیکن آگے کیا ہونے والا ہے؟ کون جانتا ہے؟ تجھے اپنی بیوی کی بات نہیں ماننی چاہیے تھی۔''

''میرے بھائی...! تو جانتا ہے کہ تو را کینہ کیسی منہ پھٹ ہے؟ حلق پھاڑ پھاڑ کر بولتی ہے اور اپنی ضد منواتی ہے۔ میں پیالہ بھر بھر کر پیتا ہوں مگر وہ میرا نشہ ہرن کر دیتی ہے۔''

وہ بے بسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں بڑے بڑے لشکروں کے منہ پھیر دیتا ہوں لیکن اس ایک عورت سے ہار جاتا ہوں۔ وہ کئی ماہ سے میرے پیچھے پڑی رہی کہ تو یوق کو یا اس کے بیٹے شیرامُون کو اپنی زندگی میں خان اعظم کے لیے نامزد کر دوں۔ میں اس کی یہ ضد ٹالتا رہا۔ ایک رات تو وہ ایک دم غصے سے بھڑک گئی۔ انگیٹھی میں انگارے دہک رہے تھے۔ اس نے تو یوق کے بچے کو بستر سے اٹھایا پھر اسے انگیٹھی میں لے جا کر ڈالنا چاہتی تھی۔ میں نے جلدی سے آگے آ کر اسے پکڑ لیا پھر اس کی اچھی طرح پٹائی کی۔ وہ مار کھاتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی، تُو میرا مرد ہے مجھے جان سے بھی مار سکتا ہے۔ لیکن میری ضد تو تجھے ماننی ہی پڑے گی۔ تُو بھائیوں کی محبت میں اندھا ہو جاتا ہے۔ میں اولاد کی محبت میں اندھی ہوں۔ بس تُو میری ایک بات مان لے۔ میرے بیٹے کو نہ چھیڑ میرے پوتے کو نامزد کر دے۔ اس کے بعد میں مر جاؤں گی، مگر کوئی خواہش نہیں کروں گی۔''

وہ دونوں بھائی الاؤ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور پیالہ بھر بھر کر پی رہے تھے۔ اوغدائی نے کہا۔ ''جب بھی ہم الاؤ کے پاس آ کر بیٹھتے ہیں تو تولوئی کی کمی بہت صدمہ پہنچاتی ہے۔ وہ بڑی اچھی باتیں کرتا تھا۔ اس کے ساتھ پینے کا مزہ آتا تھا۔ افسوس صد افسوس... سیورقوقطتی نے زندگی میں پہلی بار ایک مطالبہ کیا اور میں اسے پورا نہ کر سکا۔ تولوئی کو اس سے عشق تھا۔ اب وہ روتی ہوگی تو اس کی روح کو تکلیف پہنچتی ہوگی۔''

چغتائی نے کہا۔ ''اب ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ عورتوں کا جھگڑا نہ بڑھے۔ ان عورتوں کو پہلے کی طرح اپنے اپنے معاملات میں مصروف رہنا چاہیے۔''

وہ الاؤ کی آگ بھڑکاتے رہے اور پیتے رہے۔ پھر چغتائی نے کہا۔ ''سیورقوقطتی کو ایک طرح سے قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔''

اوغدائی نے سر اٹھا کر پوچھا۔ ''کوئی تدبیر ہے تو بتا...؟''

''قوقطتی کو بیوہ نہ رہنے دیں۔ اس کی شادی کرا دیں۔ تُو اپنے بڑے بیٹے قویوق سے اس کی شادی کرائے گا تو وہ تیری بہو بن جائے گی۔ یا ساکی رُوسے ساس بہو کو لڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ تو را کینہ اور قوقطتی آئندہ ایک دوسرے سے جھگڑ نہیں کر سکیں گی۔ عورتوں کے ذریعے جو عداوتیں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔''

اوغدائی نے اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو بہت ہی عمدہ تدبیر ہے۔ میں کل ہی اپنے بیٹے سے شادی کا پیغام بھیجوں گا۔''

چغتائی نے کہا۔ ''پیغام نہ بھیج۔ ہم سب اس کے یورت میں جائیں گے اور اسے سمجھائیں گے کہ اس شادی کے بعد اسے اور اس کی اولاد کو کتنا فائدہ پہنچنے والا ہے۔ جب سمجھایا جائے گا تو وہ یقیناً سمجھ لے گی اور راضی ہو جائے گی۔''

تو راکینہ بھی یہ تدبیر سن کر خوش ہوگئی۔ وہ سب بیش قیمت تحائف لے کر اس کے یورت میں آئے۔ سیورقوقطنی نے حیرانی سے پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہے؟''

چغتائی نے کہا۔ ''تو جانتی ہے تو لوئی اپنے بڑے بھائیوں کی کتنی عزت کرتا تھا اور ان کی ہر جائز اور ناجائز بات مان لیا کرتا تھا۔''

سیورقوقطنی نے اوغدائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں' جانتی ہوں۔ اسی لیے تو وہ اپنی جان سے گیا ہے۔''

تو راکینہ نے کہا۔ ''ہمیں طعنے نہ دے۔ اس کی قربانی کے بدلے ہم تیرے لیے اور تیری اولاد کے لیے بہت کچھ کرنے آئے ہیں۔ میں اپنے بیٹے قویوق کا رشتہ لائی ہوں۔ تجھے اپنی بہو بنانا چاہتی ہوں۔''

وہ بولی۔ ''تو نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں رشتہ قبول کرلوں گی؟''

چغتائی نے کہا۔ ''غصے اور عداوت سے بات نہ کر۔ ہمارے خلوص اور نیک نیتی کو سمجھنے کی کوشش کر۔ اوغدائی اپنے پوتے شیرامُون کو خان اعظم کے لیے نامزد کر چکا ہے۔ اگر تو قویوق کی بیوی بن جائے گی تو شیرامُون تیرا بیٹا ہوگا۔ وہ جب خان اعظم بنے گا تو تُو اُس خان اعظم کی ماں کہلائے گی۔ اس قبیلے کی تمام عورتوں سے افضل اور برتر ہو جائے گی۔''

وہ بولی۔ ''یاسا کی رُو سے بہو کو ساس اور سسر کے سامنے بولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اسے ان کے ہر حکم کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔ مجھے قبیلے کی تمام عورتوں سے افضل اور برتر بنانے کے سبز باغ دکھا رہے ہو اور در پردہ بہو بنا کر ساس اور سسر کے دباؤ میں رکھنا چاہتے ہو۔ تاکہ میں اپنے بیٹے منگو کو ان کے بیٹوں سے افضل اور برتر بنانے سے باز آجاؤں۔''

تو راکینہ نے کہا۔ ''ہم تجھ سے محبت اور رشتے داری مضبوط کرنا چاہتے ہیں اور تو ہمیں غلط سمجھ رہی ہے۔''

سیورقوقطنی نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تو راکینہ...! تو اوغدائی کی بیوی بننے سے پہلے ایک دشمن قبیلے کے سردار کی بیوی تھی۔ اوغدائی اسے قتل کر کے تجھے اپنے لیے لے آیا۔ یہ سچ ہے نا؟''

تو راکینہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، یہ سچ ہے۔ یہ سارا قبیلہ جانتا ہے۔ تُو کہنا کیا چاہتی ہے؟''

وہ بولی۔ ''میں بڑے فخر سے یہ کہتی ہوں کہ جب تو لوئی کی بیوی بن کر آئی تو کمسن اور کنواری تھی۔ اس سے پہلے کسی کا سایہ مجھ پر نہیں پڑا تھا۔ میں تجھ سے مختلف ہوں۔ تیرے مقابلے میں حیا والی ہوں۔ میرے بدن کو صرف میرے ایک شوہر نے دیکھا ہے۔ دوسرا کوئی نہیں دیکھ پائے گا۔ آئندہ تیرے بیٹے سے تو کیا کسی سے شادی نہیں کروں گی۔''

اس کی باتوں سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ اپنے مقابلے میں تو راکینہ کو ایک کے بعد دوسرا مرد بدلنے والی بے حیا عورت کہہ رہی ہے۔ اوغدائی غصے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ چغتائی نے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ''صبر کر۔ آرام سے بات کر۔ یہ ہر حال میں یاد رکھ کہ یہ ہمارے بھائی تو لوئی کی بیوہ ہے۔''

وہ بولا۔ ''میں صبر کر رہا ہوں اور غصہ برداشت کر رہا ہوں۔ ورنہ خان اعظم کی حیثیت سے حکم دے سکتا ہوں پھر اسے میرے بیٹے سے شادی کرنی ہی ہوگی لیکن میں زبردستی نہیں کروں گا۔ قربانی دینے والے عظیم بھائی کی بیوہ سے کہوں گا کہ تو لوئی کے لیے جو علاقہ مختص کیا گیا ہے۔ یہ وہاں چلی جائے اور اپنے بچوں کے ساتھ وہیں زندگی گزارے۔ اسے میرے علاقے میں نہیں رہنا چاہیے۔''

یہ کہہ کر وہ تو راکینہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ ان تینوں بھائیوں میں کبھی عداوت تو کیا معمولی سی رنجش بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب ان کی عورتوں اور بچوں کے درمیان اختلاف کی خلیج بن گئی تھی۔ آئندہ یہ خلیج بڑھتے بڑھتے عداوت میں تبدیل ہونے والی تھی۔

چنگیز خان نے اپنی زندگی میں چاروں بیٹوں کو الگ الگ علاقوں کا حکمران بنایا تھا۔ وہ ان علاقوں کے حاکم بھی تھے اور اپنی ذاتی فوجوں کے سپہ سالار بھی۔ لیکن ان چاروں کے لشکروں کا ایک سپہ سالار اعظم تھا۔ اس کا نام سوبودائی تھا۔ کسی بھی ملک پر حملہ کرنے اور جنگ لڑنے کے معاملے میں اس کے مشورے کو اہمیت دی جاتی تھی۔ اسی کی رہنمائی میں وہ چاروں بھائی کسی بھی ملک کی طرف پیش قدمی کرتے تھے اور اسی کے زیر اثر رہ کر ان چاروں نے جنگیں لڑنے میں مہارت حاصل کی تھی۔

جوجی سوتیلا تھا۔ اس لیے اسے تینوں بھائیوں سے ہزاروں میل دور روس کا علاقہ دیا گیا تھا۔ جوجی کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا باطو وہاں کا حکمران بن گیا تھا۔ وہ اس بات پر شرمندہ تھا اور احساس کمتری میں مبتلا رہتا تھا کہ اس کا باپ جوجی اپنے ماں باپ کا ناجائز بیٹا تھا۔ اس کی رگوں میں چنگیز خاں کا لہو نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ مغل خاندان کا وفادار اور تابعدار تھا۔

جب کسی قرولتائی یا کسی میدان جنگ میں وہ سب یکجا

ہوتے تھے تو اوغدائی اور چغتائی کے بیٹے باطو سے کہتے تھے کہ وہ چنگیز خان کی نسل سے ہیں۔ باطو کو یہ فخر حاصل نہیں تھا۔ وہ ان کے سامنے شرمندہ ہوتا تھا۔ اُن سے کترا تا رہتا تھا۔ ان کے برعکس تولوئی اور سیورقوقطنی کے بیٹے منگو سے اس کی اچھی خاصی دوستی تھی۔ کیونکہ انہوں نے کئی جنگوں میں ایک ساتھ دشمنوں سے مقابلہ کیا تھا۔ ان کا سپہ سالار اعظم سوبودائی یہ جانتا تھا کہ جب منگو اور باطو یکجا ہوتے ہیں تو اپنی حکمتِ عملی سے دشمنوں کے قدم اکھاڑ دیتے ہیں۔

سیورقوقطنی اپنے علاقے میں آ گئی۔ وہاں اس کے ہزاروں جانثار تھے۔ ہزاروں گھوڑے اور مویشی تھے۔ وہ اس بات سے خوش تھی کہ اس کے بیٹے منگو نے باطو خاں سے دوستی رکھی ہے۔ اس کا مذاق نہیں اڑاتا ہے بلکہ اس کی عزت کرتا ہے۔

اس کی یہ ضد تھی کہ وہ اپنے بیٹے منگو کو خان اعظم بنائے گی۔ اس کے لیے اوغدائی اور اس کے بیٹوں کے خلاف محاذ آرائی لازمی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ باطو خاں بھی اوغدائی اور اس کے بیٹوں سے بیزار رہتا ہے۔ ان سے کتراتا ہے۔ لیکن خان اعظم اور اس کے بیٹوں سے کھل کر نفرت نہیں کرتا۔ سیورقوقطنی نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ باطو خاں کی نفرت اور بیزاری سے فائدہ اٹھائے گی۔

سپہ سالار اعظم سوبودائی کی رہنمائی میں منگو اور باطو جنوب کے علاقوں میں پے در پے فتوحات حاصل کر رہے تھے۔ ایک علاقے میں قپچاق قوم سے مقابلہ ہوا تھا۔ ان کی تعداد صرف چالیس ہزار تھی۔ وہ مقابلے میں ٹھہر نہ سکے بھاگنے لگے۔ ان کا سردار کتیان بھی فرار ہو گیا۔ اس جنگ میں اوغدائی کا بیٹا قویوق اور چغتائی کا بیٹا بوری بھی تھا۔ انہوں نے فتح کا جشن مناتے ہوئے شراب کا جام اٹھایا۔ باطو سب سے پہلے دو جام پی گیا۔ اس بات پر قویوق اور بوری طیش میں آ گئے۔ قویوق نے اپنا پیالہ زمین پر پٹخ دیا۔

بوری نے چیختے ہوئے کہا۔ ''باطو کسی طرح بھی ہم سے افضل نہیں ہے۔ یہ ایک ناجائز باپ کی اولاد ہے۔ اس نے ہم سے پہلے شراب کیسے پی لی؟''

سپہ سالار اعظم سوبودائی نے آ کر پوچھا۔ ''کیا معاملہ ہے؟''

قویوق نے باطو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا منہ تو دیکھو۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی بڑھیا کے چہرے پر داڑھی لگا دی گئی ہے۔ میں ایک لات ماروں گا تو یہ گر کر تڑپنے لگے گا۔''

بوری نے کہا۔ ''یہ باطو تو ایسا ہے جیسے کسی بڑھیا کو زرہ بکتر پہنا کر اس کے ہاتھ میں تلوار دے دی گئی ہو۔ میں سپہ سالار اعظم سے درخواست کرتا ہوں کہ اسے ڈنڈے مارے جائیں۔''

منگو نے کہا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ باطو نے پہلے شراب نہیں پی بلکہ ان دونوں نے شراب پینے میں دیر کی۔''

قویوق نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، ہم نے پینے میں دیر کی مگر تُو نے دیر نہیں کی تھی پھر اس نے تجھ سے پہلے کیوں پی؟''

منگو نے کہا۔ ''اس لیے کہ یہ عمر میں ہم سب سے بڑا ہے۔ تم دونوں اسے کمتر سمجھتے ہو مگر میں نہیں سمجھتا۔ یہ میرا دوست بھی ہے اور بڑا بھائی بھی۔''

سوبودائی نے کہا۔ ''میں تم سب کو حکم دیتا ہوں کہ آیندہ میدان جنگ میں آ کر کوئی کسی سے نہ برتر ہوگا' نہ کسی سے کم تر رہے گا اور نہ ہی کسی سے جھگڑا کرے گا۔ جو ایسا کرے گا۔ میں اسے واپس بھیج دوں گا۔''

یہ بات جب خان اعظم اوغدائی تک پہنچی تو اس نے اپنے بیٹے قویوق کو سخت لعنت اور ملامت کی۔ چغتائی نے بھی اپنے بیٹے بوری کو تنبیہ کی پھر انہوں نے باطو کو یہ کہلا بھیجا کہ تُو بھی اپنی فتوحات کے معاملے میں زیادہ شیخیاں نہ بگھارا کر۔ تیری فتوحات کے پیچھے سوبودائی کا تجربہ اور حکمتِ عملی کام کرتی ہے۔ آیندہ اپنی اوقات میں رہا کر۔

یہ بات سیورقوقطنی تک پہنچی تو اس نے باطو کے نام ایک خط لکھا۔ ''باطو...! میرے بیٹے...! تُو خود کو کبھی تنہا نہ سمجھ۔ میں تیری ماں ہوں۔ میرا بیٹا منگو تیرے ساتھ ہے۔ میں ایک بیوہ ہوں۔ تُو ایک یتیم ہے۔ تیری طرح میرے بیٹے بھی یتیم ہیں۔ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ دل تھوڑا نہ کرو۔ ہماری کشتی ضرور پار لگے گی۔''

سیورقوقطنی چنگیز خاں کی زندگی میں اس کی بہو بن کر قبیلے میں آئی تھی۔ وہ تب سے اب تک اس کے بیٹوں اور پوتوں کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ رہی تھی اور بدلتے ہوئے حالات کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ یہ دیکھتی آ رہی تھی کہ باطو نفرت اور ندامت کی ہانڈی میں پک رہا ہے۔ وہ وقت جلد ہی آنے والا ہے۔ جب وہ اوغدائی اور اس کی اولاد کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہو جائے گا اور ایسے وقت وہ اس کی سرپرستی ضرور کرے گی۔

اوغدائی اب دن رات عیش و طرب کی محفلیں جمانے لگا تھا۔ اس کے حرم میں حسین ترین لڑکیاں لائی جاتی تھیں۔ وہ ان کے ساتھ کھاتا پیتا اور عیش کرتا تھا۔ اس کی فوج کو اس کے

بیٹے قویق نے سنبھالا تھا۔ قبیلے کے انتظام وانصرام کے لیے تجربہ کار بوڑھے سردار تھے۔ ان سب پر تورا کینہ کا حکم چلتا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی فکر میں رہتی تھی۔ اس نے ایک بہت ہی ذہین اور چالاک مسلمان عبدالرحمن کو اپنا معتمد خاص بنایا تھا۔ عبدالرحمن اسے دولت جمع کرنے کے ہتھکنڈے سکھاتا تھا۔ وہ اس کے مشورے کے مطابق آنے جانے والے تمام تاجروں سے ٹیکس کی صورت میں زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرتی تھی۔ تمام سردار اور سپاہی مال غنیمت میں جو حصہ وصول کرتے وہ ان کے حصوں میں سے اپنا حصہ نکال لیا کرتی تھی اور اوغدائی کو شراب و شباب میں مست رکھا کرتی تھی۔

جب وہ ہوش و حواس میں رہتا تو تورا کینہ کے یوں دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنے پر اعتراض کرتا۔ وہ کہتا کہ ہم مغل دوسری قوموں پر حملہ کرتے ہیں۔ انہیں لوٹتے ہیں مگر تو تو اپنے ہی قوم کے سرداروں کو لوٹ رہی ہے؟ اس طرح یہ مجھ سے بدظن ہو جائیں گے۔

وہ درست کہہ رہا تھا۔ تورا کینہ نے چند سرداروں کی زمینیں ضبط کر لی تھیں اور مال غنیمت میں جو سب سے بیش قیمت اور جاذب نظر ہیرے جواہرات ہوتے تھے وہ ان سرداروں سے لے لیا کرتی تھی۔ یہ سیورو قوقطنی اور باطو کے حق میں بہتر ہو رہا تھا۔ قبیلے کے بڑے اور اہم سردار اوغدائی اور اس کے بیٹوں سے بدظن ہو رہے تھے۔

تورا کینہ نے اوغدائی سے کہا۔ ''جب بھی ہمارا لشکر کہیں فتح حاصل کرتا ہے تو ہم اس ملک میں اپنے سرداروں اور سپاہیوں کو آزادی سے لوٹ مار کی اجازت دیتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کتنا مال چھپا کر رکھتے ہیں؟ ہمیں اپنے سرداروں سے بھی کچھ چھیننا جھپٹنا چاہیے۔ تاکہ ہمارا رعب و دبدبہ قائم رہے اور وہ ہم سے سہمے رہیں۔ ہمیں خوش کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تابعداری کا مظاہرہ کرتے رہیں۔''

پھر اس نے اوغدائی سے کہا۔ ''تو ان سب معاملات میں نہ اُلجھا کر... کیا تجھے پتا ہے کہ کوئرات قبیلے کی لڑکیاں کس قدر حسین ہیں؟ تُو نے تو اس باغ کے میوے ابھی تک نہیں چکھے۔ یہاں کے معاملات میں سر نہ کھپا۔ اُدھر دھیان دے۔''

کوئرات قبیلے کے لوگ مغلوں کے زیر اثر رہتے تھے۔ یہ کہتے تھے کہ خان اعظم بلا کا عیاش ہے۔ دوسرے مغل سردار بھی ان کی لڑکیوں کو اپنے لیے طلب کر سکتے ہیں۔ ایسے وقت وہ احتجاج نہیں کر سکتے تھے۔ نہ ہی ان کے مطالبات سے انکار کر سکتے تھے۔ انہوں نے آپس میں فیصلہ کیا پھر بڑی رازداری سے اپنی لڑکیوں کی منگنیاں اپنے ہی قبیلے کے جوانوں سے کر دیں اور بہت سی لڑکیوں کی شادیاں بھی کر دیں۔

جب اوغدائی کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ اس قبیلے میں سات برس سے اوپر جتنی بھی کنواری لڑکیاں ہیں۔ اور جن کی شادیاں ابھی حال ہی میں ہوئی ہیں۔ ان سب کو پکڑ کر ہمارے سامنے حاضر کیا جائے۔

تقریباً چار ہزار لڑکیوں کو رنگ برنگے زرق برق کپڑے پہنا کر اس کے سامنے ایک میدان میں حاضر کیا گیا۔ ان لڑکیوں کے ماں باپ اور رشتے دار ان کے پیچھے پیچھے روتے اور سینہ پیٹتے ہوئے آئے تھے۔ وہ دہائی دے رہے تھے۔ فریاد کر رہے تھے کہ ان لڑکیوں کی جان نہ لی جائے۔ انہیں زندہ رکھا جائے۔ ان بیچاریوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔

اوغدائی نے کہا۔ ''ہم نے تمہاری فریاد سن لی۔ تمہارا التجا قبول کی۔ ان لڑکیوں کو ہلاک نہیں کیا جائے گا۔''

اس نے اپنے افسروں کو حکم دیا کہ لڑکیوں کو قطاروں میں کھڑا کیا جائے۔ جو زیادہ حسین ہوں' انہیں پہلی قطار میں رکھا جائے۔

ان لڑکیوں کو اسی طرح کئی قطاروں میں کھڑا کیا گیا۔ اوغدائی گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے سامنے سے گزرتا جا رہا تھا جو لڑکیاں زیادہ حسین اور دلنشین لگتی تھیں۔ انہیں اشارے سے آگے آنے کو کہتا تھا۔ پھر حکم دیتا تھا کہ انہیں اس کے یورت میں پہنچا دیا جائے۔

اس کے بعد اس نے کئی سو حسین لڑکیاں چُن کر اپنے اعلیٰ افسروں کو دیں۔ تقریباً ڈھائی ہزار لڑکیاں رہ گئیں۔ اس نے اپنے سپاہیوں سے کہا۔ ''ان سب کو یہاں سے دوڑاؤ اور پکڑو۔ جو سپاہی جسے پکڑ لے گا۔ وہ لڑکی اس کی ہو جائے گی۔''

پھر تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بھگدڑ مچی۔ لڑکیاں اِدھر اُدھر چیختے ہوئے بھاگنے لگیں۔ سپاہی انہیں دوڑا رہے تھے اور گھیر گھیر کر پکڑ رہے تھے۔ اگر ایک لڑکی کو دو چار سپاہی پکڑتے تو ان میں جھگڑا ہونے لگتا پھر جو مار پیٹ کر لڑکی کو اپنے کاندھے پر اٹھا لیتا۔ وہ اس کی ہو جاتی۔

اوغدائی اور سرداروں کے لیے بڑا دلچسپ تماشا تھا۔ لیکن ان لڑکیوں کے ماں باپ رو رہے تھے۔ سینہ پیٹ رہے تھے اور ایک دوسرے کو سمجھا رہے تھے کہ جو ہو رہا ہے

ہونے دو۔ یہی کیا کم ہے کہ ہماری لڑکیاں جہاں بھی رہیں گی زندہ رہیں گی۔

اوغدائی ایسے ہی کھیل تماشوں سے دلچسپی لیتا رہتا تھا۔ اس نے کئی ممالک سے بڑے ہی زبردست پہلوان بلوائے تھے۔ ان سے کہا تھا' جو اکھاڑے میں اپنے مقابل کو اپاہج بنادے گا یا مار ڈالے گا' اسے انعام واکرام سے نوازا جائے گا۔ وہ تمام پہلوان جب باری باری اکھاڑے میں اترتے تھے تو سمجھ لیتے تھے کہ ان دو مقابلہ کرنے والوں میں سے کسی ایک کو زندہ سلامت واپس جانا ہے۔

اور یہی ہوتا تھا، ان دو پہلوانوں میں سے جو غالب آتا تھا وہ مغلوب کی ہڈیاں پسلیاں توڑ دیتا تھا یا کسی داؤ پیچ کے ذریعے اسے ہلاک کر دیتا تھا۔ وہ مشرق سے لے کر مغرب اور شمال سے لے کر جنوب تک کے کتنے ہی علاقے فتح کر چکے تھے۔ وہاں کے مہذب لوگوں کی صاف ستھری طرز زندگی کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ اس کے باوجود وہ مغل اب تک وحشی اور درندے تھے۔ ان کے کھیل تماشوں میں بھی انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنا لازمی ہوتا تھا تب ہی انہیں تماش بینی کا مزہ آتا تھا۔

جب وہ جشن بہاراں مناتے یا قرولتائی منعقد کرتے تو دور دور کے ملکوں سے تاجر' ہنر مند' سیاح اور مؤرخین وہاں آتے تھے۔ تاکہ اپنی آنکھوں سے ان کے رہن سہن کو اور ان کے طور طریقوں کو دیکھ سکیں۔ وہ مغل بے شمار ملکوں کو فتح کرنے اور بے انتہا دولت سمیٹنے کے بعد بھی اب تک خیموں میں رہتے تھے۔

ان کے جدِ امجد خان اعظم چنگیز خاں نے کہا تھا کہ ہم آباواجداد کے زمانے سے خانہ بدوش رہے ہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ ہمیں مہذب لوگوں کی طرح پکے مکانات بنا کر ایک جگہ قیام نہیں کرنا چاہیے۔ تالاب کے پانی کی طرح ایک ہی جگہ ٹھہرنا نہیں چاہیے۔ ہم دریا کی طرح رواں دواں رہیں گے۔ یوں مہذب قوموں کو کچلتے ہوئے، ان کی دولت سمیٹتے ہوئے اپنی مغل قوم کو مالا مال کرتے رہیں گے۔

اب اس قوم میں عورتوں اور مردوں کی تعداد کئی لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ چغتائی' اوغدائی' سیورقوقطنی اور باطو چار مختلف علاقوں کے حکمران تھے پھر ان کی اولاد کو بھی مختلف علاقے حکمرانی کے لیے مل گئے تھے۔ اس طرح مغل قبیلہ بہت دور دور تک پھیل چکا تھا۔ اس کے باوجود ان کی چال بے ڈھنگی' جو پہلے تھی وہ اب بھی دیکھنے میں آرہی تھی۔

جو بھی ان کی قرولتائی میں پہنچ کر اپنی آنکھوں سے ان کی طرز زندگی دیکھتا تھا۔ وہ اپنے ملک میں جا کر کہتا تھا۔ ''لوگو...! وہ ایک ایسی قوم ہے جو دنیا کے آخری سرے سے ابھر کر آئی ہے۔ وہ اب تک وہاں کی خوفناک آب وہوا اور برف باری میں کہیں چھپے ہوئے تھے۔ پھر اچانک ہی موت کے فرشتے بن کر شمال سے مشرقی جنوبی ایشیا اور مغربی یورپی ملکوں کو اپنے گھوڑوں کے سموں سے روندتے اور کچلتے آرہے ہیں۔ اب ان کی آبادی ٹڈی دل کی طرح بڑھتی اور پھیلتی جارہی ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ اس نے اس وحشی قوم کو ہم مہذب لوگوں پر کیوں عذاب بنا کر نازل کیا ہے؟

وہ ہیبت ناک وحشی درندے انسانی قوانین سے بالکل ناواقف ہیں۔ ان کا ایک سردار ہوتا ہے' جس کی وہ بہت تعظیم کرتے ہیں۔ اسے دیوتا مان کر اس کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ وہ جان دینے کو کہتا ہے تو اسی وقت جان پر کھیل جاتے ہیں۔

ان وحشیوں کے پاس بہترین گھوڑے ہیں۔ وہ بہت عمدہ کھانے کھاتے ہیں۔ بیش قیمت کپڑے پہنتے ہیں۔ ان کے پاس مشرق سے مغرب تک، تمام ملکوں سے لوٹی ہوئی دولت اتنی ہے کہ ہیرے جواہرات، سونا چاندی کچرے کے ڈھیر کی طرح ان کے یورت میں پڑے رہتے ہیں۔

پہلے ان کے پاس آہنی ہتھیار اور بھدے قسم کے زرہ بکتر تھے لیکن عیسائیوں اور مسلمانوں سے جنگیں جیتنے کے بعد ان کے پاس ہمارے ہتھیاروں کا ذخیرہ ہوگیا ہے۔ اب وہ حملے کرتے ہیں تو ہمارے ہی ہتھیاروں سے ہمارے لوگوں کو قتل کرتے چلے جاتے ہیں۔

دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام ممالک کے حکمران اس خیال سے سہمے رہتے ہیں کہ پتا نہیں وہ پھر کب پلٹ کر آئیں گے۔ قتل وغارت گری کا بازار گرم کریں گے اور اپنی ضرورت کی چیزوں کے ساتھ ہماری نوجوان اور خوبصورت عورتوں کو اٹھا کر لے جائیں گے۔

ویسے اب وہ صرف حکمرانوں کے اور ان کی فوجوں کے دشمن ہیں۔ جس ملک میں پہنچتے ہیں' وہاں کے شہریوں کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ ان کی شرط یہ ہوتی ہے کہ کچھ کہے سنے بغیر وہ اپنے گھروں میں چھپائی ہوئی دولت ان کے سامنے لا کر رکھ دیں اور اپنی حسین عورتوں کو ان کے آگے پیش کریں تو دو چار روز قیام کرنے کے بعد جب واپس جائیں گے تو ان کی عورتوں کو انہیں واپس دیتے جائیں گے۔

ان کے متعلق یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ عقل کی کمی کے

باعث وہ وحشی بن کر رہتے ہیں۔ وہ کسی دین دھرم کو نہیں مانتے۔ جادوانی آسمان سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شامان اور جادوگر انہیں آسمانی بلاؤں سے نجات دلاتے رہتے ہیں۔ ایک مہذب ملک سے قرولتائی میں ایک شعبدہ باز آیا تھا۔ اس نے چغتائی کے ساتھ ایک شامان کی جادوگری دیکھی۔ آسمان پر پانچ پرندے اڑتے جا رہے تھے۔ چغتائی تیر کمان سے ان کا نشانہ لینا چاہتا تھا۔ شامان نے کہا۔ ''اے آقا! تُو ان پانچوں میں کتنے پرندوں کو شکار کرنا چاہتا ہے؟''

چغتائی نے ان اڑتے ہوئے پرندوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس پہلے اور آخری اور بیچ والے پرندے کو مارنا چاہتا ہوں۔''

شامان نے کہا۔ ''میں کسی ہتھیار کے بغیر انہیں مار گراؤں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے زمین پر انگلی سے چند لکیریں کھینچی پھر اس انگلی کا رخ ان پرندوں کی طرف کیا۔ تو دوسرے ہی لمحے میں چغتائی کے تینوں مطلوبہ پرندے پھڑ پھڑاتے ہوئے زمین پر آگرے۔

چغتائی نے حیرانی سے پوچھا۔ ''یہ تُو نے کیسے کیا؟''

وہ سر جھکا کر بولا۔ ''میں نے زمین پر لکیر کھینچ کر جادوانی آسمان سے مدد مانگی۔ اس نے کہا' ابھی وہ تینوں پرندے تیرے آقا کے قدموں میں آگریں گے اور تُو دیکھ رہا ہے کہ یہ تینوں تیرے سامنے پڑے ہوئے ہیں۔''

مہذب ملک سے آنے والا جادوگر اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ شامان نے سراسر شعبدہ بازی کی ہے۔ جادوئی ہتھکنڈے سے ان تین پرندوں کو نیچے گرایا ہے۔ چغتائی کو متاثر کرنے کے لیے کہہ رہا ہے کہ اس نے جادوانی آسمان سے باتیں کی تھیں۔ تمام مغل سردار اُن شامانوں سے اس لیے ڈرتے تھے کہ جادوانی آسمان سے ان کا براہِ راست رابطہ رہتا تھا اور وہ اس سے باتیں کرتے ہیں اور آسمان سے نازل ہونے والی بلاؤں اور بیماریوں کو ان سے دور رکھتے ہیں۔

اوغدائی نے اس مہذب ملک کے شعبدہ باز کو طلب کیا اور اس سے کہا۔ ''تم نے ہمارے شامانوں کے کمالات دیکھے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی اور عظمت یہ ہے کہ یہ جادوانی آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ کیا تو اتنا بڑا اعزاز حاصل کر سکتا ہے؟''

اس شعبدہ باز نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ وہ شامان سراسر مکاری سے کام لیتے ہیں۔ یہ کہہ کر سرداروں کو مرعوب کرتے ہیں کہ وہ ان کے خدا کے پسندیدہ بندے ہیں اور خدا صرف ان سے ہی باتیں کرتا ہے۔

اس نے کہا۔ ''اگر یہ شامان دور پہاڑی ٹیلوں کی بلندی پر جا کر اس سے باتیں کرتے ہیں تو کیا کمال کرتے ہیں؟ اے خان اعظم...! میں یہاں تیرے سامنے جادوانی آسمان سے باتیں کروں گا اور یہاں جو ہزاروں کی تعداد میں تیرے سردار اور سپاہی موجود ہیں' یہ بھی جادوانی آسمان سے ہونے والی باتیں سنیں گے۔''

یہ ایسا چونکا دینے والا دعویٰ تھا کہ سب ہی چونک کر حیرانی اور بے یقینی سے شعبدہ باز کو دیکھنے لگے۔ اوغدائی نے کہا۔ ''تُو بہت بڑا دعویٰ کر رہا ہے۔ اگر تُو نے ابھی ہمارے سامنے جادوانی آسمان سے باتیں نہ کیں تو ہم تیرا سر قلم کر دیں گے۔''

اس نے پوچھا۔ ''اور اگر میں اپنے دعوے میں سچا ثابت ہوا تو.....؟''

''تو تجھے اتنا مال و زر دیا جائے گا کہ تو وہ دولت پانچ چھکڑوں پر لاد کر اپنے ملک لے جائے گا۔''

''تو پھر اے خاقان! اپنی مسند سے اُتر جا اور میرے رو برو آ کر پلتھی مار کر بیٹھ جا۔ اس کے بعد تماشا دیکھ۔''

اوغدائی اس کے سامنے آ کر پلتھی مار کر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔ ''اب ہمارے چاروں طرف عود اور عنبر کی خوشبو جلائی جائے۔''

ذرا سی دیر میں ان کے چاروں طرف عود اور عنبر کا دھواں منڈلانے لگا۔ وہ بلند آواز سے کوئی منتر پڑھ رہا تھا اور وقفے وقفے سے کہتا تھا۔ ''آ.....آسمان سے اتر کر آ...تُو نے مغل خاندان کے ایک بندے کو خان اعظم کا بہت بڑا رتبہ دیا ہے۔ یہ اعلیٰ خاقان اپنی مسند سے اتر کر زمین پر آ بیٹھا ہے۔ اب تجھے بھی آنا چاہیے۔ اے جادوانی آسمان...! آ...آ...آجا.....''

پھر اس نے ایک کپڑا اپنے منہ پر کس کر باندھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی ہلکی ہلکی بانسری اور دف کی موسیقی اُبھرنے لگی۔ سب حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ کوئی بانسری اور دف بجانے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے باوجود آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس قبیلے کے شامان یہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ یہ سراسر شعبدہ بازی ہے۔ اس نے اپنے طور پر جادو کے جو ہتھکنڈے سیکھے ہیں' ان کے ذریعے وہاں کے موجودہ افراد کو موسیقی سنا رہا ہے۔

پھر اچانک ہی سب نے ایک گرج دار آواز سنی۔ وہ

آواز کہہ رہی تھی۔ ''اے ساحر اعظم! تو ہمارا پسندیدہ بندہ ہے۔ تو نے ہمیں بلایا اور ہم چلے آئے ہیں۔''

وہ سب حیرانی سے اس شعبدہ باز کو دیکھ رہے تھے۔ اس کے منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔ وہ ہونٹ نہیں ہلا سکتا تھا۔ اس کے باوجود آواز سنائی دے رہی تھی پھر انہیں اس شعبدہ باز کی آواز سنائی دی۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ ''کیا تو جاودانی آسمان ہے؟''

گرجتی ہوئی آواز نے کہا۔ ''ہاں، ہم جاودانی آسمان ہیں۔ بول تو کیا چاہتا ہے؟''

وہ بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تو اس قبیلے کے خان اعظم کی عزت اور عظمت میں اضافہ کر۔ اس اعلیٰ مرتبت خاقان سے باتیں کر۔''

پھر اوغدائی نے حیرانی سے سنا۔ جاودانی آسمان اس سے مخاطب ہو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''اے اوغدائی! ہم نے تجھے زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر پہنچایا ہے۔ تجھے ایک بہت بڑے قبیلے کا خان اعظم بنایا ہے۔ بول تو اس وقت کون سا آسمانی معجزہ دیکھنا چاہتا ہے؟ ہم تیری یہ خواہش پوری کریں گے پھر یہاں سے چلے جائیں گے۔''

اوغدائی نے کہا۔ ''میں اپنے آقا بابا چنگیز خاں کی روح سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی پھر بانسری اور دف کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس کے بعد ایک لرزتی ہوئی کمزور سی آواز سنائی دی۔ وہ آواز کہہ رہی تھی۔ ''اے میرے بیٹے اوغدائی...! میں تیرا خان بابا تجھ سے مخاطب ہوں۔''

اوغدائی نے پوچھا۔ ''اے خان بابا! تیری آواز کیوں بدل گئی ہے؟ اور اتنی کمزور کیوں ہے؟ کیوں لرزتے ہوئے بول رہا ہے؟''

اسے جواب ملا۔ ''میں برسوں سے اپنی قبر میں پڑا ہوں۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا ہوں۔ ان ہڈیوں سے ایسی ہی کمزور اور لرزتی ہوئی آواز نکل رہی ہے۔''

ان کے چاروں طرف عود اور عنبر کا دھواں دور دور تک پھیل رہا تھا۔ تمام حاضرین حیرانی سے وہ آوازیں سن رہے تھے۔ پہلے تو انہیں یقین نہیں ہوا کہ جاودانی آسمان کی آواز سن رہے ہیں۔ پھر انہوں نے اپنے مردہ خان اعظم کی آواز سنی تو اور زیادہ حیران ہونے لگے۔ یہ نہ سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ اس شعبدہ باز کے منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔ وہ کچھ نہیں بول رہا تھا۔ اگر اس کے ہونٹ ہلتے۔ وہ کچھ بولتا تو یہ سمجھا جاتا کہ آواز بدل کر کبھی جاودانی آسمان اور کبھی چنگیز خاں کی روح بن کر بول رہا ہے۔ ایسے وقت قبیلے کے تمام شامان غصے سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

ان کے ایک شامان نے چیختے ہوئے کہا۔ ''یہ سراسر فریبی ہے۔ جھوٹ بول رہا ہے۔ دھوکا دے رہا ہے۔''

دوسرے شامان نے کہا۔ ''اے خاقان...! ہمیں اجازت دے۔ ہم اس کی مکاری ثابت کرنا چاہتے ہیں۔''

اوغدائی غصے سے لرزتے ہوئے ان شامانوں کو دیکھ رہا تھا، اس وقت جاودانی آسمان سے اور اپنے باپ کی روح سے بات کر رہا تھا۔ ایسے میں انہوں نے مداخلت کی تھی اور اسے غصہ دلایا تھا۔

ایک شامان نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''تو ہمیں قتل کر دے۔ ہم اپنی جان سے جائیں گے مگر اس کا جھوٹ ثابت کر کے رہیں گے۔ اس وقت جاودانی آسمان تجھ سے بات نہیں کر رہا ہے اور نہ ہی تیرے باپ کی روح تجھ سے مخاطب ہے۔''

دوسرے شامان نے کہا۔ ''اگر اس وقت جاودانی آسمان بول رہا ہے تو اس سے بول کہ وہ ہم شامانوں پر عذاب نازل کرے۔ ہمیں ابھی جلا کر مار ڈالے۔''

ایک اور شامان نے کہا۔ ''اے خاقان! تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارا جاودانی آسمان صرف ہماری قبائلی زبان میں بولتا ہے۔ جبکہ اس وقت یہ ترکی زبان میں بول رہا ہے۔''

اس شعبدہ باز نے کہا۔ ''جاودانی آسمان دنیا کی کوئی بھی زبان بول سکتا ہے۔ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے اس لیے اس وقت ترکی زبان بول رہا ہے۔''

ایک شامان نے کہا۔ ''اگر وہ ہر زبان میں بول سکتا ہے تو اس سے بول کہ وہ ہماری قبائلی زبان میں بولے۔''

وہ شعبدہ باز مغلوں کی قبائلی زبان نہیں جانتا تھا۔ وہ بری طرح پھنس گیا۔ اس نے بات بناتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت جاودانی آسمان صرف ترکی زبان میں بولنا چاہتا ہے اور ہم ناچیز بندے اسے کوئی دوسری زبان بولنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔''

ایک اور شامان نے کہا۔ ''لیکن ہمارا جدِ امجد خان اعظم چنگیز خان صرف قبائلی زبان جانتا تھا۔ کوئی دوسری زبان کبھی نہیں بولتا تھا۔ اسے ترکی زبان آتی ہی نہیں تھی۔ اے او شعبدہ باز...! اگر تو سچا ہے تو خان اعظم کی روح سے بول کہ وہ اپنی قبائلی زبان میں اپنے بیٹے اوغدائی سے بات کرے۔''

شعبدہ باز نے کہا۔ ''اس کی روح بھی اس وقت صرف

ترکی زبان ہی بولے گی۔''

''اور اس لیے بولے گی کہ تُو ترکی زبان تو جانتا ہے لیکن ہماری قبائلی زبان نہیں جانتا۔ اس لیے جادوئی ہتھکنڈوں سے ترکی زبان میں آوازیں سنا رہا ہے۔''

شامانوں کی باتیں اوغدائی اور دوسرے لوگوں کی سمجھ میں آرہی تھیں۔ اوغدائی نے اس شعبدہ باز سے کہا۔ ''میرا باپ صرف قبائلی زبان جانتا تھا۔ اس وقت ترکی زبان میں کیسے بول رہا ہے؟ اور جب وہ ترکی زبان میں بول سکتا ہے تو اپنی قبائلی زبان میں بھی بول سکتا ہے۔ لہٰذا میں اپنی ہی زبان میں اپنے باپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ شعبدہ باز اپنی بازی گری کی دلدل میں دھنس چکا تھا۔ وہ ان کی قبائلی زبان میں بولنے والا کوئی شعبدہ نہ دکھا سکا۔ اپنی سچائی ثابت نہ کر سکا۔ اوغدائی غصے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی مسند پر آکر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے شامان سچے ہیں۔ میں انہیں حکم دیتا ہوں کہ اس شعبدہ باز کو اپنے ہاتھوں سے سزا دیں اور اس طرح ہلاک کریں کہ یہاں باہر سے آنے والوں کو عبرت حاصل ہو۔ وہ اپنے ملکوں میں جا کر بتائیں کہ ہم مغلوں سے جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے؟''

وہ تمام شامان اُس شعبدہ باز پر پل پڑے۔ اسے ادھر سے ادھر دوڑا دوڑا کر خنجر کی نوک چبھونے لگے۔ وہ کبھی تلوار سے اس کا ایک ہاتھ کاٹ کر فضا میں اچھالتے تھے۔ تو کبھی کٹے ہوئے ہاتھ سے جو لہو فوارے کی صورت میں نکلتا تھا اسے وہ چاروں طرف گھما کر اس لہو سے ایک دوسرے کو رنگتے تھے۔ انہوں نے خنجر کی نوک سے اس کی آنکھیں نکال دیں۔ وہ چیخیں مار رہا تھا۔ زمین پر تڑپ رہا تھا مر جانا چاہتا تھا مگر اس کی جان نہیں نکل رہی تھی۔ ایک شامان نے خنجر کی نوک سے اس کے سینے کو چیر کر اس کے دل کو مٹھی میں جکڑ کر باہر کھینچ لیا پھر مٹھی کو فضا میں بلند کرتے ہوئے ناچنے لگا۔ مہذب ملکوں سے آئے ہوئے مہمان وحشیوں کا یہ شیطانی تماشا دیکھ رہے تھے اور تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ان کے ساتھ رہنے والے مغل ان کو سمجھا رہے تھے کہ وہ خاطر جمع رکھیں۔ مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جائے گا۔

☆☆☆

وہ موسم سرما کا آغاز تھا۔ سپہ سالار اعظم سوبودائی نے حکم دیا کہ چغتائی' اوغدائی اور باطو کی فوجیں یکجا ہو جائیں۔ اس بار شمالی روس کا خاتمہ کیا جائے گا۔ سردی کی شدت سے بہتے ہوئے دریا کا پانی جم جاتا ہے۔ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک سخت برفانی چٹان بن جاتا ہے۔ اس پر سے ہمارے سپاہی اور ہماری گاڑیاں گزر سکتی ہیں۔ ہم آسانی سے دریا پار کر سکتے ہیں۔

سوبودائی کے فیصلے کے مطابق خان اعظم اور دوسرے سرداروں کی تمام فوجیں یکجا ہو گئیں اور وہاں سے شمالی روس کی طرف بڑھنے لگیں۔ فوج کے سپاہی راستے میں مویشی اکٹھا کرتے جاتے تھے۔ تاکہ آگے جا کر خوراک کی کمی نہ ہو۔ تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر گھوڑوں کے چارے کے گودام بنا دیے گئے تھے۔ ان کے ساتھ بیل گاڑیاں چڑ چڑ اہٹ کی آوازیں پیدا کرتی ہوئی چل رہی تھیں۔ ان گاڑیوں پر منجنیقیں' مختلف قسم کے ہتھیار اور آتشی گولا بارود لدا ہوا تھا۔ اب وہ مغل وحشی گندھک اور دوسرے آتش گیر مادے کا استعمال سیکھ گئے تھے۔

ایک سپاہی کے ساتھ ایک سے زیادہ گھوڑے تھے۔ ان کے سروں پر سمور کی ٹوپیاں تھیں۔ سردی سے بچنے کے لیے سر سے پاؤں تک سمور کا لباس تھا' جو انہیں موسم کے مقابلے میں قدرے گرم رکھتا تھا۔ ان کے گھوڑوں کے ساتھ کمندیں اور رسیاں تھیں۔ دلدل سے گزرتے وقت یا چڑھائی چڑھتے وقت ان رسیوں کے ذریعے گاڑیوں کو کھینچا جاتا تھا۔ ہر سوار کے ساتھ جو کے تھیلے نمک کی تھیلی اور پکانے کا مختصر سا سامان رکھا گیا تھا۔ برفانی طوفانوں سے پناہ لینے کے لیے بھاری بھرکم خیمے تھے۔ وہ مغل وحشی سخت سردیوں میں آرام کرنے کا تصور بھی نہیں کرتے تھے۔ آگے اور آگے بڑھتے ہی چلے جاتے تھے۔

روسی باشندے سردیاں گزارنے کے لیے اپنے شہروں اور گاؤں کی چھوٹی فصیلوں میں رہتے تھے۔ وہ جنگجو قوم تھے۔ غلاموں اور سموروں کی تجارت کے باعث بہت خوشحال تھے۔ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی اپنے وطن سے باہر نکل کر دور دراز کے ملکوں تک سفر نہیں کیا تھا۔ وہ صرف دست بدست تلواروں سے لڑنا جانتے تھے اور کسی طرح کی لڑائی سے ناواقف تھے۔

منگو اور باطو اپنی فوج کو سب سے آگے بڑھا کر دریا خالکا کے کنارے آگئے تھے۔ وہاں انہوں نے جنوبی رئیسوں کی فوج پر حملہ کیا اور ایک ایک کو چُن چُن کے قتل کر دیا۔ یہ شمالی روس میں ان کی پہلی کامیابی تھی۔

نارود گرود کے راہبوں نے اگست کی تیسری تاریخ کو سورج میں ایک خاص نشان دیکھا تھا۔ اس نشان کی صورت یہ تھی کہ سورج کے مغربی جانب تاریکی سی تھی۔ یہ نشان تاریکی

اور بربادی کی طرف اشارہ کررہا تھا۔

ان راہبوں نے ریازان کے رئیسوں کے پاس قاصد بھیجے۔ ولادی میر کے رئیسوں سے بھی مدد مانگی۔ لیکن وہ سب اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے حال میں مست تھے۔ کوئی ایک دوسرے کی مدد کو نہیں آیا۔ رئیسوں کو بیرونی حملہ آوروں کی طرف سے خطرہ ضرور تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ مغل وحشی کیا چیز ہیں اور کس طرح قہر الٰہی بن کر نازل ہونے والے ہیں؟

جب ان کی منجنیقوں نے شعلہ باری کی اور ان کی کاٹھ سے بنی ہوئی فصیلیں راکھ ہونے لگیں تب وہ اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر بھاگنے لگے۔ وہ کاٹھ کی فصیلوں کو بہت مضبوط سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حملہ کرنے والے ان فصیلوں کی دیواروں کو تو ڑنہیں سکیں گے۔

لہٰذا وہ شہر مقتل بن گیا۔ مردوں کے پیچھے گھوڑے دوڑاتے ہوئے انہیں قتل کیا گیا۔ شہر کی برف پوش زمین ان کے لہو سے سرخ ہوتی چلی گئی۔ انہیں زندہ آہنی سیخوں پر چڑھا دیا گیا۔ سیخوں سے چھدنے کے بعد وہ کرتڑپ تڑپ کر جان دیتے تھے جو پادری کلیساؤں میں جا کر چھپ گئے تھے۔ انہیں بھیڑوں کی طرح ذبح کیا گیا۔ جو عورتیں کلیساؤں میں پناہ لینے گئی تھیں۔ ان پر تو قیامت ٹوٹ پڑی۔ پہلے عصمت دری کے ذریعے پھر تیز تلواروں اور کلہاڑی کے ذریعے ان کے چیتھڑے اڑا دیے گئے۔

وہ وحشی منجمد دریاؤں کی تہ پر سے گزرتے ہوئے ایک قلعے سے دوسرے قلعے تک پہنچتے جا رہے تھے۔ روسی شہر سُوزدال، روستوف، یاروسلاول اور کولومنکا ندی کو تسخیر کرتے اور منہدم کرتے جا رہے تھے۔ ماسکو شہر اس زمانے میں بہت چھوٹا سا تھا۔ انہوں نے اس شہر کو اس طرح آگ لگائی کہ وہاں کوئی مکان اور کوئی مکین زندہ نہ بچا۔

کولومنکا ندی کے کنارے روسی فوج کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ روس کا سب سے مضبوط قلعہ ولادی میر تھا۔ وہاں بھی مغلوں نے موت کی جھاڑو پھیر دی۔ وہاں ایک زندہ بچ جانے والے صحیفہ نگار نے لکھا ہے۔ ''اس طرح خدا نے اس وحشی قوم کے ذریعے ہمیں اپنی طاقت سے محروم کر دیا۔ ہمیں خوف و اضطراب میں اس طرح مبتلا کر دیا کہ آسمان پر بادل گرجتے تو ہمیں یوں لگتا، جیسے مغل موت بن کر آ گئے ہوں۔

وہ وحشی جس شہر میں پہنچ کر موت کا رقص کرتے تھے وہاں اناج اور مویشیوں کو نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ جب وہ ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف بڑھتے تو ان کے چھکڑے مال غنیمت سے بھرے ہوتے تھے۔ وہ مویشیوں اور گھوڑوں کے گلّوں کو ہنکا کر لے جاتے تھے۔ اناج اور گھوڑے کے چارے کو کبھی آگ نہیں لگاتے تھے۔ جہاں قیام کرتے تھے۔ وہاں کے دیہاتیوں کو اتنے عرصے تک زندہ رکھتے تھے جب تک کہ وہ اناج اور چارے کی فصل کاٹ لیتے پھر انہیں قتل کر دیتے تھے۔ ان بیچاروں کو اپنا اگایا ہوا اناج بھی نصیب نہیں ہوتا تھا۔''

ان ہی دنوں اوغدائی کو بیماری نے آدبوچا۔ طبیب اس کا علاج کر رہے تھے لیکن اسے طبیبوں سے زیادہ شامانوں پر بھروسا تھا۔ کتنے ہی تجربہ کار شامان اس کے یورت کے آس پاس جمع ہو گئے تھے اور ڈھول بجا بجا کر منتر پڑھ رہے تھے۔ اس طرح اس کے اندر آنے والی بیماری کو بھگانا چاہتے تھے۔

دوسرے دن اس کی حالت بہتر ہوگئی۔ شامان خوش ہو گئے پھر ان کی ساحری کا بھرم رہ گیا تھا۔ ایسے وقت سیورقوقطنی کی بہن اپنے شوہر کے ساتھ اس کی عیادت کے لیے آئی۔ اوغدائی نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور بڑی خوشی کا اظہار کیا پھر اس کے شوہر کے ساتھ بیٹھ کر شراب پینے لگا۔ توراکینہ نے کہا۔ ''تجھے اس بیماری میں پینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔''

اس نے کہا۔ ''کیا تو نہیں دیکھ رہی کہ سیورقوقطنی کی بہن آپس کی رنجشیں مٹانے میری عیادت کے لیے آئی ہے؟ تو کیا سمجھتی ہے، میں پینا چھوڑ دوں گا تو موت میرا پیچھا چھوڑ دے گی؟ جا چلی جا... میں نے سمجھ لیا ہے کہ میرا آخری وقت آ پہنچا ہے۔''

توراکینہ بڑبڑاتی ہوئی یورت سے باہر چلی گئی۔ اوغدائی نے سیورقوقطنی کی بہن سے کہا۔ ''میری طاقت اب ختم ہو رہی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ جادوانی آسمان مجھے کچھ اور روز زندہ رکھے گا لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ موت اب تب میں آنے ہی والی ہے۔''

اس نے پیالے بھر بھر کر پیئے۔ پھر اپنے مہمانوں سے غافل ہو گیا۔ سیورقوقطنی کی بہن اپنے شوہر کے ساتھ وہاں سے چلی آئی۔ اسی رات اوغدائی نیند کی حالت میں مر گیا۔

دوسری صبح جب وہ اپنے بستر پر مردہ پایا گیا تو ماتم شروع ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی سیورقوقطنی کی بہن پر الزام لگایا گیا کہ اس نے خاقان کو زہر دے کر مار ڈالا ہے۔ خاقان کو قتل کرنے کی سزا ایسی تھی کہ قوقطنی کی بہن کے پورے خاندان کو نیزوں پر اچھال دیا جاتا۔ ان کے گھروں کو آگ لگا

دی جاتی۔ان کے ننھے سے بچے کو بھی زندہ نہ چھوڑا جاتا۔

یہ بہت بڑا الزام تھا۔تورا کینہ کو قوقطتی سے انتقام لینے کا اچھا موقع مل رہا تھا لیکن وہ انتقامی کارروائی کا وقت نہیں تھا۔ایک تو وہ اپنی بیوگی کا ماتم کررہی تھی۔دوسری اہم بات یہ تھی کہ فی الوقت اوغدائی کی موت کو چھپانا تھا۔یہ خبر باہر تک جاتی تو قوقطتی ماتم کرنے کے بہانے پھر اس قبیلے میں آجاتی۔اوغدائی کی تدفین کے بعد ہی اپنے بیٹے منگو کو خان اعظم بنانے کے لیے وہاں کے سرداروں سے گٹھ جوڑ شروع کردیتی۔

تورا کینہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ یہ خبر اس سوتیلے جوجی کے بیٹے باطو تک پہنچے۔وہ باطو کو اپنے بیٹے قویوق کا بدترین دشمن سمجھتی تھی۔خان اعظم کا سایہ قویوق کے سر سے اٹھتے ہی وہ اسے جانی نقصان پہنچا سکتا تھا۔

پھر یہ کہ مغل قبیلے کے ایک طاقتور سردار الجی دائی نویان نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ قوقطتی کی بہن کو خوامخواہ الزام دیا جارہا ہے۔ہمارا خاقان اتنا نادان اور کمزور نہیں تھا کہ کسی عورت کے ہاتھوں سے زہر پی کر مر جاتا۔وہ تو ضرورت سے زیادہ پینے کا عادی تھا۔اس کی بلانوشی نے اسے مار ڈالا ہے۔

بے شمار سرداروں نے سردار الجی دائی نویان کی تائید کی تورا کینہ کو یہی مشورہ دیا کہ ابھی خاقان کی موت کی خبر قبیلے سے باہر نہیں جانی چاہیے۔سب سے پہلے قویوق کو یہاں بلایا جائے۔

سیورقوقطتی کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔وہ سیاسی کھیل کھیلنا جانتی تھی۔اس نے تورا کینہ اوغدائی کے خانوادے میں اپنے جاسوس چھوڑ رکھے تھے۔ایک جاسوس نے خاقان کی موت کی خبر اس کے پاس پہنچادی۔قوقطتی نے اپنے ایک گھڑسوار سے کہا۔''اگرچہ شمالی روس میں برف باری ہورہی ہے۔ان علاقوں سے گزرنا بہت مشکل ہے۔پھر بھی تجھے کسی بھی طرح باطو تک پہنچ کر خاقان کی موت کی خبر پہنچانی ہے۔''

وہ گھڑسوار بہت ہی جی دار اور سخت جان تھا۔کڑاکے کی سردی میں ایشیا کے اس پار گھوڑا دوڑاتا چلا گیا۔اگرچہ وہ رات کو کم سوتا تھا اور صبح سے پہلے ہی اگلی منزل کی طرف چل پڑتا تھا۔اس کے باوجود پانچ ہزار میل کا دشوار گزار برفانی راستہ ڈھائی ماہ میں طے کیا۔

باطو نے اوغدائی کی موت کی خبر سن کر اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔اسے ایک طرح کی آزادی مل گئی تھی۔اوغدائی کی موت کے بعد چنگیز خاں کے خاندان میں اب سب سے زیادہ بزرگ وہی تھا۔جہاں تک چغتائی کا تعلق تھا' وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔کثرت شراب نوشی کے باعث اس کی صحت روز بروز گرتی جارہی تھی۔

وہ شمالی روس سے نکل کر جنوبی علاقے میں آگیا۔سیور قوقطتی کے علاقے سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر پہنچ گیا۔وہاں سے دونوں کے درمیان بہ آسانی رابطہ قائم ہوگیا تھا۔ہر روز ان کے کئی قاصد ایک دوسرے کا پیغام لے کر جاتے تھے اور جواب لے کر آتے تھے۔سیورقوقطتی نے کہلا بھیجا۔''بیٹے باطو! دستور کے مطابق جب تک نئے خان اعظم کا انتخاب نہیں ہوگا تب تک تورا کینہ پورے مغل قبیلے کی ملکہ رہے گی۔تجھے انتخاب کے وقت قرولتائی میں رہنا چاہیے۔''

باطو نے کہا۔''میں وہاں جا کر کیا کروں گا۔چنگیزی یاسا کے مطابق ایک ناجائز باپ کے بیٹے کو کوئی خان اعظم تسلیم نہیں کرے گا۔البتہ میں اپنے دوست اپنے بھائی منگو کی حمایت میں بول سکتا ہوں۔لیکن صرف میرے اور تیرے حمایت کرنے سے بات نہیں بنے گی۔''

سیورقوقطتی نے کہا۔''کتنے ہی مغل سردار ہمارے حمایتی ہیں۔قرولتائی میں وہ تمام سردار ہماری حمایت کریں گے۔''

وہ بولا۔''میرا مشورہ ہے کہ ابھی قویوق کو خان اعظم بننے کا موقع دیا جائے۔وہ بہت ہی کمزور حکمران ثابت ہو گا۔تورا کینہ نے کئی سرداروں کی زمینیں ضبط کی ہیں۔تُو انہیں اپنی طرف سے زمینیں عطا کر میں یہاں سے ان سب کے لیے بیش قیمت تحائف بھیجتا رہوں گا۔ہمیں بڑی ہی حکمت عملی سے تورا کینہ اور اس کے بیٹے کو کمزور بنانا چاہیے۔''

تورا کینہ اور چغتائی کے تمام بیٹے بڑی نفرت سے باطو کو حرام زادہ کہتے تھے۔وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا۔اس کے باپ جوجی اور اس کی دادی بورتائی نے بچپن ہی سے سمجھایا تھا۔''کبھی مغل خاندان کے کسی فرد کے خلاف تلوار نہ اٹھانا۔تیرے باپ جوجی کو اسی لیے روس کا علاقہ دیا گیا ہے کہ تُو ان سے ہزاروں میل دور رہا کرے لیکن ان کے ساتھ وفاداری شرط ہے۔''

جب باطو چھ برس کا تھا تب ہی اس کی ماں مرگئی تھی۔شیرنی نے اسے بھرپور محبت اور ممتا دی تھی۔چونکہ وہ بھی ماں نہ بن سکی تھی۔اس لیے اپنی تمام ممتا اس پر نچھاور کرتی تھی۔باطو کو مغل خاندان سے کئی زخم لگے تھے۔سب سے پہلا اور گہرا زخم یہی تھا کہ وہ ایک ناجائز باپ کا بیٹا تھا۔دوسرا زخم یہ لگا کہ اس کے باپ جوجی کی موت کے بعد اس کی ماں شیرنی کو اس سے چھین لیا گیا تھا۔چغتائی' اوغدائی اور تولوئی

اپنے لشکر کے ساتھ وہاں آئے تھے اور یہ کہہ کر شینا کو وہاں سے لے گئے تھے کہ اب وہ اس کے دادا چنگیز خاں کی ملکیت بن کر رہے گی۔ باطو نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ماں پر کسی اور مرد کا سایہ پڑے۔ لیکن وہ اس سلسلے میں اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ چنگیز خاں اس کا دادا بھی تھا اور خان اعظم بھی...

شینا نے وہاں سے جاتے وقت باطو کو سمجھایا تھا۔

''بیٹے! میری جدائی برداشت کر۔ تُو جوجی کی موت کے بعد بہت بڑے علاقے کا حکمران بن چکا ہے۔ وہیں اپنے قدم جما۔ فوجی قوت زیادہ سے زیادہ حاصل کر۔ تقدیر کو منظور ہوا تو ہم ماں بیٹے پھر کبھی ضرور ملیں گے۔''

تقدیر کو ماں بیٹے کا ملاپ منظور نہیں تھا۔ جب وہ چنگیز خان کے پاس پہنچی تو اس کا دم نکل چکا تھا۔ ایسے وقت باطو نے چغتائی کے پاس قاصد بھیجا اور کہا۔ ''دادا حضرت کا انتقال ہو چکا ہے۔ لہٰذا میری ماں مجھے لوٹا دے۔''

چغتائی کی طرف سے جواب ملا۔ ''شینا کو خان اعظم کی تدفین تک قراقرم میں رکھا جائے گا۔ پھر یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ اسے کہاں جانا ہے اور کس کے ساتھ رہنا ہے؟''

باطو یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ اس کی ماں شینا کو اس کے دادا کے ساتھ قبر میں دفن کیا جا سکتا ہے، ایسا ہوگا تو وہ یہ ظلم برداشت نہیں کرے گا۔ اس نے قاصد کے ذریعے کہلا بھیجا۔ ''میں تم سب سے التجا کرتا ہوں، میری ماں کو زندگی دی جائے۔ میں چاہوں گا کہ کسی بھی شرط پر اسے زندہ رکھا جائے۔''

بعد میں پتا چلا کہ اوغدائی، چغتائی اور تولوئی نے اس کی ماں کو دادا پر قربان ہونے نہیں دیا تھا۔ اگرچہ یہ سوچ کر ہی باطو کو برا لگ رہا تھا کہ وہ تینوں بھائی اس کی ماں کو داشتہ بنا کر رکھیں گے مگر وہ مجبور تھا۔ ان کے خلاف تلوار نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ ماں جہاں بھی ہے۔ جیسی بھی زندگی گزار رہی ہے۔ زندہ تو ہے اور جب تک زندہ رہے گی تب تک یہ آس رہے گی کہ وہ اسے کسی بھی حیلے بہانے سے اپنے پاس بلا سکے گا۔

اب اس نے چغتائی کے پاس پیغام بھیجا اور کہا۔ ''میرے دونوں چچا تو لوئی اور اوغدائی مر چکے ہیں۔ تُو بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ میں تجھ سے التجا کرتا ہوں۔ اب میری ماں کو آزاد کر دے۔ اسے میرے پاس بھیج دے۔''

چغتائی نے کہا۔ ''میں ایک شرط پر تیری ماں کو آزاد کر سکتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ تو اوغدائی کے بیٹے قویوق کے خان اعظم بننے پر اعتراض نہ کرے اور سیورقوقطنی کو بھی اعتراض کرنے سے باز رکھے۔''

باطو پہلے ہی سیورقوقطنی کو یہ سمجھا چکا تھا کہ فی الحال قویوق کو خان اعظم بننے دیا جائے۔ ہم آئندہ اس کی کمزوریوں سے بہت فائدہ اٹھا سکیں گے اور وہ اس بات پر راضی ہو گئی تھی۔ اس نے چغتائی سے کہا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں، میں اور قوقطنی بھی قویوق کی مخالفت نہیں کریں گے۔ اسے خان تسلیم کر لیں گے۔ تُو میری ماں کو میرے پاس بھیج دے۔''

چغتائی نے کہلا بھیجا کہ جا۔ تیری ماں تجھے بخش دی گئی۔ اسے تیرے پاس پہنچایا جا رہا ہے۔

☆☆☆

باطو نے اپنی جوان مردی سے روس کا زیادہ تر علاقہ فتح کیا تھا۔ صرف اس کے باپ جوجی کی پیدائش کا معاملہ ایسا تھا جس کے باعث وہ احساس کم تری میں مبتلا رہتا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ باقی دوسرے تمام پہلوؤں سے اتنی عزت اور شہرت حاصل کرے گا۔ اس قدر رعب و دبدبہ قائم کرے گا کہ ساری دنیا اس کے آگے سر جھکائے گی تب یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوگا کہ ایک پہلو سے کم تر کہلانے والا دنیا کے تمام برتروں کو اپنے آگے جھکا رہا ہے۔

وہ اعلیٰ پیمانے پر اپنی شخصیت کی تعمیر کرنے کے لیے دن رات مصروف رہتا تھا۔ رات کو دو چار پیالے سے زیادہ شراب نہیں پیتا۔ کبھی کوئی حسینہ اسے اچھی لگتی، اپنی طرف کھینچتی تو وہ اس کے ساتھ کچھ وقت گزار لیتا تھا۔ ورنہ عورتوں سے کتراتا تھا۔ چونکہ ہوس پرست نہیں تھا۔ اس لیے اس نے ایک ہی شادی کی تھی۔ اس کے بعد کوئی دوسری بیوی اپنے حرم میں نہیں لایا تھا۔

ایک بار اس کے مخبروں نے بتایا۔ ''گرجستان کی ملکہ زُدسودان اس قدر حسین ہے کہ اسے دیکھنے والے آہیں بھرتے رہ جاتے ہیں۔ وہ ملکہ بہت ہی عیاش اور ظالم ہے۔ جو شخص اس کے دل و دماغ میں سما جاتا ہے وہ اسے اپنے محل میں بلاتی ہے پھر اس کے ساتھ دن رات یوں گزارتی ہے جیسے اسی کی ہو کر رہ گئی ہو لیکن گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے میں دیر نہیں کرتی۔ جب اس کا دل بھر جاتا ہے تو وہ اس شخص کو قلعے کی فصیل پر سے نیچے گرا دیتی ہے۔ نیچے دور تک آگ کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں۔ اگر گرنے والا اٹھنے کے قابل ہوتا ہے تو فوراً شعلوں سے نکل کر بھاگنا چاہتا ہے تب چاروں طرف کھڑے ہوئے سپاہی نیزوں سے مار مار کر اسے پھر آگ میں پھینک دیتے ہیں۔''

باطو نے کہا۔ ''پھر تو واقعی وہ انتہائی ظالم عورت ہے۔ میں نے فتوحات حاصل کرنے کے لیے کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔ کیا گرجستان کے آس پاس ایسے حکمران نہیں ہیں جو اسے زیر کرسکیں؟''

مخبر نے کہا۔ ''آس پاس کے حکمرانوں نے متحد ہو کر اس پر فوج کشی کی تھی۔ لیکن ملکہ کی لشکری قوت کے آگے ٹھہر نہ سکے۔ اگر تُو اس پر لشکر کشی کرے تو اس کے سارے کس بل ڈھیلے پڑ جائیں گے۔''

باطو اپنا لشکر لے کر ادھر روانہ ہوا۔ آگے آگے ایک ایلچی کے ذریعے پیغام بھیجا۔ ''اے گرجستان کی ملکہ...! تجھے معلوم ہونا چاہیے۔ باطو خان پورے روس کا فاتح اعظم ہے۔ میری فتوحات کی گونج دور دور تک سنی جاتی ہیں۔ یقیناً تُو نے بھی سنی ہوگی۔ میں تجھ سے دوستی اور امن و امان چاہتا ہوں۔ میں تیرے لیے بیش قیمت تحائف لے کر آیا ہوں۔ میری دوستی قبول کر۔ قلعہ کا دروازہ کھول کر میرے استقبال کے لیے چلی آ۔''

ملکہ کی طرف سے جواب آیا۔ ''جو مرد میرے دل کو بھاتا ہے، میں اسی سے دوستی کرتی ہوں۔ اگر تُو پسند آئے گا' تب بھی میں تجھ سے دوستی نہیں کروں گی۔ کیونکہ تُو قلعے کے اندر اپنے مسلح سپاہیوں کے ساتھ آئے گا اور میں اس کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی۔''

اس کا یہ جواب پا کر باطو نے حکم دیا۔ ''قلعے کو چاروں طرف سے گھیر لیا جائے۔ اس ملکہ کو کسی بھی چور دروازے سے فرار ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔''

اگرچہ قلعہ بہت مضبوط لکڑیوں سے بنوایا گیا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ باطو کے لشکر میں منجنیقیں ہیں۔ جن کے ذریعے بھاری بھرکم پتھر پھینکے جاتے ہیں۔ لکڑی کی دیواریں خواہ کتنی ہی مضبوط ہوں۔ وہ پتھروں کی مار سے ٹوٹ جائیں گی۔

سپہ سالار نے ملکہ کے سامنے حاضر ہو کر کہا۔ ''باطو کے پاس منجنیقیں ہیں۔ اے ملکہ! تُو نے سنا ہوگا کہ مغل وحشی آتش گیر مادہ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے گولے جب دشمن کی فوج میں آ کر پھٹتے ہیں تو ان میں سے آگ نکلتی ہے اور لوہے کے نوکیلے ٹکڑے نکل کر جسم میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔''

ملکہ رُوسودان نے فصیل کی بلندی سے چاروں طرف پھیلے ہوئے لشکر کو دیکھا۔ اس نے سوچا کہ یہ تیروں اور تلواروں سے زیر نہیں ہوگا۔ اسے مکاری سے مارنا ہوگا۔

اس نے پیغام بھیجا۔ ''میں کل صبح تک کی مہلت چاہتی ہوں۔ اس کے بعد تجھ سے صلح کروں گی۔ تیرے لیے قلعے کا دروازہ کھول دیا جائے گا۔''

وہ اپنے محل میں آ کر ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی۔ ایک نوجوان خوبصورت لڑکی نے آ کر کہا۔ ''ماما...! باطو خان بہت زبردست ہے۔ اس بار تُو ایک مرد سے زیر ہوگی اور اس کے آگے دم نہیں مار سکے گی۔''

ملکہ نے غصے سے کہا۔ ''میں نے تجھے کتنی بار سمجھایا ہے کہ مجھے ماں نہ کہا کر... کیا تو چاہتی ہے کہ میں گدی سے تیری زبان کھینچ لوں؟''

''تو جو چاہتی ہے وہ کرتی ہے۔ گرجستان پر تیرے بھتیجے کا حق تھا۔ اس کو حکمران ہونا چاہیے تھا۔ لیکن تُو نے اسے اندھے کنویں میں پھنکوا کر قیدی بنا کر رکھا ہے۔ وہ میرا عاشق ہے۔ میں تیری بیٹی ہوں۔ اس کی زندگی کی بھیک مانگتی ہوں۔ تو کیسی ماں ہے کہ مجھے بھیک بھی نہیں دیتی؟''

''میں اپنے بھتیجے اور تیرے عاشق زاوُدان کو رہا کروں گی تو وہ اپنے باپ کا یہ علاقہ مجھ سے چھیننے کی سازش کرے گا۔''

''میں کئی بار تجھ سے کہہ چکی ہوں' وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ ہم دونوں تیرے تابعدار بن کر رہیں گے۔ جب تک تُو زندہ ہے۔ یہاں حکومت کرتی رہے گی۔ تیرے بعد وہ یہاں کا حکمران بنے گا۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''حکومت کرنے کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ اپنی اولاد پر بھی بھروسا نہ کیا جائے۔''

ایسے وقت سپہ سالار نے حاضر ہو کر سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''اے ملکہ...! تیرے ایک ایک حکم کی تعمیل کی جا رہی ہے۔ باطو خان یہاں جتنے سرداروں کے ساتھ آئے گا ان کی ضیافت کے لیے انواع و اقسام کے کھانے اور مشروب تیار کیے جا رہے ہیں۔ ان سب میں زہر ملا دیا جائے گا۔ اس محل کے باہر' قلعے کے اندر باطو کے جتنے سپاہی ہمارا پیش کیا ہوا کھانا کھائیں گے، مشروب پئیں گے وہ ہمیشہ کی نیند سو جائیں گے۔''

ملکہ نے کہا۔ ''ایک بات کا خیال رکھنا کہ اس محل میں پہلے باطو اور اس کے سرداروں کو ضیافت دی جائے گی۔ پہلے وہ زہریلا کھانا کھائیں گے۔ اگر ان سے پہلے باہر کے کچھ سپاہی کھائیں گے اور کچھ کھانے سے رہ جائیں گے تو زندہ بچنے والے شور مچانا شروع کردیں گے کہ ان کے خلاف جان لیوا سازشیں ہو رہی ہیں۔ لہٰذا اس بات کا خاص خیال رکھا

چاہئے کہ پہلے میں باطو اور سرداروں کی میزبانی یہاں کروں گی۔ پہلے انہیں موت کی نیند سلاؤں گی۔ اس کے بعد باہر سپاہیوں کو کھانا اور مشروب پیش کیا جائے گا۔''

سپہ سالار سر جھکا کر الٹے قدموں چلتا ہوا اس کمرے سے باہر جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ملکہ نے سوچتی ہوئی نظروں سے اپنی بیٹی کو دیکھا پھر کہا۔ ''تو میری ایک ہی بیٹی ہے۔ مجھے تجھ پر بھروسا کرنا چاہیے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ باطو اور اس کی فوج کو ٹھکانے لگانے کے بعد میں تیرے عاشق زاؤ دان کو رہا کر دوں گی۔ تیری شادی اس سے ہو گی اور تم دونوں میری نگرانی میں رہا کرو گے۔''

وہ آگے بڑھ کر ماں کے ہاتھ کو تھام کر بولی۔ ''ماما...! تو بہت اچھی ہے۔ تو زاؤ دان کو رہا کر کے مجھے نئی زندگی دے گی۔''

وہ غصہ دکھاتے ہوئے بولی۔ ''تو پھر مجھے ماں کہہ رہی ہے۔ کیا باطو اور سرداروں کے سامنے بھی یہی کہے گی؟ بے وقوف لڑکی وہ تیری جوانی دیکھ کر میری عمر کا اندازہ کریں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی میری عمر کا حساب کرے۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کو پکڑتے ہوئے بولی۔ ''مجھ سے بھول ہو گئی۔ میں آئندہ کبھی تجھے ماما نہیں کہوں گی۔ تنہائی میں بھی نہیں کہوں گی۔''

ملکہ نے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، اب جا یہاں سے۔''

وہ ہنستی گنگناتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ ملکہ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور ناگواری سے دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ ''حکومت وہی کر سکتے ہیں جن کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ میرے سینے میں پتھر ہے۔ بیٹی کی خوشی کی خاطر اس علاقے کے حکمران کو اندھے کنویں سے نکال کر اسے رہائی دے کر اپنے ایک دشمن کا اضافہ نہیں کروں گی۔ ایک نیام میں دو تلواریں اور ایک ملک میں دو بادشاہ کبھی نہیں رہتے۔ اب وہ اس اندھے کنویں میں قیدی بن کر نہیں رہے گا۔ میں خوامخواہ ایک سانپ کو پال رہی ہوں۔ آج رات اس کا کام تمام کر دوں گی۔''

دوسرے دن قلعے کا دروازہ کھول دیا گیا۔ باطو اپنے سرداروں اور سپاہیوں کے ساتھ اندر آ گیا۔ اس کے سپاہی ننگی تلواریں اور نیزے لیے ہوئے آگے آگے اس کے لیے راستہ بنا رہے تھے۔ اس طرح وہ محل میں داخل ہو گیا۔ اس وقت ملکہ بناؤ سنگھار میں مصروف تھی۔ اس نے بیٹی سے کہا۔ مہمان آ گئے ہیں تُو وہاں جا کر ان سے باتیں کر اور ہنس بول کر ان کا دل بہلاتی رہ۔ میں ابھی آتی ہوں۔''

شہزادی اس بڑے سے ہال کمرے میں آئی۔ جہاں ... باطو اپنے سرداروں کے ساتھ آ کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ باطو کے سامنے آ کر بولی۔ ''میں ملکہ کی چھوٹی بہن ہوں۔ وہ ابھی آنے والی ہے۔ کیا تب تک تو مجھ سے بات کرنا پسند کرے گا؟''

اس نے کہا۔ ''تو اتنی حسین ہے کہ کوئی بھی شخص بات کرنا تو کیا تیرے ساتھ پوری زندگی گزارنا چاہے گا۔''

ایک سردار نے کہا۔ ''بے شک، یہ اتنی حسین ہے تو نہ جانے اس کی بڑی بہن اور کتنی حسین ہو گی؟''

شہزادی نے باطو سے کہا۔ ''میں تجھ سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس کے ساتھ چلتا ہوا دوسرے کمرے میں آیا۔ وہاں پہنچتے ہی شہزادی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے تُو کیوں رو رہی ہے؟''

وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ''ملکہ گرجستان میری بڑی بہن نہیں، بلکہ میری ماں ہے۔ اپنی عمر چھپانے کے لیے مجھے اپنی چھوٹی بہن کہتی ہے۔ میں اسے ماں کہتی ہوں تو وہ غصہ کرتی ہے اور مجھے سزا دیتی ہے۔''

وہ اسے تھپکتے ہوئے بولا۔ ''کوئی بات نہیں۔ آنسو پونچھ لے۔ میں اسے حکم دوں گا کہ تو بیٹی ہے تو وہ بیٹی کا ہی رشتہ قائم رکھے اور تجھے ماں کہنے کی اجازت دے۔''

وہ بولی۔ ''بات صرف اتنی سی نہیں ہے۔ دراصل اس گرجستان کا حکمران اس کا بھتیجا زاؤ دان تھا۔ وہ بہت اچھا تھا۔ میں اس سے محبت کرتی تھی لیکن کل رات میری ماں نے اسے قتل کرا دیا۔ وہ ماں نہیں ہے ڈائن ہے۔ اپنی اولاد کی خوشیاں بھی کھا جاتی ہے۔''

یہ کہنے کے بعد وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ باطو نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تیری ماں اپنے عاشقوں کے ساتھ راتیں گزارتی ہے پھر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، وہ تجھے اور تیری پوری فوج کو بھی بڑی چالبازی سے ہلاک کرنے کا منصوبہ بنا چکی ہے۔ ابھی اس منصوبے پر عمل ہونے والا ہے۔ اسی لیے میں تجھ سے تنہائی میں بات کرنے آئی ہوں۔ ابھی یہاں سے جا کر اپنے سرداروں اور سپاہیوں سے کہہ دے کہ کوئی یہاں کی کسی بھی کھانے پینے کی چیز کو ہاتھ نہ

لگائے۔ وہ سب زہریلی ہیں۔''

وہ یہ سن کر چونک گیا۔ وہاں سے جانے لگا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ''میری ایک بات سن لے۔ میری ماں کی اس سازش کو ابھی ظاہر نہ ہونے دے۔ تو کسی دوسری زبان میں سرداروں اور سپاہیوں کو سمجھا دے کہ وہ کھانے پینے سے پرہیز کریں۔''

وہ اسے کھینچ کر اپنے بازوؤں میں جکڑ کر چومتے ہوئے بولا۔ ''تو بہت اچھی ہے۔ میں تجھے یہاں سے لے جاؤں گا۔ آیندہ تو میری عورت بن کر رہے گی۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے سرداروں کے پاس آیا پھر اس نے مغلوں کی قبائلی زبان میں کہا۔ ''یہاں ہمیں ہلاک کرنے کی سازش کی جارہی ہے۔ یہاں تم میں سے کوئی کھانے پینے کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے، تم سب یہاں سے باہر جاؤ اور اپنی فوج کے ایک ایک سپاہی کو یہی بات سمجھا دو، لیکن اسی زبان میں بتانا کہ یہاں کے دشمن سپاہی ہماری باتیں سمجھ نہ سکیں۔''

وہ تمام سردار وہاں سے چلے گئے۔ صرف اس کے چار مسلح محافظ رہ گئے۔ اس نے تھمر سے کہا۔ ''میرے پاس آؤ اور مجھے اپنی ماں کے پاس لے چل۔''

وہ اس کے آگے آگے چلتی ہوئی محل کے مختلف حصوں سے گزرتی ہوئی ایک کمرے میں پہنچی۔ وہاں ملکہ سولہ سنگھار میں مصروف تھی۔ وہ باطو اور چار مسلح سپاہیوں کو دیکھ کر ایک دم سے چونک گئی۔ اپنی بیٹی تھمر کو دیکھ کر بولی۔ ''یہ یہاں کیوں آئے ہیں؟''

باطو نے آگے بڑھ کر ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''تو زہریلی ناگن ہے۔ تیرے ساتھ ایسا بدترین سلوک کیا جائے گا کہ تو رحم کی بھیک مانگتی رہے گی لیکن تجھے بھیک نہیں ملے گی۔''

محل کے باہر تمام سرداروں نے تمام سپاہیوں کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجا دی پھر انہیں حکم دیا۔ ''فوراً دشمن سپاہیوں پر ٹوٹ پڑو۔ ایک ایک کو چُن چُن کر قتل کرو۔ کسی کو زندہ نہ چھوڑو۔''

دشمن غافل تھے۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ بھید کھل چکا ہے۔ سب سے پہلے سپہ سالار کو قتل کیا گیا پھر سپاہیوں کے ساتھ دو بدو لڑائی ہوئی۔ یہ خبر گشت کرائی گئی کہ ملکہ کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ یہ سنتے ہی سپاہیوں نے ہتھیار پھینک دیے۔ ان کی ملکہ گرفتار ہوئی تھی اور سپہ سالار مارا گیا تھا۔ اب وہ کس لیے لڑتے؟ وہ تلوار پھینک کر اپنی جان کی امان چاہنے لگے۔

تھمر دان محل کے باہر باطو کے ساتھ آئی۔ اس نے التجا کی۔ ''یہ میرے ملک کے سپاہی ہیں۔ انہوں نے ہماری بہت خدمت کی ہے۔ ان کو جان کی امان دے۔''

باطو نے انہیں امان دی۔ پھر اپنے سرداروں اور سپاہیوں سے کہا۔ ''ملکہ گرجستان بے شک حسین ہے۔ اس نے پتا نہیں کتنے مردوں کو ہوس کا نشانہ بنا کر موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ تم میں سے جو اسے لوٹ کا مال بنانا چاہتا ہے، وہ اندر جائے اور اس کے حسن و شباب کے چیتھڑے اڑا دے۔ لیکن اسے زندہ رکھے۔''

کتنے ہی بھوکے سردار اندر جا کر اس مغرور ملکہ پر پل پڑے۔ محل کے باہر اس کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ وہ رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ لیکن کسی کو اس پر رحم نہیں آرہا تھا۔ اس لیے رہ رہ کر اس کی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ وہ بے ہوش ہوگئی تو اسے چھوڑ دیا گیا۔ اسے فصیل کی بلندی پر پہنچا کر ہوش میں لایا گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

باطو نے کہا۔ ''چل اُٹھ کر کھڑی ہوجا۔''

وہ سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے کہا۔ ''اب فصیل کے باہر دیکھ۔''

اس نے فصیل کی منڈیر کے پاس آکر نیچے دیکھا۔ تو دور تک آگ کے شعلے لپک رہے تھے۔ وہ ایک دم سے گھبرا کر باطو کو دیکھنے لگی۔

وہ بولا۔ ''تو اپنے حسن و شباب پر بہت غرور کرتی تھی مگر تُو دیکھ رہی ہے کہ میں نے تجھے ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔ میں تجھ پر تھوکتا ہوں۔''

اس نے آخ تھو کہہ کر اس پر تھوک دیا۔ پھر سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے فصیل سے نیچے پھینک دیا جائے۔ وہ رونے اور گڑگڑانے لگی۔ لیکن سپاہیوں نے اسے اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ وہ چیخیں مار کر نیچے جاتی ہوئی آگ کے شعلوں میں گری پھر وہاں سے اٹھنے کے قابل نہ رہی مگر آگ اس طرح جلا رہی تھی کہ وہ اپنی کمزوری بھول کر وہاں سے بھاگنے لگی۔ لیکن وہ جدھر جارہی تھی۔ ادھر سپاہی اسے تیروں سے چھید رہے تھے اور اسے اٹھا کر بار بار آگ میں پھینک رہے تھے۔ مغل سپاہی موت کا ایسا کھیل بڑی دلچسپی سے کھیلتے تھے۔ آخر وہ آگ میں جل کر کوئلہ ہوگئی۔

باطو نے تھمر کو دونوں بازوؤں میں اٹھا کر کہا۔ ''میں نے عہد کیا تھا کہ ایک کے بعد دوسری شادی نہیں کروں گا۔ لیکن تُو نے میرا دل جیت لیا ہے۔ میرا عہد توڑ دیا ہے۔ میں تجھے اپنی شریک حیات بنا کر رکھوں گا۔''

☆☆☆

تقریباً پندرہ برس بعد ایک ماں کو اس کے بیٹے باطو کے پاس واپس بھیجا گیا۔ ان پندرہ برسوں میں تینوں بھائیوں نے اس بیچاری کو اچھی طرح نوچا کھسوٹا تھا۔ وہ بیمار بیماری لگ رہی تھی۔ اس پر بڑھاپا طاری ہوگیا تھا۔ باطو نے اسے سینے سے لگا کر خوب پیار کیا۔ پھر دونوں بازوؤں میں اٹھا کر اپنے محل میں لے آیا۔ وہ بیٹے سے بول رہی تھی مگر شرمندہ تھی۔ جیسی زندگی گزار کر آئی تھی۔ اسے یاد کر کے رو رہی تھی۔ اس سے آنکھیں نہیں ملا رہی تھی۔

باطو نے سر جھکا کر کہا۔ ''مغل خاندان سے نہ میرا لہو کا رشتہ ہے نہ تیرا ہے۔ انہوں نے تیرا لہو نچوڑ لیا ہے اور میں ان کے خلاف کچھ کر نہیں پا رہا ہوں۔ مجھے بہت غصہ آرہا ہے۔''

وہ بولی۔ ''غصہ تھوک دے۔ اب کسی سے انتقام لینے کا وقت گزر چکا ہے۔ اوغدائی اور تولوئی مر چکے ہیں۔ چغتائی اگر چہ زندہ ہے۔ لیکن بہت بوڑھا اور کمزور ہو چکا ہے۔ پھر یہ کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں مجھ پر مہربان ہوتا رہا تھا۔ تورا کینہ اور اس کی بہو اوغول غائمش مجھ سے بہت برا سلوک کرتی تھیں۔ اپنے گندے اور ناپاک کپڑے دھلواتی تھیں۔ انہوں نے مجھے بھنگن بنا رکھا تھا۔ جب چغتائی کو معلوم ہوا تو وہ مجھے وہاں سے لے گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میری خواہش کیا ہے؟ میں نے کہا۔ ''میں اپنے بیٹے باطو کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ ایسے ہی وقت تُو نے اس سے میرا مطالبہ کیا تو اس نے فوراً مجھے یہاں بھیج دیا۔''

وہ بولا۔ ''سب ہی خود غرض اور مطلب پرست ہیں۔ اس نے تجھے یوں ہی میرے پاس نہیں بھیجا ہے۔ پہلے اپنی شرط منوائی ہے کہ ہم قویوق کے خان اعظم بننے پر اعتراض نہیں کریں گے۔ میں تھوکتا ہوں اس پر اور اس کے اعلیٰ عہدے پر۔ مجھے میری ماں مل گئی مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔''

اس نے شہنا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ''یہ سن کر غصہ آرہا ہے کہ تورا کینہ اور اس کی بہو نے تیرے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔ تجھے بھنگن بنا کر رکھا۔ جادوانی آسمان کی قسم میں بہت مشکل سے غصہ برداشت کر رہا ہوں۔ یہ اندازہ لگا رہا ہوں کہ قویوق زیادہ عرصے خان اعظم بن کر نہیں رہ پائے گا۔ میں مناسب وقت دیکھ کر بغاوت کروں گا۔ وہ میری سرکوبی کے لیے ادھر آئے گا تو پھر واپس نہیں جا سکے گا۔ اس کے بعد میں تورا کینہ اور اوغول غائمش سے تیرا بدلہ ضرور لوں گا۔''

اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس نے چنگیز خاں کے بیٹوں اور پوتوں کے ذریعے بڑی ذلتیں اٹھائی تھیں۔ وہ اسے حرام زادہ کہتے تھے۔ ایسے ہوس پرست تھے کہ انہوں نے اس کی ماں کو ایک بہت بڑی گالی بنا دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ سیورقوقطتی کے تعاون سے اپنی ذلتوں کا بدلہ لے سکے گا۔

اوغدائی اور تورا کینہ کے بیٹے قویوق کو خان اعظم بنانے کے لیے قرولتائی منعقد کی گئی۔ اس تقریب میں سیورقوقطتی حاضر ہوئی۔ لیکن باطو نہیں آیا۔ چغتائی نے قویوق کو سمجھایا کہ اس کے نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تیرے جو بھی مخالفین ہیں، انہیں تجھ سے دور رہنا چاہیے۔

تورا کینہ نے کہا۔ ''سیورقوقطتی مخالفت کے باوجود یہاں آئی ہوئی ہے۔ میں سمجھ رہی تھی وہ میرے بیٹے کی مخالفت کرے گی۔ لیکن وہ بالکل چپ ہے اور ہم میں سے کسی کی مخالفت میں کچھ نہیں بول رہی ہے۔''

چغتائی نے کہا۔ ''یہ اچھا ہی ہے، کسی بحث یا تکرار کے بغیر تیرا بیٹا خان اعظم بن رہا ہے۔''

قویوق ہمیشہ بیمار رہا کرتا تھا۔ جسمانی طور سے اس حد تک کمزور تھا کہ صبح سے شام تک گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ میدان جنگ میں اپنی فوج کے پیچھے رہ کر چیخ چیخ کر احکامات صادر کرتا تھا۔ اس کی قوت فیصلہ بہت کمزور تھی۔ وہ اپنے معتمد خاص کے مشوروں پر عمل کیا کرتا تھا۔ سونے پر سہاگا یہ کہ شام سے صبح تک شراب پیتا رہتا تھا اور حسین عورتوں کی آغوش میں لوٹ پوٹ کر راتیں گزار دیتا تھا۔ ایسی حرکتوں سے اس کی بیماری بڑھتی جا رہی تھی مگر وہ عیاشیوں سے باز نہیں آتا تھا۔

اسے اکثر مالیخولیا ہو جاتا تھا۔ وہ نیم پاگل سا ہو کر اپنے آنجہانی باپ اوغدائی کے خلاف بولتا تھا کہ اس نے کبھی اسے اہمیت نہیں دی۔ اس کے بجائے اس کے بیٹے یعنی اپنے پوتے شیرامُون کو خان اعظم کے لیے نامزد کیا تھا۔

تورا کینہ اپنے بیمار بیٹے کی غفلت اور بے پروائی کے باعث خود ہی سارے انتظامات سنبھالتی تھی اور اہم احکامات صادر کیا کرتی تھی۔ ایک ایرانی کنیز تورا کینہ کی بہت راز دار خادمہ تھی۔ جن دنوں وہ تینوں بڑی محبت اور اتحاد سے رہتے تھے۔ ان دنوں وہ کنیز ان کے خیموں میں جایا کرتی تھی اور ان کی بیویوں اور کنیزوں کے بھید لایا کرتی تھی۔ اس نے تورا کینہ کو سیورقوقطتی کے خلاف خوب بھڑکایا تھا۔

وہ کنیز ایسی سرچڑھی تھی کہ کبھی کبھی تورا کینہ کی اجازت کے بغیر اپنے مطالبات منوا لیتی تھی۔ تورا کینہ اس کی اس حرکت سے ناراض نہیں ہوتی تھی۔ مسکرا کر ٹال دیتی تھی۔ وہ اسے ایک کنیز سے زیادہ سہیلی بنا کر اپنے ساتھ رکھتی تھی۔

قویق کے معتمد خاص نے کہا۔ ''اے خاقان! تیری ماں تورا کینہ آج بھی اس قبیلے کی ملکہ بنی ہوئی ہے۔ تیری لاعلمی میں اہم احکامات صادر کرتی رہتی ہے۔ اگر یہی ہوتا رہا تو تیرا رعب و دبدبہ قائم نہیں ہوگا۔ تُو ذرا آنکھیں کھول کر دیکھ۔ پوری مغل قوم تجھ سے زیادہ تیری ماں سے مرعوب رہتی ہے۔''

تورا کینہ اپنے جن احکامات پر خاقان کی مہر لگاتی تھی۔ قویق نے وہ مہر اُس سے لے لی۔ سختی سے کہا۔ ''آیندہ تُو کوئی حکم صادر نہیں کرے گی۔''

وہ غصے سے بولی۔ ''تو اپنے تمام فرائض کی ادائیگی نہیں کرپاتا۔ رات بھر شراب اور شباب میں ڈوبا رہتا ہے اور دن کو سوتا رہتا ہے۔ ان حالات میں تجھے اپنی ماں پر بھروسا کرنا چاہیے۔''

وہ بولا۔ ''میں نے شراب کم کردی ہے۔ کبھی کبھی کسی منتخب حسینہ سے دل بہلاؤں گا مگر حکومتی معاملات سے خود ہی نمٹا کروں گا۔''

اس کے بعد وہ اپنی ذمے داریاں نبھانے لگا۔ معتمد خاص نے کہا۔ ''وہ ایرانی کنیز تیری ماں پر بہت اثر انداز ہو چکی ہے۔ اسے تیرے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ اگر اسے اور زیادہ سر چڑھایا گیا تو تیری ماں کی پشت پر رہ کر حکومت کرتی رہے گی۔ وہ کم بخت شامانوں سے ملی رہتی ہے۔ یقیناً تجھ پر اور تیری ماں پر جادو کراتی ہے۔''

قویق نے حکم دیا کہ اس کنیز کو اس کی ماں کے خیمے سے گرفتار کرکے لایا جائے۔

جب سپاہی اسے گرفتار کرنے پہنچے تو تورا کینہ اور اوغول غائمش اعتراض کرنے لگیں۔ اوغول نے قویق کے پاس آکر پوچھا۔ ''یہ تجھے کیا ہوگیا ہے؟ پہلے تُو نے ماں کے خلاف اقدامات کیے۔ اب اس کی کنیز کو گرفتار کررہا ہے۔ وہ بہت ہی خدمت گزار خادمہ ہے۔ تیری ماں کو بہت آرام پہنچاتی ہے۔ تُو اسے کوئی تکلیف نہ پہنچا۔''

سپاہی اپنے خاقان کے حکم سے مجبور تھے۔ وہ ملکہ کے خیمے سے کنیز کو پکڑ کر لے آئے۔ قویق نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''اوغول! تُو نہیں جانتی' یہ درپردہ مجھ پر اور میری ماں پر جادو کراتی رہتی ہے۔ ابھی اس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔''

حقیقت معلوم کرنے کے لیے شامانوں کو بلایا گیا۔ ایک شامان نے کہا۔ ''اسے ننگا کیا جائے۔ کیونکہ جادو لباس کے اندر چھپا ہوسکتا ہے۔''

اس کنیز کو سب کے سامنے برہنہ کیا گیا پھر سپاہیوں کو حکم دیا گیا کہ اس کی پٹائی کریں اور اس سے اقرار کرائیں کہ یہ خود جادو کرتی ہے یا کسی سے کراتی ہے؟

اس کنیز نے کبھی یہ کام نہیں کیا تھا۔ وہ انکار کرنے لگی مگر اس قدر پٹائی ہوئی کہ وہ بوکھلا کر اعتراف کرنے لگی۔ ''ہاں میں جادو کرتی ہوں... ہاں میں چڑیل ہوں۔ میں سب کو کھا جانا چاہتی ہوں۔ مجھے معاف کردے۔ مجھے آزاد کر دے۔ میں یہاں سے دور چلی جاؤں گی۔''

قویق نے شامانوں سے پوچھا۔ ''مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

ایک شامان نے کہا۔ ''اسے آزاد نہ کیا جائے۔ یہ کہیں بھی جائے گی تو واپس چلی آئے گی۔''

ایک اور شامان نے کہا۔ ''اسے مار ڈالا جائے لیکن مرتے ہی اس کے اندر کی چڑیل باہر نکل آئے گی اور سب کو نقصان پہنچائے گی۔''

قویق نے پوچھا۔ ''پھر کیا کیا جائے؟''

ایک اور شامان نے کہا۔ ''اس کے جسم کے جتنے سوراخ ہیں انہیں بند کردیا جائے۔ پھر اسے ہلاک کیا جائے۔ اس طرح چڑیل باہر نہیں نکل پائے گی۔''

شامانوں کے حکم کے مطابق چربی پگھلا کر کنیز کے دونوں کانوں میں ڈالی گئی۔ وہ برہنہ زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ تکلیف کی شدت سے چیختے ہوئے پھڑ پھڑانے لگی۔ سردی کا موسم تھا۔ باہر برف باری ہورہی تھی۔ پگھلائی ہوئی چربی فوراً ہی جم جاتی تھی۔ اس کے دونوں کان بند ہو گئے۔ اس کے اندر کی چڑیل ان کانوں سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔

پھر چربی کو پگھلا کر اس کے ناک کے دونوں نتھنوں میں ڈالا گیا تو اس کا دم ہی نکل گیا پھر بھی اسے بخشا نہیں گیا۔ اس کے جسم کے تمام سوراخوں کو بند کردیا گیا پھر اسے ندی کنارے لاکر اس کے ساتھ بھاری بھرکم پتھر باندھ کر اسے پانی میں ڈبو دیا گیا۔ وہ سب وہاں کھڑے رہے۔ جب یقین ہوگیا کہ وہ چڑیل گہرائی میں پہنچ گئی ہے اور وہاں سے ابھر کر باہر نہیں آسکے گی تو وہ مطمئن ہوکر واپس آگئے۔

تورا کینہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر رہ گئی۔ اس کی رازدار سہیلی جیسی خادمہ کو بڑی بے رحمی سے ہلاک کرکے ندی میں ڈبو دیا گیا تھا۔ وہ کس سے فریاد کرتی؟ اسے پہلی بار پتا چلا کہ وہ اپنے بیٹے کو خان اعظم بنا کر خود بے دست و پا ہوگئی ہے۔ اس نے اپنی بہو سے کہا۔ ''اوغول! تُو اس کی بیوی

ہے۔ کیا اپنے شوہر کو تابو میں نہیں کر سکتی؟ کیا تو نے نہیں دیکھا تھا کہ جب تک اوغدائی زندہ رہا' میں کس طرح اسے لگام دیتی رہی....؟''

بھونے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا میں کس طرح سے اسے لگام دوں؟ کس طرح اپنی طرف کھینچ کر رکھوں؟''

تو راکینہ نے کہا۔ ''وہ باطو سے سخت نفرت کرتا ہے۔ تُو اس کا دھیان ادھر موڑ دے۔ وہ اس سے نمٹنے میں مصروف رہے گا۔ اس کی عدم موجودگی میں ہم یہاں اپنی من مانی کر سکیں گی۔''

اوغول غائمش نے ایک رات اس سے کہا۔ ''تُو خوا مخواہ اپنوں کا دشمن بن رہا ہے۔ ماں کے خلاف تُو نے کیسے اقدامات کیے؟ پھر اس کی خدمت گزار کنیز کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لیکن جو تیرے اصلی دشمن ہیں۔ انہیں نظر انداز کر رہا ہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''کس دشمن کی بات کر رہی ہے؟''

''میں باطو خان کی بات کر رہی ہوں۔ تُو نے قرولتائی طلب کی۔ وہ اس میں حاضر نہیں ہوا۔ کیا تجھے اپنے دادا چنگیز خاں کا قول یاد نہیں ہے کہ جو ہماری قرولتائی میں حاضر نہ ہو' ہماری حکم عدولی کرے۔ اسے ایک بھاری پتھر کی طرح ندی میں گرا دینا چاہیے۔ تاکہ وہ پتھر پھر کبھی باہر نہ آ سکے۔''

تو یوق سوچتی ہوئی نظروں سے اپنی بیوی کو دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ''کیا تجھے یاد نہیں ہے کہ باطو کا باپ جوجی جب تیرے دادا خان بابا کی قرولتائی میں حاضر نہیں ہوا تھا تو اس نے اپنے تینوں بیٹوں چغتائی' اوغدائی اور تولوئی کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا تھا۔ کیا تو مغل نہیں ہے؟ اپنے دادا چنگیز خاں کا پوتا نہیں ہے؟ باطو نے تیری حکم عدولی کی ہے۔ بغاوت کی ہے۔ پھر تُو اسے سزا کیوں نہیں دے رہا ہے؟''

وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ ''میں تو اس کا سر کچلنے کے لیے کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا ہوں مگر کیا کروں؟ چغتائی نے کہا تھا کہ قرولتائی میں باطو کی غیر موجودگی کو نظر انداز کر۔ اگر وہ یہاں آتا تو سیورقوقتنی اس کے کاندھے پر سوار ہو کر میرے خلاف بولنا شروع کر دیتی۔''

اوغول نے کہا۔ ''اب تو مخالفت والی کوئی بات نہیں رہی۔ تُو خان اعظم بن چکا ہے۔ باطو قرولتائی میں حاضر نہیں ہوا تھا۔ تُو اس پر بغاوت کا الزام لگا کر اس کا سر کچل سکتا ہے۔''

عورت اگرچہ مجبور' بے بس اور کمزور ہوتی ہے لیکن اس کے اندر چالاک بھی ہوتی ہے کہ ذرا سا بھی موقع ملتا ہے تو مرد کی لگام ہاتھ میں لے کر اسے اپنی مرضی کے مطابق اِدھر سے اُدھر موڑ دیتی ہے۔

اس نے تو یوق کو موڑ دیا۔ وہ سپہ سالار اعظم سوبودائی کو بلا کر بولا۔ ''باطو قرولتائی میں حاضر نہیں ہوا تھا۔ اس نے سراسر باغیانہ روش اختیار کی تھی۔ اسے سزا دینا ہمارا فرض ہے۔ تُو تمام سپاہیوں کو حکم دے کہ ابھی ہتھیاروں سے لیس ہو کر گھوڑوں کی پیٹھ پر آ جائیں۔ ہم اس کا سر کچل دیں گے تو ہمارے مغل خاندان میں کوئی حرام زادہ نہیں رہے گا۔''

سوبودائی نے باطو کو شانہ بہ شانہ رکھ کر بے شمار جنگیں لڑی تھیں۔ وہ اسے بہت پسند کرتا تھا۔ کبھی اس کے خلاف لشکر کشی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور موجودہ خان اعظم کے حکم سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے کہا۔ ''اے خاقان! اب میں ستر برس کا ہوں۔ میرے جسم میں پہلے جیسی توانائی نہیں رہی۔ اب میں صبح سے شام تک گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھنے کے قابل نہیں رہا۔ میں اس جنگ میں حصہ نہیں لے سکوں گا۔ بہتر ہے کہ تُو ہی تمام فوج کی کمان سنبھال لے۔''

اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، ہم تیرے فرائض سے تجھے سبکدوش کرتے ہیں۔ اس مغرور باغی سے نمٹنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ وہ ابھی ہمارے ارادوں سے غافل ہے۔ ہم اچانک ہی اس پر حملہ کریں گے تو زیادہ خون ریزی نہیں ہوگی اور وہ حرام موت مارا جائے گا۔''

سپہ سالار اعظم سوبودائی وہاں سے چلا آیا۔ اس عظیم سپہ سالار کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے پینسٹھ معرکوں میں فتح حاصل کی تھی اور بیس قوموں کو زیر کیا تھا۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پوری مغل فوج اس کے آگے سر جھکاتی تھی اور وہ ہر علاقے کی فوج کا سردار تھا۔ وہ ایسا تجربہ کار جنگ باز سپہ سالار تھا کہ جس نے میدان جنگ میں کبھی کوئی غلطی نہیں کی۔ کبھی کوئی کمزوری نہیں دکھائی۔

باطو نے اس کے زیر سایہ رہ کر کئی جنگوں میں نمایاں کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ وہ باطو کو پسند کرتا تھا۔ اسے دل سے چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ایک رازدار ایلچی کے ذریعے خبر بھیج دی۔ ''باطو! تجھے ہوشیار رہنا چاہیے۔ تو یوق ایک بھاری لشکر کے ساتھ تجھے ہلاک کرنے کے ارادے سے آ رہا ہے۔''

چغتائی کے بیٹے بوری اور بائی دار اپنی اپنی فوجیں لے کر تو یوق کے لشکر میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کے لاکھوں مسلح گھڑ سوار قطار در قطار چلے جا رہے تھے۔ ہزاروں اونٹوں پر اناج اور طرح طرح کے ہتھیار لدے ہوئے تھے۔ صحرائے

گوبی میں آندھی کی ریت سے بچنے کے لیے انہوں نے منہ پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔ گھوڑوں کی زینوں کے اطراف بڑے بڑے نقارے بندھے ہوئے تھے۔ نقارچی انہیں زور زور سے بجاتے جارہے تھے۔ چھوٹے بڑے ٹیلوں پر سے سنسناتی ہوئی طوفانی ہوائیں شور مچاتی گزر رہی تھیں۔ ان سے بھی اونچی آواز میں نقارے شور مچا رہے تھے۔ چھکڑوں پر خیمقیمیں تھیں اور سمور کے خیمے بندھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک خیمے میں قویوق بیمار پڑا ہوا تھا۔ کتنے ہی طبیب اور شامان اس کا علاج کررہے تھے۔

سیورقوقطنی کے چار بیٹے تھے منگو' قبلائی' ہلاکو اور اریق بوغا.... ان میں سے منگو اور قبلائی اپنی اپنی فوجیں لے کر باطو کے لشکر میں شامل ہوگئے تھے۔ ان تینوں کا متحدہ اور مشترکہ لشکر نیلی اور زرد جھیلوں کے پاس سے گزر رہا تھا۔ قویوق مشرق سے مغرب کی طرف آرہا تھا اور باطو مغرب سے مشرق کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مغل قبیلے کے جنگجو افراد پہلی بار ایک دوسرے کے خلاف تلواریں تولنے کے لیے نکل پڑے تھے۔

قویوق کا لشکر شاہینوں کی جھیل کے پاس آکر ٹھہر گیا۔ باطو کا لشکر جھیل کے اس پار دریائے نیمل کے کنارے آکر ٹھہر گیا۔ دشمن کی پیش قدمی کا انتظار کرنے لگا۔ باطو نے جہاں قیام کیا تھا' وہاں سے اس نے منگو اور قبلائی کی فوجوں کو اپنے دائیں بائیں بہت دور بھیج دیا تھا۔ وہ دو فوجیں برفانی دھند میں چھپی ہوئی تھیں۔ جنگی منصوبہ یہ تھا کہ قویوق کا لشکر جب آگے بڑھے گا تو منگو اور قبلائی دائیں بائیں سے آکر ان پر اچانک حملہ کریں گے۔

دوسرے دن شاہینوں کے جھیل کے پاس سے ایک گھڑ سوار آتا دکھائی دیا۔ اس کا منہ اور جسم اونی کپڑوں میں چھپا ہوا تھا۔ وہ تیز ہواؤں کو چیرتا ہوا گھوڑا دوڑاتا ہوا چلا آرہا تھا۔ جب قریب آیا تو اس کے ایک ہاتھ میں حکم نامے کی طلائی لوح نظر آئی۔ وہ باطو کے سامنے پہنچ کر گھوڑے سے اتر کر دو زانو ہوگیا۔ باطو نے پوچھا۔ ''کیا پیغام لایا ہے؟''

وہ سر جھکا کر اس طلائی لوح کو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''خان اعظم قویوق بیمار تھا' وہ مر چکا ہے۔''

باطو نے خوش ہوکر ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''خس کم۔ جہاں پاک...''

پھر اس نے منشی سے کہا۔ ''اس طلائی لوح کو پڑھ کر سنا۔''

قویوق کے لشکر کے ساتھ تورا کینہ' اوغول غائمش اور چغتائی کے بیٹے بوری اور بائی دار کی بیویاں اور کنیزیں بھی آئی ہوئی تھیں۔ تورا کینہ نے اس طلائی لوح پر لکھا تھا۔ ''میرا بیٹا مر چکا ہے۔ میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے۔ بادشاہ کے بغیر جنگ نہیں لڑی جاتی۔ لہٰذا ہم واپس جارہے ہیں اور تجھ سے کہہ رہے ہیں کہ ہمارا پیچھا نہ کرنا۔ ہمیں چالیس دن تک ماتم کر لینے دے۔''

باطو نے جواباً لکھ بھیجا۔ ''اے چڑیل تورا کینہ! اگر تو زندہ رہی تو ساری عمر ماتم کرتی رہے گی۔ تُو نے اور تیری بہو نے میری ماں پر جو مظالم ڈھائے ہیں اور جیسی اس کی تذلیل کی ہے' اس کے پیش نظر کہتا ہوں کہ اوغدائی اور قویوق کی بیویوں کی عمر کم ہوچکی ہے پھر بھی چالیس دن تک ماتم کرلے اور قراقرم سے تمام بڑے بڑے سرداروں کو یہاں طلب کر۔ قرولتائی منعقد کرکے خان اعظم کا انتخاب کر۔''

تورا کینہ نے اس کا جواب پڑھ کر غصے سے کہا۔ ''یہ تو ایسی باتیں کررہا ہے' جیسے خان اعظم بن چکا ہے اور ہمیں اپنا محکوم سمجھ رہا ہے؟''

اس کی بہو نے کہا۔ ''منگو اور قبلائی کی فوجیں اس کے لشکر سے آملی ہیں۔ وہ سمجھتا ہے' ہم سے زیادہ فوجی قوت کا مالک بن چکا ہے۔''

تورا کینہ نے کہا۔ ''ہمارا سپہ سالار اعظم سوبودائی یہاں آئے گا تو وہ اس کے آگے گھٹنے ٹیک دے گا۔ میں ابھی قاصد کو بھیج کر سوبودائی کو بلاؤں گی۔''

اس نے اسی وقت ایک ایلچی کو سوبودائی کی طرف روانہ کردیا۔ پھر باطو کو لکھ بھیجا۔ ''تُو کیا سمجھتا ہے' میرے ایک بیٹے کے مرنے سے پوری مغل قوم تیرے آگے گھٹنے ٹیک دے گی؟ ہمارے لشکر کی سرداری اور سپہ سالاری کے لیے چغتائی کے بیٹے موجود ہیں پھر سپہ سالار اعظم سوبودائی یہاں پہنچنے والا ہے۔ تُو اس کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوجائے گا۔''

اور تو یہ کیا کہتا ہے کہ قرولتائی یہاں منعقد ہوگی؟ ہرگز نہیں.... آباواجداد کے زمانے سے قراقرم کی چراگاہوں میں قرولتائی منعقد ہوتی آئی ہے اور وہیں خان اعظم کا انتخاب ہوتا رہا ہے۔ اس بار بھی دستور کے مطابق یہی ہوگا۔

ارے او حرام زادے کی اولاد...! اس خیال میں نہ رہ کہ چغتائی کے بعد پورے مغل خاندان میں تو ہی بزرگ ہے اور چنگیز خان کے تمام پوتوں کا آقا ہے۔ اس کے باوجود مغل خاندان کا کوئی سردار ایک حرام کی اولاد کو اپنا خان اعظم تسلیم نہیں کرے گا۔ تُو خاقان بننے کا خواب اپنے ذہن سے نکال دے۔

ہم نے قویق کی لاش کو برف میں دبا کر رکھا ہے۔ اس کے باپ اوغدائی کی وصیت کے مطابق ہمارے پوتے شیرا مُون کو خان اعظم بنایا جائے گا۔ اس کے بعد قویق کی تدفین ہوگی۔''

پیغام رسانی کے ذریعے کئی دنوں تک ان دونوں کے درمیان باتیں ہوتی رہیں اور قراقرم سے بڑے بڑے سردار وہاں پہنچتے رہے۔ سیورقوقطتی بھی باطو کے پاس آ گئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''جھیل کے اس پار تمام بڑے سردار آ گئے ہیں۔ جہاں قرولتائی منعقد ہوگی اور خان اعظم کے سلسلے میں فیصلہ کیا جائے گا۔''

اوغول نے کہا۔ ''میں خان اعظم کی بیوہ ہوں۔ دستور کے مطابق جب تک خان اعظم کا انتخاب نہ ہو' میں پورے مغل قبیلے کی ملکہ ہوں۔ میرا حکم ہے کہ قرولتائی یہاں نہیں۔ قراقرم کی چراگاہوں میں منعقد ہوگی۔''

سیورقوقطتی نے کہلا بھیجا۔ ''جب یہاں سے واپس جا سکے گی۔ تب ہی اپنا حکم منوا سکے گی۔ ملکہ بننے والی بے وقوف عورت! تُو باطو اور میرے بیٹے منگو اور قبلائی کو نادان سمجھتی ہے۔ جب مردہ خاقان کا لشکر واپسی کے لیے مڑے گا' تب پتا چلے گا کہ تم سب کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ آیندہ تیرے لشکر تک سامان رسد بھی پہنچ نہیں پائے گا۔ جتنا اناج ہے۔ اتنا اپنے سپاہیوں کو کھلاتی رہ۔ اس کے بعد بھوکوں مرنے کی نوبت آئے گی۔ کوئی بھی سردار تیرا حکم مان کر بھوکا مرنا نہیں چاہے گا۔ اپنے موجودہ حالات کو سمجھ۔ تیرے تمام حمایتی تیرا ساتھ چھوڑنے والے ہیں۔''

اوغول اور تورا کینہ نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر انہوں نے صحیح حالات معلوم کرنے کے لیے اپنے جاسوس دوڑائے۔ انہوں نے چند گھنٹوں میں واپس آ کر کہا۔ ''ہماری واپسی کے راستے پر ایک لشکر جرّار موجود ہے۔ انہوں نے ہمیں آگے بڑھنے سے روک دیا ہے اور یہ کہلا بھیجا ہے کہ وہ سامان رسد کا ایک تنکا بھی ہم تک پہنچنے نہیں دیں گے۔''

یہ سن کر تمام سرداروں نے کہا۔ ''ہماری سلامتی اسی میں ہے کہ قرولتائی یہاں منعقد کی جائے۔''

تورا کینہ نے کہا۔ ''وہ تم سب کو اپنے دباؤ میں رکھ کر اپنی مرضی چلائیں گے اور سیورقوقطتی اپنے بیٹے منگو کو خان اعظم بنانے کی ضد کرے گی۔''

مغل قبیلے کے سب سے بزرگ سردار الجی دائی نویان نے کہا۔ ''اے تورا کینہ.....! دیکھا جائے تو تُو نے اوغدائی کی وصیت کے خلاف اپنے بیٹے کو خان اعظم بنایا تھا۔ جبکہ اوغدائی اپنے پوتے شیرا مُون کو خان اعظم کے لیے نامزد کر چکا تھا۔ تیری اس چالبازی کے باعث سیورقوقطتی اور باطو باغی ہو گئے۔''

وہ بولی۔ ''تجھ جیسے بزرگ کو یہ بھی کہنا چاہیے کہ مغل خاندان کے خلاف بغاوت کرنا بہت بڑا جرم ہے اور وہ یہ جرم کر رہے ہیں۔''

''ایسا جرم کرنے میں تیرے بیٹے نے پہل کی ہے۔ وہ مغل خاندان کے باطو' منگو اور قبلائی پر لشکر کشی کرنے کے لیے یہاں آیا تھا۔ تُو اور تیرا بیٹا غلطیاں کرنے میں جب بھی پہل کرتے ہیں تب ہی یہ لوگ بغاوت پر مجبور ہو جاتے ہیں۔''

''تم سب اس کی حمایت میں بولتے جا رہے ہو۔ کیا ہمارا ساتھ چھوڑنا چاہتے ہو؟''

ایک سردار نے کہا۔ ''ہم نے قسم کھائی تھی کہ جب تک اوغدائی کے خاندان میں گوشت کا ایک لوتھڑا بھی باقی رہے گا۔ ہم اس کی اطاعت کرتے رہیں گے۔''

اوغول نے کہا۔ ''تو پھر اس کا پوتا یعنی میرا بیٹا شیرا مُون ابھی باقی ہے۔ اس کی اطاعت کرو۔''

''وہ ابھی بچہ ہے۔ خان اعظم کی ذمے داریاں سنبھال نہیں پائے گا۔''

تورا کینہ اور اوغول نے مایوسی سے ان سرداروں کو دیکھا پھر پوچھا۔ ''کیا تم سب اس حرام زادے کے بیٹے باطو کو خان اعظم بنانا چاہتے ہو؟''

تمام سرداروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سردار الجی دائی نویان نے کہا۔ ''باطو کو نہیں، ہم منگو خان کو اپنا خان اعظم بنائیں گے۔''

جب یہ خبر سیورقوقطتی تک پہنچی تو وہ خوشی سے لہرا گئی۔ اس نے یہ الفاظ سننے اور اس مبارک وقت کا انتظار کرنے کے لیے اٹھارہ سال گزار دیے تھے۔ سیاست کی بساط پر باطو خان کو اپنا سب سے طاقتور مہرہ بنایا تھا۔ بڑے صبر و تحمل سے آہستہ آہستہ چالیں چلتی رہی تھی۔ اپنے بیٹے منگو اور باطو کے درمیان ایسی محبت' اعتماد اور دوستی پیدا کی تھی کہ وہ سگے بھائیوں سے بڑھ کر ایک دوسرے کے کام آتے رہتے تھے۔ یورت کے اندر رہنے والی ایک عورت کی حکمت عملی نے اپنے بیٹے منگو کو خان اعظم بنا دیا تھا۔

جب قرولتائی منعقد ہوئی اور تمام سرداروں اور مغل خاندانوں نے منگو خان کو اپنا خان اعظم تسلیم کر لیا تو منگو نے باطو کو گلے لگا کر کہا۔ ''میرے بھائی! بول تُو کیا چاہتا ہے؟ میرا

پورا خاندان تجھ پر قربان۔ تُو جو چاہے گا وہی ہوگا' جو بولے گا' اسے میں خان اعظم کا حکم بنا کر پورے قبیلے میں جاری کردوں گا۔''

باطو نے اس سے الگ ہو کر اپنی ماں شینا کو دیکھا پھر کہا۔ ''فی الحال تو میں تجھ سے تورا کینہ اور اوغول غائمش کا مطالبہ کرتا ہوں۔ انہیں میرے حوالے کردے۔''

اس نے فوراً ہی اس کا مطالبہ پورا کردیا۔ اس کے حکم کے مطابق تورا کینہ اور اوغول کو اس کے خیمے میں بھیج دیا گیا۔ وہاں سیورقوقطنی اور شینا موجود تھیں۔ شینا نے ان دونوں کو دیکھتے ہی ان کی طرف تھوک دیا پھر اس نے باطو سے کہا۔ ''بیٹے! میں انہیں دیکھتی ہوں تو دل کو بہت صدمہ پہنچتا ہے۔ سوچتی ہوں' ہم عورتیں کیا ہوتی ہیں؟ اپنی ہی جیسی عورتوں پر ظلم کی انتہا کردیتی ہیں۔ میں ان دونوں کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ یہاں سے جارہی ہوں مگر انہیں زندہ نہ چھوڑنا۔''

وہ وہاں سے چلی گئی۔ سیورقوقطنی نے تورا کینہ کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے درمیان اٹھارہ برس سے اقتدار کی جنگ جاری رہی۔ تُو کبھی خان اعظم اوغدائی کی بیوی بن کر حکومت کرتی رہی' کبھی اپنے بیٹے قویوق کو خان اعظم بنا کر مجھے ذلیل اور کم تر بناتی رہی۔ تُو نے اقتدار قائم رکھنے کے لیے مجھے قویوق کی بیوی بنا کر اپنے زیر اثر رکھنا چاہا تھا۔ لیکن میں نے تیری اس پیشکش پر تھوک دیا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر اعتماد تھا کہ دھیرے دھیرے ہی سہی لیکن ایک دن اقتدار کی جنگ تجھ سے جیت ہی لوں گی۔''

وہ بول رہی تھی۔ ایسے وقت تورا کینہ نے اپنے گریبان سے ایک ڈبیا نکالی پھر اسے کھول کر اپنے منہ سے لگا لیا۔ اس میں ایک زہر یلا رقیق مادہ تھا۔ جو اس کے حلق سے اترتا چلا گیا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے بڑی اذیتیں دے کر ہلاک کیا جائے گا۔ اس سے پہلے ہی اس نے زہر پی کر جان دے دی۔

دنیا کے تمام مؤرخین یہی لکھتے آئے ہیں کہ کس طرح سپہ سالار' بادشاہ اور سردار اپنی قوت بازو سے تلواروں کے جوہر دکھا کر' گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھ کر حکومت کرتے رہے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت کہیں کہیں لکھی گئی ہے کہ ان کی عورتیں کس طرح اپنے مردوں کے اعصاب پر سوار ہو کر اقتدار کی جنگ لڑتی رہی ہیں اور اپنے شوہروں' بیٹوں اور بھائیوں کو بادشاہ بناتی آئی ہیں؟

اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ایک عام شخص کی بیوی بھی اپنے مرد کو اپنے گھر کو صرف اپنے لیے مختص کرنا چاہتی ہے اور اپنے میاں کی برتری قائم رکھنے کے لیے دوسرے رشتے داروں سے لڑتی رہتی ہے۔ دنیا کے ہر ملک' ہر شہر اور ہر گھر میں گونگی بن کر رہنے والی عورت اندر سے بہت متحرک اور فعال ہوتی ہے۔

باطو نے حکم دیا کہ شینا کو سمور کی کھال میں لپیٹ کر باندھ دیا جائے۔ جب اس کے حکم کی تعمیل کی گئی تو اس نے کہا۔ ''ہمارے جد امجد چنگیز خاں نے کہا تھا کہ ایک مغل کو دوسرے مغل کا خون نہیں بہانا چاہیے۔ لہٰذا اس عورت کو ہلاک کرو اور خون نہ بہنے دو۔''

دو سپاہی بڑے بڑے آہنی ہتھوڑے لے آئے پھر ان ہتھوڑوں سے اس پر ایسی ضربیں لگائیں کہ ہڈیاں پسلیاں ٹوٹنے لگیں۔ اس کے حلق سے شروع میں چیخیں نکلیں پھر وہ چیخنے کے قابل بھی نہ رہی۔ سزا دینے والوں کو جب یقین ہو گیا کہ اس کی ہڈیوں کا سرمہ بنا دیا گیا ہے تو اسے اٹھا کر دریا میں پھینک دیا گیا۔

منگو خان اور قبلائی خان نے باہر آکر چغتائی کے بیٹے بوری اور بائی دار کو قتل کردیا۔ اس طرح چغتائی اور اوغدائی کا پورا خاندان اپنی آئندہ نسل کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ قویوق کا ایک بیٹا شیرامون باقی رہ گیا تھا۔ قبلائی خان نے کہا۔ ''یہ بہت پیارا بچہ ہے۔ میں اس کی پرورش کروں گا۔''

وہ بچہ اس کے حوالے کردیا گیا پھر باطو' منگو اور قبلائی تینوں سیورقوقطنی کے آگے آکر گھٹنے ٹیک کر سر جھکاتے ہوئے بولے۔ ''ہماری ماں بہت عظیم عورت ہے۔''

اس عظیم عورت کا ذکر تاریخ میں بہت کم ہے۔ شاید اس لیے کہ تاریخ عورتوں کے نہیں صرف مردوں کے کارنامے محفوظ رکھنے کے لیے لکھی جاتی ہے۔

میں ایک طرح کی آسودگی محسوس کررہی تھی۔ میں نے اور بے باک مومن نے فرہاد کے خلاف سازش کرنے والے پہلے دو دشمنوں کو جہنم میں پہنچا دیا تھا۔ باقی سازش کرنے والوں کے نام اور پتے ذہنوں میں محفوظ تھے۔ ہم مناسب وقت پر انہیں بھی جہنم کا راستہ دکھانے والے تھے۔

سوئٹزرلینڈ میں ان دشمنوں سے نمٹنے کے بعد بے باک میرے پاس آگیا تھا اور مجھے اپنی روداد سنا رہا تھا۔ یہ تو پہلے ہی بتا چکا تھا کہ وہ کس طرح پندرہ برس کی عمر سے ہی فرہاد سے متاثر ہوگیا تھا۔ اس قدر متاثر ہوا تھا کہ دین اسلام قبول کرلیا تھا۔ اس نے کئی برس کی تھکا دینے والی کوششوں کے بعد ٹیلی پیتھی کا علم حاصل کیا تھا۔ اپنے آئیڈیل محبوب فرہاد سے رابطہ کرنا چاہتا تھا لیکن بدقسمتی سے وچ ڈاکٹر مہاراج گندھراج منتر جوگی کے کالے علم میں پھنس گیا تھا۔ اس کے بعد ایک برس تک اس کا غلام بن کر اس کے احکامات کی تعمیل کرتا رہا تھا۔

اس نے کہا۔ ''مما! میرا ایمان ہے' اللہ تعالیٰ اگر ہمیں آزمایشوں میں مبتلا کرتا ہے' برے حالات سے گزارتا ہے تو اس میں بھی ہماری بہتری ہوتی ہے اور میری بہتری اس طرح ہوئی کہ میں اس منتر جوگی کی ڈائریاں پڑھ کر پاپا کے بدترین دشمن برین ماسٹر تک پہنچ گیا ہوں۔''

میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''بے شک، یہ تم نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔''

''برین ماسٹر اور دوسرے سازش کرنے والوں کے دلوں کو یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ پاپا کی آتما کسی کے جسم میں سما گئی ہے اور اب ان کی نیندیں حرام کررہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارے پاس برین ماسٹر کا فون نمبر اور تین خفیہ پناہ گاہوں کا پتا موجود ہے۔ یہ بتاؤ' اب تم کیا کرنا چاہو گے؟''

''میں نے اپنے طور پر بہت کچھ سوچ لیا تھا لیکن اب آپ کی سرپرستی حاصل ہوگئی ہے تو آپ ہی کے مشوروں پر عمل کروں گا۔''

میں نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''نہیں، ہمیشہ اپنی ذہانت اور صلاحیتوں پر بھروسا کرو اگر کبھی مشکل پیش آئے تب مجھ سے مشورہ لے لیا کرو۔ چلو یہ بتاؤ' اس سلسلے میں کیا سوچا ہے؟''

''میں نے سوچا ہے کہ میرے پاس برین ماسٹر کی تین خفیہ پناہ گاہوں کے پتے موجود ہیں۔ میں جب چاہوں کہیں بھی اس کے سامنے پہنچ کر اسے گولی مار سکتا ہوں لیکن میری عقل نے سمجھایا کہ طاقت کے نشے میں مدہوش رہنے والے دشمنوں کو فوراً ہی موت کے گھاٹ نہیں اتارنا چاہیے۔ پہلے ان سے ان کی طاقت چھین لینی چاہیے۔ انہیں اس قدر کمزور بنا دینا چاہیے کہ وہ مٹی کے کیڑوں کی طرح رینگتے رہیں اور کسی بھی ایرے غیرے کے قدموں تلے آکر کچلے جائیں۔''

''تم کہی سمت میں سوچ رہے ہو۔ بدترین دشمنوں کو ایسی ہی موت مرنا چاہیے کہ دوسرے دشمنی کرنے والے عبرت حاصل کرتے رہیں۔''

''پچھلی رات میں نے فون کے ذریعے اس کے دل میں یہ دہشت پیدا کردی ہے کہ پاپا نے کسی کا جسم حاصل کرلیا ہے اور اب وہ اپنا جسم اور دماغ تلاش کررہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اور دوسرے ممالک کے اکابرین کو بھی یہی میسج دیا ہے۔ سب ہی دہشت میں مبتلا ہوں گے۔ یہ اچھا طریقہ کار ہے۔''

بے باک نے کہا۔ ''برین ماسٹر کی ایک بیوی، ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ وہ لندن میں عزت داروں کی طرح شریفانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ ماں اور بیٹی سیدھی سادی سی ہیں۔ بیٹی اپنے باپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی کہ وہ کس قدر پُراسرار ہے اور انڈر ورلڈ میں رہ کر کیسی مجرمانہ زندگی گزار رہا ہے؟ بیوی سب کچھ جانتی ہے۔ اپنے شوہر کی راز دار ہے لیکن مغرور اور بددماغ نہیں ہے۔ اس کا بیٹا جان رچ بہت ہی مغرور ہے۔ اسے پہلوانی کا شوق ہے۔ فری اسٹائل ریسلر ہے۔ ڈبلیو ڈبلیو اور راجیسے مشہور و معروف اداروں کا ممبر ہے۔''

''اس کا مطلب' وہ اچھا خاصا قد آور باڈی بلڈر ہو گا؟''

''ہاں، باڈی تو خوب بنائی ہے لیکن عیاش ہے۔ شراب پیتا ہے۔ بڑے بڑے نامور پہلوانوں کے مقابلے میں کبھی جیت نہیں سکتا لیکن برین ماسٹر ٹیلی پیتھی کے ذریعے اس کی شکست کو فتح میں بدل دیتا ہے اور بیٹے کو سمجھاتا رہتا ہے کہ وہ عیاشی اور شراب نوشی سے باز آجائے۔''

میں نے کہا۔ ''ماں باپ کا ایک ہی بیٹا ہے اس لیے ضدی اور خودسر ہوگا؟ اپنی من مانی کرتا ہوگا؟''

''جی ہاں، یہی بات ہے۔ جب بھی وہ ریسلنگ کے لیے جاتا ہے فون پر اپنے باپ کو اطلاع کردیتا ہے اور ٹھیک مقابلے کے وقت باپ اپنے بیٹے کے اندر پہنچ جاتا ہے۔ اس بار بھی وہ امریکا کے ایک شہر فلاڈیلفیا میں مقابلے کے لیے گیا

ہے۔ دس دنوں کے بعد دنیا کے بڑے بڑے چیمپئن پہلوان ایک دوسرے سے مقابلہ کریں گے۔ ان میں جان رچ کا نام بھی شامل ہے۔ اس بار پانچ لاکھ ڈالر کا بہت بڑا انعام رکھا گیا ہے۔ باپ اپنے بیٹے کو اس مقابلے میں کبھی ہارنے نہیں دے گا۔''

''اور میں اسے جیتنے نہیں دوں گی۔''

''میں نے یہی سوچا ہے' مقابلے کے وقت میں اس کے مقابل پہلوان کے دماغ میں رہوں گا اگر اس کے اندر جگہ نہ ملی تو پھر ماسٹر کے بیٹے کے دماغ میں ہی رہ کر اسے شکست کھانے پر مجبور کردوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ مناسب نہیں ہے۔ اس کے اندر ماسٹر موجود ہوگا۔ میں نہیں چاہتی کہ تم بھی وہیں اسی کے اندر رہ کر ماسٹر سے خیال خوانی کا مقابلہ کرو۔ اسے معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ اس مقابلے میں وہاں کوئی خیال خوانی کرنے والا موجود ہے۔''

''مما! پھر تو مشکل ہوگی۔ کیونکہ جان رچ کے مقابل جو بھی پہلوان آئے گا وہ یقیناً یوگا کا ماہر ہوگا۔ شراب نہیں پیتا ہو گا۔ میری خیال خوانی کی لہروں کو محسوس کرتے ہی سانس روک لے گا۔ مجھے اپنے اندر آنے نہیں دے گا۔ اس طرح میں اسے ماتحت نہیں بنا سکوں گا۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''ابھی تم بابا صاحب کے ادارے کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے ہو۔ وہاں جوانوں کو جوڈو کراٹے اور فری اسٹائل ریسلنگ کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ میرے تین بیٹوں نے پارس، پورس اور کبریا بچپن سے اب تک کتنے ہی شعبوں میں طرح طرح کی ٹریننگ حاصل کی ہے اور تینوں ہی ناقابل شکست فائٹر ہیں۔ میں معلوم کروں گی کہ ان میں سے آج کل کون پوری تیاری کے ساتھ ہے۔ جو پورے فارم میں ہوگا میں اسے کل کی کسی فلائٹ سے فلاڈیلفیا روانہ کروں گی۔''

بے باک نے کہا۔ ''کبریا خیال خوانی کے ذریعے اپنا اور اپنے بھائیوں کا نام اس مقابلے میں شامل کرا سکتے ہیں۔ آپ اپنے بیٹوں سے بات کریں۔ میں مسز برین ماسٹر کے پاس جارہا ہوں۔''

وہ لندن کے ایک ہوٹل میں تھا۔ دماغی طور پر اپنے کمرے میں حاضر ہوگیا پھر لباس تبدیل کر کے ماسٹر کی فیملی کی طرف جانے لگا۔

اس نے خیال خوانی کے ذریعے معلوم کیا تھا کہ مونیکا اپنی بیٹی اینا کے ساتھ آرٹ کالج کی طرف جانے والی ہے۔

وہ ان کے بنگلے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ماں بیٹی باہر آئیں پھر اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے جانے لگیں۔ وہ انہیں چہروں کے ذریعے پہچاننے آیا تھا لیکن دور سے ایک ہی جھلک دکھائی دی تھی۔ اس لیے وہ ان کا تعاقب کرتا ہوا آرٹ کالج تک پہنچ گیا۔ اس کالج میں آرٹ گیلری بھی تھی۔ جہاں کمال حاصل کرنے والے طلبہ اور طالبات کی بنائی ہوئی تصویریں لگائی جاتی تھیں۔ اینا بھی اپنی ماں کے ساتھ وہیں آئی تھی۔ اسے اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویریں دکھا رہی تھی۔

بے باک نے وہاں پہلی بار اینا کو ذرا قریب سے دیکھا تو وہ اسے بہت اچھی لگی۔ بہت ہی سیدھی سادی سی لڑکی تھی۔ اس نے کسی قسم کا میک اپ نہیں کیا ہوا تھا۔ اس کے باوجود دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں بے حد حسین لگ رہی تھی۔

وہ مونیکا سے کہہ رہی تھی۔ ''ممی! یہ سب عام سی تصویریں ہیں۔ میں آپ کو یا کسی کو بھی اپنے سامنے بٹھا کر پورا پورٹریٹ بنا لیتی ہوں لیکن اِدھر دیکھیں! یہ ایک تجریدی آرٹ ہے۔ اسے سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔''

مونیکا تھوڑی دیر تک اس تجریدی آرٹ کو دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے۔ یہ تم نے کیا بنایا ہے؟''

''ممی! یہ ایک فنکار کے وہ احساسات اور جذبات ہیں جو اس کے اندر چھپے ہوتے ہیں۔ وہ اسے تصویروں کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔ یہ میرے اندر کے چھپے ہوئے جذبات اور احساسات ہیں۔ میں اس کی ایک فوٹو کاپی آپ کو دوں گی۔ اسے اچھی طرح دیکھیں اور غور کریں کہ آپ کی بیٹی کے اندر کتنے خوبصورت اور حسین خیالات چھپے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، تم اس کی کاپی لے آنا۔ اب میں جارہی ہوں۔ نہیں تو بینک بند ہوجائے گا۔''

وہ اپنی ماں کے ساتھ وہاں سے پلٹ کر جانے لگی۔

ایسے ہی وقت اس نے ایک نظر بے باک پر ڈالی پھر دروازے کی طرف بڑھ گئی مگر بے باک کی مرضی کے مطابق اس کے بارے میں سوچنے لگی پھر دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔ وہاں سے پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ مونیکا نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

وہ چونکتے ہوئے بولی۔ ''نہیں، کچھ بھی نہیں۔ آئیں چلتے ہیں۔''

وہ وہاں سے چلی گئی لیکن اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔ ''یہ سیاہ فام نیگرو اتنے پُرکشش کیوں ہوتے

ہیں؟ یورپ اور امریکا کی گوری چٹی حسینائیں ان کالے نوجوانوں پر مرتی ہیں، شادی کرتی ہیں، ساری عمر ان کے ساتھ گزارتی ہیں۔ پتا نہیں، ان میں ایسی کیا بات ہوتی ہے؟''

دوسری طرف وہ اس تجریدی آرٹ کے سامنے کھڑا بڑی سنجیدگی سے اینا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے افریقا سے یورپ تک کتنی ہی حسینائیں دیکھی تھیں۔ ان سے ملتا بھی رہا تھا لیکن اینا کی طرح کسی نے بھی اسے پہلی نظر میں متاثر نہیں کیا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا۔ ''یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ میں دوسروں کے خیالات بہت اندر تک اور بہت دور تک پڑھ لیتا ہوں مگر اپنے اندر کی بات کیوں نہیں سمجھ پا رہا ہوں؟ کہ اس لڑکی میں کیا ہے؟ اس نے پہلی نظر میں مجھے اپنی طرف کھینچ لیا ہے اور اپنے ہی متعلق سوچنے پر مجبور کر رہی ہے؟''

وہ ایک جگہ بیٹھ کر اینا کے خیالات پڑھنے لگا۔ یہ معلوم کرنے لگا کہ اس نے کن احساسات اور جذبات کے تحت وہ تجریدی آرٹ پیش کیا ہے؟

اس آرٹ گیلری میں ایک سے ایک خوبصورت اور خیال آفریں تصاویر تھیں۔ انہیں دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ اس آرٹ کالج کے طلبہ اور طالبات کتنے ذہین ہیں اور کیسی فنکارانہ صلاحیتیں رکھتے ہیں اگر کوئی خریدار آتا تھا تو ان تصاویر کو فروخت بھی کیا جاتا تھا۔

اینا نے آرٹ گیلری کے انچارج سے کہا تھا کہ اس کی تصویر کو صرف اسی خریدار کے حوالے کیا جائے جو تجریدی آرٹ سمجھتا ہو اگر وہ بتا دے گا کہ اینا نے اپنے کن احساسات اور جذبات کے تحت یہ فن پارہ پیش کیا ہے تو وہ اسے فروخت کرنے کی اجازت دے دے گی۔

وہ مسکرا کر دل ہی دل میں کہنے لگا۔ ''اینا! اسے تو میں ہی خریدوں گا۔ یہ تمہاری طرف بڑھنے کا پہلا مرحلہ ہے۔ خدا کرے میں تمہیں ساری زندگی کے لیے خرید لوں۔''

پھر اس نے سر جھٹک کر سوچا۔ ''میں اس لڑکی کو کیسے حاصل کر سکتا ہوں؟ یہ تو میرے دل میں گھسی جا رہی ہے۔ میں ایک دشمن اور ظالم بن کر پلک جھپکتے ہی اسے حاصل کر سکتا ہوں۔ طیل پیتھی کے ذریعے اس کے دماغ پر قبضہ جما سکتا ہوں۔ تنویمی عمل کے ذریعے اپنا تابعدار بنا سکتا ہوں پھر تو یہ میرے قدموں میں لوٹنے لگے گی۔''

اس نے انکار میں سر ہلا کر سوچا۔ ''نہیں، خدا مجھے معاف کرے۔ میں اس سے پیار کروں گا۔ اس پر جبر نہیں کروں گا۔ خواہ یہ مجھے حاصل ہو یا نہ ہو، مجھے پیار کرے یا نہ کرے۔ میں تو کرتا رہوں گا۔''

پیار کرنے والے کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کو اپنی طرف مائل کرے۔ اخلاقی دائرے میں رہ کر پیار و محبت اور اپنے اچھے اعمال سے اسے متاثر کرتا رہے۔

اس نے پہلی بار اینا کو اپنے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ یہ کالے نوجوان اتنے اچھے کیوں لگتے ہیں؟ دیکھا جائے تو اس نے جبراً ایسے خیالات پیدا نہیں کیے تھے۔ یہ سچائی تھی کہ یورپ اور امریکا کی چالیس فیصد گوری چٹی لڑکیاں کالوں پر مرتی ہیں۔ ان سے شادی کرتی ہیں اور اگر نہ کر سکیں تو بوائے فرینڈ ضرور بناتی ہیں لیکن وہ صرف بوائے فرینڈ اور محبت کا کھلاڑی نہیں بننا چاہتا تھا۔ وہ اپنی فطرت میں بھنورا نہیں تھا کہ ایک پھول سے دوسرے پھول کی طرف منڈلاتا۔ وہ تو اسے دل و جان سے اپنی شریک حیات بنا لینا چاہتا تھا۔

اینا کلاس اٹینڈ کر رہی تھی۔ وہاں ٹیچر نے تمام طلبہ اور طالبات سے کہا تھا کہ وہ اپنے اپنے کینوس کے سامنے جائیں اور اپنے کسی آئیڈیل مرد یا عورت کی تصویر بنائیں۔

اینا اُلجھی ہوئی تھی کہ اس کی زندگی میں کبھی کوئی گورا آئے گا یا کالا؟ اسے کالے پسند تھے لیکن یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ باپ اور بھائی اس کی پسند کی مخالفت کریں گے۔ وہ سوچنے لگی۔ ''جب مخالفت ہوگی تب دیکھا جائے گا۔ ابھی تو میں کسی کالے کی تصویر بنا سکتی ہوں۔''

بے باک اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک واش روم میں آ گیا۔ وہاں آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اینا کے اندر پہنچ گیا۔ آئینے میں اپنی آنکھیں، ناک، منہ، کان اور چہرے کی بناوٹ کو توجہ سے دیکھنے لگا۔ دوسری طرف اینا کو یوں لگ رہا تھا کہ آرٹ گیلری میں جس کالے جوان کو دیکھا تھا۔ وہ ایک دم سے آنکھوں کے سامنے آ گیا ہے اور اس کا چہرہ پوری تفصیل کے ساتھ دکھائی دے رہا ہے۔ وہ بے اختیار کینوس پر اس کی آنکھیں، ناک، منہ، کان اور چہرے کے بناوٹ کے مطابق تصویر بنانے لگی۔

وہ اسے کینوس پر اتار رہی تھی اور دھڑکتے ہوئے دل سے سوچ رہی تھی۔ ''اوہ گاڈ! میں اب تک کسی کو بھی سامنے بٹھا کر اس کی تصویر بناتی آئی ہوں۔ ایسا پہلی بار ہو رہا ہے۔ اس جوان کو صرف ایک بار دیکھا ہے اور وہ ایسے ذہن میں نقش ہو گیا ہے، جیسے ابھی میرے سامنے بیٹھا ہو۔ میں اسے صاف طور پر دیکھ رہی ہوں۔ میرا دل کیوں بری طرح دھڑک رہا

ہے؟''

آدھے گھنٹے بعد ٹیچر نے اس کی تصویر کو دیکھتے ہی کہا۔ ''واہ اینا! واہ، اگرچہ تم نے ایک کالے جوان کی تصویر بنائی ہے۔ لیکن اس میں لائٹ اینڈ شیڈ کا امتزاج بہت ہی فنکارانہ ہے۔ اسے مکمل کرلوگی تو یہ تمہاری بہترین تصویروں میں سے ایک ہوگی۔''

اس نے کہا۔ ''سر! پتا نہیں' میں نے کیسے ڈوب کر یہ تصویر بنائی ہے؟ اب اسے گھر لے جا کر واٹر کلر کے ذریعے مکمل کروں گی۔''

وہ اس کینوس کو بڑے سے ریپر میں لپیٹنے لگی۔ بے باک نے مجھے مخاطب کیا۔ ''مما! یہاں لندن میں آپ لوگوں کی رہائش گاہیں تو ضرور ہوں گی؟''

''ہاں بیٹے! ایسٹ بورن میں میرا اور فرہاد کا ایک بنگلا ہے اور ویسٹ بورن برسٹل میں دوسرا بنگلا ہے۔ وہاں عالی، کبریا، پارس اور پورس وغیرہ جاتے رہتے ہیں۔ تم کہاں رہنا چاہو گے؟''

''میں آپ کے بنگلے میں رہنا چاہتا ہوں۔''

''میں ابھی چوکیدار کو فون کرتی ہوں۔ وہ بنگلے کی چابی تمہارے حوالے کردے گا۔''

''ایک اور بات ہے مما! کیا اس بنگلے میں کوئی بیسمنٹ ہے؟''

''ہاں، ایک چھوٹا سا تہ خانہ ہے۔ جب تم وہاں جاؤ گے تو میں اس کا چور دروازہ تمہیں بتاؤں گی۔ ویسے تمہیں اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''برین ماسٹر نے اپنے بنگلے کے تہ خانے میں سونے اور ہیروں کا ذخیرہ رکھا ہوا ہے۔ میں وہ سب خالی کر دینا چاہتا ہوں۔ وہاں کا مال اپنے تہ خانے میں پہنچاؤں گا۔ وہ جتنی دولت حاصل کرتا رہے گا۔ میں اسے اتنا ہی کنگال بناتا رہوں گا۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم اپنا آئی ڈی کارڈ چوکیدار کو دکھاؤ گے تو اس بنگلے کے مالک بن کر رہ سکو گے۔''

وہ میرے اندر سے چلا گیا۔ بے باک نے یہ طے کیا تھا۔ کہ برین ماسٹر کی بیوی مونیکا کو غائب دماغ بنا کر اس تہ خانے سے ہیرے جواہرات کے ذخیرے کو تھوڑا تھوڑا کر کے نکالتا رہے گا اور اسے ہمارے بنگلے کے تہ خانے میں پہنچاتا رہے گا۔

ایک چپراسی نے آکر اینا سے کہا کہ آرٹ گیلری کے

دل نوازوں کے لیے سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ

بازی گر

وہ ہیرہ جو دلوں کی دھڑکن ہے

آواں حصہ شائع ہوگیا ہے

بابر زمان خان کی آپ بیتی جگ بیتی

ان کے لیے جن کے سینے دھواں دیتے ہیں، آنسوؤں، آہوں، آمنگوں اور حوصلوں کی داستان، عبرت اثر، حیرت انگیز نا قابل فراموش

7 حصے کتابی شکل میں دستیاب ہیں

قیمت فی حصہ/60 روپے ڈاک خرچ فی حصہ/23 روپے

بڑے شہروں میں ہمارے ایجنٹ یہ ہیں

کراچی: الکوثر نیوز ایجنسی۔ اخبار مارکیٹ
لاہور: شفیق نیوز ایجنسی۔ اخبار مارکیٹ
راولپنڈی: اشرف بک ایجنسی کمیٹی چوک
فیصل آباد، ملتان، حیدر آباد: جہانگیر بک ڈپو

چھوٹے شہروں اور علاقوں میں ایجنٹ حضرات کی ضرورت ہے
رابطے کیلئے

کتابیات پبلی کیشنز
فون: 021-5804300 پوسٹ بکس 23
کراچی 74200
kitabiat1970@yahoo.com
C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ (انتر کالونی بس اسٹاپ کے سامنے)

انچارج نے اسے بلایا ہے۔ اینا نے ماں سے فون پر کہا۔ ''ممی! آپ میرے لیے گاڑی بھیج دیں۔ میں گھر آنا چاہتی ہوں۔''

مونیکا نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، ابھی آدھے گھنٹے میں ڈرائیور گاڑی لے کر پہنچ جائے گا۔''

وہ ریپر میں لپٹے ہوئے کینوس کو اٹھا کر آرٹ گیلری میں آ گئی۔ وہاں کا انچارج اپنے آفس میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔ ''مس اینا! تمہارے اس تجریدی آرٹ کا ایک خریدار آیا ہے۔ وہ اسے خریدنا چاہتا ہے۔''

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ کسی باذوق خریدار کو اپنی وہ تصویر دوں گی۔''

''بے شک، اس خریدار کا دعویٰ ہے کہ وہ تمہاری بنائی ہوئی تصویر کو پوری طرح سمجھ رہا ہے اور سمجھ کر ہی اسے خریدنا چاہتا ہے۔''

ایسے ہی وقت بے باک نے دروازے پر آ کر پوچھا۔ ''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟''

اینا اسے دیکھ کر ایک دم سے چونک گئی۔ اس کے پاس رکھے ہوئے کینوس میں اسی کی تصویر تھی اور وہ تصویر اس نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھی۔ انچارج نے کہا۔ ''آیئے، مسٹر بے باک مومن! ان سے ملیں۔ یہ ہیں مس اینا.... وہ تجریدی آرٹ اسی لڑکی کی تخلیق ہے۔''

وہ اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے قریب آ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم سے مل کر خوشی ہو رہی ہے۔''

اینا نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا تو یکبارگی دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ کرسی کے پیچھے رکھے ہوئے کینوس میں اس کی تصویر تھی۔ سامنے وہ تصویر والا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ بے باک نے کہا تھا کہ تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ اسے بھی جوابارسمی طور پر کہنا چاہیے تھا کہ مجھے بھی آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے لیکن وہ اسے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ گم صم سی ہو کر رہ گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہاتھ اس کے قبضے میں چلا گیا ہے اور وہ اپنا ہاتھ واپس نہیں لا سکے گی۔

بے باک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم شاید خیالی دنیا میں رہتی ہو؟ اس وقت دماغی طور پر حاضر نہیں ہو؟''

وہ ایک دم سے چونک کر اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔ ''جی، جی ہاں۔ وہ میں کچھ اور سوچ رہی تھی۔ کیا آپ ہی اس تصویر کو خریدنا چاہتے ہیں؟''

''ہاں، اس تصویر میں بڑی گہرائی ہے۔ میں حیران ہوں کہ تم نے اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنی گہری تصویر کیسے بنا لی؟''

اس نے پوچھا۔ ''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میں اپنی اس تصویر کے ذریعے کیا کہنا چاہتی ہوں؟''

''میں تصویر کے سامنے وضاحت کر سکتا ہوں۔''

وہ وہاں سے آرٹ گیلری میں آ گئے۔ بے باک نے کہا۔ ''تصویر میں گہرا نیلا رنگ ہے۔ یعنی اسے پیش کرنے والی ابھی تاریکی میں ہے۔ اپنے احساسات اور جذبات کو کچھ کچھ سمجھ رہی ہے۔ دو مثلث مختلف زاویوں سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے ہیں۔ ہر مثلث کے گوشے میں مختلف میلے اور دھندلے سے رنگ ہیں۔ ان مثلث کے پیچھے ایک قوس قزاح کھینچی گئی ہے لیکن اس میں سات رنگ نہیں ہیں۔ قوس قزاح کے نیچے سات رنگوں کے چھوٹے چھوٹے سے نکتے بنائے گئے ہیں۔''

وہ بول رہا تھا اور اینا حیرانی سے اس کا منہ تک رہی تھی۔ کیونکہ جو باتیں اس کے دماغ میں تھیں وہی اس کی زبان پر آ رہی تھیں۔

اس نے کہا۔ ''اس تصویر کو بنانے والی اُلجھی ہوئی ہے۔ کیونکہ قوس قزاح کے سات رنگ بالکل معدوم ہیں۔ وہ سات رنگ نقطوں کی صورت میں کہیں کہیں نظر آ رہے ہیں۔ یعنی وہ پوری طرح قوس قزاح بن پائیں گے یا نہیں؟ کوئی اس کی زندگی میں رنگوں کی بہار لے کر آئے گا یا نہیں.....؟''

اینا ایک دم سے گھبرا گئی کیونکہ وہ اس کے اندر کی باتیں بیان کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''بس بس ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گئی۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ تجریدی آرٹ کو سمجھتے ہیں۔ بے شک، آپ اس تصویر کو خریدنے کے مستحق ہیں۔''

وہ سب واپس اپنی کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ انچارج نے کہا۔ ''یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ تمہاری تصویر کو مسٹر بے باک نے پوری طرح سے سمجھ لیا ہے۔''

اینا بار بار اسے چور نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''ہاں، مگر میں یہ تصویر فروخت کرنا نہیں چاہتی۔ انہیں گفٹ کے طور پر دینا چاہتی ہوں۔''

بے باک نے مسکرا کر کہا۔ ''میں آپ کی تصویر کو سمجھ رہا ہوں۔ اس کی قدر کر رہا ہوں اور آپ میری اس طرح قدر کر رہی ہیں کہ اس تصویر کو گفٹ کے طور پر دینا چاہتی ہیں۔''

وہ نظر چرا کر بولی۔ ''میری خواہش ہے کہ میری یہ تصویر میرے کسی قدر دان کے گھر میں پہنچے۔''

انچارج نے ذرا پریشان ہو کر کہا۔ ''لیکن مس اینا! یہاں سے جو بھی تصویر فروخت ہوتی ہے۔ اس کی قیمت کا پچیس فیصد کالج کو ڈونیشن کے طور پر دیا جاتا ہے۔''

بے باک نے کہا۔ ''آپ اس تصویر کی بات نہ کریں۔ یہ بتائیں' آپ کالج کے لیے کتنا ڈونیشن چاہتے ہیں؟''

انچارج نے کہا۔ ''کم از کم ایک ہزار پاؤنڈ۔''

بے باک نے اپنے بیگ میں سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر اسے پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''میری طرف سے یہ پانچ ہزار پاؤنڈ ڈونیشن کے طور پر رکھ لیں۔ اب تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے؟''

وہ ذرا جھینپ کر بولا۔ ''آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں۔''

پھر وہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''آپ تشریف رکھیں، میں ابھی تصویر کو پیک کراتا ہوں۔''

وہ وہاں سے چلا گیا۔ اینا فون کے ذریعے اپنی ماں سے پوچھ رہی تھی۔ ''آپ نے ابھی تک گاڑی نہیں بھیجی؟''

ماں نے کہا۔ ''ڈرائیور گاڑی لے کر جا چکا ہے۔ پتا نہیں کہاں رہ گیا ہے؟ اسے اب تک تمہارے پاس پہنچ جانا چاہیے تھا۔''

بے باک نے اس کے وہاں تک پہنچنے میں گڑبڑ پیدا کر دی تھی۔ وہ ڈرائیور راستے میں ہی رک گیا تھا۔ اپنی کار کا ونٹ اٹھا کر اسے چیک کر رہا تھا۔ اس نے غائب دماغ ہو کر خود ہی خرابی پیدا کر دی تھی پھر ایک فون بوتھ میں آ کر اینا کے نمبر پر رابطہ کرتے ہوئے بولا۔ ''گاڑی اچانک ہی راستے میں خراب ہو گئی ہے۔ میں اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پلیز آپ میرا انتظار کریں۔''

اینا نے پریشان ہو کر فون بند کر دیا۔ بے باک نے پوچھا۔ ''کیا کوئی پرابلم ہے؟''

وہ چونک کر بولی۔ ''نہیں، دراصل میری کار راستے میں خراب ہو گئی ہے۔ ڈرائیور دیر سے یہاں پہنچے گا۔''

''یہ تو کوئی پرابلم نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ میری گاڑی میں چلو۔ جہاں کہو گی' وہاں پہنچا دوں گا۔''

اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''وہ! نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی ٹھیک ہو جائے گی۔''

''ٹھیک ہو جائے گی تو ڈرائیور اسے گھر لے آئے گا۔ کیا میرے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض ہے؟''

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں.....''

انچارج ایک ملازم کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ لیں، آپ کی تصویر پیک ہو گئی۔''

بے باک نے ریپر میں لپٹے ہوئے دوسرے کینوس کو اٹھاتے ہوئے اینا سے کہا۔ ''چلو، میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔''

وہ دونوں انچارج سے مصافحہ کر کے کمرے سے باہر آ گئے۔ ملازم تصویر اٹھائے ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور اینا بے باک کے پیچھے چلتے ہوئے کبھی اسے اور کبھی کینوس کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی ہی تصویر اٹھائے اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کی کار کالج کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر کینوس کو وہاں رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس میں بھی شاید تمہاری کوئی شاہکار تصویر ہو گی؟ کیا میں ریپر ہٹا کر اسے دیکھ سکتا ہوں؟''

وہ جلدی سے بولی۔ ''نہیں، یہ کینوس ابھی سادہ ہے۔ میں گھر جا کر کوئی تصویر بناؤں گی۔''

ملازم دوسری تصویر گاڑی میں رکھ کر چلا گیا۔ وہ اگلی سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری اس رینٹ کار سے اندازہ ہو رہا ہے کہ اس شہر کے نہیں ہو؟ کہیں سے آئے ہو؟''

''تمہارا اندازہ درست ہے۔ میں کل تک فرینکفرٹ میں تھا۔ پچھلی رات ہی یہاں آیا ہوں۔ اب یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔ یہاں میرا ایک بنگلا ہے۔ آج شام تک ایک کار بھی خرید لوں گا۔''

''کوئی بزنس مین ہو؟''

''ہاں، ہیرے اور جواہرات کا کاروبار ہے۔ لاکھوں کروڑوں کا لین دین ہوتا رہتا ہے۔''

وہ باتوں کے دوران اسے اپنا ایڈریس سمجھاتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی بے باک نے بنگلے کے احاطے میں پہنچ کر کار روک دی۔ اینا نے پوچھا۔ ''کیا میرے ساتھ کافی پینا پسند کرو گے؟''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''یہ میری خوش نصیبی ہو گی۔''

وہ اس کے ساتھ بنگلے کے اندر آ گیا۔ اینا نے اپنی ماں سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''ممی! ان سے ملیں۔ یہ مسٹر بے باک مومن ہیں۔ بہت ہی باذوق انسان ہیں۔ انہوں نے میری اس تجریدی آرٹ والی پینٹنگ کو بڑی گہرائی سے سمجھا ہے۔ میں نے وہ تصویر فروخت نہیں کی بلکہ گفٹ کے طور پر انہیں دے دی ہے۔''

مونیکا نے بیٹی کے ساتھ اس کینوس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا یہی وہ تصویر ہے؟''

''نہیں یہ سادہ کینوس ہے۔ دوسری تصویر بنانے کے لیے لائی ہوں۔ پلیز، آپ اسے میرے کمرے میں رکھ دیں۔ میں ان کے لیے کافی بنانے جارہی ہوں۔''

مونیکا اس کینوس کو اٹھا کر بیٹی کے کمرے کی طرف چلی گئی اور اینا کافی بنانے کے لیے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ بے باک ایک صوفے پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ وہ اس کی تصویر اسی سے چھپا رہی تھی۔ یہ تاثر دینا نہیں چاہتی تھی کہ اس سے متاثر ہوگئی ہے۔ وہ اس کے ذہن میں اس طرح نقش ہوگیا ہے کہ سامنے بٹھائے بغیر اس نے اس کی تصویر بنالی ہے۔

وہ خیال خوانی کے ذریعے باری باری ان ماں بیٹی کے اندر جارہا تھا۔ ادھر بیٹی کافی تیار کررہی تھی۔ ادھر اس نے مونیکا کے ذہن میں یہ سوچ پیدا کی کہ کینوس کے ریپر کو کھول کر دیکھنا چاہیے' بیٹی نے کچھ بنایا بھی یا نہیں؟

اس نے بے باک کی مرضی کے مطابق ریپر کو ہٹا کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ بیٹی نے کہا تھا کوئی تصویر نہیں ہے جبکہ وہ اس مہمان کی تصویر بنا کر لائی تھی جو ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔

وہ بے باک کی مرضی کے مطابق سوچنے لگی۔ ''کیا میری بیٹی اس نگیر و نوجوان سے متاثر ہوگئی ہے؟ تعجب ہے۔ ہماری نسل کے گورے چٹے کتنے ہی نوجوان اس سے لفٹ لینا چاہتے ہیں لیکن وہ کسی کو منہ نہیں لگاتی۔ کیا اس جوان سے متاثر ہوگئی ہے؟''

اینا ایک ٹرے میں دو کپ کافی لے آئی۔ اس نے ایک کپ بے باک کو پیش کیا۔ ایسے ہی وقت مونیکا کینوس اٹھائے وہاں آگئی۔ بیٹی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اینا! یہ کیا؟ تم نے تو کہا تھا' کینوس سادہ ہے؟''

اینا ماں کے ہاتھ میں اس کا کینوس دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس نے جھینپ کر بے باک کو دیکھا پھر نظریں چراتے ہوئے ماں سے کہا۔ ''آپ نے اسے کھول کر کیوں دیکھا؟ میں نے منع کیا تھا۔''

بے باک نے تصویر کو دیکھ کر حیرانی ظاہر کی۔ ''اینا! تم نے آج سے پہلے مجھے کبھی نہیں دیکھا پھر یہ تصویر کیسے بنا ڈالی؟ تعجب ہے.....''

وہ کیا جواب دیتی؟ بری طرح جھینپ رہی تھی۔ شرما رہی تھی۔ یہ کیسے کہتی کہ وہ ایک ہی بار دیکھنے کے بعد اس کے ذہن میں نقش ہوگیا تھا۔ کینوس پر اسکیچ کرتے وقت اسی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ خود بھی سمجھ نہیں پائی تھی کہ یہ سب کیسے ہوگیا؟ پھر اسے کیا جواب دیتی۔

مونیکا خاموش اور ٹٹولتی ہوئی نظروں سے بیٹی کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی جھجک اور شرمانے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ سچ مچ اس نگیرو سے متاثر ہوگئی ہے۔

اس نے کہا۔ ''اینا! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ مسٹر بے باک کہہ رہے ہیں' تم نے پہلے انہیں کبھی نہیں دیکھا پھر یہ تصویر کیسے بنالی؟''

وہ بے باک کے سامنے بری طرح گڑبڑا گئی تھی۔ شرما رہی تھی۔ کوئی جواب نہیں دے پارہی تھی۔ یہ کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ ''میں کچھ نہیں جانتی۔ میں کچھ نہیں بتاسکتی.....''

اس نے بیٹی کو جاتے ہوئے دیکھا پھر بے باک سے کہا۔ ''تم بیٹھو، کافی پیو۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

وہ بیٹھ کر کافی پینے لگا۔ مونیکا بھی اپنی بیٹی کے حصے کی کافی پیتے ہوئے بولی۔ ''تم کون ہو؟ کہاں رہتے ہو اور کیا کرتے ہو؟''

اس نے اینا سے راستے میں جو کچھ کہا تھا۔ وہی اس کی ماں کو بتانے لگا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ میری بیٹی سے پہلے کبھی نہیں ملے؟ آج تم دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی ہے؟''

''ہاں، میں یہی سمجھتا ہوں۔ ہوسکتا ہے' اینا نے مجھے پہلے کہیں دیکھا ہو۔ میرا چہرہ اس کے ذہن میں نقش ہوگیا ہو۔''

''لیکن تم میں ایسی کیا بات ہے کہ تمہارا چہرہ میری بیٹی کے ذہن میں نقش ہوجائے گا؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یہ سوال تو آپ کو اپنی بیٹی سے کرنا چاہیے۔''

وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو! تمہارے اور اینا کے درمیان کوئی انڈر اسٹینڈنگ ہے تو مجھ سے نہ چھپاؤ۔''

وہ بولا۔ ''میں نے تو آج پہلی بار آپ کی بیٹی کو دیکھا ہے لیکن اس تصویر سے اندازہ ہورہا ہے کہ یہ مجھے کہیں دیکھ چکی ہے۔ اب اس کے دل میں کیا ہے؟ میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''

''میں تو تمہارے دل کی بات پوچھ رہی ہوں۔ میری بیٹی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''بہت ہی نیک خیال ہے۔ وہ ایک اچھی اور سیدھی سادی سی لڑکی ہے۔ کوئی بھی جوان اسے پہلی نظر میں پسند کر

قدرت سے ملے ہمیں تحفے...

اپنوں سے پیار نبھانے کے!

کسان

سن فلاور کوکنگ آئل

کسان اِتنا خالِص ۔ جتنا پیار

Website: www.kisan.com.pk
E-mail: info@kisan.com.pk

CERTIFIED BY "PSQCA"

صرف تیل ہی نہیں ذائقے اور صحت کا میل بھی!

سکتا ہے۔''

مونیکا نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ''اور تم نے پہلی نظر میں اسے پسند کرلیا ہے؟''

''میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آپ سچ کہہ رہی ہیں۔''

''تو میری زبان سے ایک اور سچ سن لو۔ اندھیرے اور اجالے کا میل نہیں ہوسکتا۔ تم رات ہو اور میری بیٹی دن ہے۔ دن اور رات کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے اور نہ ہی کبھی مل سکیں گے۔''

''کوئی بات نہیں۔ ہم دن اور رات کی طرح آگے پیچھے تو چل سکتے ہیں۔''

''پلیز، میری بیٹی بہت معصوم ہے۔ دنیا میں کتنی بے ایمانی اور مکاریاں ہوتی ہیں۔ وہ کچھ نہیں سمجھتی۔ میں جہاندیدہ ہوں۔ اپنی بیٹی کا برا بھلا خوب سمجھتی ہوں لہٰذا آئندہ اس سے کبھی نہ ملنا۔ وہ نظر آجائے تو کترا جانا۔''

''پلیز، یہ باتیں آپ اپنی بیٹی کو سمجھائیں کہ اگر میں کہیں نظر آجاؤں تو وہ مجھ سے کترا جائے۔''

وہ جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ مونیکا نے کہا۔ ''تم نہیں جانتے' اس کے باپ کی پہنچ کتنی اوپر تک ہے؟ وہ بہت ہی اثر رسوخ والا آدمی ہے۔ تم مشکل میں پڑجاؤ گے۔''

وہ جاتے جاتے رک کر بولا۔ ''آئندہ آپ دیکھیں گی کہ میں ان مشکلات سے کتنے مزے لے لے کر گزرتا رہوں گا؟''

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔ وہ غصے سے پیر پٹختی ہوئی بیٹی کے کمرے کی طرف جانے لگی۔ اپنا سر جھکائے سوچ رہی تھی۔ ''یہ سب کیا ہورہا ہے؟ وہ نوجوان میرے دل و دماغ پر کیوں چھا گیا ہے؟ میں نے سنا تھا کہ پہلی نظر میں محبت ہو جاتی ہے۔ کیا پہلی ملاقات میں ہی اس سے محبت ہوگئی ہے؟''

بے باک اس کے اندر موجود تھا۔ دیکھنا چاہتا تھا کہ ماں بیٹی کے درمیان کیا بات ہوتی ہے؟ اس نے بے باک کی مرضی کے مطابق سوچا۔ ''کیا وہ جبر امیرے دل و دماغ پر چھا رہا ہے یا میرا دل خود بہ خود اس کی طرف مائل ہورہا ہے؟''

وہ ایک سرد آہ بھر کر سوچنے لگی۔ ''وہ مجھ پر کیا جبر کرے گا؟ اس نے مجھے کالج سے گھر تک پہنچانے والی دوستی تو کی ہے۔ لیکن محبت یا لگاوٹ کا اظہار نہیں کیا ہے۔ میں ہی اس کے لیے پاگل ہورہی ہوں۔''

مونیکا ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر آئی تو وہ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھیں اور تیور بتا رہے تھے کہ اس نے بیٹی کی چوری پکڑ لی ہے۔ وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟ تم اس کالے کلوٹے پر مرمٹی ہو؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بدستور سر جھکائے کھڑی رہی۔ ماں نے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔ ''اب چپ کیوں ہو؟ تم ایسی تو نہیں تھیں؟ کتنے ہی خوبصورت نوجوان تم سے لفٹ لیتے رہے ہیں اور تم ان سب کو نظر انداز کرتی رہی ہو۔ کیا اسی دن کے لیے کہ ایک کالے کو ہمارے گھر لے آؤ اور اسے ہمارا داماد بنانے کی نادانی کرو؟''

وہ منہ پھیر کر بولی۔ ''میں کچھ نہیں جانتی۔ پلیز، مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔''

''اگر کچھ نہیں جانتیں تو بات یہاں تک کیسے بڑھ گئی؟ یہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں دونوں ہاتھوں سے بج رہی ہے۔ وہ بھی تمہارا دیوانہ ہے۔ مجھے چیلنج کر کے گیا ہے کہ تمہارے باپ سے بھی نہیں ڈرے گا۔ جتنی بھی مشکلیں پیش آئیں گی۔ انہیں کھیل سمجھ کر کھیلے گا۔''

اینا نے چونک کر ماں کو دیکھا۔ یہ سن کر دل تیزی سے دھڑکنے لگا کہ آگ دونوں طرف لگی ہوئی ہے۔ صرف وہی پاگل نہیں ہے۔ وہ دیوانہ بھی اسے حاصل کرنے کے لیے اس کی ماں کو چیلنج کررہا ہے۔

مونیکا نے کہا۔ ''بیٹی! میں نے تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ اس کالے کو میری آنکھ سے دیکھو۔ میرے ذہن اور تجربے سے سمجھو۔ وہ پکا فراڈ ہے۔ تمہارے قابل نہیں ہے۔ تمہارے ڈیڈی اسے کبھی داماد کی حیثیت سے قبول نہیں کریں گے۔ تمہارا بھائی ریسلر ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ دیکھے گا تو اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ خوامخواہ میرا بیٹا قاتل بن جائے گا۔ قانون کی گرفت میں آجائے گا۔ کیا اپنے بھائی کی موت اور اپنے خاندان کی تباہی چاہتی ہو؟''

اس نے پریشان ہوکر کہا۔ ''میں کچھ نہیں جانتی کہ کیا چاہتی ہوں....؟ پلیز، مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ سوچنے دیں..... سمجھنے دیں۔''

وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے، تمہیں سوچنا' سمجھنا چاہیے لیکن مجھے آج ہی جواب دو کہ اس کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہو اور آئندہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھو گی۔''

وہ اسے تنہا چھوڑ کر وہاں سے چلی گئی اگر بے باک چاہتا تو مونیکا کے دماغ پر بھی قبضہ جما کر اسے اپنی طرف مائل کر سکتا تھا۔ اپنی حمایت پر آمادہ کرسکتا تھا لیکن بعد میں برین ماسٹر اس کے خیالات پڑھ کر معلوم کرلیتا کہ مونیکا کبھی اس کی مخالفت کرتی ہے اور کبھی حمایت میں بولتی ہے۔

اگر بے باک تنویمی عمل کے ذریعے مونیکا کو اپنی کنیز بنالیتا تب بھی کسی نہ کسی دن یہ بھید کھل سکتا تھا کہ مونیکا پر تنویمی عمل کیا گیا ہے۔

بے باک برین ماسٹر کو کسی شبہے میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ورنہ وہ محتاط ہو جاتا۔ اپنی بیوی بچوں پر تنویمی عمل کر کے انہیں کسی خفیہ پناہ گاہ میں پہنچا دیتا۔ بے باک کا اصل منصوبہ تو یہی تھا کہ اس کے بیوی بچوں کو اس کی کمزوری بنا دیا جائے اور ایسا کرنے کے لیے اس کا محتاط رہنا بہت ضروری تھا۔ وہ اپنا کے عشق میں مبتلا ہو کر کسی بھی طرح کی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔

فی الحال یہ بات اطمینان بخش تھی کہ انتقام لینے کے سلسلے میں اسے ابتدائی کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ وہ اس کی بیوی' بیٹی اور بیٹے کے دماغوں میں پہنچ سکتا تھا۔ بلکہ بیٹی کے تو بہت ہی قریب ہو گیا تھا۔ اب بیٹے سے نمٹنے کی باری تھی۔

فی الوقت اس نے سوچا کہ پچھلی رات میسج کے ذریعے اس نے تمام اکابرین کو خوف زدہ کیا تھا پھر سوئٹزرلینڈ میں فرانس کا ایک فوڈ منسٹر اور ان کی کمیٹی کا ایک چالباز مارا گیا تھا۔ ان تمام واقعات کا ردِ عمل کیا ہوا ہے؟ یہ دیکھنا ضروری تھا۔

بے باک مومن نے ان تمام سازش کرنے والوں کے نام، پتے اور فون نمبر بھی معلوم کر لیے تھے جنہوں نے فرہاد کی لاش کو بم دھماکے سے اڑا دیا تھا۔ اس کے چیتھڑے اڑا کر اسے ناقابلِ شناخت بنا دیا تھا۔

وہ مختلف ذرائع سے ان تمام دشمنوں کی آوازیں سن کر ان کے اندر پہنچ کر خیالات پڑھنے لگا۔ بے باک نے ان کے خلاف جو طریقہ کار بنایا تھا۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکل رہا تھا۔ وہ سب بری طرح خوفزدہ تھے۔ انہیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ سوئٹزرلینڈ کے ایک ہوٹل میں فوڈ منسٹر مارا گیا ہے اور اس کمرے کی دیوار پر لکھا ہوا ہے۔ ''میں ڈھونڈ رہا ہوں، اپنے جسم کو.... اپنے دماغ کو...''

اس ہوٹل کی بارہویں منزل سے جس چالباز نے چھلانگ لگا کر اپنی موت کو گلے لگایا تھا۔ اس کے کمرے کی دیوار پر بھی یہی لکھا تھا۔ ''میں ڈھونڈ رہا ہوں۔ اپنے جسم کو... اپنے دماغ کو.....''

پچھلی رات ان سب نے وہ پُراسرار میسج وصول کیا تھا فرہاد کے خلاف سازش کرنے والے دو افراد کی موت اسی طرح پُراسرار طریقے سے ہوئی تھی اور جہاں ان کی موت ہوئی تھی۔ وہاں دیوار پر لکھی ہوئی تحریر چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ فرہاد کی آتما کسی نئے جسم میں سما گئی ہے۔ اب دو قتل کرنے کے بعد باقی سازش کرنے والوں تک بھی پہنچنے والی ہے۔

سب کے دماغوں میں خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ سب ہی اپنے اپنے طور پر سیکورٹی کے انتظامات سخت کر رہے تھے۔

وہ سمجھ رہے تھے کہ انتظامات اس وقت کارآمد ہو سکیں گے۔ جب فرہاد کی روح کسی کے جسم میں داخل ہو کر ان کے روبرو آئے گی۔ یہ بات بھی ریکارڈ میں تھی کہ فرہاد اپنی زندگی میں کبھی ان کے روبرو نہیں آیا تھا۔ ہمیشہ خیال خوانی کے ذریعے دن میں تارے دکھاتا رہا تھا۔

اس کے خلاف سازش کرنے والے امریکی اکابرین نے ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے کہا تھا کہ وہ ان پر عمل کر کے ان کے دماغوں کو لاک کر دیں۔ تاکہ وہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے بھی انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔

فرانس، جرمنی اور یو کے کے اکابرین بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کے دماغوں کو بھی لاک کر دیا جائے لیکن امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والے ان پر عمل کرتے' دماغوں کو لاک کرتے تو ان کے چور خیالات کے ذریعے ان کے ملک کے اہم راز بھی چرا کر لے جاتے اور لاعلمی میں انہیں اپنا تابعدار بنا لیتے۔

برین ماسٹر نے بابر کے پاس آ کر کہا۔ ''امریکی اکابرین اپنے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے ذریعے اپنے دماغوں کو لاک کرانے والے ہیں لیکن فرانس' جرمنی اور یو کے کے اکابرین بہت پریشان ہیں۔ وہ امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والوں کی خدمات حاصل کر کے انہیں اپنا راز دار نہیں بنانا چاہتے اور نہ ہی ان کے تابعدار بننا چاہتے ہیں۔''

بابر نے کہا۔ ''آپ حکم دیں' مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''تم ہر ایک یا آدھے گھنٹے بعد ان اکابرین کے اندر آتے جاتے رہو۔ جب بھی ان پر تنویمی عمل کیا جائے تو یہ معلوم کرو کہ کس آواز اور لب و لہجے کے ذریعہ ان کے دماغوں کو لاک کیا گیا ہے؟''

''ٹھیک ہے، میں ابھی سے ان کے دماغوں میں آتا جاتا رہوں گا۔''

برین ماسٹر نے کہا۔ ''یو کے کے تین' فرانس کے دو اور جرمن کے دو اکابرین فرہاد کی لاش کو نابود کرنے کی سازش میں شریک تھے۔ ہمیں ان سات اکابرین کے دماغوں میں خاموشی سے جانا چاہیے اور انہیں گہری نیند سلا کر ان پر عمل کرنا چاہیے۔ اس طرح ایک تو ہم فرہاد کی آتما کے لیے ان کے دماغوں میں پہنچنے کا راستہ روک دیں گے۔ دوسرا یہ کہ ان

سب کو اپنا معمول اور تابعدار بنالیں گے۔''

''ہاں، ہمیں اس نئے جسم میں آنے والے فرہاد کو انتقامی کارروائی کے سلسلے میں ناکام بنانا ہوگا۔''

''تم فی الحال امریکی اکابرین کی طرف توجہ دو۔ میں دوسرے ممالک کے اکابرین کو اپنا تابعدار بناتا رہوں گا۔ ان کے دماغوں کو لاک کرتا رہوں گا۔''

وہ دونوں اپنی اس پلاننگ پر عمل کرنے لگے۔ بے باک مومن ان کے بارے میں یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ لیکن امریکی اکابرین کے اندر پہنچ کر یہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اپنے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے ذریعے اپنے اپنے دماغوں کو لاک کر رہے ہیں۔

اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''مما! وہ تمام دشمن اس بات سے بری طرح خوفزدہ ہیں کہ فرہاد کی آتما نے کسی نئے جسم میں نئی زندگی کا آغاز کیا ہے اور آغاز کرتے ہی فوڈ منسٹر اور ایک چالباز کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ دیوار پر لکھی ہوئی تحریر نے انہیں بہت زیادہ دہشت زدہ کر دیا ہے۔ اب وہ فرہاد کا راستہ روکنے کے لیے اپنے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے ذریعے اپنے دماغوں کو لاک کر رہے ہیں۔ ایسے وقت ہمارے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو ان سب کے اندر آتے جاتے رہنا چاہیے۔''

''تم الپا کو میرے پاس بھیج دو۔ میں اس سے بات کرتی ہوں۔''

بے باک نے خیال خوانی کے ذریعے الپا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''سسٹر! مما نے تمہیں بلایا ہے۔''

وہ فوراً ہی میرے پاس آکر بولی۔ ''السلام علیکم! میں حاضر ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''وعلیکم السلام! میرے خیالات پڑھو۔ ابھی معلوم ہو جائے گا کہ میں نے تمہیں کس لیے بلایا ہے؟''

وہ تھوڑی دیر تک میرے خیالات پڑھتی رہی پھر بولی۔ ''میں سمجھ گئی۔ آپ چاہتی ہیں' جب ان اکابرین کے دماغوں کو لاک کیا جائے تو ہم ٹیلی پیتھی جاننے والے وہاں موجود رہیں۔ جس آواز اور لب و لہجے کے ذریعے ان کے دماغوں کو لاک کیا جائے' انہیں ذہن نشین کر لیں؟''

میں نے بے باک سے پوچھا۔ ''امریکا میں کتنے اکابرین اس سازش میں شریک تھے؟''

اس نے کہا۔ ''وہاں چار ہیں۔ یو کے میں تین' فرانس میں دو اور جرمنی میں دو اکابرین ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ہمیں اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ یو کے' فرانس اور جرمنی کے اکابرین بھی اپنے اپنے دماغوں کو لاک کرانا چاہیں گے لہٰذا ہمارے کئی ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو ان سب کے اندر آتے جاتے رہنا چاہیے۔''

الپا نے کہا۔ ''میں ابھی جا کر اعلیٰ حضرت سے بات کرتی ہوں۔ وہ تمام ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو ہدایت دیں گے تو سب ہی الرٹ ہو جائیں گے اور بڑی مستعدی سے ان سازش کرنے والوں کی خبر لیتے رہیں گے۔''

ایک پلاننگ ماسٹر نے کی تھی۔ وہ اس پر عمل کر رہا تھا اور ایک پلاننگ ہم نے کی تھی۔ ہم نے بھی اس پر عمل شروع کر دیا۔ ہمارے کئی ٹیلی پیتھی جاننے والے یو کے' فرانس، جرمنی کے اکابرین کے اندر جانے آنے لگے تو پتا چلا کہ ان کے دماغوں کو بھی نامعلوم ٹیلی پیتھی جاننے والے لاک کرنے آگئے ہیں اور ان پر عمل کر رہے ہیں۔

یہ معلوم کرنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ نامعلوم اور پُراسرار بننے والے برین ماسٹر اور بابر ہیں۔ انہوں نے یو کے' فرانس اور جرمنی کے سات اکابرین پر مکمل کرتے وقت ایک تو ان کے دماغوں کو لاک کیا۔ دوسرا یہ کہ انہیں اپنا تابعدار بنالیا اور تیسری بات ان کے ذہنوں میں یہ نقش کی کہ فرہاد کی آتما کسی دوسرے جسم میں رہ کر ایسی ذہانت اور بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ نہیں کر سکے گی۔ جیسا کہ فرہاد اپنے دماغ سے کیا کرتا تھا۔ اس کے تمام بچے ہمارے مقابلے میں کمزور پڑ جائیں گے۔ لہٰذا انہیں اپنے عامل کی مرضی کے مطابق پارس، پورس، کبریا، اعلیٰ بی بی اور عدنان کو ہر ممکن طریقے سے ٹریپ کرنا ہے۔ اس طرح کامیابی یقینی ہوگی۔

میں نے الپا اور بے باک سے کہا۔ ''یہ بات شروع سے میرے ذہن میں تھی کہ دشمن کم ظرف ہے۔ وہ فرہاد کی موت کا سوگ منانے کے لیے چالیس دن بھی انتظار نہیں کریں گے۔ جلد ہی اپنی کمینگی دکھائیں گے۔''

الپا نے کہا۔ ''اور وہ یہی کر رہے ہیں۔ پارس، پورس، عالی، کبریا اور عدنان کو کسی طرح ٹریپ کرنا چاہتے ہیں یا ہلاک کر دینا چاہتے ہیں۔''

بے باک نے کہا۔ ''وہ ایسا خواب دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔ اس سے پہلے ہی ہم انہیں عبرت ناک انجام تک پہنچا دیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''بے باک! ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ برین ماسٹر اور بابر کو کبھی یہ معلوم نہ ہو کہ ہم ان کی پلاننگ سے واقف ہو گئے ہیں۔ بہت رازداری سے ان کے

خلاف جوابی کارروائی ہونی چاہیے۔ انہیں اس خوش فہمی میں مبتلا رکھنا ہوگا کہ ہم ان کی شیطانیت سے بے خبر ہیں۔''

وہ بولا۔ ''ابھی ہم اسی سلسلے میں مصروف رہیں گے اور ان تمام اکابرین کے اندر آتے جاتے رہیں گے۔ ان کے بعد مجھے برین ماسٹر کے بیٹے جان رچ سے بھی نمٹنا ہے۔ کیا آپ نے پارس، پورس، عالی اور کبریا سے ریسلنگ کی بات کی ہے؟''

''ہاں، پارس بہت عرصے سے ادارے میں نہیں آیا۔ الپا کے ساتھ باہر رہتا آیا ہے۔ اس لیے وہ فارم میں نہیں ہے۔ باقی پورس اور کبریا پوری طرح تیار ہیں۔ وہ آج رات کی فلائٹ سے نیویارک پہنچیں گے پھر وہاں سے فلاڈیلفیا جائیں گے۔''

بے باک نے پوچھا۔ ''کیا انہیں وہاں ریسلنگ میں شامل ہونے کی اجازت مل جائے گی؟''

''ہاں، وہاں کئی ریسلرز کے الگ الگ گروپ بنے ہوئے ہیں۔ کبریا نے خیال خوانی کے ذریعے ایک گروپ کے اندر جگہ بنالی ہے۔ وہ وہاں پہنچتے ہی ان کی یونین کے ممبر بن جائیں گے پھر اس یونین کے ذریعے ہی انہیں مقابلے میں شریک ہونے کی اجازت مل جائے گی۔''

''ٹھیک ہے، میں جارہا ہوں پھر کسی وقت آؤں گا۔''

وہ چلا گیا۔ الپا نے کہا۔ ''میں بھی اعلیٰ حضرت کے پاس جارہی ہوں۔ وہ اپنے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو ہماری پلاننگ کے مطابق عمل کرنے کی ہدایت دیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''تم جاؤ مگر عالی کو میرے پاس بھیج دو۔''

وہ چلی گئی ایک منٹ کے اندر ہی عالی نے میرے اندر آکر کہا۔ ''ہائے مما! آپ نے مجھے یاد کیا ہے؟''

''ہاں، میں تمہاری خیریت معلوم کرنا چاہتی ہوں۔''

''میں بالکل خیریت سے ہوں مما!''

''تو پھر تمام بچے بابا صاحب کے ادارے میں پہنچ جائیں۔''

''وہ مما! آپ تو ایمان علی کے بارے میں جانتی ہیں کہ وہ کیسی سچی پیش گوئی کرتے ہیں؟ انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں سفر کرنے کے لیے حیدرآباد شہر سے تو کیا اس گھر سے بھی باہر نہیں جاسکوں گی۔ میں نے ان کی پیش گوئی کے باوجود جہاز میں اپنے اور ان کے لیے سیٹ ریزرو کرائی تھی لیکن وہی ہوا جو انہوں نے کہہ دیا تھا۔''

''کیا کوئی بڑی رکاوٹ پیش آئی تھی؟''

اس نے بتایا کہ کس طرح گروگھنٹال نے اس کے خلاف انتقامی کارروائی کی تھی اور کالے عمل کے ذریعے اسے عذاب میں مبتلا کردیا تھا۔ ایسے وقت سسٹر الپا نے آکر اس جادوگر سے اسے نجات دلائی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''تم نجات حاصل کرنے کے بعد تو آسکتی تھیں؟''

''ایمان علی نے پھر پیش گوئی کی تھی کہ میرے ستارے گردش میں ہیں اس لیے سفر نہیں کرسکوں گی۔ دوسری بار بھی یہی ہوا اطلاع ملی کہ پاپا کی میت جس مردہ خانے میں رکھی گئی تھی اسے بم سے اڑا دیا گیا ہے۔ ان کی لاش کو ناقابل شناخت بنادیا گیا ہے اور اعلیٰ حضرت نے حکم دیا ہے کہ ان کی تدفین بابا صاحب کے ادارے میں نہیں ہوگی۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہہ دیا کہ جہاں بھی تدفین ہو وہاں ان کی نماز جنازہ بھی ادا نہ کی جائے۔ اب آپ ہی سوچیں میں پاپا کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ان کی آخری رسوم میں شریک نہیں ہوسکتی تھی تو وہاں آکر کیا کرتی؟ ایمان علی نے سمجھایا کہ ہم یہاں رہ کر ان کے لیے عبادت کریں گے اور اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت کی دُعا مانگیں گے۔''

''چلو اچھا ہے۔ جہاں رہو وہاں بہت محتاط رہو۔ دشمن اپنی کم ظرفی اور کمینگی سے باز نہیں آئیں گے۔ تم سب کو یتیم سمجھ کر ٹریپ کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔''

''پاپا نے اپنی زندگی میں بتایا تھا کہ برین ماسٹر کا ایک ماتحت آوڈی مین ہے۔ جو غیر معمولی قوت سماعت رکھتا ہے۔ تقریباً پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر ہونے والی گفتگو کو بہ آسانی سن سکتا ہے پھر اپنے دماغ میں ماسٹر کو بلا کر اس کی آواز سناتا ہے تاکہ ماسٹر خیال خوانی کے ذریعے اس ٹارگٹ تک پہنچ سکے۔''

''ہاں، میں یہ سب جانتی ہوں۔''

''پاپا نے ہمیں تاکید کی تھی کہ ہم اپنی آواز اور لب و لہجے کو بدل لیں۔ جب سے میں نے یہی کیا ہے اگر وہ آوڈی مین اِدھر بھٹکتا ہوا آئے گا تو میری سابقہ آواز اور لب و لہجے کو سن نہیں سکے گا۔''

''شاباش! اسی طرح محتاط رہو اور ٹیلی پیتھی کے ذریعے دشمن کی مصروفیات پر بھی نظر رکھو۔ اب صرف برین ماسٹر ہی نہیں امریکا اور دوسرے بڑے ممالک کے اکابرین بھی یہی سوچیں گے، یہی سمجھیں گے کہ تمہارے پاپا کے نہ ہونے سے تم لوگوں کی آدھی سے زیادہ قوت ختم ہوچکی ہے۔ تم سب ان کے مقابلے میں بچے ہو۔ اس لیے وہ ہر طریقے سے تمہیں ٹریپ کرنے کی کوشش کریں گے۔''

''آپ درست کہہ رہی ہیں۔ میں خیال خوانی کے ذریعے ان سب کی مصروفیات پر نظر رکھوں گی۔''

''ایک نومسلم ٹیلی پیتھی جاننے والا تمہارے پاپا کا بہت عقیدت مند ہے۔ ان سے بہت محبت کرتا رہا ہے۔ الپا نے اس کے چور خیالات اچھی طرح پڑھے ہیں۔ میں اس سے بہت اہم کام لے رہی ہوں۔ تم اسی کے ذریعے ان تمام دشمنوں کے نام پتے اور ٹیلی فون نمبر معلوم کرسکتی ہو جنہوں نے تمہارے پاپا کی لاش کو ناقابل شناخت بنانے کی سازش کی تھی۔''

میں اسے بے باک مومن کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگی۔ اس نے کہا۔ ''مما! میں آپ سے محبت کرنے والے اور آپ کی تابعداری کرنے والے جوان سے ضرور ملنا چاہوں گی۔''

''تم ابھی الپا کے پاس جاؤ۔ وہ تمہیں بے باک مومن کے پاس پہنچادے گی۔''

اس نے الپا سے رابطہ کیا۔ ''ہیلو سسٹر!''

وہ آگے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے ہی الپا نے کہا۔ ''السلام علیکم.... آیندہ ہیلو نہ کہنا۔''

عالی نے سلام کا جواب دیتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔ ''وعلیکم السلام۔ آپ... آپ مجھے سلام کررہی ہیں؟''

''ہاں، تمہارے لیے یہ خوشخبری ہے کہ میں نے اسلام قبول کرلیا ہے اور اس وقت بابا صاحب کے ادارے میں ہوں۔''

عالی نے خوش ہوکر کہا۔ ''ہائے سسٹر! یہ تو تم نے بہت بڑی خوشخبری سنائی ہے۔ میں تمہیں اسلام قبول کرنے کی مبارکباد دیتی ہوں۔''

الپا اسے یہ بھی بتانے لگی کہ آیندہ چار ماہ کے بعد پارس سے اس کا نکاح پڑھایا جائے گا۔ عالی نے خیال خوانی کے ذریعے اسے چومتے ہوئے کہا۔ ''آئی لو یو سسٹر! اب تو تم میری باقاعدہ بھابھی بن کر رہا کرو گی۔ اعلیٰ حضرت ہمیں بہت ساری خوشیاں دے رہے ہیں اور اس طرح پاپا کی جدائی کا صدمہ کچھ کم کررہے ہیں۔''

وہ دونوں تھوڑی دیر تک اس سلسلے میں باتیں کرتی رہیں پھر عالی نے کہا۔ ''مما نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ تاکہ بے باک مومن سے میرا تعارف کراسکو۔''

الپا نے اسی وقت بے باک مومن کو مخاطب کیا۔ اس نے کہا۔ ''السلام علیکم سسٹر!''

وہ بولی۔ ''وعلیکم السلام! اس وقت تمہاری ایک اور بہن تم سے ملنا چاہتی ہے۔ بوجھو تو وہ کون ہے؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یہ کوئی مشکل پہیلی نہیں ہے۔ جب وہ خیال خوانی کے ذریعے آگئی ہے تو یقیناً میری پیاری بہن اعلیٰ بی بی ہوگی۔''

عالی نے کہا۔ ''آئی لو یو بے باک! مما نے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔''

''مما بہت گریٹ ہیں۔ انہوں نے مجھے پاپا کی فیملی کا ممبر بنالیا ہے۔ یہ میرے لیے اتنا بڑا اعزاز ہے جس کی میں توقع بھی نہیں کرسکتا تھا۔''

''مما نے بتایا ہے کہ تم ان تمام سازش کرنے والوں کے نام پتے اور ٹیلی فون نمبرز جانتے ہو جنہوں نے پاپا کی لاش کو ناقابل شناخت بنانے کی سازش کی تھی۔ میں ان لوگوں تک پہنچنا چاہتی ہوں۔''

''وہ تعداد میں گیارہ تھے۔ ان میں سے دو کو میں نے مما کے تعاون سے جہنم میں پہنچادیا ہے۔ اب نو رہ گئے ہیں۔ ان میں سے دو امریکی ہیں۔ تین کا تعلق یو کے سے ہے اور باقی چار کا تعلق فرانس اور جرمنی سے ہے۔ میں تمہیں ان سب کے اندر پہنچا سکتا ہوں۔''

''تم واقعی بہت مستعد ہو۔ اس لیے مما تمہیں پسند کرتی ہیں۔ انہوں نے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے تمہیں اپنے ساتھ رکھا ہے۔''

''یہ میرے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔ آؤ میں تمہیں ان دشمنوں کے اندر لے چلتا ہوں۔''

الپا نے کہا۔ ''تم بھائی بہن دشمنوں کی خبر لو۔ میں جارہی ہوں۔''

بے باک عالی کو اپنے دماغ میں لے کر ایک امریکی اعلیٰ عہدیدار کے اندر پہنچ گیا۔ وہ بیڈ پر چاروں شانے چت لیٹا ہوا تھا۔ اس پر ایک ٹیلی پیتھی جاننے والا عمل کررہا تھا۔ بے باک اس کے دماغ سے نکل کر عالی سے بولا۔ ''پلیز، بابا صاحب کے ادارے میں جاکر یہ معلوم کرو، ہمارا کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا اس وقت یہاں موجود ہے یا نہیں؟''

عالی نے فوراً ہی معلوم کیا تو پتا چلا کہ ہمارا ایک ٹیلی پیتھی جاننے والا وہاں موجود ہے۔ صرف اس کے ہی نہیں اور دشمنوں کے اندر بھی ہمارے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کی آمد ورفت جاری ہے۔

بے باک مومن نے مطمئن ہوکر عالی کو دوسرے سازش کرنے والوں کے اندر پہنچادیا۔ وہ خوش ہوکر بولی۔ ''بے باک! تم بہت اچھے ہو۔ آئی لو یو مائی برادر!''

اس نے بھی کہا۔ ''آئی لو یو ٹو مائی سسٹر!''

''میں اب جارہی ہوں۔ ان دشمنوں کے اندر آتی جاتی رہوں گی پھر تم سے بھی رابطہ کروں گی۔ فی الحال خدا حافظ۔''

وہ دماغی طور پر اپنی جگہ حاضر ہوگئی۔ اس نے ایمان علی سے کہا تھا کہ وہ پھر سے اس کے زائچے کا مطالعہ کرے۔ یہ معلوم کرے کہ آیندہ وہ سفر کر سکے گی یا نہیں؟ اگر نہیں کر سکے گی تو یہ رکاوٹ کب تک رہے گی؟

اس نے عالی کی خواہش کے مطابق اسٹڈی کی تھی اور کہا تھا کہ آیندہ سفر کرنے کے لیے راستے کھلیں گے لیکن وہ تمام راستے پیچیدہ ہیں۔ کہیں نہ کہیں' کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیش آتی رہے گی۔

عالی نے پوچھا۔ ''کیا تم وضاحت سے ان رکاوٹوں کے بارے میں معلوم نہیں کر سکتے؟ ہماری نظر میں چند اہم دشمن ہیں۔ جیسے برین ماسٹر، سپر پاور اور دوسرے بڑے ممالک کے چند اکابرین۔ ان سب کو پیش نظر رکھ کر یا ان دشمنوں کے زائچے بنا کر ان کے حوالے سے کارآمد معلومات فراہم کر سکتے ہو؟''

''کوشش کرنے سے کیا نہیں ہوسکتا؟ تم خیال خوانی کے ذریعے ان دشمنوں کے چور خیالات پڑھو۔ ان کی پیدائش کا صحیح وقت تاریخ اور ان کے والدین کے نام معلوم کرو۔ میں ابھی ان کے زائچے بنالوں گا اور بہت کچھ معلوم کر سکوں گا۔''

''ٹھیک ہے، میں تمام معلومات حاصل کروں گی۔ کیا آج رات کہیں باہر کھانے کے لیے چلو گے؟''

''میں کئی برسوں سے جمعرات کی رات گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ رات کا کھانا بھی نہیں کھاتا۔ گوشہ نشین رہتا ہوں۔ اپنے اوپر والے اسٹڈی روم میں لاک ہو جاتا ہوں پھر صبح تک وہاں کوئی مجھے ڈسٹرب کرنے نہیں آتا۔''

''تم نے پہلے تو مجھے نہیں بتایا کہ ہفتے کی ایک رات کے لیے گوشہ نشین ہو جاتے ہو؟ آخر کرتے کیا ہو؟''

''عبادت کرتا ہوں۔ علم نجوم اور فلکیات کے علوم کے متعلق زیادہ سے زیادہ اسٹڈی بھی کرتا رہتا ہوں۔''

عالی بے باک کے ساتھ مصروف رہنے کے بعد دماغی طور پر اپنی جگہ حاضر ہوگئی۔ اس وقت حیدرآباد میں آدھی رات گزر چکی تھی۔ ایمان علی کی محل نما کوٹھی میں سب ہی سو رہے تھے۔ وہ اپنے معمول کے مطابق اوپر والے کمرے میں جاکر گوشہ نشین ہوگیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ صبح تک اسے گھر کا کوئی فرد مخاطب نہیں کرتا۔ فون کے ذریعے بھی ڈسٹرب نہیں کرتا۔

عالی نے سوچا۔ ''مجھے بھی اس کی تنہائی میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ کل کسی وقت اس سے بات کی جا سکتی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے بیڈ پر آگئی پھر اپنے دماغ کو ہدایت دی کہ وہ صبح تک سوتی رہے۔ اس دوران کوئی غیر معمولی بات ہو یا کوئی اس کے کمرے میں آنا چاہے تو اس کی آنکھ کھل جائے۔

ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ آرام سے سوتی رہی۔ ایمان علی اپنے کمرے میں جاگ رہا تھا۔ وہ رات کے آٹھ بجے تک اس کمرے میں آجاتا تھا۔ وہاں بیٹھ کر بڑی توجہ سے دیگر علوم کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ گیارہ بجے تک سو جاتا تھا۔ دو گھنٹے کی نیند پوری کرنے کے بعد پھر جاگ جاتا تھا۔ وضو کر کے نماز تہجد ادا کرتا تھا اور دوبارہ پڑھنے کے لیے بیٹھ جاتا۔

اس رات اس نے اپنے سامنے میز پر اپنا اور عالی کا زائچہ رکھا۔ زیر لب کلام پاک کی آیتیں پڑھتا رہا پھر ایک ہاتھ اپنے زائچے پر اور دوسرا ہاتھ عالی کے زائچے پر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔

کمرے میں روشنی تھی لیکن آنکھوں کے پیچھے گہری تاریکی..... اور اس تاریکی میں کلام پاک کی آیتیں دھیمی دھیمی سی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنے ذہن میں ایک خاص آیت پڑھتا جارہا تھا۔ اس آیت کے معنی و مفہوم کے مطابق اس کے خیالات تاریکی میں اسی سمت سفر کر رہے تھے۔

پہلے معلوم ہوا کہ وہ مشرق کی طرف جارہا ہے۔ وہاں رکاوٹ کے طور پر کچھ دیواریں کھڑی ہیں لیکن آگے بڑھتے رہنے کا عمل جاری ہے اور وہ دیواریں گرتی جارہی ہیں۔

پھر اس نے دیکھا' مغرب کی طرف سفر جاری ہے۔ وہاں بھی راستے میں جو دیواریں تھیں' وہ ایک ایک کر کے گرتی جارہی تھیں۔ اسی طرح وہ شمال اور جنوب کی طرف سفر کرتا رہا۔ جب آگے بڑھنے کا عمل جاری رہا تو ادھر کی دیواریں بھی گرتی ہوئی دکھائی دیں۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے اور عالی کے زائچے پر تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دونوں جہاں بھی جائیں گے۔ مصائب میں مبتلا ہوتے رہیں گے لیکن ان مصائب سے نمٹ کر آگے بڑھتے جائیں گے۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اب وہ کلام پاک کی دوسری آیتیں پڑھ رہا تھا۔ ''اے ربِ جلیل! اے سماعت و بصارت و بصیرت کے مالک! جو آوازیں ہم نہیں سن سکتے۔ تو سن لیتا ہے۔ جو منظر ہم نہیں دیکھ سکتے۔ وہ تو ہمیں اپنی قدرت سے

دکھاتا ہے۔ اے ساعت والے! مجھے بھی سنا... اے بصارت والے! مجھے بھی دکھا۔ اے بصیرت والے! مجھے آگاہی دے۔''

اسے اپنی بند آنکھوں کے پیچھے رنگ برنگے قمقمے دور تک دکھائی دے رہے تھے۔ یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی شہر ہے اور وہ اس شہر سے گزرتا ہوا ایک جنگل میں پہنچ رہا ہے۔ اس جنگل میں ایک بہت ہی چھوٹی سی بستی دکھائی دے رہی تھی۔ چھوٹے بڑے مکانات نیم تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں اسٹریٹ لائٹ کے بلب روشن تھے۔ وہیں ایک بڑا سا بنگلا دکھائی دیا۔

وہ دوسرے ہی لمحے میں خود کو اس بنگلے کے اندر دیکھ رہا تھا۔ ایک وسیع و عریض چار دیواری میں جدید طرز کی بڑی بڑی مشینیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ سب میڈیکل سائنس اور مکینکل شعبے سے تعلق رکھنے والی مشینیں تھیں۔ ہر مشین کے ساتھ ایک بڑا سا مانیٹر منسلک تھا۔ اس مانیٹر پر ان مشینوں کی کارکردگی کے نتائج دیکھے جا سکتے تھے۔

ایک طرف بڑی سی میز تھی۔ وہاں ریوالونگ چیئر پر کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ جب وہ چیئر آہستہ آہستہ گھومنے لگی تب ایک عجیب سا انسان دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ انسانی تھا لیکن خرگوش کی طرح منہ آگے کو نکلا ہوا تھا۔ ناک کے نتھنے پھیلے ہوئے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی سنجیدہ اور اداس سی تھیں۔ کان بھی بڑے بڑے سے تھے۔ پیشانی چوڑی اور ابھری ہوئی تھی۔ اس کی پیشانی اور آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ غیر معمولی ذہانت کا حامل ہے۔ اگرچہ چہرہ عام انسانوں سے قدرے مختلف تھا۔

اس نے ایک مانیٹر کی طرف دیکھتے ہوئے پلکیں جھپکائیں تو وہ مانیٹر آن ہو گیا۔ وہاں دور تک ایک ریگستان دکھائی دے رہا تھا۔ تیز ہوا کے باعث ریت اڑ رہی تھی اور اسکرین دھندلا رہی تھی۔ اس دھند میں عالی اور ایمان علی دکھائی دیے۔ ان کے دونوں ہاتھ، پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ بدن پر بھی زنجیریں لپٹی ہوئی تھیں۔ وہ بڑی مشکل سے ایک ایک قدم اٹھاتے ہوئے چل رہے تھے۔ ان کے پاؤں ریت میں دھنستے جا رہے تھے۔

اس عجوبے نے پھر پلکیں جھپکائیں تو منظر بدل گیا۔ پارس، الپا، پورس، کبریا، انوشے اور تاشہ سب ہی اسی طرح زنجیروں میں جکڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بھی بڑی مشکل سے ایک ایک قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے پاؤں ریت میں دھنستے جا رہے تھے۔ ان سب سے آگے چھ برس کا عدنان تاشہ کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں بھی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ عدنان کے پاؤں ریت میں دھنس رہے تھے۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ تاشہ اسے سہارا دے رہی تھی۔

تیز ہوا کے باعث ان کے آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے ریت ہی ریت تھی۔ وہ بڑی مشکل سے ہوا کی مخالف سمت آگے بڑھتے ہوئے ایک جگہ پہنچ کر رک گئے۔ وہاں کچھ فاصلے پر ایک صلیب گڑھی ہوئی تھی۔ جس طرح حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھایا گیا تھا۔ ویسے ہی ایک صلیب پر فرہاد علی تیمور کو چڑھا دیا گیا تھا۔ اس کی دونوں ہتھیلیوں پر بڑی بڑی کیلیں ٹھونکیں گئی تھیں۔ سینے پر بھی دو کیلیں ٹھونکیں گئی تھیں۔ دونوں پاؤں رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ پیروں کے نیچے میں (سونیا) بال بکھرائے بیٹھی ہوئی تھی۔ ماتم کرنے کے انداز میں مٹھیوں سے ریت اچھال رہی تھی اور وہی ریت اپنے سر پر بھی ڈال رہی تھی۔

پھر اس صلیب کی بلندی پر وہ عجوبہ بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔'' I DO THE FINAL JUDGEMENT'' (آخری فیصلہ میں کرتا ہوں)

اچانک ہی ایمان علی کی آنکھیں کھل گئیں۔ تاریکی ختم ہو گئی۔ روشنی میں تمام مناظر گم ہو گئے۔ وہ حیرانی اور پریشانی سے سامنے دیوار کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

اس نے یہ بات آج تک کسی کو نہیں بتائی تھی کہ اسے ہر جمعرات کی رات آگاہی ملتی ہے۔ وہ تو علم نجوم میں کامل تھا۔ سچی پیش گوئی کرتا تھا لیکن اس علم نجوم کو آگاہی سے تقویت ملتی تھی۔ جب وہ اپنے علم سے کوئی پیش آنے والی بات معلوم کرتا تھا تو پہلے سے ملنے والی آگاہی کی روشنی میں اپنی معلومات کو جانچتا تھا' پرکھتا تھا پھر کوئی پیش گوئی کرتا تھا۔

ابھی جو آگاہی ملی تھی۔ اس نے اسے الجھا دیا تھا۔ الجھن یہ تھی کہ وہ فرہاد علی تیمور کی موت کی پیش گوئی کر چکا تھا۔ اس کے مطابق اس کی موت بھی ہو چکی تھی۔ لیکن آگاہی کے منظر میں اس نے فرہاد کو صلیب پر دیکھا تھا۔ اس کے جسم میں کیلیں ٹھونکی گئی تھیں۔ لیکن ایمان علی نے صاف طور پر دیکھا تھا کہ فرہاد بے جان نہیں ہے۔ ہلکے ہلکے سانس لے رہا ہے۔

اس کا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟ تازہ ترین آگاہی کے مطابق وہ سانس لے رہا ہے۔ اس کا مطلب' وہ کہیں زندہ ہے اور اس کی پچھلی پیش گوئی کسی وجہ سے غلط ہو گئی ہے۔

اس نے فرہاد کے زائچے کا مطالعہ کرنے اور اسے سمجھنے

میں کہیں کوئی غلطی کی ہے۔ پہلی پیش گوئی کے وقت اسے کوئی آگاہی نہیں ملی تھی۔ اس نے علم نجوم کے حوالے سے پورے اعتماد کے ساتھ کہہ دیا تھا کہ فرہاد کی موت شیوانی کی موت سے مشروط ہے۔ وہ مرے گی تو فرہاد کی موت بھی واقع ہوگی۔ ایسا ہوا بھی تھا اور جو ہو چکا تھا اب وہ سچ ہوتے ہوئے بھی سچ نہیں رہا تھا۔

ایمان علی حیرانی سے سوچ رہا تھا۔ ''عالی کے پاپا سانس لے رہے ہیں۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ اگر وہ زندہ ہیں تو پھر کہاں گم ہو گئے ہیں؟ کسی سے رابطہ کیوں نہیں کر رہے ہیں؟ کیا اس آگاہی کے مطابق میں یہ سمجھ لوں کہ اس عجوبے نے پاپا کو اپنا اسیر بنا رکھا ہے؟ ان کے بعد وہ مجھے' عالی کو اور ان کے تمام بچوں کو بھی اسیر بنا لے گا؟''

وہ آگاہی بڑی ہی تکلیف دہ تھی۔ پھر بھی اسے اچھی طرح سمجھنا تھا۔ اس کے کتنے ہی پہلوؤں پر غور کرنا تھا۔ پہلی بات یہی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ عجوبہ کون ہے؟ وہ انسان ہی ہے یا کوئی بلا ہے جو فرہاد اور اس کی فیملی کو بالکل ہی بے بس بنا دے گی۔ ان سب کو فرہاد کی موت کا تماشا دکھائے گی؟

ایمان علی کے ذہن میں سب سے اہم سوال یہ چیخ رہا تھا کہ عالی کے پاپا کہاں ہیں؟ مجھے ملنے والی آگاہی آج تک کبھی غلط نہیں ہوئی۔ یہ بھی غلط نہیں ہوگی۔ وہ زندہ ہیں مگر کہاں ہیں؟ کیا کسی نے انہیں بے بس و مجبور بنا رکھا ہے یا قدرتی حالات نے ان کی یادداشت چھین لی ہے اور وہ سب کو بھلا بیٹھے ہیں؟

وہ جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی اُلجھ رہا تھا۔

☆☆☆

کرونا' فرمان اور ٹونی جے اس داستان میں اب اہم رول ادا کرنے والے ہیں۔ اس لیے ان کا ذکر لازمی ہو گیا ہے۔ کرونا کئی دنوں سے فرمان کی حویلی میں مہمان کے طور پر تھی۔ فرہاد نے اپنے کام کے سلسلے میں فرمان کو تلاش کرنے بھیجا تھا اور وہ اسے تلاش کرتی ہوئی اس کی حویلی میں پہنچ گئی تھی۔

پہلے وہ حویلی میں اس کی مہمان بنی پھر اس کے دل کی مہمان بن گئی۔ فرمان خوب سوچ سمجھ کر اسے اپنی شریک حیات بنانا چاہتا تھا۔ ابتدا میں عالی اس کی آئیڈیل تھی۔ لیکن بعد میں عالی اس سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا تھا کہ وہ کبھی اتنے بڑے باپ کی بیٹی کا لائف پارٹنر نہیں بن سکے گا۔

عالی کے بعد اس کی زندگی میں ایک انڈین عورت آئی تھی۔ وہ ایک کالا عمل کرنے والے چنڈال جوگیا کی بیٹی تھی۔ اس کا پتی مر چکا تھا۔ فرمان اس کے پتی کا ہم شکل تھا۔ اس لیے وہ اس پر مرمٹی تھی۔ اس طرح وہ ایک جادو کی چکر میں پڑ گیا تھا۔ چنڈال جوگیا نے اپنے منتروں کے ذریعے اسے اپنا داماد بننے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس نے سحر زدہ ہو کر مجبوری کی حالت میں ایک عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزاری تھی۔ اس کے بعد اسے نجات مل گئی تھی۔ دوسری طرف چنڈال جوگیا نے ٹونی جے کو بھی اپنا بدترین غلام بنا کر رکھا تھا۔ جب اسے بھی نجات ملی تو ٹونی جے اور فرمان دوست بن گئے۔ انہوں نے متحد ہو کر چنڈال جوگیا سے انتقام لیا اور یہ عہد کیا کہ آئندہ خیال خوانی کریں گے اور نہ ہی کسی عورت کے چکر میں پڑیں گے۔

ٹونی جے نے کہا۔ ''ہم ٹیلی پیتھی جاننے والے بڑے فخر سے یہ سمجھتے ہیں کہ ساری دنیا کو جیت لیں گے اور اپنے مخالف ٹیلی پیتھی جاننے والوں پر بھی حاوی ہو جائیں گے۔ لیکن یہی خوش فہمی ہمیں مار ڈالتی ہے اور ہم کسی نہ کسی کالے جادو جاننے والے کے اسیر بن جاتے ہیں۔''

فرمان نے کہا۔ ''بے شک، اگر گوشہ گمنامی میں رہیں' کبھی خیال خوانی نہ کریں تو کوئی دشمن ہماری طرف نہیں آئے گا۔ ہم سکون سے زندگی گزارتے رہیں گے۔ آئندہ کبھی زندگی اور موت کا مسئلہ پیش آئے گا تب مجبور ہو کر ہم خیال خوانی کریں گے۔''

یہ عہد کرنے کے بعد وہ دونوں ایک عرصے تک گوشہ نشین رہے۔ اب کرونا کے آنے پر دوبارہ اس داستان میں شامل ہو رہے ہیں۔ ایک دن کرونا نے فرمان سے پوچھا۔ ''میں کب تک تمہارے گھر میں مہمان بن کر رہوں گی؟''

وہ بولا۔ ''تم خود کو مہمان کیوں سمجھتی ہو؟ اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔''

''واہ! میں کسی رشتے کے بغیر اسے اپنا گھر کیسے سمجھ لوں؟''

اس نے مسکرا کر کرونا کو دیکھا پھر کہا۔ ''رشتہ ہو سکتا ہے۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں' تم مجھے چاہنے لگی ہو؟''

اس نے پوچھا۔ ''اور تم.....؟''

''میرے دل میں بھی تمہارے لیے چاہت ہے۔ ہم ایک دوسرے کے لائف پارٹنر بن کر بہت اچھی زندگی گزار سکتے ہیں لیکن.....''

''لیکن کیا.....؟''

''دو اہم شرائط پر تمہیں عمل کرنا ہوگا۔''

''کیسی شرائط.....؟''

''پہلی شرط تو یہ ہے کہ تم میری اور ٹونی جے کی طرح گوشہ گمنامی میں رہو گی۔ خیال خوانی نہیں کرو گی۔''

''یہ تو بڑی اچھی شرط ہے۔ میں بھی دنیا وی جھمیلوں سے دور رہنا چاہتی ہوں۔ جب کوئی ایسی مشکل آئے گی۔ جسے ٹالنے کے لیے خیال خوانی لازمی ہو گی تب میں ٹیلی پیتھی کا سہارا لوں گی۔ ورنہ تمہاری طرح زندگی گزاروں گی۔''

''پاپا نے تمہیں بیٹی بنایا ہے۔ وہ کسی بھی معاملے میں تمہیں اپنے کام کے لیے بلا سکتے ہیں۔''

''ہم شادی کا فیصلہ کرتے ہی پاپا سے رجوع کریں گے۔ میں ان سے کہوں گی کہ فرمان اور ٹونی جے کی طرح میں بھی خیال خوانی سے باز آ رہی ہوں۔ ضرورت کے وقت دیکھا جائے گا۔ اب تم اپنی دوسری شرط بتاؤ؟''

''تم پہلے پاپا کو یہ بتاؤ کہ ہم ایک دوسرے سے متاثر ہیں اور جیون ساتھی بننا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ہی میں دوسری شرط بیان کروں گا۔''

اس وقت فرہاد زندگی کے آخری دن گزار رہا تھا۔ کرونا نے اس سے رابطہ کیا پھر اپنی اور فرمان کی شادی کا معاملہ پیش کیا۔ فرہاد نے کہا۔ ''شادی اپنے ہی مذہب میں بہتر ہوتی ہے۔ پیار اور جذبات میں بہہ کر غیر مذہب میں شادی کرنے کا انجام بعد میں بہت برا ہوتا ہے۔ میاں بیوی میں علیحدگی ہو جاتی ہے۔ بچے نہ ماں کے رہتے ہیں نہ باپ کے۔ تتر بتر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

تم اور ٹونی جے یہودی ہو۔ تم دونوں کا رشتہ ہو سکتا ہے۔ اس طرح ایک اچھی لائف گزر سکتی ہے اگر فرمان تمہارے لیے ضروری ہے تو تمہیں اس کا مذہب اپنانا چاہیے۔''

ان دنوں ٹونی جے فرمان سے ملنے اس کی حویلی میں آیا ہوا تھا۔ اس نے بھی فرہاد کی باتیں سنی تھیں۔ اس نے کہا۔ ''کرونا! پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تم دونوں کو جذباتی انداز میں قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔''

فرمان نے کہا۔ ''میں جذباتی نہیں ہوں۔ میں نے کرونا کے سامنے کہا تھا کہ شادی کرنے کی دو شرائط ہیں۔ میں نے دوسری شرط بیان نہیں کی تھی۔ دراصل میں چاہتا تھا کہ کرونا پاپا کی زبان سے سن لے۔''

وہ بولی۔ ''تو تم بھی یہی چاہتے ہو کہ میں تم سے شادی کرنے کے لیے اسلام قبول کر لوں؟''

''بے شک، میں یہی چاہوں گا۔ اسی طرح ہماری زندگی اچھی گزر سکے گی۔''

وہ بولی۔ ''نان سنس، دنیا میں کتنے ہی ایسے ہیں جو دوسرے مذہب میں شادی کرتے ہیں اور کامیاب ازدواجی زندگی گزارتے ہیں۔''

''میں نے ایسے نوے فیصد شادی کرنے والوں کا برا انجام بھی دیکھا ہے۔''

وہ بولی۔ ''تم مسلمان اتنے انتہا پسند کیوں ہوتے ہو؟ کسی کو بھی اپنے مذہب کی طرف کھینچ لینا چاہتے ہو۔ اپنے ہی مذہب کی برتری قائم رکھنا چاہتے ہو۔ کیا تم میرا مذہب قبول نہیں کر سکتے؟''

''میں دیوانہ مجنوں نہیں ہوں کہ ایک عورت کی خاطر دین و دنیا کو چھوڑ کر کپڑے پھاڑ کر جنگل میں نکل جاؤں۔''

ٹونی جے نے کہا۔ ''تم دونوں مزید بحث نہ کرو۔ ورنہ ہمارے آپس کے تعلقات میں تلخیاں پیدا ہو جائیں گی۔ یہ طے ہے کہ کرونا اپنے مذہب سے اور تم اپنے مذہب سے پھر نہیں سکتے۔ لہٰذا تم ایک دوسرے کو قائل نہ کرو۔ اپنے اپنے مذہب کی طرف مائل نہ کرو۔''

فرمان نے کہا۔ ''سوری کرونا! تم میری مہمان ہو۔ میرے لیے محترم ہو۔ ہم ہمیشہ اچھے دوست بن کر رہیں گے۔''

''ٹھیک ہے، دوست بن کر تو رہ سکتی ہوں لیکن ہمیشہ مہمان بن کر نہیں رہ سکتی۔ سوچ رہی تھی، پیرس چلی جاؤں گی۔ وہاں کچھ وقت گزاروں گی۔''

پھر اس نے ٹونی جے سے کہا۔ ''تم تو آج کل پیرس میں ہو نا؟''

''ہاں، مگر.....''

''تم ہچکچاتے کیوں ہو؟ میں خوامخواہ تم پر بوجھ نہیں بنوں گی۔''

وہ جلدی سے بولا۔ ''ارے، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا۔''

''کیا کہنا چاہتے تھے.....؟''

''یہی کہ پیرس میں میری مستقل رہائش نہیں ہے۔ میں آئندہ فیصلہ کر کے یہاں سے جاؤں گا کہ کس ملک کے کس شہر میں رہنا چاہیے؟''

''یعنی تم یہاں سے سیدھے پیرس نہیں جاؤ گے؟''

''ضرور جاؤں گا۔ وہاں میرا بہت سا ضروری سامان پڑا ہے۔ تم وہاں جانا چاہتی ہو تو مجھے خوشی ہو گی۔ میں جب تک وہاں رہوں گا۔ تم میری مہمان بن کر رہ سکتی ہو۔''

وہ دوسرے ہی دن فرمان کو چھوڑ کر ٹونی جے کے ساتھ

اُنکی زلفیں

بن کے گھٹا جب چھا جائیں
یا پھر ہَواؤں میں لہرائیں
... جادو سا چھا جائے

پاکستان بھر میں
سمجھدار خواتین یہ جانتی ہیں کہ
میڈی کیم شیمپو
کے باقاعدہ استعمال سے بالوں کو
حفاظت کے ساتھ ساتھ ملے...

پھولوں جیسی شگفتگی...
ہَواؤں جیسی نرمی...

Medicam Shampoos

25 روپے میں مہینے بھر کا شیمپو

پیرس چلی آئی۔ اس نے ٹونی جے سے پوچھا۔ ''کیا میری کوئی پرسنالٹی نہیں ہے؟''

''کیسی باتیں کررہی ہو؟ تم تو بے حد حسین اور پرکشش ہو۔ مقابلہ حسن میں بھی حصہ لے سکتی ہو پھر یہ کہ ٹیلی پیتھی جانتی ہو۔ ایک شاندار لائف گزار رہی ہو۔''

''تو پھر کوئی مجھے شادی کے لیے پرپوز کیوں نہیں کرتا؟''

''تم اس بات کی منتظر کیوں ہو کہ کوئی تمہیں پرپوز کرے؟ تم خیال خوانی کے ذریعے بے شمار خوبرو اور صحت مند جوانوں کے خیالات پڑھ سکتی ہو۔ جو تمہارے مزاج کے مطابق ہو اسے اپنی طرف مائل کرکے اس سے شادی کرسکتی ہو۔''

''تم کسی حسین لڑکی کے خیالات پڑھ کر شادی کیوں نہیں کرتے؟''

''کروں گا، ضرور کروں گا مگر خوب سوچ سمجھ کر.....''

کرونا نے اس کی بات سے اندازہ لگالیا کہ وہ اس کی طرف مائل نہیں ہے۔ بقول اس کے وہ حسین ہے، پرکشش ہے۔ اس کے باوجود وہ اس سے کترا رہا تھا۔ آخر اس میں ایسی بھی کیا خرابی ہے؟

یہ سوچ کر وہ جھنجلا گئی۔ اسے اپنی توہین کا احساس ہونے لگا۔ بہت عرصہ پہلے وہ پورس کی محبوبہ تھی لیکن اپنی خود غرضی اور مکاری کے باعث اس کی نظروں سے گر گئی تھی پھر روس میں ایک خطرناک ٹیلی پیتھی جاننے والے کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ وہاں سے ٹھوکریں کھاتی ہوئی انڈیا پہنچی تھی پھر ایشیا کے کئی ممالک میں بھٹکتی رہی تھی۔

بہت عرصے بعد قسمت مہربان ہوئی تو فرہاد نے اسے بیٹی بنالیا اور اس سے کام لینے لگا لیکن اسے اپنی اہمیت منوانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے کوئی ایسا کام کرے کہ اس کی واہ واہو جائے یا کوئی خوبرو قابل اور بہت ہی شہرت رکھنے والا مرد اس سے شادی کرکے اسے اہمیت دے دے لیکن وہ اس معاملے میں بدنصیب تھی۔ کتنے ہی مرد اسے منہ لگانے تو آتے تھے مگر دل لگانے نہیں آتے تھے۔

عورت بہت کچھ برداشت کرلیتی ہے لیکن یہ کبھی برداشت نہیں کرتی کہ اسے حسن و شباب کے معاملے میں کمتر سمجھا جائے۔ اس نے اُلجھ کر سوچا کہ کوئی اسے نہیں مانتا، نہ مانے۔ وہ جبراً خود کو منوائے گی۔

وہ پیرس میں ٹونی جے کے ساتھ تھی۔ اس نے کہا۔

''کرونا! یہ میرا ذاتی فلیٹ ہے۔ میں دو چار دن کے بعد یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تم یہاں مستقل رہ سکتی ہو۔ جب بھی جانا چاہو تو اسے لاک کرکے چلی جانا۔''

وہ دو چار دن میں اسے چھوڑ کر جانے کی بات ایسے کہہ رہا تھا، جیسے اس حسینہ کے وجود کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ اس نے موقع پاکر اس کے کھانے کی ایک ڈش میں اعصابی کمزوری کی دوا ملا دی۔ کوئی چیز ملتی نہ ہو تو چھین لینی پڑتی ہے۔ وہ بھی یہی کررہی تھی۔

اس نے ٹونی جے کو ایسے وقت کمزور بنایا تھا۔ جب قاہرہ میں فرمان کے سونے کا وقت تھا تاکہ وہ خیال خوانی کے ذریعے یا ٹیلی فون کے ذریعے اپنے دوست سے رابطہ نہ کرے۔

ٹونی جے نے کمزوری محسوس کرتے ہی گھبرا کر کرونا کو دیکھا پھر حیرانی سے پوچھا۔ ''کرونا! یہ..... یہ میں کمزوری کیوں محسوس کررہا ہوں؟ سچ بتاؤ تم نے کیا کیا ہے؟''

وہ مسکراتی ہوئی اس کے پاس آئی پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''تم دونوں دوست گمنامی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے دور رہنا چاہتے تھے۔ میں بھی تمہارے ساتھ یہی کرنا چاہتی تھی لیکن تم دونوں نے بڑے ہی دوستانہ انداز میں مجھے ٹھکرا دیا۔ اس نے مذہب کی آڑ لے کر ایسا کیا اور تم نے دو چار روز میں یہاں سے جانے کی بات کہہ کر یہ اچھی طرح سے سمجھا دیا کہ مجھ سے کترا رہے ہو۔ کیا میں اسی لیے پیدا ہوئی ہوں کہ تم جیسے لوگ میری قدر نہ کریں؟''

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ڈائننگ روم سے نکل کر بیڈروم میں آگیا۔ بیڈ کے سرے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں۔ یہ ضروری تو نہیں کہ عزت اور قدر کرنے کے لیے شادی کی جائے؟''

وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں چلی آئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''کیا ضروری ہے اور کیا ضروری نہیں ہے۔ اب یہ میں خود دیکھ لوں گی۔ آیندہ تم مجھے ٹھکرا کر نہیں جاسکو گے بلکہ میری ٹھوکر میں رہو گے۔''

''اوہ گاڈ! تم ایک دشمن کی زبان سے بول رہی ہو۔ یہ کیوں بھول رہی ہو کہ فرہاد علی تیمور جیسی ہستی نے تمہیں عزت دی ہے۔ اپنی بیٹی بنایا ہے اگر انہیں یہ بات معلوم ہوگی تو کیا ہوگا؟''

''جب پاپا اس دنیا میں رہیں گے تب ہی انہیں معلوم ہوگا۔ اب تو وہ جارہے ہیں۔ اِدھر وہ ہمیشہ کے لیے جارہے

ہیں۔اُدھر تم ہمیشہ کے لیے تابعدار بن کر رہو گے۔ میں تمہارے ذریعے فرمان کے دماغ پر بھی قبضہ جمانے کی کوشش کروں گی۔ دیکھوں گی کہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے کہاں کہاں پہنچ سکتی ہوں؟''

وہ اس کے اندر پہنچ گئی۔ وہ بے چارہ اس کی مرضی کے مطابق بیڈ پر چاروں شانے چت لیٹ گیا۔ وہ بولی۔ ''آنکھیں بند کرو۔ میں تم سے دشمنی نہیں کر رہی ہوں۔ ہم دونوں یہودی ہیں۔ میں ہمیشہ تمہیں اپنا لائف پارٹنر بنا کر رکھوں گی۔ ہم دونوں ٹیلی پیتھی کی دنیا میں بہت دور تک آگے بڑھ سکتے ہیں۔ ایک تو ہم دو ہیں۔ اس کے بعد میں نے تمہیں اور فرمان کو ان تین کو مامیں رہنے والوں اور ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے اندر پہنچایا تھا۔ ان تینوں کے دماغوں کو ایک مخصوص آواز اور لب ولہجے کے ذریعے لاک کیا گیا ہے۔ وہ مخصوص آواز اور لب ولہجہ ہم دونوں جانتے ہیں۔ ان تینوں کے اندر پہنچ سکتے ہیں۔ انہیں بھی ٹریپ کر کے اپنا تابعدار بنا سکتے ہیں۔ اس طرح ہمارے پاس ٹیلی پیتھی جاننے والوں کی ایک ٹیم بن جائے گی۔ پھر اس میں مزید ٹیلی پیتھی جاننے والوں کا اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔''

پھر وہ خوش ہو کر بولی۔ ''پاپا نے مجھے فرمان کی تلاش میں اس کے پاس بھیجا تھا۔ وہاں سے میں تمہارے پاس پہنچ گئی۔ بے چارے پاپا اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ لیکن میرے لیے کامیابی کے دروازے کھول کر جا رہے ہیں۔''

ٹونی جے بیڈ پر چاروں شانے چت لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ گہری نیند میں ڈوب گیا تھا۔ کرونا نے اسے بڑے پیار سے شوہر بنانا چاہا تھا۔ لیکن سیدھی انگلی اسے گھی نہیں نکلا۔ اب وہ ٹیلی پیتھی کی ٹیڑھی انگلی سے نکال رہی تھی۔ اسے اپنا تابعدار بنا رہی تھی۔

☆☆☆

پورس اور کبریا فلاڈیلفیا پہنچ گئے تھے۔ ایک ہفتے بعد وہاں کے مشہور ارینا میں ریسلنگ ورلڈ کے نامی گرامی پہلوان ایک دوسرے کے مقابلے پر آنے والے تھے۔ وہیں برین ماسٹر کا بیٹا جان رچ ہمیشہ کی طرح فاتح پہلوان کہلانے والا تھا۔

ان دونوں نے وہاں ایک بنگلا کرائے پر لیا تھا۔ پورس نے کہا۔ ''کبریا! ذرا معلوم تو کرو وہ فاتح پہلوان کہاں ہے؟ کیا کر رہا ہے؟''

کبریا نے کہا۔ ''ہاں، ارینا میں پہنچنے سے پہلے اسے دیکھنا چاہیے کہ وہ ہے کیا چیز.....؟''

اس نے بے باک سے رابطہ کیا۔ ''ہائے بے باک! میں کبریا بول رہا ہوں۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''ہاں بھائی بولو۔ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''سب سے پہلے یہ کہ ہم سے گفتگو کرتے وقت خادموں کی طرح خدمت والی بات نہ کیا کرو۔ تم ہمارے بھائی ہو۔ ہم میں سے ہو اور ہمیشہ ہمارے اپنوں کی طرح رہا کرو گے۔''

''شکریہ بھائی! میں آئندہ کسی خادم کی طرح نہیں۔ ایک چھوٹے بھائی کی طرح گفتگو کیا کروں گا۔''

''ابھی تم کیا کر رہے ہو؟''

''ممافرینکفرٹ پہنچنے والی ہیں۔ میں اب ان کے پاس جانے والا ہوں۔ وہ پاپا کے خلاف سازش کرنے والے ایک دشمن سے نمٹنے والی ہیں۔''

''ٹھیک ہے، تم ممما کے پاس جاؤ۔ اس سے پہلے مجھے برین ماسٹر کے بیٹے جان رچ کے اندر پہنچا دو۔''

وہ دوسرے ہی لمحے میں اسے وہاں پہنچا کر چلا گیا۔ جان رچ اپنے ایک عالیشان بنگلے کے بیڈروم میں تھا۔ اس وقت وہ کم اعشرت کدہ بنا ہوا تھا۔ شراب کے ساتھ ساتھ شباب کا نشہ اسے مدہوش کیے ہوئے تھا۔

ریکارڈ پلیئر سے موسیقی کی آواز ابھر رہی تھی۔ ایک حسینہ اس دھن پر رقص کر رہی تھی اور اپنا ایک ایک لباس اتارتی جا رہی تھی۔ کہتی جا رہی تھی۔ ''میں شعلہ ہوں۔ تمہیں اپنی جوانی سے جلا ڈالوں گی۔ میں بجلی ہوں۔ تم پر گروں گی تو پہلوان ہو کر بھی اٹھنا بھول جاؤ گے۔''

کبریا اس حسینہ کے اندر پہنچ گیا۔ وہ بولی۔ ''کتے کے بچے! تیرے باپ نے بھی کبھی پہلوانی کی ہے؟''

پھر وہ اپنے طور پر بولنے لگی۔ ''تم بہت خوبرو اور جوان ہو۔ دنیا کی تمام حسینائیں تم پر مرتی ہیں۔ میں بھی مرمٹی ہوں۔''

وہ گالی سنتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ غصے سے کہہ رہا تھا۔ ''تم نے مجھے کتے کا بچہ کہا...؟''

وہ رقص کرتے کرتے رک گئی پھر بولی۔ ''کیسی باتیں کر رہے ہو؟ میں تمہاری تعریفیں کر رہی ہوں اور تم اسے گالی سمجھ رہے ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''

وہ پریشان ہو کر اپنا سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''ابھی ایسا لگا تھا، جیسے تم نے مجھے گالی دی ہے۔''

''مائی ڈیئر! ابھی تم نے پہلا ہی پیگ پیا ہے اور ابھی سے بہک گئے ہو؟''

وہ ہنسنے لگی۔ کبریا نے دماغی طور پر حاضر ہو کر پورس سے کہا۔ ''وہ ماسٹر کا بگڑا ہوا بچہ ہے۔ ایک حسینہ اس کے سامنے رقص کر رہی ہے۔ ابھی اس نے ایک پیگ پیا ہے۔ دوسرا پینے والا ہے۔''

پورس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''آؤ اس کے پاس چلتے ہیں۔''

وہ دونوں اس کے بنگلے کی طرف جانے لگے۔ کبریا نے پورس کو اس کا فون نمبر بتایا۔ وہ نمبر پنچ کر کے فون کو کان سے لگا کر رابطے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی جھنجھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ اس لیے جھنجھلا گیا تھا کہ عیش و عشرت کے لمحات میں کسی کی بھی مداخلت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ناگواری سے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

پورس نے کہا۔ ''تمہارا باپ.....!''

وہ جلدی سے سنبھل کر بولا۔ ''اوہ ڈیڈی! آپ ہیں...؟ مگر اس وقت آپ نے فون کیوں کیا ہے؟''

''کیا فون کرنے کا کوئی وقت مقرر ہے؟ نالائق! اکھاڑے میں اترنے کے لیے صرف آٹھ دن رہ گئے ہیں۔ تم اس وقت کیا کر رہے ہو؟''

''میں، میں ویٹ لفٹنگ کر رہا ہوں۔ باڈی بنانے کے لیے.....''

''کیا شراب پی کر باڈی بنا رہے ہو؟ تمہارے منہ سے تو شراب کی بو آ رہی ہے۔''

وہ فوراً ہی منہ پر رومال رکھتے ہوئے بولا۔ ''نہیں تو، میں تو.....وہ۔''

پہلے تو وہ بوکھلا سا گیا تھا پھر عقل آئی کہ فون کے ذریعے باپ اس کے منہ کی بو کیسے سونگھ سکتا ہے؟ پھر یہ کہ وہ آواز اس کے ڈیڈی کی نہیں ہے۔ اس نے سی ایل آئی پر نمبر پڑھے۔ وہ اس کے ڈیڈ کا فون نمبر نہیں تھا۔

ادھر کبریا نے پورس کے اندر آ کر بتایا کہ وہ سی ایل آئی پر نمبر پڑھ چکا ہے۔

پورس نے سوچ کے ذریعے کہا۔ ''تم ابھی اس حسینہ کو بولنے پر مجبور کرو۔ تاکہ وہ اپنے باپ سے پھر کوئی جھوٹ نہ بول سکے۔''

ادھر اس نے سی ایل آئی پر نمبر پڑھنے کے بعد غصے سے کہا۔ ''کون ہو تم؟ مجھے الو بنا رہے ہو۔ میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔ ورنہ تم سے نمٹ لیتا۔ آئندہ کبھی میرے نمبر پر فون نہ کرنا۔''

وہ فون بند کرنا چاہتا تھا لیکن کبریا کی مرضی کے مطابق ایسا نہ کر سکا۔ پورس نے کہا۔ ''الو کے پٹھے! اپنے باپ کو باپ ماننے سے انکار کر رہے ہو۔ کیا میں تمہاری ماں کو بلاؤں؟ وہی گواہی دے گی کہ میں تمہارا باپ ہوں۔''

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''اے! تم کون ہو؟ کیوں مجھے فون پر پریشان کر رہے ہو؟''

پورس نے کہا۔ ''اصل بات یہ ہے کہ تمہارے باپ نے ایک جاسوس کی حیثیت سے میری خدمات حاصل کی ہیں۔ میں تمہارے پیچھے لگا رہتا ہوں اور تمہاری مصروفیات کے بارے میں معلوم کرتا رہتا ہوں۔ یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس وقت ایک لڑکی تمہارے بیڈروم میں ہے۔ میں ایک ایک پل کی رپورٹ تمہارے باپ تک پہنچاتا رہتا ہوں۔''

وہ گڑبڑا کر بولا۔ ''نہیں، نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میرے بیڈروم میں اس وقت کوئی نہیں ہے۔ میں، میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''مجھ سے مل کر کیا کرو گے؟ میں تو تمہارے باپ سے اپنی خدمت کا معاوضہ وصول کر رہا ہوں۔''

''میرے ڈیڈی تمہیں جتنا دیتے ہیں۔ میں اس سے زیادہ تمہیں دوں گا مگر تم میری کوئی رپورٹ ان کے پاس نہیں پہنچاؤ گے۔''

''انہوں نے مجھے دس دن کے لیے ہائیر کیا ہے اور پچاس ہزار دیے ہیں۔ تم کتنا دے سکو گے؟''

''میں پچیس ڈالرز زیادہ دوں گا۔ میرے حکم کے مطابق کام کرو گے تو اور بھی دوں گا۔''

''ٹھیک ہے، میں ابھی آ رہا ہوں لیکن اپنی آنکھوں سے کسی بے حیا لڑکی کو تمہارے کمرے میں نہیں دیکھنا چاہتا۔''

ایسے ہی وقت کبریا نے اس لڑکی کو بولنے پر مجبور کیا۔ اس نے دور ہی سے پوچھا۔ ''ہائے ڈارلنگ! اتنی دیر سے کس سے بات کر رہے ہو؟''

پورس نے پوچھا۔ ''یہ لڑکی کی آواز ہے نا؟''

وہ جلدی سے بولا۔ ''کسی کی نہیں۔ میرا ٹی وی آن ہے۔ اس میں سے آواز آ رہی ہے۔ میں نے ریموٹ سے اسے بند کر دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں ابھی آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔''

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ دوسری طرف وہ بھی فون بند کرتے ہوئے اس حسینہ سے بولا۔ ''جلدی جلدی کپڑے پہنو اور میرے اوپر والے بیڈروم میں جا کر چھپ جاؤ۔ یہاں

میرے ڈیڈ کا جاسوس آنے والا ہے۔ وہ تمہیں دیکھ کر اپنا ریٹ اور بڑھا دے گا۔ مجھ سے زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرے گا۔''

وہ اپنے کپڑے اٹھا کر اوپر والے بیڈروم کی طرف چلی گئی۔ پورس اور کبریا آدھے گھنٹے کے اندر وہاں پہنچ گئے۔ اس نے ان دونوں سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ یہاں دیکھ سکتے ہیں۔ کوئی لڑکی نہیں ہے۔ البتہ منہ سے بو آرہی ہے۔ میں مجبور ہو کر کبھی کبھی پی لیتا ہوں۔''

پورس نے اس کے منہ پر ایک گھونسا جڑتے ہوئے کہا۔ ''کیوں پیتا ہے؟ جب تیرے باپ نے منع کیا ہے تو کیوں پیتا ہے؟''

وہ ایک دم سے گھبرا گیا۔ اس نے پلٹ کر حملہ کیا تو ناکام رہا۔ جواباً پھر اس کے منہ پر ایک گھونسا پڑا۔ وہ پیچھے کی طرف گیا تو سینے پر ایک فلائنگ کک پڑی۔ وہ ایک سینٹر ٹیبل پر آ کر گرا پڑا۔ اس کے بوجھ سے وہ ٹیبل ٹوٹ گئی۔

کبریا نے کہا۔ ''ریسلنگ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ پہلوان لڑتے لڑتے رنگ سے باہر آجاتے ہیں اور کسی نہ کسی کو اٹھا کر میز پر پٹخ دیتے ہیں تو وہ میز ٹوٹ جاتی ہے۔''

وہ اپنی کمر پکڑے تکلیف سے کراہ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''تم میرے ڈیڈ کے جاسوس نہیں ہو۔ جھوٹ بولتے ہو۔ میرے مخالف ریسلروں کی یونین سے آئے ہو۔ مجھے مقابلے سے پہلے ناکارہ بنا دینا چاہتے ہو۔''

پورس نے اس کے منہ پر ایک ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ''تم تو خود ہی اپنے آپ کو ناکارہ بنا رہے ہو۔ تمہارے ڈیڈ نے کہا ہے اگر تم سیدھی طرح باز نہ آؤ تو تمہاری پٹائی کی جائے اور تمہیں صحیح راستے پر لا کر مقابلے کے قابل بنایا جائے۔''

وہ وہاں سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں اب کبھی شراب نہیں پیوں گا۔ کسی لڑکی کے پاس نہیں جاؤں گا۔ آج سے ہی ورزش کروں گا۔ مقابلے کے لیے پوری طرح تیار ہو جاؤں گا۔''

''تو کیا مقابلہ کرے گا؟ تو ایک بھی جوابی حملہ نہیں کر رہا ہے۔ کیا پہلوان ایسے ہوتے ہیں؟''

وہ ذرا تپ کر بولا۔ ''تم میرے ڈیڈ کے جاسوس ہو۔ اس لیے عزت کر رہا ہوں۔ ورنہ ابھی تمہاری ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دیتا۔''

پورس نے کہا۔ ''زیادہ نہیں، میری صرف ایک ہڈی توڑ دو یا میرے پاس آ کر مجھے چھولو پھر میں مانوں گا کہ تم ایک پہلوان ہو۔''

پورس کی بات ختم ہوتے ہی اس نے چھلانگ لگائی پورس ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ چھلانگ لگا کر کبریا کے سامنے پہنچا۔ اس نے کہا۔ ''گدھے کے بچے! میرے پاس کیوں آرہا ہے؟

یہ کہتے ہی کبریا نے اس کے منہ پر اپنے سر سے ایک ٹکر ماری تو اس کی ناک سے خون کی دھار بہنے لگی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گیا پھر چکرا کر زمین پر بیٹھ گیا۔

پورس نے ناک پر اسی جگہ ایک ٹھوکر ماری تو آنکھوں کے سامنے ستارے ناچنے لگے پھر تاریکی چھا گئی۔ وہ چکرا کر زمین پر گر گیا۔

پورس نے اس کی الماری کھولی۔ کبریا اس کے خیالات پڑھ کر معلوم کر چکا تھا کہ وہاں پانچ لاکھ روپے کیش رکھے ہوئے ہیں۔ اس نے کیش نکالتے ہوئے کہا۔ ''اس کے باپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں دو چور آئے تھے۔''

پھر وہ دونوں کیش سمیت کر وہاں سے چلے آئے۔ میں فرینکفرٹ پہنچی ہوئی تھی۔ بے باک نے کہا۔ ''پاپا کے خلاف سازش کرنے والا یہ شخص یہاں کی حکومت میں فارن افیئرز سے تعلق رکھتا ہے۔ فارن منسٹر لمبی چھٹی پر گیا ہے۔ اس لیے یہ اس کی جگہ کام کر رہا ہے۔ لہٰذا اسے فارن منسٹر ہی کہا جائے گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''ابھی یہ کہاں ہے؟''

''اپنے بنگلے میں ہے۔ بیوی بچوں سے رخصت ہو کر ایک اہم اجلاس میں شریک ہونے جا رہا ہے۔''

''اس کے دل میں ایک ذرا سی دہشت پیدا کرو اور اسے اجلاس میں جانے دو پھر وہاں سے بھٹکا کر اسے ایسی جگہ پہنچا دو جہاں ہمارے درمیان کوئی تیسرا مداخلت کے لیے نہ آئے۔''

بے باک نے اپنے موبائل میں وہی سم لگائی جس کے ذریعے وہ فرہاد کی آتما بن کر انہیں دہشت زدہ کیا کرتا تھا۔ اس وقت وہ فارن منسٹر اپنے گھر میں بیٹھا بیوی سے پیار بھری باتیں کر رہا تھا اور بچوں کو باری باری چوم رہا تھا۔ ایسے ہی وقت اس کے فون کا بزر بولنے لگا۔ اس نے اسے آن کر کے کان سے لگایا پھر کہا۔ ''ہیلو کون....؟''

ایک بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''پوچھتے کیا ہو؟ پہلے فون پر میرا نمبر پڑھو۔''

اس نے فون کو کان سے ہٹا کر نمبر پڑھے تو ایک دم سے گھبرا گیا۔ یہ سوچتے ہی سر گھومنے لگا کہ فرہاد کی آتما نے اسی

نمبر پر پہلی بار دھمکی دی تھی کہ وہ ایک نئے جسم میں آرہا ہے۔

اور وہ آگیا تھا۔ پچھلی بار اس نے سوئٹزرلینڈ میں ایک چالباز اور ایک فوڈ منسٹر کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور ان کی موت کو بہت ہی عبرتناک بنا دیا تھا۔

ان دونوں کی ہلاکت کے بعد جو باقی بچے تھے۔ ان سب کے لیے عبرت حاصل کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ اس فارن منسٹر کی اتنی جرأت نہیں ہو رہی تھی کہ اب اس فون کو دوبارہ کان سے لگا کر کچھ سنتا۔

اس کی بیوی نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان ہو گئے ہو؟''

وہ جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا۔ ''نہیں، ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ایک ایمرجنسی ہے۔ مجھے فوراً ہی جانا ہوگا۔''

اس کی بیوی نے اس کے ہاتھ سے فون چھین کر کان سے لگایا پھر پوچھا۔ ''ہیلو، تم کون ہو؟''

بے باک نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اپنے شوہر سے کہو آخری بار تمہیں اور اپنے بچوں کو پیار کر لے۔ اس کے بعد وہ پیار کرنے اور پیار کیے جانے کے قابل نہیں رہے گا۔''

وہ سہم کر بولی۔ ''تم ہو کون؟''

اس کے شوہر نے اس کے ہاتھ سے فون چھین کر کہا۔ ''یہ وہی..... وہی فرہاد کی آتما ہے... تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں ابھی اجلاس میں جا رہا ہوں۔ مجھے ایسی سیکیورٹی دی جائے گی کہ میرے قریب پرندہ بھی پر نہیں مار سکے گا۔''

پھر وہ فون کو کان سے لگا کر چیختے ہوئے بولا۔ ''سن رہے ہو تم۔ تم دھوکے سے دو واردات کر گئے۔ اس بار میرے سامنے آؤ گے تو گویا موت کے سامنے آؤ گے۔ ایک بار مر کر زندہ ہو گئے۔ دوسری بار زندگی نہیں ملے گی۔ سیدھے جہنم میں جاؤ گے۔''

وہ فون بند کر کے بڑبڑاتا ہوا باہر آیا پھر اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے جانے لگا۔ اس کے آگے پیچھے مسلح گارڈز کی دو گاڑیاں تھیں۔ وہ فون کے ذریعے تمام اکابرین کو بتا رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے اس نے فرہاد کا فون ریسیو کیا ہے۔ وہ ابھی یا کسی بھی وقت اس کی موت بن کر اس کے سامنے آنے والا ہے۔

وہ بڑے یقین سے کہہ رہا تھا۔ ''میں نے پہلے سے ہی سارے انتظامات کر رکھے ہیں۔ میرا پرسنل سیکریٹری ہر وقت میرے ساتھ رہے گا۔ جیسے ہی وہ خیال خوانی کے ذریعے آئے گا تو میرا سیکریٹری انجکشن کے ذریعے مجھے بے ہوش کر دے گا پھر یہاں کے تجربہ کار اور ماہر ڈاکٹرز مجھے سنبھال لیں گے۔ مجھے اس طرح نگرانی میں رکھیں گے کہ میری بے ہوشی طویل ہونے کے باوجود میرے لیے نقصان دہ نہیں ہوگی۔''

ایک اعلیٰ حاکم نے پوچھا۔ ''اگر وہ تمہارے سیکریٹری کے دماغ میں بھی قبضہ جما لے گا تب کیا ہوگا؟''

''میرا سیکریٹری یوگا کا ماہر ہے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اپنے لیے حفاظتی انتظامات کیے ہیں۔ تم لوگوں کو بھی یہی کرنا چاہیے۔ اب اپنی اپنی فکر کرو۔''

اس نے اجلاس میں پہنچ کر سب کو بتایا کہ فرہاد اگر اس کے روبرو نہ آسکا تو دماغ میں ضرور آئے گا۔

وہاں ایک دوسرا عہدے دار بھی فرہاد کے خلاف سازش میں شریک تھا۔ یہ سن کر اس کے بھی ہوش اڑ گئے تھے۔ وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ تمہارے بعد میری طرف بھی آئے گا؟''

فارن منسٹر نے کہا۔ ''میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ وہ میرے بعد کس کے پاس جائے گا؟ میں نے تو فون کے ذریعے سب ہی کو اطلاع دے دی ہے کہ آپ لوگ بھی اپنے اپنے طور پر آخری حد تک محتاط رہیں۔''

وہ سب سے بول رہا تھا مگر اندر سے بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں ذہنی طور سے بہت اپ سیٹ ہوں۔ یہاں زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکوں گا اس لیے معذرت چاہتا ہوں۔''

وہ وہاں سے نکل کر اپنی کار میں بیٹھ کر بیوی بچوں کے پاس آگیا۔ بنگلے کے چاروں طرف مسلح افراد کا پہرا تھا۔ گھر کے اندر بھی مسلح گارڈز موجود تھے۔ اس کی بیوی اور بچے اس کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔ وہ سب کو تسلی دے رہا تھا پھر ان سے بولا۔ ''میں ذہنی طور پر بہت تھکا ہوا ہوں۔ اپنے کمرے میں جا کر آرام کروں گا۔''

وہ اپنے سیکریٹری کے ساتھ بیڈ روم میں آگیا۔ دروازے کو اندر سے بند کر دیا گیا۔ میں اس بیڈ روم کے باتھ روم میں پہلے سے موجود تھی۔

ہوا یہ تھا کہ بے باک نے اس کی بیوی کے دماغ پر قبضہ جما لیا تھا۔ اس نے اس کی مرضی کے مطابق بنگلے کے پیچھے کھڑے ہوئے دو مسلح گارڈز کو اندر بلا کر انہیں باتوں میں لگایا تھا۔ ان سے کہہ رہی تھی کہ وہ خوفزدہ ہے۔ وہ دونوں تھوڑی دیر تک اس کے آس پاس رہیں۔

میں اتنی دیر میں بنگلے کے پچھلے حصے سے داخل ہو کر اس فارن منسٹر کے بیڈ روم میں پہنچ گئی تھی۔ جب وہ وہاں آیا

تو میں باتھ روم میں چلی آئی۔

بے باک نے مجھ سے کہا۔ ''اس کے سیکریٹری نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا ہے۔ اب میں اس کے اندر رہوں گا۔ اسے چیخنے چلانے کا موقع نہیں دوں گا۔ آپ پہلے اس کے سیکریٹری سے نمٹ لیں۔''

وہ سیکریٹری یوگا کا ماہر تھا۔ بے باک اس کے اندر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس سے پہلے اسے زخمی کرنا ضروری تھا لہٰذا میں نے باتھ روم کا دروازہ کھول کر کمرے میں آتے ہی اس کی گردن پر کرائے کا ایک ہاتھ رسید کیا۔ وہ سامنے والی دیوار سے ٹکرا کر پیچھے آیا تو میں نے گھوم کر ایک اور کک ماری۔ اتنی ہی پٹائی کافی تھی۔ اب وہ سانس روکنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

میں نے بے باک سے کہا۔ ''اس کے اندر چلے آؤ۔''

اس نے سیکریٹری کے دماغ پر قبضہ جمایا پھر اسے ایک طرف لے جا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ ایک تماشائی کی طرح وہاں چپ چاپ بیٹھ گیا۔

فارن منسٹر کے دماغ کو ڈھیل مل گئی تھی۔ وہ چلانا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی میرا ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا پھر دوسرا گھونسا ناک پر پڑتے ہی وہ چکرا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

میں نے کہا۔ ''جب بھی چیخنا چاہو گے تو تمہاری پٹائی ہو گی۔ مجھ سے دھیمی آواز میں بولو۔ کیا تم سمجھ رہے ہو کہ تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟''

وہ بری طرح سہما ہوا تھا۔ ہاں کے انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ''مجھے فون پر دھمکی ملی تھی مگر.....''

میں نے کہا۔ ''ہاں، آگے بولو۔''

''فرہاد کی آتما مجھ سے انتقام لینا چاہتی ہے لیکن تم فرہاد تو نہیں ہو؟''

''میں فرہاد کیسے ہو سکتی ہوں....؟ میں تو اس کی آتما ہوں اس لیے بول رہی ہوں۔ وہ بھی بولتا اگر کسی مرد کے جسم میں آتا۔''

وہ اثبات ..... میں سر ہلا کر بولا۔ ''میں سمجھ گیا..... ہاں، میں سمجھ گیا۔''

''اتنے ہی سمجھدار ہو تو فرہاد کی لاش کے چیتھڑے کیوں اڑائے تھے؟ وہ تو مر چکا تھا۔ اپنی موت کے بعد تمہیں کوئی نقصان پہنچانے والا نہیں تھا پھر تم نے اس کی لاش کو نقصان کیوں پہنچایا؟''

وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی۔ مجھے معاف کر دو۔ آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا۔''

''کیا تمہارے آئندہ غلطی نہ کرنے سے فرہاد کا جسم اور دماغ واپس آ جائے گا؟''

''نہیں، واپس تو نہیں آئے گا۔ مگر فار گاڈ سیک۔ مجھے معاف کر دو۔''

''کس لیے معاف کر دوں؟ کسی زندہ شخص کو قتل کیا جائے تو اسے معاف نہیں کیا جاتا۔ پھانسی پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ لیکن تم نے تو ایک مردے کے ساتھ دہشت گردی کی ہے۔ اسے بم سے اڑا دیا ہے۔ تمہارا انجام بھی کچھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔''

وہ نہیں نہیں کہہ کر چلانا چاہتا تھا۔ میں نے پھر اس کی پٹائی شروع کر دی اور بے باک سے کہا۔ ''اب اس کے پاس آ کر اسے غائب دماغ بناؤ۔''

وہ فارن منسٹر کے اندر پہنچ گیا۔ میں نے سیکریٹری کے پاس آ کر اس کے منہ میں ایک کپڑا ٹھونسا اور اوپر سے ایک پٹی باندھ دی پھر ہاتھوں کو بھی پیچھے لے جا کر باندھ دیا۔

بے باک میری ہدایت کے مطابق اسے غائب دماغ بنا چکا تھا۔ اس فارن منسٹر نے بے باک کی مرضی کے مطابق ایک چاقو لیا۔ پھر اسے اپنے بائیں بازو میں پیوست کیا اور اسے دور تک چیرتا چلا گیا۔ اس بازو سے لہو اُبلنے لگا۔

وہ وہاں سے چلتا ہوا دیوار کے پاس آیا پھر اپنے لہو میں ایک انگلی ڈبو کر دیوار پر لکھنے لگا۔

I AM LOOKING FOR MY BODY AND MY BRAIN....

(میں ڈھونڈ رہا ہوں اپنے جسم کو، اپنے دماغ کو.....)

بے باک نے اس کے دماغ کو آزاد چھوڑا تو وہ زخمی بازو کی تکلیف سے کراہنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''اپنی تکلیف بھول جاؤ گے۔ ذرا دیوار کی طرف دیکھو۔''

وہ دیوار پر لکھی ہوئی تحریر پڑھتے ہی ایک دم سے گھبرا گیا۔ خوف سے چیخنا چاہتا تھا لیکن بے باک نے ٹیلی پیتھی کے ذریعے اسے فوراً ہی بے بس کر دیا۔ میں نے ایک ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے جا کر اس دیوار سے ٹکرایا۔ ایسے ہی وقت بے باک نے اس کے دماغ میں زلزلہ پیدا کیا۔ وہ ایک دم سے اچھل کر فرش پر گر پڑا۔ تکلیف کی شدت سے تڑپنے لگا۔ حلق پھاڑ کر چلانا چاہتا تھا لیکن بے باک اسے منہ کھولنے کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''اب میں یہاں سے جاؤں

گی۔ باقی کام تم کرو۔''

اس نے فارن منسٹر کی وائف کے اندر پہنچ کر دیکھا تو وہ اور اس کے بچے موجودہ حالات سے سہمے ہوئے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے ان کے سرپرست پر کیا گزر رہی ہے؟ بس اتنا معلوم تھا کہ برا وقت آگیا ہے۔

اس کی وائف نے بے باک کی مرضی کے مطابق پھر ان دو گارڈز کو اپنے پاس بلالیا جو بنگلے کے پیچھے پہرا دے رہے تھے۔ وہ دونوں مسلح گارڈز اس کے پاس آئے تو میں فارن منسٹر کے بیڈ روم سے نکل کر بنگلے کے پچھلے حصے سے باہر آگئی۔ کچھ فاصلے پر میری کار کھڑی تھی۔ میں اس میں بیٹھ کر وہاں سے جانے لگی۔

زلزلے کے ایک ہی جھٹکے کے بعد وہ منسٹر اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک یونہی پڑا رہا پھر بے باک نے اسے اٹھنے پر مجبور کیا۔ وہ فرش پر گھسٹتا ہوا اپنے سیکریٹری کے پاس آیا اور اس کے ہاتھوں کی رسی کھولنے لگا۔ اس کارروائی سے فارغ ہوکر سیکرٹری نے اپنے منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھولا پھر اندر ٹھونسے ہوئے دوسرے کپڑے کو نکال کر کہا۔

''سر! وہ بلا یہاں سے جا چکی ہے۔ میں ابھی فون پر مسلح گارڈز سے کہتا ہوں۔ وہ زیادہ دور نہیں گئی ہوگی۔ اسے پکڑا جاسکتا ہے۔''

وہ فون کے پاس جانا چاہتا تھا۔ بے باک نے اسے الماری کے پاس پہنچادیا۔ اس نے اسے کھول کر اس کی دراز میں سے ایک ریوالور نکالا۔ فارن منسٹر نے پوچھا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''ہم غلط سمجھ رہے ہیں۔ وہ بلا تو پتا نہیں کہاں چلی گئی ہے؟ مگر موت یہاں آگئی ہے۔ چلو۔ فون نکالو اور دوسرے اکابرین سے رابطہ کرو۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''تم میرے سیکریٹری ہو۔ ایسی باتیں نہ کرو۔''

اس نے اس کے منہ پر ایک ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ''کیا بھول گئے کہ تم حکم عدولی کرتے تھے تو وہ بلا تمہاری پٹائی کرتی تھی؟ اب بھی تمہارے ساتھ یہی کیا جائے گا۔ لہٰذا جو کہا جارہا ہے وہ کرو۔''

وہ فرش پر چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتا ہوا فون کے پاس آیا پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔ رابطہ ہونے پر بولا۔ ''سامان سو برس کا ہے۔ پل کی خبر نہیں۔ میں نے ایک لمبی عمر جینے کے لیے کتنے ہی حفاظتی انتظامات کیے۔ مگر موت آگئی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جارہی ہے۔ اس کی آواز سنو۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی سیکریٹری نے ٹھائیں ٹھائیں کی آواز کے ساتھ اس پر دو گولیاں چلا ئیں۔ ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ زندگی سے چھوٹ کر موت کے ہاتھوں میں چلا گیا۔

گولیاں چلنے کی آواز اس فون کے ذریعے دوسری طرف سنی گئی تھی اور بنگلے کے اندر باہر بھی سنی گئی تھی۔ مسلح گارڈز فوراً ہی دوڑتے ہوئے بنگلے کے اندر آگئے تھے۔ منسٹر کی بیوی چیختی ہوئی ان گارڈز کے ساتھ اس کمرے کے دروازے پر آئی۔ وہ دروازہ اندر سے لاک تھا۔

اس کمرے کے اندر کیا ہوتا رہا تھا؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس وقت اس سیکرٹری کے ہاتھ سے ریوالور گر گیا تھا۔ اس کے اندر زلزلے پیدا کیے جارہے تھے۔ بے باک اسے چیخنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ زلزلے کے دو جھٹکوں کے بعد ہی اس کا دم نکل گیا۔

سیکیورٹی افسر نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔ ''سر! ہم نے گولی چلنے کی آواز سنی ہے۔ پلیز دروازہ کھولیں۔''

اندر گہری خاموشی تھی۔ بار بار دستک دینے اور دروازہ پیٹنے کے باوجود کوئی جواب نہ ملا تو دروازے کو توڑ دیا گیا۔ وہاں دو لاشوں کو دیکھتے ہی بات سمجھ میں آگئی کہ فرہاد کی آتما اپنا کام کرکے جاچکی ہے۔

یہ دہشت زدہ کرنے والی خبر بندوق کی گولی کی طرح فرانس، جرمنی، یو کے اور امریکی اکابرین تک پہنچ گئی۔ سب کو بتایا جارہا تھا کہ اس بنگلے کے اندر اور باہر بہت سخت پہرا تھا۔ اس کے باوجود وہ منسٹر مارا گیا ہے۔ اس نے فرہاد کا راستہ روکنے کے لیے اپنے سیکریٹری کو قریب رکھا تھا تاکہ وہ ایسے وقت اسے انجکشن لگا کر بے ہوش کرسکے لیکن شاید اسے اس کا موقع نہ مل سکا۔ وہ بھی فارن منسٹر کے ساتھ مارا گیا۔

فرہاد کی لاش کے ٹکڑے کرنے والوں میں آٹھ رہ گئے تھے۔ مگر ان آٹھ میں سے کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ اب بھی نو کی تعداد ہے۔ وہ نو نمبر والا برین ماسٹر ہے۔ ان سب کے دماغوں میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ چیخ رہی تھی کہ فرہاد موت کی طرح اٹل ہوگیا ہے۔ جب کہتا ہے کہ آرہا ہے تو پھر ضرور آتا ہے۔

انہیں یہ خاص طور پر بتایا گیا تھا کہ اس تیسرے کی موت بھی اس سے پہلے مرنے والوں کی طرح ہوئی تھی۔ یعنی اس نے بھی مرنے سے پہلے دیوار پر لکھ دیا تھا کہ فرہاد اپنا جسم اور اپنا دماغ ڈھونڈ رہا ہے۔

باقی نو سازش کرنے والے جو رہ گئے تھے۔ ان کا سکون یہ سوچ سوچ کر برباد ہو رہا تھا کہ حفاظتی تدابیر بھی کام نہیں آرہی ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ''اب تک تو یہی بات سمجھ میں آئی ہے کہ ہم میں سے جو یوگا کا ماہر ہوگا' شاید وہی فرہاد سے بچ سکے گا۔''

دوسرے نے کہا۔ ''ہم آٹھ رہ گئے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی یوگا کا ماہر نہیں ہے۔''

ماسٹر ان کی باتیں سن رہا تھا اور یہ سوچ کر مطمئن ہو رہا تھا کہ وہ یوگا کا ماہر ہے۔ ٹیلی پیتھی جانتا ہے۔ فرہاد اس کے اندر آکر اسے نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ جب بھی آئے گا۔ وہ اپنی ذہانت، طاقت اور بھرپور صلاحیت سے اسے پسپا کردے گا مگر ایک پریشان کن سوال یہ تھا کہ وہ کب آئے گا؟

جب یہ یقین ہو کہ موت آئے گی اور اسے اپنی تدابیر' طاقت اور صلاحیتوں سے ٹالا جاسکتا ہے تو ایسے وقت یہی سوال پریشان کرتا ہے اور نیند اُڑا دیتا ہے کہ وہ آنے والی موت کب آئے گی؟ کچھ تو معلوم ہونا چاہیے' وہ کس چور دروازے سے آنے والی ہے؟ اور یہی معلوم نہیں ہوتا۔

ماسٹر نے سوچا۔ ''کم از کم اتنا ہی ہو جائے کہ فرہاد کی آتما جس دشمن کو چیلنج کرتی ہے۔ اس کے پاس آنے والی ہوتی ہے۔ اس کی خبر مجھے ہو جایا کرے۔ تاکہ میں پہلے سے ہی اس مرنے والے کے اندر پہنچ جاؤں اور یہ دیکھوں کہ فرہاد کسی نئے جسم میں آکر کس طرح اپنا چیلنج پورا کرتا ہے؟''

اس نے اب تک تمام اکابرین سے یہ بات چھپا رکھی تھی کہ فرہاد کی لاش کو نابود کرنے کی سازش میں وہ درپردہ شریک رہا تھا۔ اس نے ہی ٹیلی فون کے ذریعے ان تمام اکابرین کے دماغوں میں یہ بات ٹھونس دی تھی کہ ایک آتما شکتی جاننے والا فرہاد کی آتما کو اپنے قابو میں کر چکا ہے اور اب وہ آتما کسی نئے جسم میں داخل ہونے والی ہے۔

اس نے جو کہا تھا وہی سامنے آرہا تھا لیکن فرہاد کسی نئے جسم میں آکر یہ سب کچھ کیسے کر رہا ہے؟ یہ معلوم کرنا ضروری تھا اور یہ معلوم کرنے کے لیے ان اکابرین سے رابطہ کرنا بھی لازمی ہو گیا تھا۔ اس نے پہلے کبھی خود کو برین ماسٹر کی حیثیت سے ظاہر نہیں کیا تھا لیکن اب مجبور ہو گیا تھا۔

وہ ان کے اندر آکر انہیں مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''فرہاد نے اپنی زندگی میں درست کہا تھا کہ ایک خفیہ تنظیم کا سربراہ برین ماسٹر کہلاتا ہے اور وہ میں ہوں۔''

کوئی آسانی سے ماننے والا نہیں تھا کہ ایک برین ماسٹر جو ہمیشہ گمنام اور پُراسرار بن کر رہتا تھا۔ وہ اس وقت انہیں مخاطب کر رہا ہے۔ اس نے کہا۔ ''کوئی یقین کرے یا نہ کرے۔ میں ہی برین ماسٹر ہوں۔ تم نے فرہاد کی لاش کو شناخت کرنے کے لیے جو کمیٹی بنائی تھی۔ میں نے ہی اس کمیٹی کے اراکین کو فون کے ذریعے بتایا تھا کہ فرہاد کی آتما ایک آتما شکتی جاننے والے تانترک مہاراج کے قبضے میں آگئی ہے اور آئندہ دوسرا جسم حاصل کرنے والی ہے۔ یہ حقیقت میرے سوا کسی اور کو معلوم نہیں تھی۔''

یہ بات سن کر وہ قائل ہونے لگے۔ کیونکہ ایک گمنام شخص نے ہی فون کے ذریعے انہیں آتما شکتی جاننے والے کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا اور جو کچھ بتایا تھا وہ اب ان کے سامنے آرہا تھا۔

ماسٹر نے کہا۔ ''جب میری بات کا یقین ہو رہا ہے تو یہ بھی مان لو کہ اس کا شکار تم صرف نہیں نو ہیں اور وہ نو واں میں ہوں۔''

''پھر تو تم نے بھی حفاظتی انتظامات کیے ہوں گے؟''

''ہاں، تم لوگوں کے مقابلے میں میرے پاس ایک سہولت یہ ہے کہ میں ٹیلی پیتھی جانتا ہوں۔ وہ میرے اندر آکر مجھے ٹریپ نہیں کر سکے گا۔ مجھ تک پہنچنے کے لیے اسے میرے روبرو آنا ہوگا اور میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ میرے مقابل آنا اسے بہت مہنگا پڑے گا۔''

ایک نے کہا۔ ''پھر تو ہم دعا کریں گے کہ وہ پہلے تمہارے پاس آئے تاکہ تم اس کا کام تمام کر سکو اور ہمیں اس سے نجات دلا سکو۔''

''میں تو خود چاہتا ہوں کہ وہ پہلے میرے پاس آئے خواہ مخواہ اس کے انتظار میں بے چینی پیدا ہو رہی ہے۔ سکون الگ برباد ہو رہا ہے۔''

ایک نے کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ ہم میں سے کسی کی موت بن کر آنا چاہے تو ایسے وقت تم اس کے اندر پہنچ جاؤ اور اس کی حفاظت کرنے کی کوشش کرو؟''

''ہاں، میں تم سب کے اندر آسکتا ہوں لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ چوبیس گھنٹے تم لوگوں کی نگرانی کرتا رہوں۔ مجھے اطلاع دی جائے گی کہ آئندہ کس کی باری ہے تو میں فوراً ہی اس کے اندر آکر اس کی حفاظت کروں گا۔''

ماسٹر نے سوچا تھا کہ ان آٹھ افراد میں سے دو امریکی ہیں۔ جن کی حفاظت ان کے اپنے ٹیلی پیتھی جاننے والے کریں گے۔ تنویمی عمل کے ذریعے ان کے دماغوں کو لاک کیا جائے گا۔ تاکہ فرہاد کسی بھی صورت ان کے اندر نہ پہنچ سکے لیکن برین ماسٹر کے پاس ہر ایک پر عمل کرنے کا وقت نہیں

تھا۔ اس نے یہ ارادہ بدل دیا تھا۔

ارادہ اس لیے بدل دیا تھا کہ اگر وہ ان کے دماغوں کو لاک کر دیتا اور فرہاد نہ آتا تو وہ معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ فرہاد کے واردات کرنے کا کیا طریقہ کار ہے؟

ماسٹر کے لیے آسانی یہی تھی کہ ان سب کے دماغ کے دروازے کھلے رہیں اور فرہاد آسانی سے ان کے اندر آتا رہے۔ اس کی موت کے بعد اسے دیکھنے اور سمجھنے کا یہی ایک راستہ رہ گیا تھا۔

وہ ان سب سے باتیں کرنے کے بعد دماغی طور پر حاضر ہوا تو اس کے موبائل فون نے اسے مخاطب کیا۔ اس نے نمبر پڑھے۔ پتا چلا' اس کا بیٹا اسے کال کر رہا ہے۔

ایسے وقت ماسٹر فوراً ہی اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ بلکہ اس کے چور خیالات پڑھ کر معلوم کرتا تھا کہ وہ فون پر کیا کہنا چاہتا ہے؟ اس کے اندر اصل بات کیا چھپی ہے؟

اس نے فون پر آواز بنا کر کہا۔ ''آپ کے مطلوبہ نمبر سے اس وقت جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔ برائے مہربانی کچھ دیر بعد دوبارہ ڈائل کریں۔''

اس نے بیٹے کے دماغ میں پہنچ کر یقین دلایا کہ واقعی دوسری طرف فون بند ہے۔ اس نے جھنجھلا کر فون کو ایک طرف پھینک دیا۔ اس کے خیالات بتا رہے تھے کہ تھوڑی دیر پہلے اس پر کیا گزر چکی ہے؟

پہلے تو ماسٹر کو یہ معلوم ہوا کہ بیٹا عیش و ترنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک لڑکی کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ ایسے وقت کسی نے فون پر اسے کہا کہ وہ ایک جاسوس ہے۔ اس کے باپ نے اسے ہائیر کیا ہے۔ تاکہ وہ بیٹے کے ایک ایک پل کی رپورٹ اس کے پاس پہنچاتا رہے۔

وہ دھوکے باز جھوٹ بول کر اس سے ملنے آیا تھا۔ وہ کوئی جاسوس نہیں تھا بلکہ مخالف ریسلروں کے گروپ کا ایک پہلوان تھا۔ اس کے ساتھ اس کا دوست بھی تھا۔ وہ دو تھے۔ انہوں نے اس کی خوب پٹائی کی تھی اور اسے بے ہوش کر دیا تھا۔

وہ اپنے بیٹے کے خیالات پڑھ رہا تھا۔ اسے غصہ آ رہا تھا کہ دو پہلوانوں نے آ کر اس کی دُرگت بنائی تھی پھر پتا چلا کہ انہوں نے صرف اس کی پٹائی نہیں کی تھی۔ بلکہ اس کی الماری سے پانچ لاکھ ڈالرز بھی چرا کر لے گئے تھے۔

ماسٹر نے بیٹے کے ذہن میں یہ سوال پیدا کیا کہ اسے مخالف ریسلروں کے گروپ سے معلوم کرنا چاہیے' وہ دونوں پہلوان کون تھے؟

اس نے اس کے خیالات پڑھ کر تمام مخالف ٹیموں کے نام اور ان کے فون نمبرز معلوم کیے پھر فون کے ذریعے باری باری ہر ٹیم کے انچارج کے اندر پہنچنے لگا اور ہر ٹیم کے پہلوانوں تک بھی پہنچنے کی کوشش کرنے لگا لیکن یہ معلوم نہ کر سکا کہ آج کس ٹیم کے پہلوان نے کہیں سے پانچ لاکھ ڈالرز چوری کیے ہیں؟

اسے مکمل معلومات اس لیے بھی نہ مل سکی کہ بیشتر پہلوان یوگا کے ماہر تھے۔ وہ اپنے اندر پرائی سوچ کی لہروں کو محسوس کرتے ہی سانس روک لیتے تھے۔ ان سے کسی بھی طرح کی معلومات نہ مل سکیں۔

تب اس نے فون پر بیٹے کو مخاطب کیا۔ اس نے باپ کی آواز سنتے ہی کہا۔ ''اوہ ڈیڈ! میں جب بھی فون کرتا ہوں۔ آپ کا نمبر بزی رہتا ہے یا بند رہتا ہے۔''

اس نے انجان بن کر پوچھا۔ ''کیا تم نے مجھے ابھی فون کیا تھا؟''

''ہاں، ابھی میرے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ دو ڈاکو اچانک ہی یہاں گھس آئے تھے۔ انہوں نے مجھے بری طرح مارا ہے۔ وہ میرے پچاس لاکھ ڈالرز چرا کر لے گئے ہیں۔''

''تمہیں یہ کہتے شرم نہیں آتی؟ کیا تم کوئی نازک سی لڑکی ہو کہ کوئی آیا اور تمہیں چھیڑ کر چلا گیا؟ کیا تم پہلوان نہیں ہو؟ کیا ورلڈ چیمپین نہیں کہلاتے ہو؟''

''ہاں، ڈاکو اگر پیچھے سے آ کر حملہ کرے اور ان کے پاس ہتھیار بھی ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے جاسوس نے مجھے اطلاع دی ہے کہ تمہارے بنگلے میں ایک عورت آئی تھی۔''

''ڈیڈ! وہ ایک ملازمہ ہے۔ میرے لیے کھانا پکاتی ہے۔''

''جھوٹ مت بولو۔ وہ جاسوس بہت ہی چالاک ہے۔ اس نے تمہارے بنگلے میں گھس کر اور چھپ کر دیکھا ہے' وہاں ایک جوان حسینہ تھی۔ وہ تمہارے سامنے بے لباس ہو کر رقص کر رہی تھی اور تم شراب پی رہے تھے۔ تمہیں باپ سے جھوٹ بولتے ہوئے شرم نہیں آتی.....؟''

''ڈیڈ! ناراض نہ ہوں۔ آپ کو اپنے بیٹے کی بات پر بھروسا کرنا چاہیے لیکن آپ اس جاسوس کے جھوٹ پر بھروسا کر رہے ہیں۔ اس کو سچ مان رہے ہیں اور مجھے جھوٹا کہہ رہے ہیں۔''

''تمہارا جھوٹ اس طرح بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایک ورلڈ چیمپئن پہلوان ہو کر ڈاکوؤں سے مار کھا گئے جبکہ ورلڈ چیمپئن تو چار ڈاکوؤں کو تنہا مار گرا تا ہے لیکن تم شراب و شباب میں اس قدر ڈوب چکے ہو کہ اب پہلوانی کے قابل نہیں رہے ہو۔ میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا ہے' پہلوانی چھوڑ دو۔ اب سختی سے کہہ رہا ہوں' ایک ہفتے بعد ہونے والے مقابلے میں سے اپنا نام واپس لے لو اور لندن واپس آجاؤ۔''

''نو ڈیڈ! میں نام واپس لوں گا تو میری بہت انسلٹ ہو گی۔ کیا آپ میری بے عزتی کرانا چاہتے ہیں؟''

''اور جب مقابلے میں کسی پہلوان سے ہار جاؤ گے تب تمہاری انسلٹ نہیں ہوگی؟''

''نہیں، آپ نے وعدہ کیا ہے' ہمیشہ کی طرح آپ اس عامل کی خدمات حاصل کریں گے۔ وہ عمل کرتا رہے گا تو کبھی میری ہار نہیں ہوگی۔ میں بڑے سے بڑے پہلوان کو رنگ چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دوں گا۔''

''زیادہ نہ بولو۔ تم نہیں جانتے' وہ عامل بہت بیمار ہے۔ کسی تشویش ناک مرض میں مبتلا ہو گیا ہے۔ پتا نہیں کب صحت مند ہوگا؟ کب تمہارے لیے کوئی عمل کر سکے گا؟ تمہاری بہتری اسی میں ہے' اس ریسلنگ سے باز آجاؤ۔ وہ عامل تمہارے کام نہ آسکا تو تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔ اس سے پہلے عقل سے کام لو۔''

وہ باپ کی باتیں سن کر پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ڈیڈ! آپ مجھے مایوس کر رہے ہیں۔ آپ نے آج تک اپنے بیٹے کو کسی خوشی سے محروم نہیں کیا مگر مجھے میرے شوق سے باز رکھ کر مایوس کر رہے ہیں۔ میرا دل توڑ رہے ہیں۔''

''بیٹے! میں نے تمہاری ہر خوشی پوری کر کے تمہیں بہت سر چڑھا لیا ہے۔ تم اپنا اچھا برا سمجھنے کے قابل نہیں رہے ہو۔ اب وقت آگیا ہے کہ زندگی میں پیش آنے والے سنگین مصائب کو سمجھو اور ان سے نمٹنا سیکھو۔ تمہارا باپ ہمیشہ اس دنیا میں نہیں رہے گا اور جب نہیں رہے گا تو تم دو کوڑی کے ہو جاؤ گے۔ دشمن تمہیں کسی چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دیں گے۔''

برین ماسٹر کا وہ اکلوتا بیٹا بہت ہی لاڈلہ تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تھا اگر بیٹا ذہانت اور مکاری سے کام لینا جانتا تو وہ اسے پتی طرح جرائم کی دنیا میں زبردست ٹریننگ دیتا۔ اسے اپنا جانشین بناتا لیکن وہ انڈر ورلڈ کے خطرناک ماحول میں رہنے کے قابل نہیں تھا۔

کبریا وقتاً فوقتاً جان رچ کے اندر آتا جاتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی پہنچا تو باپ بیٹے کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے لگا پھر اس نے پورس کو بتایا کہ وہ باپ بیٹے کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔

پورس نے تفصیل سننے کے بعد کہا۔ ''ماسٹر انڈر ورلڈ کا بہت ہی خطرناک مجرم ہے اور وہ یہ حقیقت اپنی بیوی بچوں سے چھپاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ بیٹا اس کا جانشین بننے کے قابل نہیں ہے۔''

کبریا نے کہا۔ ''ہم خوامخواہ ریسلنگ کے جھمیلے میں کیوں پڑیں؟ کیوں نہ مقابلے سے پہلے ہی اس کے بیٹے کی ایسی مرمت کریں کہ وہ کسی سے بھی مقابلہ کرنے کے قابل نہ رہے اور واپس جانے پر مجبور ہو جائے۔''

پورس نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''بے شک، ہم ریسلنگ میں حصہ لے کر پیشہ ور پہلوان بننے پر مجبور ہو جائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ جان رچ کی واپسی کا ٹکٹ کٹا دیا جائے۔''

''ٹھیک ہے، آج رات اس سے پھر ایک بار نمٹا جائے گا۔ اس کے بعد وہ یہاں سے دم دبا کر بھاگے گا۔''

ماسٹر اپنے بیٹے سے باتیں کرنے کے بعد فون بند کر کے سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ جرائم کی دنیا میں اس کا کام اس قدر پھیلا ہوا تھا کہ وہ بیٹے پر پوری توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ اگر اس کے پاس وقت ہوتا تو وہ روزانہ بیٹے پر تنویمی عمل کرتا رہتا اور اسے ریسلنگ کی دنیا سے ہٹا کر کاروباری دنیا میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیتا لیکن کاروباری دنیا میں کامیابی کی منزلیں حاصل کرنے کے لیے یہ لازمی تھا کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے بیٹے کے ساتھ رہتا۔ اسے گائیڈ کرتا رہتا۔ اس کے لیے کامیابی کی راہیں کھولتا رہتا لیکن اتنے سارے کاموں کے لیے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

اس کے اطمینان کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اس نے بے انتہا دولت جمع کر رکھی تھی۔ یہ جانتا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی بچے کسی کے محتاج نہیں رہیں گے اور اس کی آئندہ نسل بھی عیش و عشرت کی زندگی گزارتی رہے گی۔

ایسے ہی وقت فون کا بزر بولنے لگا۔ سی ایل آئی پر اس کی وائف کا فون نمبر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے آن کر کے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ''ہائے مونیکا! کیسی ہو؟''

''میں بہت پریشان ہوں۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم اور پریشان؟ تمہیں کس بات کی پریشانی ہے؟ میں نے ایسے انتظامات کیے ہیں کہ فکر و پریشانی کبھی تمہیں چھو کر بھی نہیں گزر سکتی پھر تم

کیوں پریشان ہو؟''

وہ بولی۔ ''جب تک بچے چھوٹے تھے۔ زیادہ مسائل نہیں تھے لیکن ان کے جوان ہونے کے ساتھ اچانک ہی مسائل بھی جوان اور سنگین ہو گئے ہیں۔''

''پہیلیاں نہ بوجھواؤ۔ صاف صاف کہو۔''

''بیٹے کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اسے ریسلنگ کی دنیا میں نہیں رہنا چاہیے لیکن وہ اپنا شوق پورا کرنے کے لیے جاتا ہے اور جیتنے کے باوجود زخمی ہو کر آتا ہے۔ ایسے وقت میری کیا حالت ہوتی ہے۔ یہ آپ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔''

''ہاں، میں سمجھتا ہوں۔ میں نے آج اسے اچھی طرح سمجھایا ہے کہ وہ آئندہ ریسلنگ کے مقابلوں میں حصہ نہیں لے گا۔ میں پوری کوشش کروں گا' وہ دو چار روز میں لندن واپس آجائے۔''

''یہ تو آپ نے بہت اچھی خبر سنائی ہے۔ میرا بیٹا میرے پاس آئے گا تو کلیجے کو ٹھنڈک پہنچتی رہے گی لیکن اب بیٹی کا مسئلہ ہے۔''

''میری لاڈلی بیٹی کا مسئلہ کیا ہو سکتا ہے؟''

''ہم ماں باپ اپنے بچوں کو جوان ہونے کے بعد بھی بچے سمجھتے رہتے ہیں۔ آپ کی لاڈلی ایک نوجوان کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔''

''یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے؟ دنیا کی ہر لڑکی جوان ہو کر کسی نہ کسی کو اپنا آئیڈیل بناتی ہے۔ اس سے محبت کرتی ہے۔ قسمت ساتھ دے تو اس سے شادی بھی کر لیتی ہے۔ ہماری بیٹی کے ساتھ بھلا کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟''

''سب سے پہلا مسئلہ تو یہی ہے کہ وہ نوجوان نیگرو ہے۔''

برین ماسٹر نے تعجب سے پوچھا۔ ''کیا وہ کالوں کی نسل سے ہے؟''

وہ ناگواری سے بولی۔ ''وہ کالا بھی ہے اور مسلمان بھی۔''

''اوہ گاڈ! یہ ہماری گوری نسل کی لڑکیوں کو کیا ہو گیا ہے؟ کالوں کو پسند کرنے لگی ہیں۔ ویسے وہ کالا صحت مند' ذہین اور اچھی شخصیت کا مالک ہوتا تو میں بیٹی کی خاطر اسے داماد بنا لیتا لیکن ایک مسلمان کو کبھی اپنا داماد نہیں بناؤں گا۔''

''آپ بیٹی کو کیسے روکیں گے؟ وہ اس کالے کی دیوانی ہو گئی ہے۔ وہ بھی یہ کہہ کر گیا ہے کہ خود ہماری بیٹی کی طرف نہیں آئے گا لیکن ہماری بیٹی اس کی طرف بڑھے گی تو وہ پیچھے نہیں ہٹے گا۔''

''وہ اپنے طور پر معقول بات کر رہا ہے۔ بہر حال تم فکر نہ کرو۔ میں اپنی اینا کو سمجھاؤں گا۔''

اس نے بیوی کو تسلی دینے کے بعد فون کا رابطہ ختم کر دیا پھر سوچنے لگا کہ اب تک وہ بیوی بچوں سے دور رہتا آیا ہے۔ ان کی طرف توجہ زیادہ نہیں دیتا۔ مونیکا بڑی ذہانت سے اور بڑی ذمے داری سے ان دونوں کی پرورش کر رہی تھی لیکن اب مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ اپنے گھر کی طرف توجہ دینے کے لیے تھوڑا سا وقت نکالنا لازمی ہو گیا تھا۔

وہ چپ چاپ اینا کے اندر پہنچ گیا۔ اس کے خیالات پڑھنے لگا۔ یہ معلوم کرنے لگا کہ وہ جان بوجھ کر اس کالے کی طرف مائل نہیں ہوئی ہے۔ قدرتی طور پر دل اس کی طرف کھنچا جا رہا ہے۔ وہ اس کے دل و دماغ میں اس طرح نقش ہو گیا ہے کہ اسے دیکھے بغیر اس کی تصویر بھی بنا لیتی ہے۔

اس نے فون کے ذریعے بیٹی کو مخاطب کیا۔ ''ہیلو اینا! مائی ڈارلنگ! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟''

وہ سمجھ گئی پھر بھی انجان بنتے ہوئے بولی۔ ''آپ کیا سن رہے ہیں ڈیڈ....!''

''یہی کہ تم کسی کالے جوان کو پسند کرنے لگی ہو اور اس کے معاملے میں بہت سنجیدہ بھی ہو؟''

''یہ بات آپ کو ممی نے بتائی ہو گی؟ ویسے یہ سچ ہے۔ آئی لو ہم ڈیڈ! میرا دل اس کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ میں اسے ڈیٹ دینا چاہتی ہوں۔ اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتی ہوں۔''

''بیٹی! تم اپنے ڈیڈ کی ہر بات مان لیا کرتی ہو۔ یہ بات بھی مان لو۔ وہ ہمارے قابل نہیں ہے۔ ایک تو نیگرو ہے۔ دوسرے یہ کہ مسلم ہے۔ ہم معزز لوگوں کی ایک اونچی سوسائٹی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ کیا تم اپنے ماں باپ کا سر جھکانا چاہتی ہو؟''

وہ بولی۔ ''ڈیڈ! میں اسی سوسائٹی میں ایسے کئی خاندان بتا سکتی ہوں' جن کی بیٹیوں اور بہنوں نے کالے جوانوں سے شادیاں کی ہیں اور یہیں ان کے ساتھ اچھی خوشحال زندگی گزار رہی ہیں۔''

''تو تم بحث کر رہی ہو؟ اپنے باپ کو مایوس کر رہی ہو؟ کوئی بات نہیں۔ میں پھر کسی وقت تم سے بات کروں گا۔''

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ ایسے وقت بے باک اینا کے اندر موجود تھا۔ ان باپ بیٹی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ بہت پہلے ہی اینا کے خیالات پڑھ کر معلوم کر چکا تھا کہ وہ اس کی طرف

نیند انسانی زندگی کی اہم ضرورت ہے، بے خوابی اور نیند کی شکایات ہر عمر کے مرد و عورت دونوں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں، اس کی اہم علامات میں رات کو نیند نہ آنا، نیند کا بار بار ٹوٹنا، بے چینی، بیقراری، ڈراؤنے خواب یا صبح بیدار ہونے کے بعد جسم میں سستی کا بلی، طبیعت کا بوجھل ہونا شامل ہیں، اس کے علاوہ پیشاب کی بار بار حاجت بھی نیند میں خلل کا باعث بنتی ہے، نباتاتی جڑی بوٹی ویلیر یائہ (Valeriana) پر مشتمل دوا ویلکیزان نیند کے تمام مسائل کا قدرتی حل ہے۔ جسے ڈاکٹر ولمار شوابے نے طویل تحقیق اور جستجو کے بعد تیار کیا ہے۔ جو پرسکون نیند لانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ نیند کی دیگر ادویات کے مقابلے میں ویلکیزان کے کوئی مضر اثرات نہیں ہوتے اور نہ ہی مریض اس کے استعمال کا عادی ہوتا ہے۔

Reser oducts of Dr. Willmar Schwabe, Germany AV ALL LEADING MEDICAL & HOMOEOPATHIC STORES

SCHWABE

Dr. Hamid General Homoeo (Pvt.) Ltd.

KARACHI :Tel:2211895,2628754 LAHORE :Tel:6363664, 6304657

مائل ہے۔ اسے دل و جان سے چاہنے لگی ہے۔ اب اس نے اینا کو اپنے باپ سے دوٹوک بات کرتے سنا تو خوشی سے کھل گیا۔

وہ دو چار منٹ اس کے اندر رہ کر وہاں سے جانا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت اینا جمائی لینے لگی۔ حیرانی سے سوچنے لگی۔ ''ابھی سونے کا وقت تو نہیں ہے پھر مجھے نیند کیوں آرہی ہے؟''

بے باک اس کی یہ سوچ پڑھ کر چونک گیا۔ چھٹی حس نے سمجھایا۔ ''ضرور کوئی بات ہے۔ مجھے یہاں رکنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ وہ بے وقت سونا کیوں چاہتی ہے؟''

وہ جمائی لینے کے بعد بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔ اس کی سوچ کہہ رہی تھی کہ سونا نہیں چاہتی لیکن بے اختیار لیٹ گئی۔ ذرا سی دیر میں ہی اس نے آنکھیں بند کرلیں اور گہری نیند میں ڈوبتی چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اسے برین ماسٹر کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''تم مجھے آواز سے نہیں پہچان رہی ہو۔ اس وقت خواب میں ایک عامل کو دیکھ رہی ہو۔''

اینا نے کہا۔ ''ہاں، میں کسی شخص کو دیکھ رہی ہوں مگر اس کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دے رہا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''میں ہی وہ عامل ہوں۔ میرا چہرہ دیکھنا ضروری نہیں ہے۔ میں جو کہوں گا' وہ باتیں تمہارے ذہن میں نقش رہیں گی۔ آئندہ تم میری معمولہ اور تابعدار بن کر میری مرضی کے مطابق زندگی گزارو گی۔''

بے باک سمجھ گیا تھا کہ اینا ٹرانس میں آگئی ہے اور سحر زدہ ہو کر اس کی باتیں ماننے والی ہے۔ ایسے ہی وقت اس نے بھی اینا کے دماغ پر قبضہ جمالیا۔ وہ اس کی مرضی کے مطابق بولی۔ ''میں کیوں تمہاری تابعدار بنوں گی؟ تم کیوں مجھ پر عمل کرنے آئے ہو؟''

ماسٹر نے حیرانی سے کہا۔ ''تعجب ہے! تنویمی عمل کے دوران کوئی معمول بننے اور سحر زدہ ہونے کے بعد پلٹ کر اپنے عامل سے سوال نہیں کرتا اور تم مجھ سے سوال کر رہی ہو؟''

وہ بے باک کی مرضی کے مطابق بولی۔ ''یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں سحر زدہ ہوگئی ہوں؟ پتا نہیں' یہ کیسا اُلٹا سیدھا خواب دیکھ رہی ہوں؟ نہ جانے ابھی سو رہی ہوں یا بے خوابی کی حالت میں یہ سب کچھ سن رہی ہوں اور کسی عامل کو دیکھ رہی ہوں۔ مگر.... مگر اب یہ عامل میرے سامنے سے گم ہوتا جارہا ہے۔''

برین ماسٹر نے محسوس کیا کہ وہ اس کے خواب کی اسکرین سے گم ہو رہا ہے اور ایسا بے باک کر رہا تھا۔

ماسٹر کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی مخالف ٹیلی پیتھی جاننے والا اس کی بیٹی کے اندر موجود ہے۔ اس کے عمل کا توڑ کر رہا ہے۔ اسے یہ شبہ نہیں ہو رہا تھا کہ کوئی اس کے اندر ہے۔ وہ اپنے طور پر سوچ رہا تھا۔ ''میری بیٹی کا ذہن کچھ عجیب سا ہے۔ مجھے کبھی اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ اس کے چور خیالات کو گہرائی تک پڑھتا۔ اس کے ذہن کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ بہرحال یہ ماننا پڑتا ہے کہ میری اینا کا ذہن کچھ عجیب و غریب ہے۔ میں پھر کسی وقت آکر اس کے ذہن کی اسٹڈی کروں گا۔''

بے باک مومن یہ نہیں جانتا تھا کہ ماسٹر اپنی جگہ کیا سوچ رہا ہے؟ لیکن یہ سمجھ گیا تھا کہ ابھی اس کے اندر سے جانے والا پھر بھی آسکتا ہے۔ دوسری بار عمل کرنے کی کوشش کرسکتا ہے۔

وہ اپنی جگہ دماغی طور پر حاضر ہو کر سوچنے لگا۔ ''مجھے اینا کو اس کے باپ کے تنویمی عمل سے بچانا ہوگا۔ اگر وہ کامیاب ہو جائے گا اور اس کے دماغ کو لاک کردے گا تو میں بھی اس کے اندر نہیں جاسکوں گا پھر یہ کہ وہ میرے خلاف اس کے دل و دماغ میں نفرت پیدا کردے گا اور میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔''

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر ذہن میں یہ تدبیر آئی کہ ماسٹر کو دوسری طرف اُلجھا دیا جائے تاکہ وہ دو چار گھنٹے تک اپنی بیٹی کی طرف نہ آسکے۔ اتنی دیر میں وہ اینا کو اپنا تابعدار بنا لے گا۔

اس نے اپنے موبائل فون میں پھر وہی سم ڈالی جس کے ذریعے وہ ان تمام دشمنوں کو خوفزدہ کرتا تھا۔ اس نے ماسٹر کے نمبر پر یہ میسج بھیجا کہ تمہارے بیٹے کی پٹائی کس نے کی....؟ کس نے اس کے پانچ لاکھ ڈالرز چرائے...؟ جب تک میرا جسم مجھے نہیں ملے گا۔ میرا دماغ مجھے نہیں ملے گا۔ تمہارے بیٹے کی شامت آتی رہے گی۔ جاؤ، اس کے پاس جاؤ۔ اس کی حفاظت کرو...

ایسا پیغام ملتے ہی ماسٹر بیٹی کی فکر بعد میں کرنے والا تھا۔ پہلے بیٹے کی طرف دوڑ کر جانے والا تھا۔ بے باک وہ میسج بھیج کر مطمئن ہوگیا تھا اور بڑے اطمینان کے ساتھ اینا کے اندر چلا آیا تھا۔ وہ ابھی تک آنکھیں بند کیے بیڈ پر پڑی ہوئی تھی۔

اس نے تنویمی عمل کے ذریعے اسے سحر زدہ کیا۔ اپنا تابعدار بنایا پھر اس کے ذہن میں یہ بات نقش کی کہ جب بھی اس کا باپ اس کے اندر آکر اسے سحر زدہ کرنا چاہے گا تو وہ

کبھی اس کے سحر میں نہیں آئے گی۔ اس سے صاف صاف کہہ دے گی کہ وہ کبھی کسی کی سوچ کے اثر میں نہیں آتی ہے اور یہ کہ وہ کون ہے؟ بار بار کیوں اس کے اندر چلا آتا ہے؟ کیوں اسے پریشان کرتا ہے؟

بے باک نے اس کے ذہن کو لاک نہیں کیا۔ اگر ایسا کرتا تو ماسٹر سمجھ جاتا کہ دشمنوں نے اس کی بیٹی کے دماغ پر قبضہ جمالیا ہے۔ وہ دشمن فرہاد ہی ہوسکتا ہے۔ وہ اس کی بیوی اور بیٹی تک آپہنچا ہے۔

بے باک نے اینا کے دماغ کو ایک ذرا سا عجوبہ بنا کر اسے تنویمی نیند سونے کے لیے چھوڑ دیا اور مطمئن ہوگیا کہ اب اس کی اینا اپنے باپ کے سحر میں آکر کبھی اس سے نفرت نہیں کرے گی۔

ماسٹر اس میسج کو پڑھ کر کچھ زیادہ ہی خوفزدہ ہوگیا تھا۔ پریشان ہوکر سوچ رہا تھا۔ ''کیا فرہاد میرے بیٹے تک پہنچ گیا ہے؟''

اس سوال کا جواب تھا ''ہاں۔'' اس میسج میں واضح طور پر لکھا تھا کہ اس کے بیٹے کی پٹائی ہوئی تھی اور اس کے پانچ لاکھ ڈالرز چرائے گئے تھے۔ اس سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ کارروائی فرہاد نے ہی کی تھی۔ اپنے آلہ کاروں کو وہاں بھیج کر وہ یہ ثابت کرچکا ہے کہ اس کے بیٹے تک پہنچ گیا ہے۔ آئندہ ماسٹر سے انتقام لینے کے لیے اس تک نہ پہنچ سکا تو اس کے بیٹے کو جانی نقصان پہنچا سکتا ہے۔

اسے بیٹے کی محبت نے تڑپا دیا۔ اب اسے اپنی جان سے زیادہ اس کی جان کی فکر ہوگئی تھی۔ فوراً ہی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کس طرح تحفظ دے؟ اس نے خیال خوانی کے ذریعے بیٹے کی خیریت معلوم کی' اس کے خیالات پڑھے تو پتا چلا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے انہی ڈاکوؤں کا فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ ان پانچ لاکھ ڈالرز میں ہمارا گزارہ نہیں ہورہا ہے۔ مزید پانچ لاکھ ڈالرز بینک سے نکال کر رکھو۔ ہم آج رات تک لینے آئیں گے۔

ماسٹر یہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ وہ ڈاکو نہیں ہیں۔ فرہاد کے آلہ کار ہیں۔ اس نے بیٹے کے دماغ پر قبضہ جمایا تو وہ فوراً ہی ایک سفری بیگ میں اپنا ضروری سامان پیک کرکے بنگلے سے باہر آگیا پھر وہاں سے سیدھا ایرپورٹ پہنچ گیا۔

ماسٹر اس کے ذہن میں یہ بات نقش کررہا تھا کہ ایرپورٹ کے بکنگ کاؤنٹر پر جس فلائٹ کی بھی سیٹ ملے اسے اڑ کے کرادے اور یہاں سے دور چلا جائے۔ یہ بات بھی نقش کررہا تھا کہ اسے لندن نہیں جانا چاہیے۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ بیٹا لندن جائے تو فرہاد اس کے ذریعے اس کی بیوی اور بیٹی تک بھی پہنچ جائے۔ اب وہ اندھیرے میں بھٹکنے لگا تھا۔ فرہاد کو جہاں پہنچنے سے روک رہا تھا۔ وہاں بہت پہلے ہی بے باک پہنچ چکا تھا۔

کبریا تھوڑی دیر بعد جان رچ کے اندر پہنچا تو پتا چلا وہ ایرپورٹ پہنچ چکا ہے اور نیویارک جانے کے لیے ایک فلائٹ میں سیٹ بھی حاصل کرچکا ہے۔

اس نے پورس سے کہا۔ ''جان رچ یہاں سے فرار ہورہا ہے۔ ابھی نیویارک جائے گا۔ وہاں سے پھر کسی دوسرے ملک میں جانے کے لیے سوچے گا۔''

پورس نے پوچھا۔ ''وہ اچانک یہاں سے کیوں جارہا ہے؟ کیا اس کا باپ ایسا چاہتا ہے؟''

''ہاں، اس کے خیالات میں اچانک تبدیلی آئی ہے۔ اس سے اندازہ ہورہا ہے کہ اس کے باپ نے ٹیلی پیتھی کے ذریعے اسے یہاں سے فرار ہونے پر مجبور کیا ہے۔ اس کے ذہن میں بات بھی نقش کی ہے کہ وہ دنیا کے ہر ملک اور ہر شہر میں جائے گا لیکن لندن کا رخ نہیں کرے گا۔''

''کیا اسے شبہ ہوگیا ہے کہ خیال خوانی کرنے والے اس کے پیچھے پڑگئے ہیں؟''

''پتا نہیں ایسا ہی لگتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ بیٹا لندن جائے اور خیال خوانی کرنے والے اس کے پیچھے پیچھے اس کی بیوی اور بیٹی تک بھی پہنچ جائیں۔''

''پھر تو ہم وہی چاہیں گے جو وہ نہیں چاہتا۔ اس لیے اسے خیال خوانی کے ذریعے بھٹکا کر لندن اس طرح پہنچاؤ کہ اس کے باپ کو تمہاری طرف سے خیال خوانی کا شبہ نہ ہو۔''

کبریا نے کہا۔ ''میں یہی کروں گا۔ کیا اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے؟''

''ہاں، میں یہاں سے بابا صاحب کے ادارے میں جاؤں گا۔ تم کہاں جانا چاہو گے؟''

وہ بولا۔ ''ہم سوچتے ہیں کہ گھر جائیں گے لیکن گھر پہنچنے سے پہلے ہی تقدیر اور حالات دوسری طرف بھٹکا دیتے ہیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا لیکن تقدیر نے کسی اور سمت جانے کا اشارہ کیا تو پھر میں ادھر ہی چلا جاؤں گا۔''

وہ دونوں نئے سفر کے لیے اپنا سامان پیک کرنے لگے۔ برین ماسٹر کا سکون غارت ہوگیا تھا۔ وہ کسی بھی اہم معاملے کی طرف دھیان دینا چاہتا تھا تو گھوم پھر کر بیٹے کے بارے میں سوچنے لگتا تھا۔ بیٹا اس کی جان تھا اور بیٹی دل کی دھڑکن تھی۔ اپنی بیوی مونیکا سے بھی اس قدر پیار کرتا تھا کہ

اس نے اس کے بعد کسی دوسری عورت میں کبھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ وہ چاہتا تو ٹیلی پیتھی کے ذریعے دنیا کی حسین ترین عورتوں کو ٹریپ کر کے عیاشی میں وقت گزار سکتا تھا لیکن وہ مونیکا کے سوا کسی کو اہمیت نہیں دیتا تھا۔

اب اس کے ذہن میں ایک سوال چیخ رہا تھا کہ کیسے وہ اپنے بیٹے کو فرہاد سے دور لے جائے؟ اتنی دور کہ وہ آتما شکتی کے ذریعے بھی اس کے بیٹے تک نہ پہنچ سکے۔ فی الوقت یہی ایک طریقہ سمجھ میں آرہا تھا کہ جلد از جلد اس کے دماغ کو لاک کر دیا جائے۔

اس نے اپنی اہم مصروفیات کو کھٹائی میں ڈال دیا۔ بیٹے کے اندر پہنچ کر معلوم کرنے لگا کہ فرہاد اس وقت وہاں موجود ہے یا نہیں؟ کیا وہ اپنے آلہ کاروں کے ذریعے اس کی نگرانی کر رہا ہے؟

یہ معلوم کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ بیٹے کے دماغ میں خاموشی چھائی رہتی تھی۔ صرف اس کی اپنی سوچ اس کے اندر گردش کرتی رہتی تھی۔ اس کی کسی بھی حرکت سے یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ فرہاد اسے اپنے طور پر استعمال کر رہا ہے۔

پھر ایرپورٹ پر اچھا خاصا ہجوم تھا۔ وہاں یہ معلوم نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کون لوگ اس کے بیٹے کی نگرانی کر رہے ہیں؟ ایسے وقت اندازے سے کام لینا پڑتا ہے۔ خطرہ مول لینا پڑتا ہے کہ جو کرنا ہے کر گزرو۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔

کرنا یہی تھا کہ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر بیٹے کے دماغ کو لاک کر دینا تھا۔ جان رچ ایرپورٹ میں سکون سے نہیں بیٹھ رہا تھا۔ ادھر سے ادھر جا رہا تھا۔ چاروں طرف گھوم گھوم کر نظریں دوڑا رہا تھا۔ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کون لوگ اس کی نگرانی کر رہے ہیں؟

وہ ایسا کر رہا تھا اور جھنجھلا کر سوچ رہا تھا۔ ''میں خوامخواہ کیوں اِدھر سے اُدھر جا رہا ہوں؟ قریب سے گزرنے والوں کو اور دور تک نظر آنے والوں کو کیوں اتنی توجہ سے دیکھ رہا ہوں؟''

یہ بات وہ سمجھ نہیں سکتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ باپ کی مرضی کے مطابق ایرپورٹ سے باہر آگیا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں سے بہت دور ایک ہوٹل کی طرف جانے لگا۔ ماسٹر جلد از جلد اس کے دماغ کو لاک کر دینا چاہتا تھا۔ ہوٹل پہنچتے ہی اس نے ایک کمرا کرائے پر لیا پھر اس کمرے میں پہنچتے ہی بیڈ پر لیٹ گیا۔ ماسٹر نے فوراً ہی اسے تھپک تھپک کر گہری نیند سلا دیا پھر تنویمی عمل کرنے لگا۔ اس وقت کیریا اور پورس پیرس کے لیے سیٹیں او کے کرانے کے بعد ایک ہوٹل میں آگئے تھے۔ وہاں کھانے کے دوران مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے۔ انہوں نے جان رچ کو یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا تھا کہ جب وہ نیویارک پہنچے گا تو کبریا خیال خوانی کے ذریعے اس کی خبر لے گا۔

بے باک بھی اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ یوں کہنا چاہیے کہ تقدیر اس وقت ماسٹر پر مہربان تھی۔ وہاں کوئی مداخلت کرنے والا نہیں تھا۔ وہ اپنے بیٹے کا برین واش کر رہا تھا۔ اس کے دماغ سے ماضی کی تمام باتیں مٹا رہا تھا۔ وہ کون ہے؟ اس کا باپ کون ہے؟ وہ کہاں پیدا ہوا تھا؟ کہاں رہتا آیا ہے؟ یہ سب کچھ اس کے ذہن سے مٹا رہا تھا۔ ایک نئے نام کے ساتھ ایک نئی شخصیت اس کے ذہن میں نقش کر رہا تھا۔ اس کی آواز اور لب ولہجہ بدل رہا تھا۔

وہ اتنی مہارت اور استحکام سے اس پر عمل کر رہا تھا کہ آیندہ پیدا کرنے والی ہاں بھی اسے اپنے بیٹے جان رچ کی حیثیت سے پہچان سکتی تھی اور نہ ہی وہ اپنی فیملی کو پہچان سکتا تھا۔ ماسٹر نے عمل کرنے کے بعد اسے دو گھنٹے تک تنویمی نیند سونے کا حکم دیا۔ پھر اس کے اندر مسلسل موجود رہا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے جانے کے بعد فرہاد یا اس کا کوئی آلہ کار وہاں پہنچ کر گڑبڑ تو نہیں کرے گا؟

بیٹے کے اندر مکمل خاموشی تھی۔ کوئی دوسرا ٹیلی پیتھی جاننے والا نہ تو اس کے اندر بول رہا تھا اور نہ ہی اس کے عمل کا توڑ کر رہا تھا۔ اس اطمینان کے بعد اس نے معلوم کیا کہ اس شہر میں پلاسٹک سرجری کا ماہر کون ہے؟ اور کہاں رہتا ہے؟ تھوڑی دیر بعد ہی اسے ایک ماہر سرجن کا پتا ٹھکانا مل گیا۔ اس نے اسے ٹریپ کر کے تنویمی عمل کیا پھر تین گھنٹے بعد بیٹے کو اس سرجن کے پاس پہنچا دیا۔ یہ تاکید کی اس کے بیٹے کو بہت ہی خوبرو جوان بنا دیا جائے۔

اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت نکال کر انہیں ہر طرف سے محفوظ کرے گا۔ جب یہ یقین ہو جائے گا کہ فرہاد کبھی اس کی فیملی تک نہیں پہنچ سکے گا' تب وہ دوسرے معاملات میں دلچسپی لے گا۔

☆☆☆

کرونا نے بڑی مہارت اور استحکام سے ٹونی جے پر تنویمی عمل کیا تھا۔ وہ تنویمی نیند سے بیدار ہوا تو یہ بھول گیا کہ اب سے چار گھنٹے پہلے اعصابی کمزوری میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کرونا نے اس کے خلاف سازش کی تھی اور اس پر تنویمی عمل کیا تھا۔ یہ سب کچھ وہ بھول چکا تھا۔ آیندہ بھی یہ باتیں اسے یاد آنے والی نہیں تھیں۔

ایک تو اس نے بڑی پھرتی سے عمل کیا تھا۔ دوسرا یہ کہ وہ ہر دوسرے تیسرے روز اس پر وہی عمل دہرانے والی تھی۔ تاکہ اس کے عمل کا استحکام ہمیشہ قائم رہے اور وہ اس کے اثر سے کبھی باہر نہ جا سکے۔

جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو واقعی سب کچھ بھول چکا تھا۔ کرونا نے اسے اعصابی توانائی کے لیے دوا کھلائی' جوس پلایا پھر بڑے پیار سے پوچھا۔ ''اب کیسے ہو؟''

وہ حیرانی سے بولا۔ ''مجھے کیا ہوا تھا؟ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔''

''ٹھیک ہو تو بے وقت کیوں سو رہے تھے؟''

''ہاں، یہ سوچنے کی بات ہے۔ شاید میں تھک گیا تھا یا بے وقت اس لیے نیند آ گئی کہ کبھی کبھی عادت کے خلاف بھی آدمی سوتا اور جاگتا ہے۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''تم درست کہہ رہے ہو۔ بائی دا وے۔ میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

وہ اسے بڑے پیار سے دیکھنے لگا۔ اس نے ٹونی کے ذہن میں یہ بات نقش کی تھی کہ وہ آئندہ دیوانگی کی حد تک اس سے محبت کرے گا۔ اسے اپنی پہلی اور آخری شریکِ حیات بنائے گا۔

اس نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''تم میری مہمان بن کر آئی ہو لیکن میں نہیں چاہتا کہ یہاں سے واپس جاؤ۔ اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔''

وہ بولی۔ ''میں بھی اپنے دل کی بات کہہ رہی ہوں۔ تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گی لیکن یہاں کب تک مجھے مہمان بنا کر رکھو گے؟''

''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم تو میرے دل کی بات کہہ رہے ہو۔ ہم ٹیلی پیتھی جانتے ہیں۔ ہم میاں بیوی بن کر ایک طاقت بن جائیں گے اور دوسرے ٹیلی جاننے والوں پر بھاری پڑیں گے۔ میں نے اس سلسلے میں بہت زبردست پلاننگ کی ہے۔''

کرونا نے اس کے دماغ میں یہ بات بھی نقش کی تھی کہ آئندہ وہ خیال خوانی سے پرہیز نہیں کرے گا اور گمنامی کی زندگی نہیں گزارے گا۔ اس نے کہا۔ ''اگر تم نے کوئی پلاننگ کی ہے تو پھر زبردست ہوگی۔ مجھے بتاؤ کیا چاہتی ہو؟''

وہ تین امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والے جوکوما میں تھے۔ اب بالکل نارمل ہو گئے ہیں۔ تم اور فرمان ان کے اندر جا کر دیکھ چکے ہو۔''

وہ اثبات ..... میں سر ہلا کر بولا۔ ''برین ماسٹر نے ان تینوں پر دوبارہ عمل کیا ہے۔ ان کے دماغوں میں مخصوص آواز اور لب و لہجہ نقش کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ جب بھی وہ اس آواز اور لب و لہجے کے ذریعے انہیں مخاطب کرے گا تو وہ اپنے امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والوں کا تنویمی عمل بھول جائیں گے پھر اس کے حکم کے مطابق وہ جگہ چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے جائیں گے اور وہاں روپوش رہیں گے۔''

''اب یہ معلوم کرنا چاہیے کہ وہ کہاں ہیں؟ اور کیا کر رہے ہیں؟''

ٹونی جے نے کہا۔ ''کیا میں فرمان کو بلاؤں؟ وہ بھی اس مہم میں شریک تھا۔''

''نہیں، فرمان کو ہمارے کسی بھی معاملے میں شریک نہ کرو۔ وہ ہمارے ساتھ زیادہ دور تک نہیں چل سکے گا۔''

''نہیں کرونا! وہ میرا بہت اچھا اور بہت ہی مخلص دوست ہے۔ ہمیشہ میرا ساتھ دے سکتا ہے۔''

''تم نہیں جانتے..... وہ مسلمان ہے۔ ہمیشہ مسلمانوں کا ساتھ دے گا۔ پاپا کی پوری فیملی کو اور ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو یہ بتا دے گا کہ ہم کس طرح امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو اپنے زیرِ اثر لا رہے ہیں؟''

''کیا تم سونیا مما' ان کے بچوں اور ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے یہ بات چھپانا چاہتی ہو؟''

''بے شک، میں اور تم اپنی ایک ذاتی ٹیلی پیتھی جاننے والوں کی فوج بنائیں گے۔ بے شک ہم پاپا کی طرح سونیا مما کے تابعدار رہیں گے اور ان کے بچوں کو دوست بنا کر رکھیں گے لیکن اپنے کسی راز میں شریک نہیں کریں گے۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کرونا نے کہا۔ ''بنیادی طور پر دیکھا جائے تو ہم یہودی ہیں اور وہ مسلم ہیں۔ ہم جب بھی انہیں کہیں گے کہ وہ اپنا مذہب تبدیل کریں تو وہ کبھی ایسا نہیں کریں گے بلکہ چاہیں گے کہ ہم اپنا مذہب بدل کر ان میں شامل ہو جائیں اور وہ ایسا کر چکے ہیں۔ نومی کرسٹل نے اپنا مذہب بدل لیا ہے۔ الپا نے بھی یہی کیا ہے۔''

وہ اس کے قریب ہو کر شانے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔ ''جب وہ بنیادی طور پر ہماری خاطر تبدیل نہیں ہو سکتے تو ہم ان پر کیسے بھروسا کریں؟ وہ یہودیوں کے خلاف محاذ آرائی کرتے ہیں۔ آئندہ ہم اسرائیل میں رہ کر اپنے اس ملک کو اور یہودی قوم کو تحفظ فراہم کریں گے۔ تم میرے نیک جذبات کو سمجھو۔''

ٹونی جے کو سمجھنا کیا تھا؟ وہ تو عمل کے ذریعے بہت پہلے ہی اسے سمجھا چکی تھی کہ وہ اس کی ہاں میں ہاں ملائے گا۔ کبھی

مخالفت نہیں کرے گا۔ اس کی محبت میں ہمیشہ اس کا دیوانہ بن کر رہے گا۔

وہ بہت دیر تک کرونا کے ساتھ مستقبل کے منصوبے بناتا رہا پھر رات کے کھانے کے بعد وہ دونوں خیال خوانی کے ذریعے ان تین امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے اندر پہنچنے لگے۔

وہ تینوں واشنگٹن میں تھے۔ وہاں شام ہو رہی تھی۔ ان کے خیالات سے پتا چلا کہ انہیں گھومنے پھرنے کی آزادی ہے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کے ساتھ دو دو مسلح جاسوس رہتے ہیں۔ وہ ان نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ جب بھی انہیں کوئی خطرہ پیش آتا ہے تو وہ فوراً ہی خیال خوانی کے ذریعے ان جاسوسوں کو الرٹ کر دیتے ہیں۔

کرونا اور ٹونی جے نے ان تینوں کے اندر باری باری جا کر پھر سے عمل کیا۔ نئی آواز اور لہجے کے ذریعے ان کے دماغوں کو لاک کر دیا تاکہ ماسٹر اور امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والے ان کے اندر نہ پہنچ سکیں۔

عمل کے بعد انہیں آدھے آدھے گھنٹے تک تنویمی نیند سونے کا حکم دیا گیا تھا۔ مقررہ وقت پر وہ تینوں بیدار ہو گئے۔ ان کی مرضی کے مطابق باہر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ انہوں نے دستور کے مطابق اپنے اپنے دو جاسوسوں کو اطلاع دی کہ وہ باہر جانے والے ہیں۔ لہٰذا وہ ان کے ساتھ ہی رہیں۔

وہ تینوں اپنے پاس ہتھیار رکھتے تھے۔ تاکہ کسی بھی خطرہ کے وقت انہیں استعمال کر سکیں۔ انہوں نے اپنے لباس میں ریڈی میڈ میک اپ کا کچھ سامان چھپا لیا تھا۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ اپنی اپنی گاڑیوں میں آ کر بیٹھ گئے۔

کرونا اور ٹونی جے نے ان کے دماغوں میں یہ باتیں نقش کر دیں تھیں کہ انہیں اپنی رہائش گاہوں سے باہر نکلنے کے بعد کیا کرنا ہے؟ کہاں جانا ہے؟ اس کے باوجود وہ دونوں خیال خوانی کے ذریعے ان تینوں کے اندر جا رہے تھے لیکن بیک وقت صرف دو کے اندر رہ سکتے تھے۔ ایسے وقت تیسرے کے اندر پہنچ کر اس کی خیریت معلوم کرتے رہتے تھے۔

وہ تینوں لمبی آؤٹنگ کے لیے نکلے تھے۔ ان کے ساتھ رہنے والے وہ دو دو جاسوس ان کی گاڑیاں ڈرائیو کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک بائیں مور جانے والے راستے پر تھا، دوسرا ایک ہائی وے پر جنوب کی طرف جا رہا تھا اور تیسرا شمال کی طرف بڑھ رہا تھا۔

سب سے پہلے تیسرے کو موقع ملا۔ اس کی کار ہائی وے پر ایک ویران علاقے سے گزر رہی تھی۔ اس نے فوراً ہی ریوالور نکال کر آگے بیٹھے ہوئے ایک مسلح جاسوس کو گولی سے اُڑا دیا۔ دوسرے نے چونک کر کار روک دی۔ پلٹ کر پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟

مگر دوسری گولی نے مہلت نہ دی۔ پلک جھپکتے ہی اس کا کام بھی تمام ہو گیا۔ اس کارروائی سے فارغ ہوتے ہی اس نے ڈرائیونگ سیٹ والے کو کھینچ کر پچھلی سیٹ پر ڈالا پھر اسٹیرنگ سنبھال کر وہاں سے واپس جانے لگا۔ ذرا دور جانے کے بعد اس نے گاڑی کو جنگلی جھاڑیوں کے پیچھے روک دیا پھر دوڑتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ وہاں سے گزرنے والی گاڑیوں سے لفٹ لینے کی کوشش کرنے لگا۔

اتفاق سے مردوں کو شکار کرنے والی ایک عورت کار ڈرائیو کرتی ہوئی اِدھر آ رہی تھی۔ اس نے لفٹ مانگی تو اس نے فوراً ہی کار روک دی۔ اگلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ ''یہاں کوئی کسی کو لفٹ نہیں دیتا مگر میں تمہیں دوں گی۔''

وہ اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''شکریہ، آگے کہیں ٹیکسی مل جائے گی تو میں اتر جاؤں گا۔''

وہ کار آگے بڑھاتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ ''تم جہاں جانا چاہو گے میں تمہیں پہنچا دوں گی۔''

اس نے دل میں کہا۔ ''وہ تو تمہیں پہنچانا ہی ہوگا۔''

پھر وہ اس کے خیالات پڑھنے لگا۔ پتا چلا کہ اچھی خاصی دولت مند خاتون ہے۔ مگر مردوں کی بھوکی ہے۔ جنسی جنون میں مبتلا رہتی ہے۔ اس نے پوچھا۔ ''اگر میں تمہارے گھر چلوں تو.....؟''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''تو میں تمہیں خوش آمدید کہوں گی۔''

''لیکن میں قانون کے محافظوں سے چھپ رہا ہوں۔ کیا تم میرا ساتھ دو گی؟''

وہ بڑے جذباتی انداز میں بولی۔ ''تم گھر میں چھپانے کی بات کر رہے ہو۔ میں تو تمہیں دل میں چھپا کر رکھوں گی۔''

وہ اپنے لباس میں سے ریڈی میڈ میک اپ کا سامان نکالتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے چہرے پر تبدیلی کر رہا ہوں اور تم پر بھروسا کر رہا ہوں۔''

حالانکہ بھروسا کرنا ضروری نہیں تھا۔ وہ آئندہ اسے اپنی تابعدار بنا کر اس کے ساتھ دو چار دن گزارتا تو اسے تلاش کرنے والے اس کے روبرو پہنچ کر بھی اس پر شبہ نہ کرتے کیونکہ وہ بعد میں مستقل میک اپ کے ذریعے چہرہ تبدیل

کرنے والا تھا۔

وہ تینوں ٹیلی پیتھی جاننے والے جب بھی کہیں نکلتے تھے تو پچھلی سیٹ پر بیٹھا کرتے تھے۔ اگلی سیٹ پر بیٹھنے والے محافظ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ جن کی حفاظت کر رہے ہیں۔ وہی ان پر قاتلانہ حملہ بھی کر سکتے ہیں۔

دوسرے ٹیلی پیتھی جاننے والے وائس مین نے بھی یہی کیا۔ آگے بیٹھنے والوں کو گولیوں سے اُڑا دیا پھر وہاں سے فرار ہو کر ایک ایسے چھوٹے کاج میں آ گیا۔ جہاں بوڑھے میاں بیوی اپنی عمر کے آخری ایام گزار رہے تھے۔ اس نے تنویمی عمل کے ذریعے ان دونوں کے دماغوں میں بات نقش کر دی کہ وہ ان کا بیٹا ہے۔ بہت عرصے کے بعد لندن سے یہاں آیا ہے۔ وہ بھی وہاں رہ کر اطمینان سے اپنا چہرہ تبدیل کرنے والا تھا۔

تیسرے ٹیلی پیتھی جاننے والے واسکوڈی نے بھی یہی کیا۔ سامنے بیٹھے ہوئے دونوں محافظوں کو گولی ماری لیکن ان کی لاشوں کو چھپانے کے لیے اس کار کو ہائی وے سے دور نہ لے جا سکا۔ اس سے پہلے ہی پولیس کی ایک موبائل وین وہاں پہنچ گئی۔ ایسے وقت واسکوڈی فرار ہونا چاہتا تو وہ اسے گولی مار دیتے۔ کرونا اس کے اندر تھی۔ اس نے کہا۔ ''تمہیں حرام موت نہیں مرنا ہے۔ حالات سے سمجھوتا کرو اور گرفتاری پیش کر دو۔ ہم بعد میں تمہیں نکال لیں گے۔''

ٹونی جے نے اسے حکم دیا۔ ''تم خیال خوانی کے ذریعے اپنے امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے رابطہ کرو۔ انہیں بتاؤ کہ کس طرح پولیس کے شکنجے میں آ گئے ہو۔ وہ تمہیں کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچنے دیں گے۔ تم یہ بیان دو گے کہ کسی نے تمہیں اپنا تابعدار بنایا ہے اور تم اس عامل کو نہیں جانتے ہو۔''

کرونا نے کہا۔ ''ہم نے تمہارے دماغ میں یہ بات نقش کی ہے کہ ہماری مخصوص آواز اور لب و لہجے کو صرف تم جانتے ہو۔ ہم بعد میں اسی لب و لہجے کے ذریعے رابطہ کریں گے۔''

کرونا اور ٹونی جے نے تیسرے کو فی الحال اس کے حالات کے مطابق چھوڑ دیا۔ باقی کے دو پر توجہ دینے لگے۔ انہیں بتایا کہ ان کا تیسرا ساتھی گرفتار ہو گیا ہے۔ باقی دو کو تلاش کرنے کے لیے صرف پولیس والے نہیں، آرمی کے جوان بھی دور دور تک پھیلیں گے۔ ٹیلی جنس والے ہر علاقے کے مکان میں جھانک جھانک کر دیکھیں گے۔ لہٰذا وہ فوراً بازار جا کر میک اپ کا سامان خریدیں اور ایسی مہارت سے چہرہ بدلیں کہ کوئی ان پر شبہ نہ کر سکے۔

ان دونوں نے جب تک مکمل مہارت سے اپنے چہروں کو تبدیل نہیں کیا تب تک کرونا اور ٹونی جے ان کے ساتھ لگے رہے پھر مطمئن ہو کر اپنی جگہ دماغی طور پر حاضر ہو گئے۔ کرونا نے کہا۔ ''ہم نے بڑی کوشش کی مگر ایک ٹیلی پیتھی جاننے والا ہاتھ سے نکل گیا۔''

ٹونی جے نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں، پہلی بار یہی بہت بڑی کامیابی ہے کہ ہم نے دو ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو اپنا تابعدار بنا لیا ہے۔ ہماری تعداد بڑھ گئی ہے۔ دو سے چار ہو گئے ہیں۔ یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں ہے۔''

انہوں نے طے کیا کہ ہر دوسرے تیسرے دن ان دونوں پر عمل کرتے رہیں گے اور سختی سے ان کی نگرانی کرتے رہیں گے۔ اس طرح نہ تو وہ ان کے اثر سے نکل سکیں گے اور نہ وہاں کے قانون کی گرفت میں آ سکیں گے۔

ٹونی جے یہی سمجھ رہا تھا کہ ان دونوں پر ہر دوسرے تیسرے دن عمل کرنا ہے۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ کرونا اس پر بھی یہی عمل کرتی رہے گی۔

☆☆☆

ایمان علی کو جب سے وہ آگاہی ملی تھی تب سے وہ بری طرح الجھا ہوا تھا۔ پہلے تو یہی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ عجوبہ کون ہے؟ کیا وہ جیسا نظر آیا تھا' ویسا ہی نگاہوں کے سامنے آئے گا؟

آگاہی کہہ رہی تھی کہ وہ ضرور آئے گا اور جب آئے گا تو سب کو زنجیریں پہنا چکا ہوگا۔ ایسے وقت فرہاد موت کی دہلیز پر ہوگا۔ یہ دوسری بات بھی الجھانے والی تھی کہ جو فرہاد مر چکا ہے۔ وہ آگاہی کے دوران زندہ کیسے دکھائی دے رہا تھا؟ اگر آگاہی درست تھی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ فرہاد زندہ ہے۔

اگرچہ ایمان علی کے لیے یہ خوشی کی بات تھی لیکن پھر ایک بار موت کی آگاہی مل رہی تھی۔ صلیب پر چڑھائے جانے کا مطلب یہی تھا کہ مرنا لازمی ہے۔

ایک اور اُلجھن یہ تھی کہ وہ عالی کو اس سلسلے میں کیا بتائے گا؟ وہ دوسری صبح دیر تک سوتا رہا اور عالی اس کا انتظار کرتی رہی۔ سوچتی رہی۔ ''پتا نہیں ایمان علی تمام رات کیا کرتا رہا ہے؟ کس قسم کی پڑھائی کرتا رہا ہے؟ کیا اس نے ہمارے مستقبل کے بارے میں اہم معلومات حاصل کی ہیں؟''

وہ دن کے ایک بجے سو کر اٹھا۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہوا تو ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ عالی بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ تنہائی میں ملنا چاہتی تھی۔ نماز کے بعد سب کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔ اس کی بے چینی بڑھتی ہی جا رہی

تھی۔

وہ بار بار اس کے چہرے کو تک رہی تھی۔ وہ کچھ الجھا ہوا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس سے نظریں بھی چرا رہا تھا۔ کئی بار اس کے جی میں آیا کہ خیال خوانی کے ذریعے اس کے اندر پہنچ کر معلوم تو کرے کہ وہ آخر اتنا چپ چپ سا کیوں ہے؟

لیکن وہ بہت پہلے وعدہ کر چکی تھی کہ اس کی مرضی کے خلاف کبھی اس کے اندر نہیں آئے گی۔ ایسے میں وہ پرائی سوچ کی لہروں کو محسوس کر کے سانس روک سکتا تھا پھر یہ کہ کھاتے وقت سب کے درمیان بیٹھ کر خیال خوانی کرنا مناسب نہیں تھا۔ ایسے میں کھل کر بات نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ پیٹ بھر کر نہ کھا سکی۔ کھانا چھوڑ کر اٹھ گئی۔ ایمان علی کی والدہ نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے بیٹی! کیا کھانا اچھا نہیں لگا؟''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ کھانا تو بہت مزیدار ہے۔ بس میرا پیٹ بھر گیا ہے۔''

ایمان اس کی بے چینی کو سمجھ رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ بھی کھانا چھوڑ کر اٹھتے ہوئے بولا۔ ''امی! آپ سب کھائیں۔ میں ذرا دیکھتا ہوں۔ عالی کچھ پریشان لگ رہی ہے۔''

وہ وہاں سے چلتا ہوا اس کے بیڈ روم میں آ گیا۔ عالی کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ ضرور اس کے پیچھے آئے گا اور آ ہی گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تم کھانا چھوڑ کر چلی آئیں؟''

عالی نے اسے دیکھا پھر نظریں جھکا کر کہا۔ ''مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو؟ تم سمجھ سکتے ہو، میں کل سے پوچھ رہی ہوں کہ میرے فیوچر کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ میں یہاں سے کبھی جا سکوں گی یا نہیں؟ سفر کرنا چاہوں گی تو کب تک روکاوٹیں پیش آتی رہیں گی؟ لیکن تم میری باتوں کا کیا جواب دو گے؟ تمہارے منہ پر تو بارہ بج رہے ہیں۔ ضرور کوئی پریشانی کی بات ہے اور وہ مجھ سے چھپانا چاہتے ہو۔''

وہ اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بھلا میں تم سے کیا چھپاؤں گا؟''

''سچ کہو، کیا تم پریشان نہیں ہو؟''

''ہاں، پریشان تو ہوں۔ مگر کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ بس یہ سوچ رہا ہوں کہ کیسے بتاؤں؟''

''تعجب ہے اور کیسے بتاؤ گے؟ زبان سے بول کر بتاؤ۔ ابھی اردو زبان بول رہے ہو۔ اگر بولنا چاہو تو انگریزی میں بولو۔ ویسے میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ جب زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے اور تم مجھے بتا سکتے ہو تو اتنی سوچ بچار کس لیے....؟''

''علم نجوم نے الجھا دیا ہے۔ بہر حال تم مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ جو کچھ میں کہوں گا۔ وہ تم کسی پر ظاہر نہیں کرو گی؟''

''میں وعدہ کرتی ہوں، تم جو چاہو گے وہی ہوگا۔ راز کی بات راز میں ہی رہے گی۔''

''تم اپنے کسی رشتے دار حتیٰ کہ اپنے کسی بزرگ سے بھی نہیں بولو گی۔''

''توبہ ہے۔ آخر بات کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔ میں کسی سے بھی نہیں کہوں گی۔ اپنے بزرگوں سے تو کیا اپنے سائے سے بھی نہیں کہوں گی۔ اب تو بولو۔''

''اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میری پچھلی پیش گوئی درست نہیں تھی۔ علم نجوم میں میرا حساب کچھ غلط ہو گیا تھا اور میں نے یہ کہہ دیا تھا کہ تمہارے پاپا وفات پا جائیں گے؟''

''مگر تم نے غلط کب کہا تھا؟ تمہاری بات تو درست نکلی ہے؟''

''یہی تو بات ہے کہ وہ پیش گوئی درست نہیں تھی۔ تمہارے پاپا زندہ ہیں۔''

''کیا.....؟''

وہ ایک دم سے چیخ مار کر اُچھل پڑی۔ اسے دونوں بازوؤں سے پکڑتے ہوئے بولی۔ ''کیا سچ کہہ رہے ہو؟''

وہ اس کے منہ پر اپنی ایک ہتھیلی رکھتے ہوئے بولا۔ ''خدا کے لیے اس کے بعد نہ چیخنا۔ خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔ تم نے وعدہ کیا ہے، یہ بات کسی کو نہیں بتاؤ گی۔''

''کیوں نہ بتاؤں؟ اس میں چھپانے کی کیا بات ہے؟''

''بات یہ ہے کہ ابھی جو میں تمہارے پاپا کے زندہ رہنے کی پیش گوئی کر رہا ہوں۔ یہ بھی غلط ہو سکتی ہے۔''

وہ ذرا مایوس ہو کر جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو! تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ وہ زندہ ہیں مگر.... مگر اس بار میں ان کی موت کی سچی پیش گوئی کر رہا ہوں۔''

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کا منہ یوں تکنے لگی، جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ وہ سوچنے لگی۔ ''ایمان علی کو کیا ہو گیا ہے؟ پاپا مر چکے ہیں اور یہ انہیں زندہ کہہ رہا ہے پھر انہیں زندہ کرنے کے بعد دوبارہ موت کی پیش گوئی کر رہا ہے۔ آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟''

ٹیلی پیتھی کے فسوں کار فرہاد علی تیمور کی اس مقبول عام سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں پڑھیے

سولہ مارچ۔

میری زندگی کی ایک اہم تاریخ۔ ہماری شادی کی تاریخ۔ اس تاریخ کو ہم خوشیاں مناتے ہیں۔ میں خاص طور پر کیک بنواتی ہوں۔ چاکلیٹ کیک جو فیاض کو شروع سے پسند رہا ہے۔

اس تاریخ کو میں پورے گھر کو سجاتی ہوں۔ فیاض میرے اس والہانہ پن پر بہت ہنستا ہے۔ ''جانم، آخر یہ سب کیوں کرتی ہو۔ اب میری عمر تو نہیں رہی کہ میں اپنی شادی کی سالگرہ مناتا رہوں۔''

''لیکن یہ دن میرے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔'' میں اس سے کہتی ہوں۔ ''اور یہ میری خوشی بھی ہے۔ اس لیے تم مجھے منع مت کیا کرو۔''

''اچھا بابا، منع نہیں کرتا۔'' فیاض ہنس دیتا ہے۔

پھر ہم دونوں میاں بیوی برتھ ڈے سیلی بریٹ کرتے ہیں اور رات کا کھانا کہیں باہر کھاتے ہیں۔

فیاض صرف میرا شوہر ہی نہیں بلکہ میری محبت بھی ہے۔ اگر شوہر محبوب بھی ہو تو پھر اس کی ہر بات یاد رکھی جاتی ہے۔ جس طرح میں یاد رکھتی ہوں۔

فیاض سے میری ملاقات پھولوں کی ایک خوب صورت دکان میں ہوئی تھی۔ اس دن بھی میری ایک دوست کی برتھ ڈے تھی۔ میں اس کے لیے پھول خریدنے اس دکان میں داخل ہوئی تھی۔ دکان میں اس وقت صرف ایک نوجوان کھڑا

سولہ مارچ

منظر امام

محبت جب بھی اپنی معراج پاتی ہے جب اس میں قربانی شامل ہوجائے، وگرنہ خالی محبت کے وعدے تو سبھی کرلیتے ہیں۔ محبت کی معراج پانے والوں کی دل گداز و چشم کشا کہانی

ہوس کی غلیظ کیچڑ میں کھلنے والے محبت کے کنول کی داستان

ہوا تھا۔ ''مجھے ایک خوب صورت سا بوکے بنا دیں۔'' میں نے اسے آرڈر دیا۔

''کتنا خوب صورت؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

میں جز بز ہو کر رہ گئی۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟ جب کہہ رہی ہوں کہ خوب صورت بوکے بنا دیں تو یہ کیا پوچھنا ہے؟''

''محترمہ، وہی تو معلوم کرنا چاہ رہا ہوں کہ اس بوکے کی خوب صورتی کا معیار کیا ہو۔ کیا وہ آپ ہی کی طرح خوب صورت ہو یا آپ سے کچھ کم ہو۔''

''عجیب بدتمیز آدمی ہو تم۔'' میں چڑ گئی تھی۔

''میں آپ کی تعریف کر رہا ہوں اور تعریف بدتمیزی نہیں ہوتی بلکہ حسن ذوق ہوتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اور یاد رکھیں کہ تعریف اسی کی کی جاتی ہے جو اس قابل ہوتا ہے۔''

میں اس کو کوئی سخت بات کہنے والی تھی کہ ایک اور شخص دکان میں داخل ہو گیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں کچھ نوٹ اور ریزگاری وغیرہ لے کر آیا تھا۔ ''یہ لیں صاحب۔'' اس نے پہلے والے نوجوان کو مخاطب کیا۔ ''بہت مشکل سے کھلا ملا ہے۔''

اور اس وقت پتا چلا کہ وہ نوجوان دکاندار نہیں تھا بلکہ وہ بھی پھول خریدنے آیا ہوا تھا اور میں اسے دکاندار سمجھ کر اس سے الجھ پڑی تھی۔ وہ نوجوان شرارت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھے جا رہا تھا اور مجھے اس پر غصہ بھی آ رہا تھا اور اس کی حرکتوں پر ہنسی بھی آ رہی تھی۔ بہرحال میں نے اپنی پسند کا بوکے بنوایا اور اس دکان سے باہر آ گئی۔ وہ بھی میرے پیچھے ہی باہر آیا تھا۔ ''محترمہ۔'' اس نے مجھے آواز دی۔ ''پلیز ایک منٹ۔''

میں رک گئی۔ نہ جانے وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ وہ نوجوان جلدی سے میرے پاس آ گیا۔ ''آپ نے میری شرارت کا برا تو نہیں مانا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''خیر، جو ہو گیا وہ ہو گیا۔ اب آپ بے تکلف ہونے کی کوشش مت کیجیے گا۔'' میں نے کہا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں آپ سے کیوں بے تکلف ہونے لگا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں تو یہ بھی نہیں بتاؤں گا کہ میرا نام فیاض انور ہے اور میں ایم بی اے کر رہا ہوں۔ کیا فائدہ آپ کو یہ سب بتانے کا؟''

میں زیر لب مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ کچھ بھی ہو وہ آدمی دلچسپ تھا۔ اس نے مجھ سے کسی قسم کی بدتمیزی نہیں کی تھی۔ صرف شرارت کی تھی اور وہ بھی بہت مہذب قسم کی شرارت۔

تو فیاض سے اس طرح میری ملاقات ہوئی تھی۔ پہلی ملاقات۔

اس کے بعد کئی ہفتوں تک وہ مجھے یاد آتا رہا تھا۔ اس کی خوب صورت باتیں یاد آتی رہی تھیں۔ ''نہ جانے کون تھا؟ کہاں رہتا تھا؟ کیا کرتا تھا؟''

کہتے ہیں جب کوئی ذہن اور دل میں بسا ہو اور اس سے ملنے کی خواہش شدید بھی ہو تو یہ خواہش پوری ہو جاتی ہے اور یہ اتفاق ہے کہ وہ ایک شام پھر مجھے ایک شاپنگ سینٹر میں مل گیا تھا۔

ہم دونوں نے پہلی نگاہ میں ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ ''کیا بات ہے۔ یہ آپ ہر وقت دکانوں کے چکر کیوں لگاتی رہتی ہیں؟'' اس نے شوخ انداز میں پوچھا۔

''یہی سوال میں آپ سے بھی تو کر سکتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اوہ ہاں۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''چلیں، اس معاملے میں ہم دونوں ایک جیسے تو ہوئے۔ ویسے آپ مجھے ایک پرابلم میں ڈال گئی تھیں۔''

''کیسی پرابلم؟''

''آپ نے تو مجھے فیاض انور کے نام سے یاد کیا ہو گا لیکن میں کس نام سے یاد کرتا۔''

اس نے بہت سلیقے سے میرا نام دریافت کر لیا تھا۔

''چلیں بتا دیتی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میرا نام سائرہ ہے۔ بانو نہیں صرف سائرہ۔''

''بہت بہت شکریہ۔''

''اب شاید آپ یہ کہنے والے ہیں کہ چلیں کہیں چل کر بیٹھ جاتے ہیں۔'' میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپ قیافہ شناس بھی معلوم ہوتی ہیں۔'' وہ ہنس دیا۔ ''چلیں، میں آپ کے اندازے کو غلط نہیں کروں گا۔ جی ہاں۔ چلیں چل کر کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔''

مجھے اس کے ساتھ قریبی کیفے تک جانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ حالانکہ میں بہت ریزرو قسم کی لڑکی رہی ہوں۔ لیکن فیاض کے انداز میں کسی قسم کا گھٹیا پن نہیں تھا بلکہ ایک ایسی بے تکلفی اور خلوص کا پہلو تھا جو صرف دوستوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ اس لیے میں اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

ہم ایک قریبی کیفے میں جا کر بیٹھ گئے تھے۔

یہ ہماری دوسری ملاقات تھی۔ جو بہت دیر تک جاری رہی تھی اور ہم نے اس ملاقات میں ایک دوسرے کے بارے

میں بہت کچھ جان لیا تھا۔ فیاض کا تعلق ایک کھاتے پیتے تعلیم یافتہ مہذب گھرانے سے تھا۔ ایم بی اے کررہا تھا اور زندگی کے بارے میں اس کا اپروچ بہت دوستانہ تھا۔ وہ ہنستے کھیلتے ہوئے زندہ رہنے کے فلسفے پر یقین رکھتا تھا۔

اس نے بتایا کہ اس سے بڑا ایک اور بھائی ہے جو ڈاکٹر ہے۔ دو چھوٹی بہنیں تعلیم حاصل کررہی تھیں۔ غرضیکہ پہلی ملاقات میں اس نے اپنا اور اپنے گھر والوں کا مکمل تعارف کروادیا تھا۔ ''ہاں اب تم اپنے بارے میں بتاؤ۔'' اس نے دریافت کیا۔

''میرا خیال ہے کہ میرے پاس اپنے بارے میں بتانے کے لیے کوئی زیادہ باتیں نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''والد صاحب ریٹائر سرکاری آفیسر ہیں۔ دو بھائی ہیں۔ جو جاب کررہے ہیں۔ امی دن بھر پڑوسنوں سے گپ شپ کرتی رہتی ہیں اور میں اپنی اسٹڈی میں لگی رہتی ہوں۔''

''اسٹڈی میں یا گھومنے پھرنے میں۔''

''اس کو بھی اسٹڈی سمجھ لو۔'' میں مسکراتی ہوئی بولی۔

''انسانوں کو دیکھنا ان کے بارے میں جاننا بھی تو ایک علم ہی ہے۔''

اس دوسری ملاقات میں ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے تھے۔ محبت کے مرحلے تو اسی طرح طے ہوا کرتے ہیں۔ آندھی طوفان کی طرح۔ یہ وہ سیلاب ہے جو اپنی راہ بناتا ہوا نکلتا جاتا ہے۔

ہم جب رخصت ہونے لگے تو اس نے کہا۔ ''چلو، میں تمہیں تمہارے گھر تک ڈراپ کردیتا ہوں۔''

''نہیں۔'' میں مسکرادی۔ ''اب یہ نہیں ہوگا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مجھے ڈراپ بھی کرو۔''

''اچھا چلو، یہ بتاؤ کب ملوگی؟''

''میں نے تمہارا موبائل نمبر لے لیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جب تم سے ملنے کی خواہش ہوگی۔ میں فون کردوں گی۔''

اور اس یاد کی گھڑی کے انتظار میں یہ موبائل میرے سینے سے لگا رہے گا۔'' اس نے کہا۔

وہ چلا گیا۔ اور میں اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک اس کی گاڑی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔ اس کے بعد میں نڈھال سی ہوکر ایک طرف ایک دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی تھی۔

میں نے اپنے بارے میں اس سے بہت جھوٹ بولا تھا۔ میں وہ نہیں تھی جو میں نے کہا تھا۔ میرا ماضی میرا بیک گراؤنڈ کچھ اور تھا۔ لیکن کیا کرتی۔ جب پہلی دفعہ کسی کی اتنی محبت اور توجہ حاصل ہورہی ہو تو اس پر اپنے زخم نمایاں نہیں کیے جاتے۔

میرا خاندانی پس منظر کچھ بھی نہیں تھا۔

میں اس عورت کی بیٹی تھی۔ جسے معاشرے میں بہت حقیر نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ ایک گانے والی تھی۔ گلشن نام تھا میری ماں کا۔ دوسروں کے لیے وہ چاہے جیسی بھی ہیں لیکن میرے لیے تو وہ سب کچھ تھی۔ اس نے خود پر سختیاں برداشت کی تھیں لیکن مجھ پر کبھی آنچ نہیں آنے دی تھی۔

میری رہائش بھی ایک بالاخانے میں تھی۔

یہ بالا خان بخشی خانم کا بالا خانہ کہلاتا تھا۔ بہت ہی ٹھسّے کی عورت تھی۔ پورے بازار میں اس کی دھاک بندھی ہوئی تھی۔ وہ ایسا بالا خانہ تھا جس کی عمارت سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی تھی۔ دو منزلہ۔ بہت خستہ تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ گٹر کا پانی بہتا رہتا۔ اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ لکڑی کی

خواتین کا جانا پہچانا نام

خانم بیوٹی ہوم جو آپ کے کھوئے حسن کو دوبالا کرنے میں مصروف عمل رہا ہے، خود کو حسین سے حسین تر بنانے اور شخصیت کو نیا نکھار دینے کیلئے کریں ہماری پروڈکٹس کا استعمال۔

سکونی ہربل ہیئر ٹانک: خاص کر ایسی لڑکیوں وخواتین کیلئے تیار کیا گیا ہے جو دماغی کمزوری وسر کی خشکی کے باعث اپنے گرتے اور تیزی سے سفید ہوتے بالوں سے پریشان ہوں۔ اس کا استعمال بالوں کو دوبالا بنا دیتا ہے مضبوط اور بنائے لمبا، گھنا، سیاہ و چمکدار۔ جو ئیں لیکھیں بھی کرے ختم۔ قیمت فی پیکنگ 180 روپے

اسکنول: چہرے پر پیدا شدہ دانوں، کیل مہاسوں، داغ دھبوں کو کرے ہمیشہ کیلئے دور اور چہرے کو دے رونق۔ ہزاروں کا آزمودہ قیمت فی پیکنگ -/200

خانم بیوٹی ہوم کا ایک خاص شعبہ خواتین بھی ہے جو ایسی لڑکیوں وخواتین کو مفت مشورہ فراہم کرتا ہے جو کسی بھی قسم کی پوشیدہ تکلیف میں مبتلا ہوں یا برسوں سے اولاد جیسی نعمت سے محروم ہوں۔ مشورہ کیلئے ایک خط معہ جوابی لفافے کے لکھیں، گھر بیٹھے کوئی بھی پروڈکٹ منگوانے کیلئے وی پی پارسل طلب فرمائیں۔ کوئی ایک چیز منگوانے کیلئے محصول ڈاک خرچ علاوہ 50 روپے ہوگا، دو یا زائد اشیاء منگوانے پر محصول خرچ معاف ہوگا۔ اپنا خط یقینی ترسیل کیلئے رجسٹرڈ پوسٹ روانہ کریں۔

خانم بی ہوم، پوسٹ بکس نمبر 2535، کراچی 74600

بنی ہوئی۔ بوقدموں کے بوجھ سے کراہتی رہتیں۔

ایک قطار میں کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ جن میں گانے والیاں رہا کرتیں۔ ایک بڑا کمرا یا ہال تھا۔ جس میں فرش بچھا رہتا۔ گانے بجانے کا کام اسی ہال میں ہوا کرتا تھا۔

بخشی خانم کے بالا خانے پر میری ماں سمیت پانچ لڑکیاں تھیں۔ وہ رقاص بھی تھیں۔ میری ماں کو بخشی کے بعد سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اس کا خیال رکھا جاتا اور اس کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے جب میری ماں نے میرے بارے میں یہ فیصلہ دیا کہ میں گانے اور رقص وغیرہ نہیں سیکھوں گی۔ بلکہ تعلیم حاصل کروں گی تو کسی نے مخالفت نہیں کی۔

سنا ہے کہ صرف بخشی خانم نے کچھ کہا تھا لیکن میری ماں نے انہیں خاموش کر دیا تھا۔ اس کے بعد پھر کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ میں تعلیم حاصل کرتی چلی گئی۔

میں نے اپنی ماں سے کبھی اپنے باپ کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ یا تو ماں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہوگا اگر ہوا بھی تو وہ کچھ نہیں بتائے گی۔

اندھیرے کی اس دنیا میں باپ نہیں ہوا کرتے تھے۔ صرف ماں ہوتی تھی۔ وہ چاہے جیسی بھی ہو۔ اسی طرح وہاں پیدا ہونے والے لڑکوں کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ لڑکیوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا۔

میں نے اپنے باپ کا نام خود ہی رکھا تھا۔ مرزا شرافت بیگ۔ بہت بھاری بھرکم سا نام تھا۔ اسکول میں داخلہ اسی نام سے ہوا اور اب کالج میں بھی یہیں نام ساتھ دے رہا تھا۔

میں نے اپنا ماحول اپنے تصور کی آنکھوں سے خود بنایا تھا۔ مرزا شرافت بیگ ایک بہت بڑے سرکاری آفیسر ہیں۔ دو بھائی ہیں۔ جو جاب کر رہے ہیں اور اماں دن بھر پڑوسنوں سے باتیں کرتی رہتی ہیں۔ یہ تھا میرا تصوراتی ماحول۔

میں نے آج تک کسی کو نہیں بتایا تھا کہ میں کہاں رہتی ہوں۔ لڑکیوں سے دوستی تو تھی لیکن صرف کالج کی چہار دیواری تک۔ نہ تو خود کسی کے گھر جاتی اور نہ ہی کسی کو مدعو کرنے کی جرأت کر سکتی تھی۔

کالج میں لڑکیاں جب اپنے کزن وغیرہ کے قصے سنایا کرتیں تو دل میں ہوک سی اٹھنے لگتی تھی۔ ہمارے یہاں اس قسم کے رشتوں کا تو کوئی تصور ہی نہیں تھا۔

نہ جانے میری ماں کا بیک گراؤنڈ کیا تھا۔ وہ کہاں سے آئی تھی۔

یہ تو یقین تھا کہ میری ماں کا تعلق اس بازار سے ہرگز نہیں تھا۔ وہ اوروں سے بہت مختلف تھی۔ بہت باوقار تھی۔ چپ چپ رہنے والی۔ باتیں بھی بہت کم کیا کرتی۔ کبھی کبھی خاموش ہو کر نہ جانے کیا سوچنے لگتی تھی۔ شاید پرانی باتیں بے چین کر دیتی ہوں گی۔

ہمارے یہاں محبت وغیرہ کا کوئی تصور نہیں تھا۔ صرف سودے ہوا کرتے تھے۔ براہِ راست جسم حاصل کر لیے جاتے۔ لیکن بخشی کے بالا خانے پر نہیں۔ بلکہ آس پاس کے کوٹھوں پر یہی ہوتا تھا۔

اس لیے ہم محبت نام کی کسی چیز سے آشنا نہیں تھے۔ بخشی کے کوٹھے پر ماں کے علاوہ میری دوست افشاں تھی۔ پچیس چھبیس برس کی۔ دبلی پتلی، اس کی آواز بہت خوب صورت تھی۔ اس لیے گانا سیکھا ہوا تھا۔ بس وہی میری دوست تھی۔ اس سے میں اپنے دل کی باتیں کہہ لیا کرتی۔ اور وہ مناسب مشورے بھی دے دیا کرتی تھی۔

ان کوٹھوں پر پیدا ہونے والے لڑکوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ دن بھر گلیوں میں بھٹکتے رہتے اور جب بڑے ہو جاتے تو ان ہی بالا خانوں کے دلال یا ملازم بن جاتے۔ بس یہ تھی ان کی حیثیت۔

ہمارے کوٹھے کے برابر میں ایک اور کوٹھا تھا۔ یہ نگہت آرا کا تھا۔ بہت تیز و طرار عورت تھی۔ دراصل چار پانچ کوٹھے ایک بڑے سے احاطے میں بنے ہوئے تھے۔ احاطے کا مرکزی دروازہ لکڑی کا تھا۔ بہت بڑا۔ جس طرح پرانے قلعے کے دروازے ہوا کرتے ہیں۔ چار پانچ کوٹھوں سے تعلق رکھنے والے اس احاطے میں رہا کرتے تھے۔

نگہت آرا کے کوٹھے سے تعلق رکھنے والا ایک نوجوان منصور بھی تھا۔ اس کی ماں کا نام دلاری تھا۔ خدا جانے یہ نام درست تھا یا پھر یہاں رکھ دیا گیا تھا۔

منصور ایک بانکا سانو جوان تھا۔ جس طرح فلمی ہیرو ہوا کرتے ہیں۔ صورت شکل اس کی بہت اچھی تھی۔ میں نے جب اس کے بارے میں اپنی دوست افشاں سے پوچھا تو وہ ہنس کر بولی۔ ''بے چارہ کسی شریف باپ کی اولاد معلوم ہوتا ہے۔''

''افشاں! مرد کیسے ہوتے ہیں جو اپنی اولاد کو اس طرح چھوڑ جاتے ہیں۔ پلٹ کر ان کی خبر نہیں لیتے۔''

''تم بھی تو اسی قسم کے باپ کی اولاد ہو۔'' افشاں نے کہا۔ ''میری جان! یہ مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ انہیں صرف اپنا سکون چاہیے۔ اس کے بعد عورت پر کیا قیامت گزرتی ہے انہیں اس سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔''

منصور اس احاطے کا نگراں تھا۔ دن بھر کسی سانڈ کی طرح اِدھر اُدھر گھومتا رہتا یا ایک درخت کے نیچے چارپائی ڈالے بیٹھا رہتا۔ احاطے میں ہونے والے جھگڑوں کو وہی نمٹایا کرتا تھا۔ اس پورے علاقے میں اس کی اچھی خاصی دھاک تھی۔ باہر کے لوگ احاطے میں آکر کسی گڑبڑ کی ہمت نہیں کرسکتے تھے۔

بالا خانوں کی لڑکیاں دن بھر اس سے اُلٹے سیدھے کام بھی لیتی رہتی تھیں۔ منصور ذرا بھاگ کر یہ لے آؤ۔ منصور میرا یہ کام کردو۔ منصور ذرا سامنے والی دکان پر چلے جاؤ اور وہ سب کے کام آتا تھا۔

منصور اس احاطے کی دوسری لڑکیوں سے تو کبھی کبھی ہنسی مذاق بھی کر لیتا تھا لیکن جب میں اس کے سامنے جاتی تو گردن جھکا لیتا تھا۔ کبھی کبھی دیکھ بھی لیتا لیکن پھر اس کی گردن جھک جاتی۔

مجھ سے اس نے کبھی مذاق کی کوشش نہیں کی۔ میں نہیں جانتی کہ وہ میرا اتنا احترام کیوں کرتا تھا۔ حالانکہ کبھی کبھی میں اسے ڈانٹ بھی دیا کرتی۔ لیکن وہ خاموش ہی رہتا۔ البتہ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔

میں نے ایک دن اپنی دوست افشاں کو اپنے دوست فیاض کے بارے میں بتایا تو وہ خاموش ہوگئی۔ وہ میرے چہرے کو خالی خالی نگاہوں سے دیکھتی رہی تھی۔ ''کیا ہوا افشاں۔'' میں نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں یقین نہیں آرہا؟''

''یقین تو آگیا ہے جانو۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تمہیں مبارک باد دوں یا تمہارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کروں۔'' اس نے کہا۔

''میں تمہاری بات نہیں سمجھی۔''

''دیکھ سائرہ، یہ محبت تو ہمارا حق ہے۔'' اس نے کہا۔ ''یہ خدا کا ایک تحفہ ہے۔ نعمت ہے اس کی۔ محبت ہمارے بند دروازوں کو کھول دیتی ہے۔ ہمارے لیے محبت سے بڑی چیز اور کیا ہوسکتی ہے اور تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں کسی کی محبت حاصل ہوگئی ہے کیونکہ ہم سب محبتوں کے صرف خواب دیکھتے ہیں۔ میرا مطلب ہے اس بازار میں رہنے والیوں کے لیے محبت ایک خوب صورت خواب کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور تم نے اس خواب کو حاصل کرلیا ہے۔ اس لیے بہت مبارک باد دے رہی ہوں۔ لیکن۔'' وہ خاموش ہوگئی تھی۔

''لیکن کیا؟''

''لیکن یہ کہ اس بازار کی لڑکیوں کو محبتیں راس نہیں آتیں۔'' اس نے کہا۔ ''لوگ وقتی طور پر محبت کرتے ہیں اور

اسپیشل آفر

ماہنامہ دلکش کراچی

اپنی فائل مکمل کیجیے

صرف 100 روپے میں

اپنی پسند اور ضرورت کے پچھلے 5 شمارے

رجسٹرڈ ڈاک سے گھر بیٹھے حاصل کریں

دلکش

کا اجرا اپریل 2006ء سے ہوا۔ اگر آپ پچھلے شمارے حاصل کرنا چاہیں تو اپنی پسند کے کوئی بھی 5 شمارے (دستیابی سے مشروط)

صرف 100 روپے کا ڈرافٹ یا منی آرڈر ادارے کے نام اور پتے پر بھیج کر رجسٹرڈ ڈاک سے اپنے دروازے پر وصول کریں۔

یہ رعایتی اسکیم محدود مدت کے لیے ہے۔

اس سے آج ہی فائدہ اٹھائیں۔

ڈرافٹ / منی آرڈر اس پتے پر بھجوائیں

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63 سی فیز III ایکسٹینشن، مین کورنگی روڈ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کراچی

مزید معلومات کے لیے فون: 5802552

فراموش کر دیتے ہیں۔''

''یہ تو اس وقت ہوتا ہے نا جب وہ ہمارے بارے میں جانتا ہو۔''

''یہ تو اور بھی خطرناک بات ہے۔'' وہ اداس ہو کر بولی۔ ''میری جان جب اسے یہ پتا چلے گا کہ تم کون ہو اور کس بازار سے تمہارا تعلق ہے تو پھر اندازہ لگا لو کہ اس کا کیا ردعمل ہوگا۔ وہ کن نگاہوں سے تمہاری طرف دیکھے گا۔ تمہاری کیا حیثیت ہو گی؟ تمہارا اصل چہرہ اس کے لیے بھیانک ہو جائے گا۔ وہ تم سے اپنا دامن جھٹک کر اس طرح چلا جائے گا کہ تم اسے آواز دیتی رہ جاؤ گی اور۔''

''خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ افشاں۔'' میں گھبرا کر چیخ اٹھی۔ ''ایسا کبھی نہیں ہوگا۔''

''خدا کرے ایسا کبھی نہ ہو۔ لیکن زندگی کے حقائق کچھ اور ہوتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میری تو بس دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''

میں نے جب اپنے کمرے میں بند ہو کر اس کی باتوں پر غور کرنا شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں نے ابھی تک فیاض کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور اسے بتانے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی لیکن کب تک۔ ایک نہ ایک دن یہ راز تو ظاہر ہونا تھا پھر اس وقت کیا ہوتا۔ کیا وہ میرے لیے وہی فیاض رہتا یا کچھ اور ہو جاتا۔

بہرحال ان اندیشوں اور پریشانیوں کے باوجود فیاض سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ ہم بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ محبت کی ایسی سرشاری تھی کہ جس کا بیان باہر ہے۔

فیاض مجھ سے ہر بار مل کر آنے والی خوب صورت زندگی کی باتیں کیا کرتا۔ ''معلوم ہے سائرہ، میں نے بچوں کے لیے کیا سوچا ہے؟'' وہ کہا کرتا۔ ''یہ سوچا ہے کہ کم از کم چار بچے ہوں گے۔ دو لڑکے اور دو لڑکیاں۔ کیوں؟ کیا خیال ہے تمہارا؟''

''تو کیا یہ ہمارے اختیار میں ہوگا؟''

''بالکل ہماری محبت کے اختیار میں ہوگا۔'' وہ کہتا۔ ''محبت کی طاقت حاصل ہو جائے تو دعاؤں میں بھی اثر آ جاتا ہے۔''

اور کبھی ہنی مون پر جانے کی جب بات کرتا تو خوابوں کی نگری کی باتیں ہوتیں۔ جہاں ہر طرف سکون ہی سکون ہو۔ اس کی باتیں جہاں ایک طرف مجھے خوشی دیتیں۔ وہاں دوسری طرف مجھے دھڑکا بھی دیتی تھیں۔ میں دل ہی دل میں سوچا کرتی۔ فیاض، تم جب زیادہ خوش ہوتے ہو تو مجھے خوف محسوس ہوتا ہے۔ میں یہ سوچتی ہوں کہ اگر میرے چہرے سے نقاب ہٹ گیا تو پھر کیا ہوگا؟ کیا تمہارا والہانہ پن اس کے بعد بھی برقرار رہے گا؟

ایک دن میں نے اس سے پوچھ لیا۔ ''فیاض! فرض کرو اگر میں کچھ اور ثابت ہو جاؤں تو پھر تم کیا کرو گے؟''

''کچھ اور ثابت ہونے سے کیا مراد ہے تمہاری؟''

''یہی کہ میں جو کچھ ہوں۔ یعنی تمہارے سامنے جیسی ہوں تو میری حقیقت کچھ اور ہو۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے تم سے اپنے بارے میں غلط بیانی کی ہو میری حقیقت کچھ اور ہو تو پھر تمہارا کیا ردعمل ہوگا؟''

''ردعمل کیا ہونا ہے۔ میں رو دھو کر چپ ہو جاؤں گا۔''

''اور مجھ سے تمہاری محبت؟ اس کا کیا ہوگا؟''

''اس کا کیا ہونا ہے۔ وہ اسی طرح رہے گی۔ جس طرح آج ہے۔'' وہ ہنس کر کہتا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو کہ میری محبت بدل جائے گی۔ اول تو میں یہ جانتا ہوں کہ تمہاری زندگی میں ایسا کوئی بھید نہیں ہے۔ تم وہی ہو جو تمہیں ہونا چاہیے۔ اگر کچھ اور بھی ثابت ہو گئیں تو بھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''لیکن کیا واقعی ایسا ہی ہوتا؟''

میں جانتی تھی کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود میں اس سے محبت کیے جا رہی تھی۔ اس کے خواب اپنی آنکھوں میں بسا رکھے تھے۔ ایک شام فیاض نے مجھ سے کہا۔ ''سائرہ! آج میں تمہاری ایک بات نہیں مانوں گا۔''

''وہ کیا؟''

''آج چاہے تم کچھ بھی کہو۔ میں تمہیں ڈراپ کرنے تمہارے گھر ضرور جاؤں گا۔''

یا خدا! میں لرز کر رہ گئی تھی۔ فیاض نے یہ کیا کہہ دیا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ کہاں لے جاتی۔ کس کے پاس لے جاتی۔ کیا اس بازار میں جہاں کا نام بھی شریف لوگ اپنی زبان پر نہیں لایا کرتے۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''فیاض آج نہیں، پھر کسی دن۔''

''کیوں آج کیوں نہیں؟''

''اس لیے کہ آج میں ڈائریکٹ گھر نہیں جا رہی۔'' میں نے بہانہ بنایا۔ ''مجھے اپنی ایک دوست کے یہاں سے ہوتے ہوئے جانا ہے۔ اس لیے تم زحمت مت کرو۔ میں خود چلی جاؤں گی۔ اس کا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ میرے اس انکار سے اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ بہرحال، اس

نے پھر ضد نہیں کی تھی۔

میرا خیال تھا کہ شاید اب میری یہ کہانی اپنے انجام کو پہنچ جائے گی۔ میں فیاض سے زیادہ دنوں تک جھوٹ نہیں بول سکوں گی۔ اسے سب کچھ بتانا ہی پڑے گا۔ اس شام میں بہت پریشانی کے عالم میں اپنے کوٹھے یا احاطے میں واپس آئی تھی اور گیٹ میں داخل ہوتے ہی منصور میرے سامنے آ گیا تھا۔ ''سائرہ! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔'' اس نے مخاطب کیا۔

منصور سے میری بات چیت ہوتی رہتی تھی لیکن اس نے اس انداز سے کبھی مخاطب نہیں کیا ہوگا جس طرح اس وقت مخاطب کیا تھا۔ ''ہاں کہو منصور۔ کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سائرہ! تم شاید یہ سب سن کر مجھ سے ناراض ہو جاؤ۔ مجھے برا بھلا کہو لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

''کیا؟'' میں چکرا کر رہ گئی تھی۔ ''منصور تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''میں جانتا ہوں سائرہ کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ تم بہت اچھی ہو۔ اس احاطے میں تمہاری ایک حیثیت ہے۔ تم کالج میں پڑھتی ہو۔ بہت خوب صورت ہو اور میں ایک فالتو انسان ہوں۔ جو دن بھر اس احاطے میں گھومتا رہتا ہے۔ جس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے جس کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اس کے باوجود تم مجھے اچھی لگتی ہو اور میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

مجھے اس کی باتیں سن کر اس پر ترس سا آ گیا تھا۔ ''منصور! تم بہت اچھے انسان ہو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا ''میں نے ہمیشہ تمہیں اچھی نگاہوں سے دیکھا ہے لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہم لوگ جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس میں محبت وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔''

''اس لیے تو تم سے محبت کرتا ہوں کہ تمہیں اس ماحول سے نکال کر لے جاؤں۔'' اس نے کہا۔ ''حالانکہ اس وقت میرے بس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ میں تو خود احاطے والوں کے بھروسے پڑا رہتا ہوں لیکن تم دیکھ لینا کہ تمہارے لیے میں بہت کچھ کر جاؤں گا۔''

''منصور مجھے تمہارے جذبے کی قدر ہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں سائرہ! مجھے تم سے کوئی جواب نہیں لینا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میرے لیے تو یہی بہت ہے کہ میں نے اپنی بات تم تک پہنچا دی ہے۔ میرے لیے یہی اطمینان اور خوشی کی بات ہے۔ اب تم جاؤ۔''

اور میں اپنے گھر (بالا خانے) آ گئی۔

میں جیسے جیسے منصور کے بارے میں سوچتی مجھے اس پر حیرت ہونے لگتی۔ کیا آدمی تھا وہ۔ وہ بے چارہ مجھ سے کیسی محبت کرنے لگا تھا اور اس نے محبت بھی کس سے کی تھی۔ اس لڑکی سے جو پہلے ہی کسی اور کی ہو چکی تھی۔

منصور کے خیال کو جھٹک کر میں نے فیاض کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

میں نے جب آج کے واقعے کے بارے میں افشاں کو بتایا تو اس نے کہا۔ ''میری بنو، اب یہ کھیل ختم ہوا۔ دو چار بار اور انکار کرو گی تو وہ تمہاری طرف سے کھٹک جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ تم سے بور ہو جائے یا اسی طرح کی کوئی بات ہو۔''

''تو پھر کیا کروں میں؟ کیا میں اسے یہاں لے آؤں؟''

''نہیں، ایسا بھی مت کرو۔ بلکہ اس سے دور ہو جاؤ۔'' افشاں نے مشورہ دیا۔ ''چھوڑ دو اس کو۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہی کرنا ہوگا یا تو اسے سب کچھ صاف صاف بتا دو اور اس کے شدید اور سخت ردِعمل کا انتظار کرو کہ وہ خود ہی تمہیں اپنی زندگی سے الگ کر دے یا پھر تم ہی اس کی زندگی سے دور ہو جاؤ۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو افشاں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں ہی اس کی زندگی سے دور ہو جاؤں گی۔''

میں نے افشاں کو منصور کی اس حماقت کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ اس لیے اس نے کہا۔ ''میری بنو، تمہارے اس فیاض سے اچھا یہ منصور ہوگا۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں کیونکہ یہی سچائی ہے۔ تم اور منصور ایک ہی ماحول کے ہو۔ ایک ہی جیسے حالات میں پیدا ہوئے ہو۔ تم دونوں میں سے کوئی بھی آسمان سے اتر کر نہیں آیا۔ بلکہ اسی گندی نالی کی پیداوار ہو۔ ایک دوسرے سے تمہیں کوئی توقع نہیں ہوگی۔ اس لیے اگر حقیقت سے کام لو تو منصور ہی تمہارے لیے مناسب رہے گا۔''

افشاں کی یہ بات بھی درست تھی۔ ویسے منصور بے چارہ تو برسبیلِ تذکرہ آ گیا تھا۔ میں اس پر کہاں دھیان دے سکتی تھی۔

میں نے افشاں سے یہ وعدہ تو کر لیا تھا کہ میں فیاض سے نہیں ملوں گی لیکن دل کے معاملات پر اختیار ہی کہاں ہوتا ہے۔ ہر دوسرے تیسرے دن جب اس کی یاد میں پریشان

کرنے لگتیں تو میں اس سے موبائل پر رابطہ کر لیتی اور ہم پھر ایک دوسرے سے مل کر ایک دوسرے کی محبت میں سرشار ہو جاتے۔

ایک شام اس نے مجھ سے کہا۔ ''سائرہ، آج میں تمہیں ایک خاص جگہ لے جانا چاہتا ہوں۔ تمہیں میرے ساتھ چلنے پر اعتراض تو نہیں ہے۔''

''تمہارے ساتھ جانے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

''تو پھر آؤ۔''

مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ کہاں لے جا رہا ہے۔ میں اس وقت چونکی تھی جب وہ گاڑی ایک خوب صورت مکان کے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ ''فیاض، یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو۔'' میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

''اپنے گھر۔'' اس نے بتایا۔ ''اس سے خاص جگہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ میرا پورا گھر اس وقت تمہارے انتظار میں ہے۔''

میرے خدا! میں کانپ کر رہ گئی تھی۔ کیا میں اس قابل تھی کہ فیاض کے گھر آ سکتی۔ میری حیثیت ہی کیا تھی۔ میں ان معزز لوگوں کو کس طرح فیس کر سکتی تھی۔ نہ جانے فیاض نے انہیں میرے بارے میں کیا بتایا ہوگا۔ وہ مجھے کیا سمجھ رہے ہوں گے۔ کسی معزز گھرانے سے تعلق رکھنے والی لڑکی۔ فیاض نے یہی بتایا ہوگا۔

اس کے خوب صورت ڈرائنگ روم میں واقعی اس کے گھر والے بڑی خوش دلی کے ساتھ میرا انتظار کر رہے تھے اور انہوں نے بہت والہانہ طور پر میرا استقبال کیا تھا۔ بہت شفیق اور مہربان لوگ تھے اور میں ان کے درمیان اپنے آپ کو کمتر محسوس کر رہی تھی۔ کیونکہ میں کمتر تھی۔

وہ میری تعریفیں کر رہے تھے۔ مجھ پر نچھاور ہوئے جا رہے تھے۔ پورے گھر نے ذہنی طور پر مجھے قبول کر لیا تھا۔ لیکن میں کیا تھی۔ کاش میں یہاں نہ آئی ہوتی، کاش۔

اس رات گھر واپس جا کر اپنے کمرے میں بند ہو کر میں روتی رہی تھی۔ اپنے آپ پر۔ اپنی حالت پر اور اپنی زندگی پر اور اس رات ایک تیز درد نے مجھے آ لیا تھا۔

ایسی شدید کیفیت کہ بیان سے باہر ہے۔ میں بے قابو ہو کر چیخنے لگی تھی۔ میری ماں دوڑی ہوئی آ گئی تھی۔ پھر مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ ہوش آیا تو میں اسپتال کے ایک کمرے میں موجود تھی۔

اس کمرے میں ماں کے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی تھا۔ جب میرے اوسان بحال ہوئے تو ڈاکٹر نے بتایا۔ ''محترمہ، آپ کب سے اس تکلیف کو پال رہی تھیں۔''

''کیا ہوا ہے مجھے؟''

''کچھ نہیں۔'' ماں جلدی سے بول پڑی۔ ''تو جلدی ٹھیک ہو جائے گی۔''

''میرا خیال ہے کہ ان کو بتا دیا جائے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''یہ حوصلہ مند معلوم ہوتی ہیں اور اپنے مرض کا پتا چل جانے کے بعد احتیاط بھی کریں گی۔''

''ہاں ڈاکٹر صاحب بتا دیں، کیا ہوا ہے؟''

''آپ کے گردے خراب ہو رہے ہیں۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

''اوہ۔'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ اس کا اندیشہ مجھے بہت پہلے سے تھا۔ ایک بار سخت قسم کے یرقان میں مبتلا ہو چکی تھی۔ اس کے بعد علاج ہوتا رہا تھا لیکن وہ عام قسم کے ڈاکٹر تھے انہوں نے پوری طرح توجہ نہیں دی ہوگی۔ گردوں میں تکلیف پہلے سے ہوا کرتی تھی لیکن اتنی شدید پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

اب شاید معاملہ حد سے باہر ہو گیا تھا اس لیے میں اسپتال تک پہنچ گئی تھی۔

''تو فکر مت کر بیٹا۔'' ماں نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنی شروع کر دیں۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تیرا بہتر سے بہتر علاج ہوگا۔''

''ہاں آج کل تو بہت آسانی سے ٹرانس پلانٹ ہو جاتا ہے۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

مجھے وقتی طور پر دوائیں وغیرہ دے دی گئی تھیں اور دو دنوں بعد اسپتال سے فارغ کر دیا گیا تھا لیکن میرا علاج مکمل نہیں ہوا تھا۔ مجھے ٹرانس پلانٹیشن کی ضرورت تھی۔

احاطے میں منصور سے ملاقات ہوئی۔ وہ بہت بے تاب ہو رہا تھا۔ ''سائرہ، تمہاری بیماری نے تو مجھے پاگل کر دیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''میں تمہیں اسپتال تک لے جانے کے لیے ٹیکسی پکڑ کر لایا تھا اور میں نے تمہارے لیے غازی شاہ کے مزار پر جا کر منتیں بھی مانگی ہیں۔''

''تمہارا بہت شکریہ منصور۔''

''ارے نہیں، اس طرح اجنبی بن کر بات مت کرو۔'' اس نے کہا۔ ''میں اگر تمہارے کام نہ آ سکا تو پھر ایسی زندگی کا کیا فائدہ۔''

مجھے اس وقت بھی اس پر ترس آیا تھا۔ بے چارہ اپنی محبت میں نہ جانے میرے لیے کیا کیا خواب دیکھ رہا ہوگا۔

میں نے اس دن جب فیاض کو اس کے موبائل پر فون کیا

ہاشمی
اسپغول
بھوسی

ہر موسم میں موزوں
ہر موسم میں مُفید۔

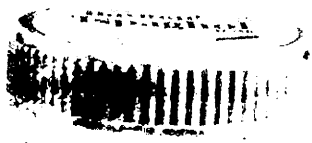

فیملی پیک
160 گرام
صرف 135 روپے

سردیوں میں عموماً گرم اور چکنائی والی چیزوں کا استعمال بڑھ جاتا ہے، جن میں کیلوریز زیادہ ہوتی ہیں جو وزن اور کولیسٹرول میں اضافے کا باعث بنتی ہیں، لہٰذا ہاشمی اسپغول کا روزآنہ استعمال ضروری ہے۔
سرد موسم میں ہاشمی اسپغول کا استعمال نیم گرم دودھ کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے۔

8 گرام ساشے
صرف 7 روپے

۲۵، ۵۰ اور ۱۰۰ گرام
کے پیکٹ میں دستیاب ہے۔

ایک وقت کی تجویز کردہ خوراک 8 گرام ہے۔

ڈیلی لو فِٹ رہو

A Product of:
Mohammad Hashim Tajir Surma
Website: www.hashimsurma.com E-mail: a.hashim@...net.pk

ESTABLISHED 1794

Mussell 12-06

تو میری آواز سن کر وہ بکھر گیا تھا۔ ''سائرہ، کہاں ہو تم۔ یہ تم اچانک کیوں غائب ہو گئیں؟''

میں نے اسے بتایا کہ میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے میں اس سے نہیں مل سکی تھی۔ وہ مجھے دیکھنے کے لیے آنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکلوں سے اسے روکا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد اس سے ملاقات ہوئی تھی اور اس نے ایک خبر سنا دی۔ دوسرے حالات ہوتے تو میں اس خبر کو سن کر نہال ہو جاتی۔ لیکن میں اندر ہی اندر سسک کر رہ گئی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ''سائرہ، میرے گھر والوں نے تمہیں پسند کر لیا ہے۔''

میں صرف مسکرا دی تھی۔

اس نے پھر آنے والے خوب صورت دنوں کی باتیں شروع کر دیں۔ یہ کرنا ہے۔ وہاں جانا ہے۔ گھر کی سجاوٹ ایسی ہونی چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور میں اس کی باتیں سنتی رہی تھی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ میں اسے سب کچھ بتا سکتی۔

تیسرے یا چوتھے دن میری طبیعت پھر خراب ہو گئی۔ مجھے پھر اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ اس بار میری کنڈیشن زیادہ خراب تھی۔ ڈاکٹرز نے فوری طور پر مشورہ دیا تھا کہ میں ٹرانس پلانٹ کروالوں۔

مجھے کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا۔ کیونکہ میں تو درد کی شدت سے نڈھال ہو رہی تھی اور ایک شام ماں نے آ کر خبر دی کہ میرے لیے گردے کا بندوبست ہو گیا ہے اور بہت جلد میں آپریشن کے مرحلے سے گزر جاؤں گی۔

اس کے بعد کئی طرح کے ٹیسٹ ہوئے اور بالآخر میں کسی اور کے گردے کے ساتھ سارے مراحل سے گزر گئی۔ ہاں اس دوران منصور میری خیریت دریافت کرنے کے لیے آتا رہا تھا۔

وہ چپ چاپ میرے بستر کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی ہوتیں جیسے پیغام دینا چاہتی ہوں پھر وہ کچھ کہے بغیر خاموشی سے میرا ہاتھ دبا کر کمرے سے باہر چلا جاتا۔

آپریشن سے پہلے تک وہ میرے پاس آیا تھا۔ ہو سکتا ہے میری بے ہوشی کے دوران بھی وہ آتا رہا ہو لیکن مجھے اس کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔

پندرہ دن کے بعد میں صحت یاب ہو کر گھر آ گئی تھی۔

پندرہ دن۔ فیاض سے ملے ہوئے پندرہ دن ہو گئے تھے۔ پندرہ دنوں کے بعد میں نے جب اسے فون کیا تو وہ چہک اٹھا۔ ''خدا کی پناہ کتنے دنوں کے بعد تمہاری آواز سن رہا ہوں۔''

''میں بہت بیمار تھی فیاض۔'' میں نے بتایا۔

''کیا تم مجھ سے ملنے کے لیے آ سکتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''کہاں آ جاؤں؟''

''اسی ہوٹل میں جہاں ہم ملا کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، کل آ جاؤں گی۔''

اب میرے چلنے پھرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس لیے دوسری شام میں کوٹھے سے نیچے اتر آئی اور گیٹ پر منصور کھڑا ہوا تھا۔ مجھے اس طرح آتے دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ وہ جلدی سے میرے پاس آ گیا تھا۔ ''سائرہ! ابھی تمہیں آرام کرنا چاہیے۔'' اس نے بڑی اپنایت سے کہا۔

''تمہارا بہت بہت شکریہ منصور کہ تم مجھے دیکھنے اور میری خیریت معلوم کرنے کے لیے آتے رہے۔ اور اب میں پہلے سے بہت بہتر ہوں اور اس وقت اپنی ایک دوست کے پاس جا رہی ہوں۔''

''چلو اچھا ہے۔ تمہارا دل بہل جائے گا۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن اپنا خیال رکھنا۔''

اس وقت میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو زرد ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ مجھے پہلے سے بہت کمزور محسوس ہو رہا تھا۔ ''کیا ہوا ہے تمہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے کیا ہونا ہے۔''

''تم پہلے سے بہت کمزور دکھائی دے رہے ہو؟''

''ارے بس یوں ہی۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''ویسے اب یہ کمزوری دور ہو جائے گی۔''

''وہ کس طرح؟''

''وہ اس طرح کہ تم نے جو پوچھ لیا ہے۔''

میں مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت دیر تک مجھے دیکھتا رہا تھا۔

فیاض کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سرِ عام مجھ سے لپٹ جاتا۔ میں اس کی بے تابی دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ ''تم تو اس طرح برتاؤ کر رہے ہو جیسے برسوں بعد مجھے دیکھا ہو۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، میرے لیے تو برسوں ہی گزر چکے ہیں۔'' اس

نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ''اور اب میں تمہیں اپنی نگاہوں سے دور نہیں ہونے دوں گا یہ میرا فیصلہ ہے۔''

اور یہ وہی وقت تھا جب مجھے فیاض کو اپنے بارے میں بتا دینا تھا۔ میں نے بات شروع کر دی۔ ''فیاض، ..... میں اپنے بارے میں تمہیں سب کچھ بتا دوں۔ کیونکہ میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی۔''

''بے وقوف، میں تمہارے بارے میں سب جانتا ہوں۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''نہیں، تم جو کچھ جانتے ہو وہ درست نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میری حیثیت کچھ اور ہے۔''

''ارے ہابا، یہی حقیقت ہے نا کہ تمہارا تعلق اس بازار سے ہے۔'' وہ اچانک بول پڑا۔

''کیا؟'' مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے اوپر سے اٹھا کر پھینک دیا ہو، میری آنکھوں کے گرد اندھیرا چھانے لگا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا۔ فیاض کو میرے بارے میں کیا معلوم یا کیسے معلوم۔ مجھے ایسا لگا جیسے فیاض کا چہرہ دور بہت دور ہو گیا ہو۔''

''کیا ہوا سائرہ؟'' اس نے پھر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''تمہاری حالت ایسی کیوں ہو رہی ہے؟''

''فیاض، تم..... تم۔'' میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ پائی تھی۔

''اوہو، تم شاید یہ سوچ کر حیران ہو رہی ہو کہ مجھے کیسے معلوم ہوا۔'' فیاض نے کہا۔ ''بات یہ ہے کہ تم ہر بار مجھ سے بہانہ کر دیتی تھیں۔ تم یہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں تمہارا گھر دیکھ سکوں۔ تمہارے اس پراسرار رویے نے مجھے الجھا دیا تھا۔ اس لیے میں ایک دن تمہارا تعاقب کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا۔ جہاں تم رہتی ہو۔ اس وقت میری عجیب حالت تھی۔ تم میری کیفیت کا اندازہ لگا سکتی ہو۔ جیسے کسی نے مجھے گولی مار دی ہو۔ دل چاہا کہ میں تمہارے چہرے سے یہ نقاب نوچ پھینکوں۔ پھر میں نے سوچا۔ نہیں، مجھے اپنے آپ پر قابو رکھتے ہوئے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہئیں۔''

''اور تم نے میرے بارے میں معلومات حاصل کیں۔''

''ہاں، اور پتا چلا کہ اس ماحول میں رہنے کے باوجود تم ایک پاکیزہ لڑکی ہو۔ جس طرح کیچڑ میں کنول کا پھول ہوتا ہے۔ تم تو بہت معصوم سی ہو۔ تمہارے بارے میں معلوم ہوا کہ تم اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہو اور اس ماحول سے نجات کے لیے تم نے تعلیم حاصل کی ہے۔ احاطے کے لوگ تمہارا احترام کرتے ہیں پھر میں نے یہ جان لیا کہ تمہیں یہاں لانے میں تقدیر کا قصور ہے۔ تم تو بالکل پاک ہو بلکہ ان ہزاروں لاکھوں لڑکیوں سے اچھی ہو جو نہایت شریف گھرانوں میں پیدا ہوتی ہیں لیکن ان کے دلوں میں کھوٹ ہوتی ہے۔''

وہ بولتا رہا اور میں سنتی رہی۔ سنتی رہی۔

یا خدا! تو مجھے کیسا انعام دے رہا تھا۔ کیا میں واقعی اس قابل تھی؟ فیاض نے مجھ سے یہ کیسی محبت کی تھی۔ یہ کتنے بڑے ظرف کا انسان تھا۔ اسے پروا ہی نہیں تھی کہ میں کون ہوں اور میرا بیک گراؤنڈ کیا ہے۔ وہ تو اس حال میں بھی میری محبت کا دم بھر رہا تھا۔ مجھے اپنانے کی باتیں کر رہا تھا۔

میں نے فیاض کا ہاتھ تھام کر رونا شروع کر دیا۔ ''ارے اس میں رونے والی کون سی بات ہے۔'' اس نے میرے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ''یہ جو محبت ہوتی ہے اس میں یہی تو مزہ ہے کہ یہ انسان کو فرش سے عرش تک لے آتی ہے۔''

''فیاض، چلو مان لیا کہ تمہارا دل واقعی بہت بڑا ہے لیکن اور اندیشے بھی تو ہیں۔''

''میں جانتا ہوں کہ تم کن اندیشوں کی بات کر رہی ہو۔'' اس نے کہا۔ ''میرے گھر والے اس طرح آسانی سے راضی تو نہیں ہوں گے لیکن ان کے لیے مجھے ایک ڈراما کرنا پڑے گا۔ بشرطیکہ آپ میرا ساتھ دیں۔''

یہ محبت کی ایسی کہانی ہے کہ جو قدم قدم پر مجھے حیران کیے دے رہی تھی۔ حالانکہ میں خود اس کہانی کا مرکزی کردار تھی۔ لیکن فیاض کے ساتھ میری حیثیت کیا تھی۔ کچھ بھی نہیں۔ اس نے محبت میں کمال کر دکھایا تھا۔

اس نے میری ماں سے ملاقات کی اور جب ماں کو یہ سب کچھ پتا چلا تو وہ بھی گنگ رہ گئی تھیں۔ ''بیٹے، تم شاید میری سائرہ کے لیے کوئی فرشتہ بن کر اترے ہو۔''

''ارے نہیں آنٹی، کہاں کا فرشتہ۔ بس محبت کر کے پھنس گیا ہوں۔'' وہ شرارت بھرے لہجے میں بولا۔ ''اب آپ کی بیٹی کا ڈھول میں نے گلے میں ڈال لیا ہے تو پیٹنا تو پڑے گا۔''

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ بلکہ فیاض نے جس ہوشیاری سے مجھے اپنایا وہ بھی قابل تعریف تھا۔ اس نے شہر کے ایک اچھے علاقے میں مکان کرائے پر حاصل کیا۔ اس میں فرنیچر رکھا گیا اور یہ شو کیا گیا کہ ہم لوگ کینیڈا میں اور میری ماں اس مکان میں رہتی ہیں۔

اس کے بعد وہ گھر والوں کو مجبور کر کے لایا۔ رشتہ طے ہوا اور اسی مکان سے باقاعدہ شادی ہو گئی۔ اس شادی میں، بخشی خانم کے علاوہ افشاں اور دوسری لڑکیاں بھی شریک

ہوئی تھیں۔

اور انہیں دیکھ کر کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان لڑکیوں کا تعلق کسی اور علاقے یا بازار سے ہوگا۔ وہ سب خوب صورت لباسوں میں تھیں اور بار بار مجھے پیار کیے جارہی تھیں۔ کیونکہ میں اپنے پیا کے گھر جارہی تھی۔

ان سب کو اس بات کی خوشی تھی کہ میں اب اس بازار میں نہیں رہوں گی۔ خدا نے مجھے ایک باعزت زندگی گزارنے کا موقع دے دیا ہے۔ ورنہ اس بازار کی لڑکیوں کا ایسا مقدر کہاں ہوتا ہے؟

شادی والے دن میں نے ماں سے پوچھا۔ ''اماں، میرا خیال ہے کہ آپ لوگ بے چارے منصور کو بلانا بھول گئی ہیں۔ وہ بھی یہاں آکر بہت خوش ہوگا۔''

''بیٹا، اس کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔'' اماں نے بتایا۔ ''اسے اسپتال میں داخل کردیا گیا ہے۔''

''اوہ، مجھے واقعی سن کر افسوس ہوا تھا۔ یہ کیا ہوا۔ منصور ایک اچھا آدمی تھا۔ اس نے مجھ سے محبت کی تھی یہ اور بات ہے کہ میں اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکی تھی۔

بہت خوب صورت اور سلیقے سے شادی ہوگئی تھی۔ شادی کی رات میں نے فیاض سے پوچھا۔ ''فیاض، یہ بتاؤ کہ یہ ڈراما آخر کب تک چلے گا۔ کبھی تو تمہارے گھر والوں اور رشتے داروں کو معلوم ہوگا۔ اس کے بعد میری کیا پوزیشن ہوگی؟''

''اوہو، تم ابھی سے کیوں سوچنے لگی ہو۔ جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔ خدا نے چاہا تو حالات قابو میں آجائیں گے۔''

شادی کے پندرہ دنوں تک خوب ہنگامے ہوتے رہے تھے۔ لوگوں کا آنا جانا۔ میں سسرال سے رخصت ہوکر اس گھر میں چلی جاتی۔ جو میری ماں نے کرائے پر لیا تھا۔

ایک شام فیاض مجھے ڈراپ کرگیا تھا۔ باتوں باتوں میں یوں ہی مجھے منصور کا خیال آگیا تھا۔ میں نے ماں سے پوچھا۔ ''اماں، اب منصور کی طبیعت کیسی ہے۔ اسپتال سے تو واپس آگیا ہوگا۔''

''نہیں بیٹا، اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''اس کا انتقال ہوگیا ہے۔'' اماں نے بتایا۔

''اوہ خدا!'' میں بوکھلا گئی تھی۔ ''کس دن؟''

''جس دن تیری شادی تھی۔ سولہ مارچ کو۔ اس دن میں نے اس کی خبر تجھ سے چھپائی تھی۔''

اوہ خدا، منصور کا انتقال ٹھیک میری شادی والے دن ہوا تھا۔ سولہ مارچ۔ یہ کیسا اتفاق تھا۔ ''اماں کیا ہوا تھا اسے؟'' میں نے پوچھا۔

''سچ بتادوں؟'' اماں نے کہا۔

''ہاں ہاں۔ بتاؤ کیا ہوا؟''

''بیٹا، اس نے تیرے لیے اپنی جان دی ہے۔'' اماں نے بتایا۔

''میرے لیے۔'' میں حیران ہوگئی تھی۔ ''اماں، یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔''

''بیٹا، تجھے گردہ دینے والا وہی تو تھا۔'' اماں نے انکشاف کیا۔

''کیا؟'' میں لرز کر رہ گئی تھی۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو اماں۔''

''ہاں بیٹا، اس پاگل نے ہم سبھوں کو یہ قسم دلا رکھی تھی کہ تجھے کوئی بھی یہ نہیں بتائے گا کہ تجھے گردہ کس نے دیا ہے۔'' اماں بتا رہی تھیں اور میں آنکھوں میں آنسو لیے صرف سن رہی تھی۔ سنتی جارہی تھی۔ ''وہ مرگیا بیٹا۔ نہ جانے اسے کیا ہوگیا تھا؟ ورنہ کون کس کے لیے اتنی بڑی قربانی دیتا ہے۔''

''محبت کرنے والے دیتے ہیں اماں۔'' میں دھیرے سے بولی۔ ''محبت اسی جذبے کا نام ہے۔''

اس کے بعد بہت کچھ ہوا۔ فیاض کے گھر والوں نے میری اصلیت جان لی تھی۔ ایک ہنگامہ برپا ہوگیا تھا لیکن فیاض اپنی جگہ ڈٹا رہا تھا۔ اس نے سب کو قائل کردیا تھا کہ میں اس بازار کے ماحول سے مختلف لڑکی ہوں۔

گھر والوں نے فیاض اور مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔ ان حالات کے باوجود بھی فیاض نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا کیونکہ اس نے بھی مجھ سے محبت کی تھی۔ وہ اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ بالآخر کئی برسوں کے بعد فیاض کے گھر والوں نے مجھے اچھی طرح پرکھ کر مجھے قبول کرلیا تھا۔

اب کئی برس ہو چکے ہیں اور میری زندگی میں سولہ مارچ کی بہت اہمیت ہے۔ اس دن ہماری شادی ہوئی تھی۔ میں نے فیاض کی محبت حاصل کی تھی اور ایک محبت کرنے والے کو کھودیا تھا۔

سولہ مارچ کو ایک طرف تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ رہتی ہے لیکن دوسری طرف میری آنکھوں میں آنسو بھی رہتے ہیں۔ مسکراہٹ فیاض کی محبت کے لیے ہوتی ہے اور آنسو اس کے لیے جو اپنے آپ کو قربان کرکے مجھے زندگی دے گیا ہے۔

سفید کپڑوں میں ملبوس دو قد آور، صحت مند اور گنجے شخص ٹنڈو محمد خان کے مشہور ایرانی ہوٹل، کیفے کنگال، میں داخل ہوئے۔ دونوں کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی اور وہ خاصے بارعب اور معتبر دکھائی دیتے تھے۔ کیفے کنگال میں بیٹھے ہوئے گاہک ان کی شخصیت سے خاصے متاثر ہوئے تھے اور سب ان کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ دونوں ناک کی سیدھ میں جا کر اس چار پایوں والی پرانی میز کے سامنے جا رکے، جسے کاؤنٹر کہا جاتا تھا اور وہ کیفے کنگال کے مالک، عاشق آزاد سے کچھ کہنے لگے۔

کیفے کنگال کا اصل نام ''اسٹار آف سندھ ریسٹورنٹ'' ہے۔ اس لیے اس کا ستارہ گردش میں ہے۔ اس ایرانی ہوٹل میں صرف وہی گاہک آتے ہیں جن کی تقدیر کے ستارے ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح بجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں کی لکیریں کدال اور بیلچوں کی رگڑ سے مٹ گئی ہوتی ہیں۔ ایسے ہوٹلوں کے گاہک اپنی پیشانیوں پر صدیوں کی تاریخ کے آثار سجائے رہتے ہیں، ان کے ہونٹوں پر انسانیت کی وہ گمشدہ مسکراہٹ ہوتی ہے، جسکی تلاش میں انسان نے ''فیس پاؤڈر'' سے ''گن پاؤڈر'' تک ایجاد کر لیے ہیں

جو گذر گئے وہ اچھے تھے، اس حقیقت کا عکاس خوب صورت افسانہ

بے امان

امر جلیل/محمد ابراھیم جمالی

گزرے وقت کو کم ہی لوگ برا کہتے ہیں اکثر اسے اچھے الفاظ ہی میں یاد کرتے نظر آتے ہیں..... ایسا کیوں ہے اس سوال کے جواب کی ایک جھلک اس سندھی کہانی میں پیش کی جارہی ہے۔

ان کہانیوں میں سے ایک جنہیں ''آئینہ'' کہانیاں کہا جاتا ہے

لیکن وہ مسکراہٹ کی ایک فیکٹری تیار نہیں کر سکے۔

ایرانی ہوٹلوں میں شکستہ پیالوں اور پرچ پرانی کرسیوں کے بجائے بغیر پشت کی بنچیں رکھی ہوتی ہیں، یہاں مجھ جیسے موالی آتے ہیں، بیٹھتے ہیں اور کڑک چائے پی کر فلمی گانے اور قوالیوں کے ریکارڈ سنتے ہیں۔

کیفے کنگال کا مالک عاشق آزاد فجر سے لے کر آدھی رات تک زور زور سے لتا منگیشکر اور محمد رفیع کے ریکارڈ بجاتا ہے۔ وہ اس طرح اپنے ہوٹل کی پبلسٹی کرتا ہے۔ ہوٹل میں چار لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے ہیں، جن میں سے ایسی فلک شگاف آواز نکلتی ہے کہ وہاں بیٹھے ہوئے گاہک اندر اور باہر کی آوازیں بھول کر گانوں کی لہروں میں بہہ جاتے ہیں، سپ سپ چائے پیتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔

کیفے کنگال کے بالکل سامنے نور مسجد ہے۔ مسجد کے میناروں پر پہلے دو لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے تھے لیکن بعد میں جب عاشق آزاد، محمد رفیع کا فلم ''برسات'' میں گایا ہوا گانا ''میں زندگی میں ہر دم روتا ہی رہا ہوں'' کا ریکارڈ خرید لایا تو اس وقت مسجد کی انتظامی کمیٹی نے ایک ہنگامی اجلاس بلوایا اور فوراً دو مزید لاؤڈ اسپیکر خریدنے کی منظوری لی گئی۔ تب سے نور مسجد کے میناروں پر چار لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے ہیں۔ جن میں سے دن میں پانچ مرتبہ اذان کی آواز گونجتی ہے اور جمعہ کے دن مولانا عبدالجبار گچانی مسلسل ڈیڑھ گھنٹے تک، خطبے سے قبل تقریر کرتا ہے۔ وہ اپنی تقریر میں لوگوں کو قبر کے عذاب، قیامت کے منظر اور اللہ تعالیٰ کے قہر سے ڈرانے کی کوشش کرتا ہے۔ لوگ، جو بھوک کے عذاب، بے روزگاری کے خوف اور خالی ذہن میں بیٹھے ہوئے عفریت کے قہر سے لرزے ہوئے ہوتے ہیں، ان پر مولانا عبدالجبار گچانی کی تقریر کا زبردست اثر ہوتا ہے۔

جب بھی نور مسجد کے چاروں لاؤڈ اسپیکروں سے اذان کی آواز گونجتی ہے تب عاشق آزاد فوراً ریکارڈنگ بند کر کے آنکھیں بھی بند کر لیتا ہے (ہمارے ملک میں ریکارڈ بجنے کو ریکارڈنگ کہتے ہیں) جب وہ اذان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سنتا ہے تب دونوں انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگاتا ہے۔ اذان ختم ہوتی ہے تو اپنی قمیص کے بٹن کھول کر سینے پر پھونک مارتا ہے۔ اس کے بعد فوراً دوبارہ ریکارڈنگ شروع ہو جاتی ہے۔ ''میں زندگی میں ہر دم روتا ہی رہا ہوں۔''

ایک روز مولانا عبدالجبار گچانی کیفے کنگال کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ آستینیں کہنیوں تک اٹھا کر اور پوری قوت صرف کر کے کچھ کہنے لگا۔ اتنی جھاگشی کے بعد بھی لوگ ''روتا ہی رہا ہوں'' سنتے رہے تھے۔

جب لوگوں کا ہجوم کیفے کنگال کے سامنے جمع ہونے لگا تو عاشق آزاد نے ریکارڈ بند کر دیا اور مولانا کی بات سننے کے لیے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ مولانا نے پہلے تو عاشق آزاد کو قبر کے عذاب، قیامت کے خوف اور اللہ کے قہر سے ڈرانے کی کوشش کی پھر اس نے کہا تھا۔

''عزیزم جناب عاشق علی آزاد بن معشوق علی برباد! کچھ شرم کر۔''

عاشق علی آزاد کا باپ معشوق علی شاعر تھا اور خود کو ''برباد'' کہلاتا ہے۔ برباد اس کا تخلص تھا۔

عاشق آزاد نے ''کاؤنٹر'' کے نیچے رکھی ہوئی لکڑی کی پیٹی میں سے ریکارڈنگ کرنے کا لائسنس نکالا اور مولانا کو دکھاتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس ریکارڈنگ کرنے کا اجازت نامہ ہے۔''

مولانا نے لائسنس کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''تم مومن مسلمان ہوتے ہوئے ہندوستانی فلموں کے ریکارڈ، یعنی کافروں کے ریکارڈ بجاتے رہتے ہو۔ کیا پاکستانی گانے والے مر گئے ہیں؟ کیا پاکستان میں گویوں کا کال پڑ گیا ہے.....؟ اگر تمہیں ریکارڈ بجانے ہی ہیں تو پاکستانی ریکارڈ لے آؤ۔ مثلاً ''میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا''

مولانا کی تلقین، قبر کے عذاب اور قیامت کے خوف کا عاشق آزاد پر ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا۔ وہ اب بھی زور شور سے لتا منگیشکر اور محمد رفیع کے ریکارڈ بجاتا ہے۔ ہر جمعے کو مولانا عبدالجبار گچانی اپنی تقریر میں لوگوں کو بتاتا ہے کہ عاشق آزاد ہندوستان کا سیکرٹ ایجنٹ ہے، پاکستان کا دشمن اور غدار ہے اور خفیہ طور پر ایٹم بم تیار کر رہا ہے۔

جب سفید کپڑوں میں ملبوس دو قد آور لحیم شحیم اور گنجے شخص کیفے کنگال میں داخل ہوئے تھے تب تمام گاہکوں کو سخت تشویش ہوئی تھی اور وہ سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ میں سمجھا خدائی فوجدار ہیں اور عاشق آزاد کی کہانی ختم کرنے آئے ہیں۔

وہ دونوں کاؤنٹر پر کہنیاں ٹکا کر کھڑے تھے اور چیخ چیخ کر عاشق آزاد سے کچھ کہہ رہے تھے۔ ان کی تمام چیخیں محمد رفیع کی چیخوں میں گم ہو جاتی تھیں۔ ''اور دنیا کے رکھوالے، سن درد بھرے میرے نالے۔''

وہ دونوں مٹھیاں بھینچ اور کھول کر، سرخ ہوتے چہروں کے ساتھ پھیپھڑوں کی پوری قوت صرف کر کے بول رہے تھے دور سے ایسا لگتا تھا جیسے گونگی فلم چل رہی ہو۔

ریکارڈوں کی مغز پھاڑ آوازوں میں صرف ہوٹل کا ٹیبل والا دھنی بخش عرف دھنو بول سکتا ہے۔ اس گھمسان کے شور شرابے میں اس کی آواز سنی جاسکتی ہے۔ ''صاب سے چھ آنہ لیو، چھ آنہ۔ ایک سنگل دال فرائی اور ایک روٹی پھینکو ''یا، ''بھائی کو ایک کڑک گولی مار چائے مارو۔''

جب ریکارڈ بجنا بند ہوجاتے ہیں تب دھنی بخش عرف دھنو بھی بولنا بند کردیتا ہے۔ اصل میں دھنو کی آواز بیٹھ گئی ہے اور اسے بولنے کے لیے گانے والوں کی طرح ''دھم دھڑام'' جیسے سازوں کا سہارا ریکارڈوں سے لینا پڑتا ہے۔ دھنو کا دنیا میں صرف ایک دوست ہے، چھوٹے سر والا جسے لال شہباز قلندر کا چوہا کہا جاتا ہے۔ لتا منگیشکر اور محمد رفیع کے گانوں پر مست ہوکر دھنو آرڈر پر آرڈر پکارے جاتا ہے اور لعل شہباز قلندر کا چوہا سروں پر سر دھننے لگتا ہے۔

عاشق آزاد ریکارڈوں کے شور شرابے میں دھنو کی آواز سن اور سمجھ سکتا ہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر عاشق آزاد ٹنڈو محمد خان میں ہوٹل نہ کھولتا تو شاید اسماعیل آزاد قوال کے مقابلے میں قوالیاں گاتا، ملک میں نام پیدا کرتا اور ملک کا نام روشن کرتا۔ اس میں ایسے ''گٹس'' موجود ہیں۔ عاشق آزاد کو تین ہابیز..... یعنی شغل پسند تھے۔ وہ اخباروں اور رسالوں میں سے اداکارہ شمیم آرا کے فوٹو کاٹ کر دیواروں پر چپکاتا ہے... لتا منگیشکر اور محمد رفیع کے ریکارڈ پوری آواز سے بجاتا ہے اور ریڈیو پاکستان، ریڈیو سیلون، آکاشوانی ''آمد آباد بزودا'' اور آل انڈیا ریڈیو کے اردو پروگراموں میں فرمائشی خط لکھتا ہے... اس کا نام جب بھی کسی ریڈیو اسٹیشن کے فرمائشی پروگرام میں نشر ہوتا ہے تب وہ مٹھائی تقسیم کرتا ہے۔

عاشق آزاد کان پر ہاتھ رکھ کر دونوں مہیم شمیم افراد کی بات کو سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔ جب اسے ریکارڈ کے شور میں ان کی بات سمجھ میں نہ آئی تب اس نے مجبوراً ریکارڈ بند کردیا۔ اچانک ہوٹل میں مکمل خاموشی گویا دھم سے آکودی۔

ریکارڈ بند ہوتے ہی دھنو نے بھی بولنا بند کردیا۔ وہ دونوں شخص اپنی پھٹے ہوئے ڈھول جیسی آواز سن کر لمحے بھر کے لیے ششدر رہ گئے تھے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر خاموش ہوگئے تھے۔

ان میں سے ایک کی پچکی ہوئی ناک کے نیچے خوفناک مونچھیں تھیں اور دوسرا صفا چٹ (کلین شیو) تھا۔ اس کی ناک چیل کی چونچ جیسی تھی۔ اس نے کھنکھار کر زور سے پوچھا۔ ''سچل کہاں ہے؟''

اپنا نام سن کر میرے کان کھڑے ہوگئے۔ میں نے غور

زندگی بدلنے والی ورزش کی مشینیں

KOBE KOREAN
ELECTRIC TREADMILL
The King of All Exercise Machines
LCD TV کے ساتھ بھی دستیاب
LG موٹر و انورٹر کی طاقت اور انتہائی مضبوط چاپانیز بیلٹ کے ساتھ
آرمی و پبلک جمنازیمز، پرائیویٹ کلبز، اور گھر بھر کے استعمال کیلئے
بعد از فروخت سروس اور پارٹس کی فراہمی کی ضمانت

UNIQUE
ELEPTICAL TRAINER
ورزش کی مشینوں میں انقلابی اضافہ، جاگنگ، سائیکلنگ، سیڑھی چڑھنے اور کشتی چلانے کی چار ورزشیں ایک ہی مشین میں۔ ایک حرکت میں جسم کے تمام حصوں کی ورزش جسم کو خوبصورت بنانے اور وزن کم کرنے کے لئے موزوں ترین۔

یاد رکھیئے! دائمی صحت برقرار رکھنے کے لئے چند منٹ کی گھریلو ورزش کا کوئی نعم البدل نہیں، ورزش کے کوئی مضر اثرات نہیں

BILAL BROTHERS
Mustafa Arcade, SMCHS, Karachi. Tel: 4531961-62
Be Sure of our Prompt After Sales Service

LAHORE	FAISALABAD	PESHAWAR	QUETTA
NABI BUX & SONS	ELECTROLUXE	RASHID SONS	S. K. BUSINESS MART
Tel: 7354004	Tel: 8541004-8543436	Tel: 5272823-5274931	Tel: 2825564-2839082

BB-2007/12 marksman

سے ان کی طرف دیکھا۔

عاشق آزاد نے میری طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ سامنے جو کھڑکی ہے نا؟''

''ہاں'' کلین شیو نے جواب دیا۔

''اور کھڑکی کے قریب جو شمیم آرا کا فلم ''برباد جوانی'' سے لیا گیا فوٹو لگا ہوا ہے۔''

''ہاں۔''

''اس فوٹو کے بالکل نیچے دیوار سے ٹیک لگائے جو موالیوں جیسا نوجوان بیٹھا ہے۔''

''ہاں۔'' کلین شیو غرایا۔

''وہی سچل ہے۔''

دونوں نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں کسی دوسری دنیا کا فرد تھا اور موجودہ معاشرے کے سماجی شیش محل کو چور چور کر رہا تھا۔ ان کی مشکوک نگاہ اور پیشانی کی سلوٹوں کو دیکھ کر میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ دونوں عاشق علی آزاد کی نہیں۔ بلکہ میری کہانی ختم کرنے آئے تھے۔

جن دنوں میں، پرائمری ماسٹر تھا اور اپنی تنخواہ سے پندرہ افراد کے کنبے کا نہ پیٹ بھر سکتا تھا اور نہ تن ڈھانپ سکتا تھا تب میں نے حکومت کو دھمکی آمیز خط لکھا تھا کہ میری تنخواہ بڑھائی جائے..... یا مجھے زیادہ تنخواہ والی نوکری دی جائے۔ ورنہ میں خودکشی کرلوں گا۔

پھر جلد ہی مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ یہاں نہ صرف مجھ جیسے انسانوں کے لیے اپنی مرضی کے مطابق زندہ رہنا جرم ہے، بلکہ اپنی مرضی سے مرنا بھی کم جرم نہیں ہے۔ خودکشی کا اعلان کرکے میں خواہ مخواہ قانون کی نظروں میں آگیا تھا اور نئی مصیبتوں میں گھر گیا تھا۔

ان دونوں کریم شمیم آدمیوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ واقعی خدائی فوجدار ہیں اور مجھے مردوں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور کرنے آئے ہیں۔ پہلے تو میرے دل میں آیا کہ اٹھ کر بھاگ جاؤں لیکن پھر یہ خیال آیا کہ انسان عذرائیل سے تو پیچھا چھڑا سکتا ہے لیکن اس قسم کی مخلوق سے جان چھڑانا ناممکن ہے۔ اس لیے میں رب کی رضا پر راضی ہوکر بیٹھا رہا۔

ہوٹل کے تمام گاہک ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور وہ قدم سے قدم ملا کر میری طرف بڑھ رہے تھے۔ جب وہ دونوں میرے قریب پہنچے تو کچھ بولے بغیر ٹانگ گھما کر بینچ پر بیٹھ گئے اور میرا جائزہ لینے لگے پھر انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اثبات میں گردن ہلائی۔ گویا ان کا شک یقین میں بدل گیا تھا۔

کلین شیو نے کھنکھار کر حلق صاف کیا اور ٹوٹی پھوٹی سندھی میں مجھ سے پوچھا۔ ''سچل تمہارا نام ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میرا ہی نام سچل ہے۔ آج کل میں نے خودکشی کا ارادہ ملتوی کردیا ہے۔ اب میں نے خدا کے فضل اور میونسپلٹی کے کرم سے راحت سنیما کے سامنے پکوڑے بیچنا شروع کردیے ہیں۔''

وہ خاموش رہے اور مجھے گھورتے رہے۔ ان کی نگاہیں مجھے اپنے وجود میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں نے بے چینی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''میری بات کا یقین کیجیے..... میں نے سچ مچ خودکشی کا ارادہ ملتوی کردیا ہے..... بلکہ تقریباً رد ہی کردیا ہے۔ دیکھیے نا، زندہ رہنے میں کتنا مزہ ہے۔ ہم ہوا میں سانس لے سکتے ہیں، ہنس سکتے ہیں، رو سکتے ہیں..... میں نے زندہ رہنے کے لیے ہی تو پکوڑے بیچنا شروع کیے ہیں اگر مرنا ہوتا تو ماسٹری کرتا رہتا۔''

وہ اب بھی خاموش رہے۔ ٹیبل پر کہنیاں ٹکا کر اور ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھ کر مجھے گھورتے رہے۔ ان کی خاموشی مجھے پریشان کرنے لگی۔ گھٹن محسوس کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ''میں سچ مچ پکوڑے بیچتا ہوں۔ آپ بھی دل میں سوچتے ہوں گے کہ بھلا گریجویٹ بھی کہیں پکوڑے بیچتے ہیں..... گریجویٹ تو کلرکی کرتے ہیں، دفتری بنتے ہیں اور ماسٹر ہوتے ہیں..... لیکن جناب! میں گریجویٹ ہوں مگر میرے پاس سرٹیفکیٹ نہیں ہے۔ میں نے اپنا سرٹیفکیٹ سچل نامی ایک دوسرے شخص کو بیچ دیا ہے۔ اس کے پاس ''جیک'' تھا۔ لہٰذا اب وہ گزیٹڈ آفیسر ہے۔''

وہ اب بھی کچھ نہ بولے۔ ان کے چہرے گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہے تھے۔ مجھے الجھن ہونے لگی۔ میرے قریب آچر بیٹھا تھا۔ اس نے گویا میرے حال پر رحم کھاتے ہوئے میری حمایت میں کہا۔ ''ہاں سائیں! سچل جب پرائمری ماسٹر تھا تو بھوکوں مرتا تھا اور ایک دن بھوک سے بے بس ہوکر اس نے خودکشی کا ارادہ بھی کیا تھا..... پاگل۔''

دونوں نے کافور کے گٹھوں کی طرح گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ آچر نے مزید کہا۔ ''سچل نے جب سے ماسٹری چھوڑ کر پکوڑے بیچنا شروع کیے ہیں تب سے آسودہ ہے۔ اب اس نے خودکشی کا خیال بھی دل سے نکال دیا ہے۔''

دونوں کی آنکھیں عقاب کی آنکھوں کی طرح گول ہو گئیں۔ آچر کی حالت بھی مجھ جیسی ہوگئی۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''سس..... سائیں.....! میں راحت سنیما کے سامنے گنڈیریاں بیچتا ہوں.....''

الٹرا فورس ذہنی اور جسمانی پر ذرمنس کا خوشگوار احساس

ORTHOTONE
active lifestyle!

CENTRA SILVER
your ultimate health insurance!

ULTRA SLIM
fast acting weight-loss formula!

ALL NATURAL

the Vitamin company

MADE IN USA

• جوڑوں کے درد کا دشمن، ہڈیوں و عضلات کا مضبوط ساتھی

• یادداشت، ورائٹی کے لئے فٹ اور توانا

• یکساں کمزوری اور قدرتی فارمولا

ملک بھر میں فری ہوم ڈلیوری کے لئے ہماری ہیلپ لائن پر رابطہ کریں: 0300-8490075, 0321-8490075, 0321-6400422

قدرت کا بہترین توازن

Cakes Bakes
ROOP SINGHAR
HKB
Sery PHARMACY
guard an
MUSHTAQ
AL-FATAH
FAZAL DIN'S 24
D.WATSON
ZAKA

www.thevitamincompany.net email: info@thevitamincompany.net Phone: 042- 5863992-4 Fax: 042-5832796

''خاموش!'' دونوں ایکدم ایک ساتھ دھاڑے۔ ان کی دھاڑ بے حد خوفناک تھی۔ اس قدر کے لعل شہباز قلندر کا چوہا بھی چونک گیا۔ آچر خوف سے سکڑ کر رہ گیا۔ جس شخص کی ناک پچکی ہوئی تھی، وہ بالکل مگر مچھ لگتا تھا۔ اس نے آچر کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''گیٹ آؤٹ۔''

آچر انگریزی بولنے اور سمجھنے میں سندھ کے لیڈروں کی طرح ''قابل'' ہے۔ وہ اس انگریزی جملے کو سمجھا تھا یا نہیں، .... بہرحال جملے کا لہجہ فوراً سمجھ گیا تھا۔ وہ ایکدم اٹھا اور وہاں سے کھسک گیا۔ دوسرے گاہک بھی کیفے کنگال کی ہنگامی حالات دیکھ کر وہاں سے رفو چکر ہونے لگے تھے۔

دونوں نے دوبارہ مجھ پر نظریں گاڑ دیں۔

میں نے سلور کے پچکے ہوئے جگ میں سے سلور ہی کے میلے سے گلاس میں پانی انڈیلا اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔ پانی پی کر، ٹھنڈی سانس لے کر میں نے دونوں کی طرف دیکھا پھر میں نظریں جھکا کر ٹیبل پر جمی ہوئی میل کی تہ کو کریدنے لگا۔

کھنکھارنے کی آواز سن کر میں نے سر اٹھایا۔ کلین شیو نے مجھ سے پوچھا۔ ''تم کب سے شاعری کر رہے ہو؟''

''شش..... شاعری.....!'' میں اس کا سوال سن کر اچھل پڑا تھا۔ جیسے اس نے پتھر کھینچ کر مارا ہو۔

''ہاں، شاعری۔''

''میں اگر میرے گھر کے سارے افراد جب بھوکوں مرتے تھے اور بغیر دوا کے تڑپتے تھے تب بھی مجھے مرنے کا خیال آیا تھا، شاعری کرنے کا ہرگز نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

کلین شیو نے اپنے مگر مچھ جیسے ساتھی سے انگریزی میں کہا۔ ''بہت چالاک ہے۔''

مگر مچھ کی پچکی ہوئی ناک پکوڑے جیسی ہوگئی۔ اس نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''تو تم اپنے شاعر ہونے سے انکار کرتے ہو؟''

''میں بالکل صحیح الدماغ انسان ہوں جناب!''

میں نے جواب دیا۔ ''شاعروں اور افسانہ نویسوں کی کھوپڑی میں خلل ہوتا ہے۔ میں ٹھیک ٹھاک ہوں اور پکوڑے بیچتا ہوں۔''

''یاد رکھو۔'' کلین شیو نے کہا۔ ''ہم تمہارا ایک ایک جواب نوٹ کر رہے ہیں۔ کیا تم شاعر نہیں ہو؟''

''نہیں جناب! نہ میرا باپ شاعر تھا اور نہ میں شاعر ہوں اور نہ ہی میری اولاد میں سے کوئی شاعر ہوگا۔''

''کیا تمہارے اشعار رسالوں میں نہیں چھپتے؟''

''مجھے صرف ایک رسالے کا معلوم ہے، جو کاغذ کا نہیں تارکول کا بنا ہوا ہے۔ جہاں اشعار نہیں کتے نظر آتے ہیں۔ وہ ہے حیدرآباد کا رسالہ روڈ۔''

''ہمیں ہنسنے کی عادت نہیں ہے۔'' مگر مچھ غرایا۔ ''اس لیے ہمیں ہنسانے کی ناکام کوشش مت کرو۔''

''میں پچھلے ایک کروڑ برسوں سے ہنس نہیں سکا۔''

میں نے کہا۔ ''میں دوسروں کو کیسے ہنسا سکتا ہوں؟''

''تم نے شاید ہمیں پہچانا نہیں۔'' کلین شیو نے کہا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آپ میری کہانی ختم کرنے آئے ہیں۔''

کلین شیو نے اپنا اور اپنے ساتھی کا تعارف کرایا۔ میں ان کے نام اور عہدے سن کر بہت متاثر ہوا۔ دونوں بہت بڑے جاسوس تھے۔ میں نے انہیں یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میں یہ اقرار کرتا ہوں کہ میں نے خودکشی کا ارادہ ضرور کیا تھا لیکن میں شاعر نہیں ہوں اور آنے والے سات ہزار برسوں میں بھی میں شاعر نہیں بن سکوں گا۔''

مگر مچھ نے کہا۔ ''ہم مشہور اور بے مثال جاسوس زیرو زیرو ایٹ اور زیرو زیرو نائن ہیں۔ ہماری آنکھ کیمرا ہے۔''

''بے شک جناب.....! لیکن میرے فوٹو کا نگیٹو، پازیٹو لگتا ہے اور پازیٹو ہمیشہ نگیٹو لگتا ہے۔'' میں نے عاجزی سے جواب دیا۔

''تمہاری باتیں بالکل جاپانی شاعروں جیسی ہیں۔'' کلین شیو نے کہا۔ ''جو بھی باغی شاعر علامتی یعنی Symbolic شاعری کرتے ہیں اور عوام کو ورغلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم ان کے ارادے خاک میں ملا دیتے ہیں۔''

مگر مچھ نے کہا۔ ''جہاں انگریز جاسوس ناکام ہو جاتے ہیں وہاں ہم ایسے کارنامے سرانجام دیتے ہیں کہ انگریز عملدار بھی دانتوں میں انگلیاں دبا لیتے ہیں۔''

''دانتوں میں انگلیاں تو ہم جیسے دیسی لوگ دیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''انگریز تو دانتوں میں برش دیتے ہیں۔''

''خبردار!'' پچکی ہوئی ناک والے نے کہا۔ ''زبان سنبھال سنبھال کر بات کرو چیل! تمہارا روبیہ جاپان کی حدیں پار کر کے چین میں داخل ہو رہا ہے۔''

''تم نے عالمی امن کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔'' کلین شیو نے کہا ''آج کل تم انتہائی قابلِ اعتراض اور انقلابی

شاعری کر رہے ہو۔''

''انقلابی شاعری؟'' میں نے حیرت سے دہرایا۔

''ہاں، تم سو فی صد خالص ملحدانہ اور انقلابی شاعری کر رہے ہو۔'' دونوں نے کورس میں جواب دیا۔

انقلاب اور شاعری کی باتیں سن کر باقی جوگا ہک ہوٹل میں موجود تھے، وہ بھی خوف سے باہر نکل گئے۔ اب کیفے کنگال میں دو لحیم شحیم جاسوسوں اور میرے علاوہ، عاشق آزاد، دھنی بخش عرف دھنو اور لعل شہباز قلندر کا چوہارہ گئے تھے۔ شاعری، فساد اور انقلاب کی بحث کا لعل شہباز قلندر کے چوہے پر زبردست اثر ہوا تھا۔ وہ ایک پیچ پر لیٹ گیا اور گیند جتنے سر کے نیچے بازو رکھ کر غور سے جاسوسوں کی باتیں سننے لگا تھا۔

مگر مچھ نے کہا۔ ''تم جیسے انقلابی شاعر سماج کے دشمن ہیں۔''

''جس چیز کا وجود ہی نہیں ہے۔ اس کا میں دشمن کیسے ہو سکتا ہوں؟'' میں نے کہا۔

''تم سماج کے وجود سے انکار کرتے ہو؟''

''اگر کولہو کا دوسرا نام سماج ہے تو پھر میں سماج کے وجود سے انکار نہیں کرتا۔''

دونوں جاسوسوں نے سرگوشی میں کچھ مشورہ کیا پھر کلین شیو نے کہا۔ ''ہم تمہیں گرفتار کریں گے۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ تم سچل ہو۔''

''میں سچل ہوں، اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ سارا قصور میرے باپ کا ہے جس نے میرا نام سچل رکھا ہے..... لیکن میں اپنے بیٹے کا نام جھومل رکھوں گا۔ جیسا دیس، ویسا بھیس۔''

''ہم نے تمہارے بارے میں جو کچھ سنا تھا، تم اس سے بھی دو ہاتھ آگے ہو۔'' کچھ دیر کے بعد کلین شیو نے کہا۔

''آپ نے کیا سنا تھا میرے بارے میں؟''

''یہی کہ تم براہ راست کارل مارکس کے زیر اثر ہو۔''

''میں ہیچ ہاکس کے زیر اثر ہوں۔''

اس نے میری بات ان سنی کرتے ہوئے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''یعنی، تمہاری شاعری میں شعلے ہیں، تمہاری شاعری آگ سی بھڑکا دیتی ہے۔''

دھنی بخش عرف دھنو نے بحث میں ٹانگ اڑائی۔

''سائیں! یہ بے چارہ کیا جانے شاعری وائری، یہ تو مستانہ ہے مستانہ!''

''کیا کہا..... مستانہ!'' کلین شیو کی چیخ نکل گئی تھی اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا پھر دوبارہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''مستانہ، یعنی مست..... یعنی سرمست..... تمہارا مطلب ہے یہ سرمست ہے؟''

مگر مچھ نے کہا ''اب تم قابو میں آئے ہو سچل سرمست!''

کلین شیو نے کہا۔ ''ہم سے بچ جانا آسان نہیں ہے.....''

''مم..... میں سچل سرمست نہیں ہوں.....'' میں ہکلایا۔ ''میں سچل پکوڑائی ہوں..... اور راحت سنیما کے سامنے پکوڑے بیچتا ہوں۔''

''تم خود کو نہ صرف سچل پکوڑائی، بلکہ سچل مسخرہ بھی ظاہر کر رہے ہو۔'' مگر مچھ نے کہا۔ ''اصل میں تم سچل سرمست انقلابی شاعر ہو۔''

کلین شیو نے ایکدم پوچھا۔ ''اچھا بتاؤ، مذہب کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''مذہب.....؟ کونسا مذہب؟'' میں نے پوچھا۔

''دنیا میں تو بہت سے مذہب ہیں، اسلام، عیسائیت، بدھ.....''

''بس! بس.....'' کلین شیو ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا اور بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے فتح مندی کا احساس جھلکتا تھا۔ ''تم سیانے کوے کی طرح اپنی دونوں ٹانگیں پھنسا چکے ہو سچل سرمست!''

''آپ کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔

دونوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور گویا میرا مذاق اڑانے کے لیے جملہ دہرایا۔ ''کونسا مذہب.....!''

کلین شیو نے کہا۔ ''تم بچپن ہی سے مذہب، مسجد، نمازوں اور پیر بزرگوں کے خلاف ہو۔ تم کمیونسٹ ہو۔''

مگر مچھ نے ایک شعر پڑھا:

''مذہب نے ملک میں لوگوں کو الجھایا
پیروں، بزرگوں، پنڈتوں نے بے حد بھلایا
کچھ نمازیں پڑھیں، کچھ نے مندر بسائے
قریب نہ آئے، عقل والے عشق کے۔''

کلین شیو نے پوچھا۔ ''کیا یہ ملحدانہ شعر تمہارا نہیں ہے۔''

''تیل کی کڑاہی اور پکوڑوں کے ٹھیلے کے سوا اس دنیا میں میرا کچھ بھی نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

کچھ دیر تک دونوں جاسوس خاموش رہے پھر مگر مچھ نے کچھ کہنے کے لیے بات آگے بڑھائی۔ ''مسٹر سچل سرمست.....!''

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تصحیح کی۔ ''سچل سرمست نہیں، سچل پکوڑائی کہیے۔''

''اوکے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''کیا تم مسلمان ہو؟''

''ہاں، پکا۔''

''تمہیں کس نے مسلمان کیا؟''

''جی؟''

''میں نے پوچھا ہے، تمہیں کس نے مسلمان کیا ہے؟''

''کسی نے بھی نہیں۔'' میں ان کی جرح سے ہکلانے لگا تھا۔ ''مم... میرا مطلب ہے..... میں پیدائشی مسلمان ہوں۔''

''یہ ایک اور ثبوت ہے.....'' مگر مچھ نے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا۔ ''کہ تم سچل سرمست ہو۔ جس بات کا اظہار تم نے ابھی کیا ہے، اس کا اقرار تم اپنے شعر میں ہی کر چکے ہو۔ کیا تم اب ابھی انکار کرو گے کہ تم سچل سرمست نہیں ہو؟''

''ہاں، میں اب بھی انکار کرتا ہوں.....''

''اچھا، ایک بات بتاؤ..... تم اردو جانتے ہو؟''

''بالکل، میں نے ہزاروں اردو فلمیں دیکھیں ہیں۔ اب بھی مجھے اردو نہیں آئے گی تو کیا قیامت کے دن آئے گی؟''

''گڈ! تم پنجابی جانتے ہو؟''

''ہاں، فردوس میری پسندیدہ اداکارہ ہے۔ میں اس کی پنجابی فلمیں دیکھ دیکھ کر پنجابی زبان سیکھ گیا ہوں۔''

''یعنی تم پنجابی بھی جانتے ہو؟''

''جی ہاں۔''

''سرائیکی؟''

''ثریا ملتانیکر کی سرائیکی گانیاں سمجھ لیتا ہوں۔''

''تمہیں فارسی بھی آتی ہے؟''

''ہاں، پاکستان کا قومی ترانہ سمجھ سکتا ہوں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ بلبل کو فارسی میں عندلیب کہتے ہیں۔''

''واہ..... بہت خوب۔ اس کا مطلب ہے تمہیں فارسی بھی آتی ہے۔''

''ہاں، کچھ کچھ۔''

''ہندی جانتے ہو؟''

''جی ہاں، لعل پشپ اور گی ساماتانی کے افسانے پڑھ لیتا ہوں۔''

''اور عربی؟''

''کلمے کے معنی اور تشریح آتی ہے۔''

''اور سندھی تمہاری مادری زبان ہے؟''

''جی ہاں۔''

''بس، اب تم پھنس گئے۔'' مگر مچھ نے جذبات میں آکر میز پر دو تین مکے مارے۔ ''تم ایک ہی وقت میں اردو، پنجابی، سرائیکی، فارسی، عربی، ہندی اور سندھی جانتے ہو۔ یعنی تمہیں سات زبانیں آتی ہیں۔''

کلین شیو نے انگلی سے میرے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور تمہارا دوسرا نام شاعر ہفت زبان ہے۔''

مگر مچھ نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ ''کیا اب مزید کسی ثبوت کی ضرورت باقی ہے کہ تم سچل سرمست ہو؟''

میں الجھ کر رہ گیا۔ دونوں جاسوسوں کے ثبوت سن کر مجھے بھی کچھ کچھ شک سا ہونے لگا کہ میں سچل پکوڑائی نہیں بلکہ سچل سرمست ہوں۔

کلین شیو نے کہا۔ ''تم سماج میں کفر، الحاد اور کمیونزم کا پرچار کر رہے ہو۔''

''کمیونزم کا پرچار! نہیں سائیں! میں صرف آموں کا اچار ڈال سکتا ہوں۔ آپ کو کسی نے غلط خبر پہنچائی ہے۔''

''ہم سے کوئی بھی جدید شاعر بچ نہیں سکے گا۔'' مگر مچھ نے کہا۔

''آج تم گرفتار ہوئے ہو، کل سے ہم ایک دوسرے انقلابی شاعر کی تلاش شروع کر دیں گے۔'' کلین شیو بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''وہ کون خوش نصیب ہے، جو اب تک آپ لوگوں سے بچا ہوا ہے؟''

''اوہ! اب تم اپنے ساتھی انقلابی شاعر کو پہچاننے سے بھی انکار کر رہے ہو۔''

''میرا ساتھی..... ! انقلابی شاعر؟''

''ہاں، کیا تم شاہ عبداللطیف بھٹائی کو پہچاننے سے انکار کرتے ہو؟''

''بھٹائی.....!'' میں اچھل پڑا تھا اور حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ لعل شہباز قلندر کا چوہا بھی اٹھ بیٹھا تھا اور تعجب سے جاسوسوں کی باتیں سننے لگا۔

''کیوں۔'' کلین شیو نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اپنے ساتھی کا نام سن کر چونک گئے نا..... ہم سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ آج سچل سرمست، تم گرفتار ہوئے ہو۔ کل شاہ عبداللطیف بھٹائی کی باری ہے۔''

اس وقت لعل شہباز قلندر کا چوہا اپنا سر پیٹتا ہوا بھاگ کر ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

خواب

ایس ایم شجاع رضوی

کہتے ہیں خوابوں میں رہنے والے حقیقت کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں اس لیے اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں مگر یہ معاملہ کچھ مختلف ہے اس میں خواب تو ہے اور خواب پرست بھی،لیکن اس کا خواب .....صرف خواب ہی نہیں حقیقت ہے۔

سفر کے لیے زادِراہ جمع کرتی مغربی عورت کا قصہ بے چارگی

ادھیڑ عمر مارتھا انتہائی درجے کی کنجوس مشہور تھی۔اس کی مصروفیات بھی بہت محدود تھیں۔صاف ستھرے گھر میں برتن دھونے اور دوسرے کاموں سے فارغ ہوکر کافی پیتے ہوئے ٹی وی دیکھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔وہ تنہا رہتی تھی اور وہ کبھی تنہائی سے خوفزدہ نہیں ہوئی۔وہ اس خیال سے خوش اور مسرور رہتی تھی کہ اس پر کوئی حکم چلانے والا تھا اور نہ ہی بچے تھے کہ زندگی اجیرن کرڈالیں۔صرف دو بلیاں اس کی رفیق تھیں۔

چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں جب وہ ٹی وی کھولتی تو اسے

یوں لگتا جیسے ہنگاموں کا درکھل گیا ہو۔ وہ گھنٹوں ٹی وی کے سامنے گزار دیتی تھی۔

مارتھا نے جوانی کے دن بھی تنہا گزارے تھے اور اس ادھیڑ عمری میں بھی تنہائیاں اس کی ساتھی تھیں، یہ تنہائیاں اسے عزیز تھیں، جوں جوں وقت گزرتا رہا، رفیق حیات کے حصول کی امید کم سے کم تر ہوتی گئی۔ ایک مختصر سے عرصے کے لیے اس پر ڈپریشن حملہ آور ہوا تھا لیکن اس نے جلد ہی اس سے چھٹکارا پالیا تھا۔ اس نے اپنی تنہائیوں کے ساتھ گویا سمجھوتا کرلیا تھا پھر رفتہ رفتہ اسے اپنی آزادی کی قدر و قیمت کا احساس ہونے لگا۔

وہ خود مختار تھی۔ وقت اپنی مرضی کے مطابق گزارتی تھی۔ کسی کی روک ٹوک نہیں تھی۔ جبکہ اس کی عمر کی دوسری عورتیں مختلف بندھنوں اور ناتوں میں بندھی ہوئی تھیں، مارتھا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کا اپنا تھا۔ وہ چاہتی بھی یہی تھی کہ اس کی اس ملکیت پر کوئی اپنا حق نہ جتائے۔

گزرے ہوئے کئی برسوں میں اس نے کافی رقم پس انداز کرلی تھی۔ اس کی اس بچت کا مقصد سیاحت تھا۔ اس کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ پورے یورپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اس کی کفایت شعاری، جسے لوگ کنجوسی کا نام دیتے تھے، دیکھ کر اکثر اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔

لوگ صرف یہی سمجھتے تھے کہ مارتھا کنجوس ہے اور جو کچھ جمع کررہی ہے، اسے اپنی لاش کے ساتھ تابوت میں رکھ کر قبر میں لے جائے گی۔ اس کے ساتھ دفتر میں کام کرنے والی نوجوان لڑکیاں اکثر اس پر فقرے کستیں اور بلند آواز میں ایک دوسرے سے کہتیں۔ ''بے چاری شادی کے لیے رقم جمع کررہی ہے۔ شاید کوئی دولت کی خاطر ہی اس سے شادی کرلے۔''

ادھیڑ عمر مارتھا ان کی باتیں گویا سنتی ہی نہیں تھی یا سن کر ان سنی کردیتی تھی۔ وہ اکثر نوجوان لڑکیوں کے طنزیہ جملے اور اپنا مضحکہ اڑاتے قہقہے سنا کرتی تھی۔

ان دنوں وہ یہی سوچتی کہ اگر لڑکیاں اس پر ہنستی ہیں۔ اس کا مذاق اڑاتی ہیں تو کوئی ہرج نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ جب یہ لڑکیاں بوڑھی ہوجائیں گی اور ان کی آمدنی کا ذریعہ بند ہوجائے گا..... تب انہیں احساس ہوگا کہ مارتھا نے یورپ کی سیاحت کے لیے رقم جوڑ جوڑ کر ایک دانش مندانہ اقدام کیا تھا۔

''انہیں میرا مذاق اڑانے دو، مجھ پر ہنسنے دو۔'' ایک روز مارتھا نے خود بھی زیر لب مسکراتے ہوئے گویا اپنے آپ سے کہا تھا ''انہیں تو رقم حاصل کرکے فوراً خرچ کرنے کی فکر رہتی ہے۔ بڑھاپے میں ان کی یہ ہنسی آہوں میں بدل جائے گی۔''

..... اور اب وہ یورپ کے سفر پر نکلنے کی تیاریاں کررہی تھی۔ لنچ کے وقفے میں وہ کپڑوں کی دکانوں پر جاتی اور ان کپڑوں کو نظروں میں بھر لیتی جن کی اسے سیاحت کے دوران میں ضرورت پڑسکتی تھی۔ وہ سب سے پہلے سوئٹزرلینڈ پھر اسپین، ہالینڈ، جرمنی، انگلینڈ، اٹلی، ناروے، سویڈن، فرانس اور ترکی جانا چاہتی تھی۔ وہ یورپ کے حسن کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کے لیے برسوں سے مچل رہی تھی۔

اس کے ریٹائر ہونے میں صرف دو ماہ باقی رہ گئے تھے۔ وہ یہ مدت ختم ہونے کی منتظر تھی۔ اس کے بعد وہ دنیا کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لینے کے لیے اس ملک سے روانہ ہوجاتی۔

رقم پوری طرح محفوظ تھی۔ برسوں کی کمائی بستر کے نیچے گدے میں رکھی تھی۔ پورا گدا روئی یا فوم کے بجائے ڈالروں سے بھرا ہوا تھا۔ اب صرف دو ماہ باقی تھے..... اس کے بعد مارتھا اس رقم کو خرچ کرنا شروع کردیتی۔

اس نے ٹی وی بند کیا اور اٹھ کر اپنے بیڈروم کی طرف چل دی۔ بیڈ پر لیٹ کر اس نے ایک سگریٹ سلگائی اور آنکھیں بند کرکے تصور میں سوئٹزرلینڈ کی حسین وادیوں کو دیکھنے لگی، اب ان مناظر کو حقیقی نظر سے دیکھنے کے لیے اسے صرف دو ماہ گزرنے کا انتظار کرنا تھا... صرف دو ماہ!

یہ سوچتے ہوئے اس کے چہرے پر تبسم تھا۔ چہرے کی جھریوں کے باوجود سیاحت کے خیال سے اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ وہ سوچتی رہی کہ بس دو ماہ..... صرف ساٹھ دن کے بعد وہ طیارے میں بیٹھ کر حسین وادیوں میں گھومنے کے لیے روانہ ہوجائے گی۔

☆☆☆

''کیا مصیبت ہے، اب یہ کیا بڑبڑا رہی ہے؟''

''وہی پرانی باتیں۔'' ایک بوڑھی عورت نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا کہہ رہی ہے؟''

''یہی بتائے جارہی ہے کہ وہ کس طرح یورپ کے دورے پر جائے گی۔ کہاں کہاں رہے گی..... بے چاری دنیا کی ہر حسین چیز کو بہت قریب سے دیکھنے کے لیے بے چین ہے..... بعض اوقات تو اس کی باتیں سن کر مجھے رونا آتا ہے۔''

''اوہ..... سارا! چھوڑو بھی'' سفید ایپرن پہنے ہوئے شخص نے بوڑھی عورت سے کہا۔ اس کے لہجے میں قدرے بیزاری تھی۔ حلیے سے وہ ڈاکٹر معلوم ہوتا تھا۔

''تم ہر بات کو غیر جذباتی انداز میں مت لیا کرو..... یہ بے چاری.....'' بوڑھی عورت نے دکھ سے کہا۔

الجھی ڈور

مرزا امجد بیگ

دنیا کا کاروبار حیات مختلف اقسام وانواع کے افراد کے باعث جاری وساری ہے، اچھے برے، بہت اچھے اور بہت برے بھی اس دنیا کا حصہ ہیں اور اپنی بساط کے مطابق دنیا کو اچھا یا برا بنانے میں مصروف عمل ہیں۔ ایسے ہی چند اچھے برے کرداروں کا حقیقی فسانہ جو تفویض کردہ فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھے۔

بدی پسپائی کے غلبے کی کتھا، زندہ کرداروں پر مبنی سچا واقعہ، وکیل کی ڈائری سے انتخاب

ایک روز میں عدالت کے کمرے سے نکل کر پارکنگ کی طرف جارہا تھا تو اپنے عقب میں ایک نامانوس سی آواز سن کر چونک اٹھا۔ اس چونکنے کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ کسی شخص نے اجنبی آواز میں مجھے ہی پکارا تھا۔ ''بیگ صاحب! ذرا ایک منٹ!''

لامحالہ مجھے رُکنا پڑا کیونکہ پکارنے والا جو کوئی بھی تھا اسے مجھ ہی سے کوئی کام تھا۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو وہ ایسے پُراشتیاق انداز میں مجھے آواز نہ دیتا۔ رُکتے ہی میں نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا۔

دس بارہ قدم کے فاصلے پر مجھے ایک دُبلا پتلا، دراز قامت شخص نظر آیا۔ یقیناً اسی شخص نے مجھے آواز دی تھی کیونکہ وہ مجھ تک پہنچنے کا راستہ میں دکھائی دیتا تھا۔ آس پاس اس وقت کوئی اور بندہ نظر نہیں آرہا تھا اس لیے بھی مجھے یقین تھا کہ ایک لمبے چوڑے کسی اور نے مجھے نہیں پکارا ہوگا۔

وہ دراز قامت شخص میرے قریب آیا اور خاصی کراری آواز میں بولا۔ ''السلام علیکم بیگ صاحب!''

''وعلیکم السلام!'' میں نے سنجیدہ لہجے میں اس کے سلام کا جواب دیا۔

اس نے اسی پر بس نہیں کی اور باقاعدہ مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے معانقے کی فرمائش نہیں کی تھی ورنہ خوامخواہ میں ایک آزمائش سے دوچار ہوجاتا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ میں معانقے کے خلاف ہوں یا میں اسے پسند نہیں کرتا بلکہ میں جس مصروف ترین پیشے سے وابستہ ہوں اس کا تقاضا ہے کہ ''نہ جان، نہ پہچان'' والے معاملات میں زیادہ بے تکلفی ٹھیک نہیں ہوتی پھر عدالت کی مثال کسی میلے ٹھیلے یا پکچر ہاؤس جیسی ہی ہے جہاں بھانت بھانت کے لوگ گھومتے پھرتے ہیں جن میں ہر شعبۂ جرم کے افراد بھی شامل ہوتے ہیں لہٰذا علیک سلیک خصوصاً معانقے کے معاملے میں خاصا محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پتا نہیں، کس وقت کون شخص ''کیا کام'' دکھا جائے۔ میں یہاں پر خاص طور پر صرف ان لوگوں کا ذکر کررہا ہوں جو آپ کے لیے شناسا نہ ہوں ورنہ جان پہچان کے اور دیکھے بھالے لوگوں کے معاملے میں ایسی کسی احتیاط کی ضرورت نہیں۔

مجھے پکارنے والا وہ دُبلا پتلا، دراز قامت شخص بھی چونکہ میرے لیے قطعاً اجنبی تھا لہٰذا میں نے معانقے کے سلسلے میں ایک حتمی اصول کا ذکر کردیا۔ اس شخص نے بڑے پُرجوش انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا پھر ایک معروف مجسٹریٹ کا نام لیا۔

''آپ ان کی عدالت میں تھے نا؟''

اس نے کسی شک و شبے والی بات نہیں کی تھی لہٰذا میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ''ہاں!''

وہ بولا۔ ''میں نے آپ کو وہاں مصروف دیکھ لیا تھا اسی لیے عدالت سے باہر آپ کا انتظار کررہا تھا۔''

''اچھا اچھا!'' میں نے جلدی سے کہا پھر پوچھا۔ ''آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟''

میں ابھی تک اس شخص کی غرض و غایت کا صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ وہ کسی کیس کے سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہ رہا ہوگا۔ اس نے جتنے اعتماد سے ''بیگ صاحب!'' کہہ کر مجھے پکارا تھا۔ ازیں علاوہ مذکورہ عدالت اور وہاں کے مجسٹریٹ کا حوالہ دیا تھا اس سے لگتا تھا کہ وہ عدالت اور عدالتی معاملات میں کسی نہ کسی طور واسطہ

ضرور رکھتا ہے۔ میں انہی سوچوں میں اُلجھا ہوا تھا کہ اس کا جواب میری سماعت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''بیگ صاحب! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ واقعی، مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے اسی لیے تو میں آپ کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہوں۔ بندے کو غلام مرتضیٰ کہتے ہیں۔'' بات کے اختتام پر اس نے اپنا اِسی تعارف بھی کرادیا۔ تعاقب والی بات بھی اس نے خوب کہی تھی۔

''جی غلام مرتضیٰ صاحب!'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ ''اگر آپ کسی کیس کے سلسلے میں مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں یا میرے توسط سے آپ کو اور کسی قسم کا قانونی تعاون درکار ہے تو ایک گھنٹے بعد آپ میرے دفتر آجائیں۔'' پھر میں نے اسے اپنے دفتر کا پتا بتایا جو سٹی کورٹ کے نزدیک ہی ایک عمارت میں واقع تھا اور کہا۔ ''میں آپ کو دفتر ہی میں مل جاؤں گا۔''

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''بیگ صاحب! میں نے آپ کا دفتر دیکھ رکھا ہے لیکن مجھے آپ سے جو کام ہے اس کے لیے دفتر جانا ضروری نہیں۔'' وہ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے کے بعد تجویزی لہجے میں بولا۔

''کیوں نہ تھوڑی دیر کے لیے کینٹین ہی میں بیٹھ جائیں۔ اسی بہانے آپ کے ساتھ ایک چائے پینے کا اعزاز بھی حاصل ہوجائے گا۔''

میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا کہ وہ عدالت اور عدالتی متعلقات سے بخوبی واقف تھا۔ اس کی تجویز پر عمل کرنے میں بھی مجھے کوئی قباحت نظر نہ آئی۔ وہ دوپہر کا وقت تھا اور میرے لنچ میں ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا۔ عموماً چائے کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ بھوک کی دشمن ہے۔ خالی پیٹ میں ایک کپ چائے ڈال دو تو بجھو، کھانے کی بھٹی لیکن میرے ساتھ چائے کا معاملہ اس کے بالعکس ہے۔ یہ اللہ کی نعمت میرے لیے ایک مؤثر اور عمدہ ایپی ٹائزر کے طور پر کام کرتی ہے۔ بہرحال، ہر شخص کا اپنا اپنا مزاج اور اپنا اپنا تجربہ ہے۔

میں اس غلام مرتضیٰ نامی دراز قامت شخص کے ساتھ عدالت کی کینٹین میں جا بیٹھا۔

''آپ مجھ سے کوئی کام کی بات کرنے والے تھے؟''

''جی!'' وہ کچھ اس انداز سے چونک کر میری جانب متوجہ ہوا جیسے میں نے اسے گہری نیند سے جگادیا ہو۔ ''وہ دراصل..... میں آپ کے لیے کچھ کام کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔

''مثلاً..... آپ میرے لیے کیا کیا کرسکتے ہیں؟''

''میں اِدھر عدالت میں اور اُدھر عدالت کے باہر جگہ جگہ گھومتا پھرتا ہوں۔'' اس نے بتانا شروع کیا۔ ''میرے پاس طرح طرح کی دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیاں موجود ہوتی ہیں۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو اچھی اور معیاری کہانیاں مہیا کرسکتا ہوں۔''

''میں ان کہانیوں کا کیا کروں گا بھلا؟''

''وہ..... وہ آپ سسپنس ڈائجسٹ میں کہانیاں لکھتے ہیں نا!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس لیے آپ کو نت نئی کہانیوں کی ہر وقت ضرورت رہتی ہوگی۔ میں نے سوچا، اگر میں آپ کو مختلف قسم کی کہانیاں دینا شروع کردوں تو آپ کے لیے کافی آسانی ہوجائے گی اور میرا بھی کچھ بھلا ہوجائے گا۔''

''ایسی کسی کوشش میں آپ کا کیا بھلا ہوسکتا ہے مرتضیٰ میرا مطلب ہے غلام مرتضیٰ صاحب؟''

وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''میں نے یہی سوچ کر آپ سے کہانیوں والی بات کی ہے کہ چلو، اسی بہانے میری آمدنی کا ایک ذریعہ نکل آئے گا۔''

''دیکھو بھائی صاحب! سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی جن کہانیوں کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس سلسلے میں ایک وضاحت کردوں کہ وہ اِدھر اُدھر سے جمع کی ہوئی مرچ مسالے دار قصے کہانیاں نہیں ہوتیں بلکہ وہ میرے کامیاب کیسز کی روداد ہوتی ہیں اور.....''

''اوہ!'' وہ قدرے مایوس سا ہوگیا پھر ایک بوجھل بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے، میں بالکل غلط سمجھ رہا تھا۔''

''ہاں، ایسی ہی بات ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''جو حقیقت ہے وہ میں نے آپ کے سامنے بیان کردی ہے۔ مجھے افسوس ہے..... آپ کی ایک متوقع آمدنی کا دروازہ کھلنے سے پہلے ہی بند ہوگیا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس میں آپ کا کیا قصور! جب میری قسمت ہی خراب ہے تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔''

اس نے قسمت کی خرابی کا ذکر کچھ ایسے انداز سے کیا تھا کہ میں اپنے دل میں اس شخص کے لیے ہمدردی کے جذبات اُبھرتے ہوئے محسوس کرنے لگا۔ پتا نہیں، وہ شخص بے روزگاری کی کس صورت کا مارا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں خیال

آیا کہ میں اسے کریدنے کی کوشش کروں اور ہو سکے تو اس کی کچھ مدد بھی کردوں۔

بے روزگاری فی زمانہ سب سے بڑا عذاب ہے بلکہ اسے اگر ایک لعنت کہا جائے تو کچھ غلط نہیں ہوگا۔ کوئی ایسا انسان نہیں جس کے ساتھ پیٹ لگا ہوا نہ ہو اور یہ پیٹ ہر حال میں کھانے کو مانگتا ہے۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ حاملِ پیٹ روزگار والا ہے یا بے روزگار، امیر ہے یا غریب، اختیار والا ہے یا بے اختیار۔ اسے اس بات سے بھی کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ اس کے اندر پہنچنے والا کھانا جائز ذرائع اختیار کر کے حاصل کیا گیا ہے یا کسی ناجائز حرکت کا شاخسانہ ہے، شاید اسی بنا پر اسے ''جہنم'' اور ''پاپی پیٹ'' ایسے خطابات سے نوازا جاتا ہے۔

میں چند لمحات تک گہری نظروں سے غلام مرتضیٰ کو دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا لیا۔ ''غلام مرتضیٰ صاحب! آپ کا اصل ذریعۂ روزگار کیا ہے؟''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی اور بتایا۔ ''بنیادی طور پر میں آپ کا ہم پیشہ ہوں جناب!''

اس انکشاف نے مجھے اُچھلنے پر مجبور کردیا۔ میں نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''یعنی آپ بھی ایک وکیل ہیں؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا اسی لیے متاملانہ انداز میں اس سے استفسار کیا۔ ''اگر آپ نے باقاعدہ وکالت پڑھ رکھی ہے تو پھر اس پیشے کو ذریعۂ روزگار کیوں نہیں بناتے؟ میرا خیال ہے، اگر آپ وکالت کی پریکٹس شروع کردیں تو آپ کے جملہ مسائل چٹکی بجاتے میں حل ہوجائیں گے۔''

اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے ایک چٹکی بجائی پھر قدرے طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''زندگی بڑی تلخ اور کڑوی ہے۔ اس کے مسائل یوں چٹکی بجاتے میں حل نہیں ہوجاتے۔ یہ الگ بات کہ سب لوگ آپ کی طرح خوش قسمت نہیں ہوتے۔''

اس نے یاس انگیز انداز میں توقف کیا اور رشک بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں منتظر رہا کہ وہ کچھ آگے بھی بولے۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ ''بیگ

U.K امریکہ، کینیڈا اور پاکستان کے معروف عالمی شہرت یافتہ ماہر خاندانی معالج

الحاج حکیم سید شفقت علی شاہ

CONSULTANT
Herbalist & Homeopathic PHYSICIAN

خواتین کے جملہ امراض نسواں کے بارے میں مکمل اعتماد کے ساتھ مشورہ کرسکتی ہیں کمزور بچوں کا وزن بڑھانے کیلئے فوری رجوع کریں

مردانہ امراض کے ماہر معالج

سوریاسیس، ایگزیما، بواسیر، ذیابیطس، سانس کی تکلیف جوڑوں کا درد، برص پھلبہری ہیپاٹائٹس بی اور سی، پتھری گردہ و مثانہ، پراسٹیٹ گلینڈ کا بغیر آپریشن کامیاب علاج

بے اولادی کیلئے سپیشل کورس

For Consultation and Appointment Call
Ph& Fax: 0161-2052118, Mob: 07984 229845
228 Moston Lane Moston Manchester M40 9NS England
E-mail: syedherblist@yahoo.com

صاحب! میں نے باقاعدہ وکالت کا امتحان پاس کیا ہے اور اس سلسلے کی تمام اسناد اور سرٹیفکیٹ وغیرہ بھی میرے پاس ہیں۔ میں نے باقاعدہ پریکٹس کرنے کی کوشش بھی کی لیکن بری طرح ناکام رہا..... کچھ عرصے تک ایک نامور اور سینئر وکیل کے ساتھ بھی وزنی فائلیں اٹھائے اس کے دفتر سے عدالت اور عدالت سے دفتر کے چکر کاٹتا رہا۔ سوچا تھا، شاید اس طرح کامیابی کا کوئی راستہ نکل آئے مگر اس محاذ پر بھی مجھے ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آپ یقین نہیں کریں گے، میں اس بے روزگاری کے ہاتھوں کس قدر پریشان ہوں۔ اس پریشان دماغ اور بیمار سوچ کے ساتھ میں یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ شاید میں دنیا کا بدقسمت ترین شخص ہوں۔''

بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ میں نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہاں پر مجھے ناکامیابی، مایوسی اور دل شکستگی کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ بے روزگاری کا عفریت جس تیزی، سفاکی سے زندگی کے مختلف شعبوں اور کام کے مختلف پیشوں کو نگلتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا اس کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ میں ایسے کئی وکلا کو بھی ذاتی طور پر جانتا تھا کہ جو دن بھر عدالت کے برآمدے میں کسی مؤکل کی تلاش میں جوتیاں چٹخاتے رہتے ہیں مگر مؤکل ہے کہ ان کے قریب نہیں پھٹکتا۔ ان میں سے بعض تو باقاعدہ یہ صدا لگاتے ہوئے بھی سنے گئے ہیں..... ''بھائی صاحب! کوئی کیس کروانا ہے؟ بہت سستے میں کردوں گا۔'' مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایسے تمام ناکام لوگوں، چاہے وہ وکلا ہوں یا زندگی کے کسی دوسرے شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد..... ان کی نامرادیوں میں دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ غالب ہاتھ ان کی اپنی غلطیوں، کوتاہیوں اور خامیوں کا بھی ہوتا ہے۔

اس کی مدد کا خیال تو میرے دل میں پیدا ہو ہی چکا تھا، ایک قابلِ عمل آئیڈیا بھی فوراً ہی سوجھ گیا۔ میں نے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں اس سے کہا۔ ''تم فوری طور پر میرے لیے کام کرنا شروع کردو۔ اپنے دائیں بائیں نظر رکھو اور میرے لیے مختلف کیس پکڑتے رہو۔ میں تمہیں ہر کیس پر پانچ سو روپے دے سکتا ہوں۔ اس طرح اگر تم نے مہینے بھر میں چار پانچ کیس بھی میرے حوالے کردیے تو تمہارا روزگار چل نکلے گا۔ آگے اللہ مالک ہے۔''

میں نے غلام مرتضیٰ کو یہ پیشکش اس غرض سے نہیں کی تھی کہ خدانخواستہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے مکھیاں مارتا رہتا تھا۔ میرے پاس کیسز کی کبھی کمی نہیں رہی۔ میں محض اس کی مدد کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس زمانے میں پانچ سو روپے کی بڑی اہمیت تھی اور کسی بے روزگار شخص کے لیے تو یہ رقم کچھ زیادہ ہی اہمیت کی حامل تھی۔ غلام مرتضیٰ نے ایک لمحہ سوچنے میں ضایع نہیں کیا اور فوراً ہی میری اس پیشکش کو قبول کرلیا۔ میں نے اس کی تسلی کی خاطر مزید کہا۔

''اس دوران میں، میں اس بات کا خیال بھی رکھوں گا کہ اگر کوئی آسان کیس ہاتھ لگ جائے تو میں وہ تمہارے ہاتھ سے ڈیل کرواؤں۔ اس طرح تمہاری پریکٹس تو ہوگی ہی، اس کے ساتھ ہی تمہارے اعتماد میں اضافہ ہوگا اور..... ظاہر ہے، ڈائریکٹ کوئی کیس نکل کرنے پر آمدنی بھی بڑھے گی۔''

وہ فرطِ جذبات میں چند لمحات تک عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''بیگ صاحب! لگتا ہے، آپ انسان کے روپ میں کوئی فرشتہ ہوں۔''

''بس بس!'' میں نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر قدرے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''میں ایک گناہ گار، خطا کار انسان ہوں، مجھے انسان ہی رہنے دیں۔''

''یہی تو آپ کا بڑا پن ہے۔'' وہ بدستور عقیدت بھرے انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے.....'' میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی ہپ پاکٹ میں سے والٹ برآمد کرلیا پھر اس کے اندر سے پانچ سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر غلام مرتضیٰ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ رکھ لیں۔ پہلا کیس مجھ تک پہنچانے کی فیس۔''

میں نے ''کمیشن'' کو ''فیس'' کا نام دے کر اس کا مان بڑھا دیا تھا۔ وہ حیرت اور اُلجھن بھری نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''لل..... لیکن..... میں نے تو ابھی کوئی بھی کیس آپ کے حوالے نہیں کیا؟''

''جانتا ہوں۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں پہلے کیس کی فیس ایڈوانس میں دے رہا ہوں۔''

غلام مرتضیٰ نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد وہ نوٹ میرے ہاتھ سے لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ وہ اس وقت سخت ضرورت مند تھا۔

☆☆☆

دو روز کے بعد غلام مرتضیٰ میرے دفتر میں موجود تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بتانے لگا۔

''بیگ صاحب!'' وہ پہلے سے بھی زیادہ بے تکلفی سے مخاطب ہوا۔ ''آپ نے ایڈوانس میں رقم دے کر مجھے ایک بہت بڑی آزمایش میں ڈال دیا تھا لیکن اللہ کا شکر ہے کہ دو دن ہی میں، میں نے آپ کے لیے ایک کیس ڈھونڈ نکالا ہے۔''

میں نے اس کے عقب میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیس کہاں ہے؟''

''کیس کو میں اپنے ساتھ لے کر نہیں آیا۔'' وہ بے ساختہ بولا۔ ''سوچا، پہلے آپ سے بات کرلوں، پھر اسے بھی آپ سے ملوادوں گا۔''

''بہت اچھا کیا آپ نے۔'' میں نے سرسری سے انداز میں کہا۔

''بیگ صاحب! زاہدہ بہت ہی مظلوم لڑکی ہے۔'' وہ اپنی کوششوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کا سوتیلا باپ لیاقت اس پر بہت ستم ڈھاتا ہے حتیٰ کہ..... وہ اس پر بری نظر بھی رکھتا ہے۔ اگر زاہدہ کو جلد از جلد اس ماحول سے نکالنے کی کوشش نہیں کی گئی تو کوئی بہت بڑا..... شرمناک واقعہ بھی پیش آسکتا ہے۔ اس کے علاوہ زاہدہ کی ماں خدیجہ سے بھی اس کا رویہ بہت ظالمانہ ہے۔''

''ٹھیک ہے، آپ کی بات اور جذبات میری سمجھ میں آگئے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ ایک ہمدرد اور پُرخلوص دل رکھتے ہیں لیکن یہ بات میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس صورت حال میں، میں کیا کرسکتا ہوں؟''

وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر لاپروا سے انداز میں بولا۔ ''مجھے یہ تو پتا نہیں، آپ کس طرح ان ماں بیٹی کی مدد کرسکتے ہیں لیکن اتنی بات میں جانتا ہوں کہ آپ اگر قانون کا سہارا لیں تو ان کے لیے بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔''

''دیکھو غلام مرتضیٰ!'' میں بے ساختہ اس کے لیے ''آپ'' سے ''تم'' کے صیغے پر آگیا تھا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ جب تک زاہدہ یا اس کی ماں خدیجہ اپنے ساتھ ہونے والی ظلم و زیادتی کی شکایت لے کر گھر سے نہ نکلیں، ان کے لیے کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا اور یہ کہ..... انہیں یہ شکایت لے کر اپنے علاقے کے تھانے میں پہنچنا چاہیے یا پھر وہاں کی مصالحتی کونسل وغیرہ کے پاس جانا چاہیے۔ مجھے اُمید ہے، علاقے کا کونسلر ان کا مسئلہ حل کردے گا یا پھر تھانہ انچارج اس معاملے میں کوئی قانونی کارروائی ڈال سکتا ہے۔ یہ سیدھا سیدھا پولیس کیس ہے۔ اس میں فی الحال کسی وکیل کے لیے کارکردگی دکھانے کی کوئی گنجایش نہیں نکلتی۔''

اس کا منہ لٹک گیا اور وہ خاصا مایوس دکھائی دینے لگا۔ اس کے چہرے کے مرجھائے ہوئے تاثرات کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال اُبھرا کہ غلام مرتضیٰ کو زاہدہ اور اس کے گھر کے معاملے کی اتنی زیادہ فکر کیوں ہے۔ کیا یہ محض جذبۂ ہمدردی ہے یا پھر کوئی اور سلسلہ ہے؟

اسی بات کی تصدیق کے لیے میں نے اس سے سوال کیا۔ ''غلام مرتضیٰ! کیا ان لوگوں سے تمہاری کوئی رشتے داری ہے؟''

''رشتے داری تو نہیں.....'' وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''بس محلے داری ہے۔''

''کوئی اور قریبی تعلق؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے تھوڑے تامل کے بعد نفی میں گردن ہلادی۔

میں نے کہا۔ ''بس تو پھر زاہدہ اور اس کی ماں کے لیے جو کچھ کیا جاسکتا ہے اس کی تفصیل میں نے تمہیں بتادی ہے۔ تم اپنے طور پر انہیں گائیڈ کرسکتے ہو۔''

وہ کمزور سی آواز میں بولا۔ ''ٹھیک ہے جناب! میں کوشش کرکے دیکھتا ہوں.....''

اس نے کوشش کا وعدہ کیا اور مجھے سلام کرکے دفتر سے رخصت ہوگیا۔

میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ کوشش کے سلسلے میں اس نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا یا نہیں البتہ، ٹھیک چار روز کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور اس بار وہ اکیلا نہیں آیا تھا۔

وہ اپنے ساتھ درمیانے قد کے ایک سانولے سے شخص

ماں نے دوسرے کمرے میں آواز دے کر بیٹے سے پوچھا ''بیٹا! تمہارا چھوٹا بھائی کیوں رو رہا ہے؟''

''ممی! میں اپنے بسکٹ کھا رہا ہوں اور اسے نہیں دے رہا..... اس لیے رو رہا ہے۔'' بیٹے نے جواب دیا۔

''تو اس کے پاس اپنے بسکٹ نہیں ہیں کیا؟ میں نے اسے بھی تو دیے تھے۔'' ماں نے کہا۔

''ممی! جب میں وہ کھا رہا تھا یہ تب بھی رو رہا تھا۔'' بڑے بیٹے نے شکوہ بھرے انداز میں کہا۔

کو بھی لے کر آیا تھا۔ مذکورہ شخص کی عمر تیس کے قریب رہی ہوگی۔ اس وقت ان دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ سخت پریشان دکھائی دیتے تھے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ اُدھر گولیمار میں کوئی بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے غلام مرتضیٰ سے استفسار کیا۔ ''خیریت تو ہے۔ تمہارا رنگ کیوں اُڑا ہوا ہے؟''

''خیریت کہاں ہے بیگ صاحب!'' وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''پولیس نے معاملہ ہی اُلٹا دیا ہے۔''

میں یہی سمجھا کہ وہ زاہدہ کے سوتیلے باپ کی شکایت لے کر اپنے علاقے کے تھانے میں تھانہ انچارج سے ملنے پہنچے ہوں گے اور اس نے اُلٹا انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر واپس بھیج دیا ہوگا۔ اسی سوچ کے پیشِ نظر میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''لگتا ہے، پولیس والوں نے رپورٹ درج نہیں کی؟''

''ایسی بات نہیں ہے جناب!'' غلام مرتضیٰ نے بدستور اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔ ''ایک دن رپورٹ درج کی۔ میں توقع کر رہا تھا کہ اگلے دن وہ لوگ زاہدہ کے سوتیلے باپ کو تھانے بلا کر سمجھائیں بجھائیں گے لیکن ایسا کچھ نہ ہوا بلکہ ایک دن کے وقفے سے پولیس نے زاہدہ کو گرفتار کر کے حوالات میں ڈال دیا ہے۔''

''کیا؟'' میں اُچھل پڑا۔ ''یہ تو تم بڑی ہی عجیب کہانی سنا رہے ہو غلام مرتضیٰ۔''

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں بیگ صاحب۔''

میری حیرت اُلجھن میں بدل گئی۔ میں نے پوچھا۔ ''پولیس نے زاہدہ کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟''

''ٹھہریں جناب! میں بتاتا ہوں۔'' غلام مرتضیٰ کے بجائے اس کے ہم راہی سانولے شخص نے کہا۔ ''مرتضیٰ بھائی تو پریشانی میں حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ حالات کو صحیح طرح سے آپ کے سامنے پیش نہیں کر پا رہے۔''

وہ شخص جو کچھ بھی کہہ رہا تھا، میں اس سے صد فیصد اتفاق کرتا تھا۔ پریشانی میں کیا، میں نے خود دیکھا تھا کہ غلام مرتضیٰ بغیر پریشانی کے بھی معقول انداز میں اپنا مطمعِ نظر پیش کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص مزید کچھ کہتا، میں نے اس سے کہا۔

''آپ کی تعریف..... آپ نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کرایا؟''

''میرا نام پرویز ہے وکیل صاحب!'' اس شخص نے جواب دیا۔ ''میں بھی گولیمار ہی میں رہتا ہوں۔ اُدھر میری ہارڈ ویئر اور سینیٹری فٹنگ کی ایک چھوٹی سی دکان ہے۔'' یہاں تک بتانے کے بعد وہ لمحے بھر کے لیے خاموش ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''مرتضیٰ بھائی نہایت ہی نیک اور مخلص انسان ہیں۔ لیاقت کے گھر میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کی وجہ سے ہم اور دیگر محلے دار سخت کوفت میں تھے۔ مرتضیٰ نے آپ سے مشورہ کیا اور اسی مشورے کی روشنی میں ہم تین چار افراد مل کر تھانے پہنچے اور تھانے دار کو سارا قصہ کہہ سنایا۔ اس نے پوری توجہ سے ہماری بات سنی اور آخر میں سوال کیا، ہم میں سے مدعی کون ہے؟ ظاہر ہے، ہم میں سے کوئی بھی مدعی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا لہٰذا ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ تھانے دار نے بڑے واضح الفاظ میں کہہ دیا، میں محلے داروں کی شکایت پر اس وقت تک کوئی قانونی کارروائی نہیں کر سکتا جب تک زاہدہ یا اس کی ماں خدیجہ میں سے کوئی یہاں آ کر لیاقت کے خلاف رپورٹ درج نہ کرائے یا کم از کم ان میں سے کوئی ایک محلے داروں کے ساتھ ضرور موجود ہو۔''

وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس لی اور سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔ ''ہم ابھی یہی سوچ رہے تھے کہ اس معاملے کو کس طرح ہینڈل کریں کہ گزشتہ رات پولیس نے زاہدہ کو گرفتار کر کے تھانے میں بند کر دیا ہے۔''

''یہاں تک تو ٹھیک ہے۔'' میں نے پرویز کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''لیکن ابھی تک مجھے میرے سوال کا جواب نہیں ملا۔ پولیس نے زاہدہ کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟''

''اس پر قتل کا الزام ہے۔'' پرویز نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے پوچھا۔ ''زاہدہ نے کس کو قتل کیا ہے؟''

''اس نے کسی کو قتل نہیں کیا وکیل صاحب!'' پرویز قدرے احتجاجی انداز میں بولا۔ ''پولیس اس پر جھوٹا الزام لگا رہی ہے۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''الزام جھوٹا ہے یا واقعی زاہدہ نے کسی کو قتل کیا ہے، اس بات کا فیصلہ تو عدالت کرے گی۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں، زاہدہ کو کس شخص کے قتل کے الزام میں پولیس نے گرفتار کیا ہے؟''

''لیاقت حسین کے قتل کے الزام میں۔'' پرویز نے بتایا۔

''کیا؟'' میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ''تم زاہدہ کے سوتیلے باپ لیاقت حسین کی بات کر رہے ہو نا؟''

''جی جی..... جی ہاں.....!'' وہ دونوں بیک وقت بول اٹھے۔

یہ واقعی ایک سنسنی خیز اور حیرت انگیز اطلاع تھی۔ میں اپنی کرسی میں بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا پھر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ان دو افراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیاقت حسین قتل ہوگیا۔ زاہدہ اپنے سوتیلے باپ کے قتل کے الزام میں حوالات میں بند ہے۔ آپ دونوں کا ان دونوں سے کوئی سنجیدہ رشتہ ناتا نہیں ہے۔ بتائیں، پھر اس سلسلے میں، میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

''آپ ہمارے لیے کچھ نہ کریں جناب!'' مرتضیٰ نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ زاہدہ کا کیس لڑیں۔ وہ مظلوم اور بے گناہ ہے۔ آپ اسے باعزت بری کروادیں گے تو یہ ایک بہت بڑی نیکی ہوگی۔''

پرویز نے کہا۔ ''مرتضیٰ بھائی نے مجھے بتایا ہے کہ آپ بہت اُونچے وکیل ہیں۔ اسی حساب سے آپ کی فیس بھی بہت ہائی ہے لیکن آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی فیس اور دیگر عدالتی اخراجات میں برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ بس آپ یہ کیس اپنے ہاتھ میں لینے کی ہامی بھرلیں۔''

میں نے انہیں کسی خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے بجائے واضح اور دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''میں کسی بھی شخص کا کیس لیتے ہوئے چند باتوں کی تسلی ضرور کرتا ہوں۔ جہاں تک فیس کی ادائی کا تعلق ہے تو وہ تو میرے حرکت میں آنے کا نقطۂ آغاز ہے۔''

میری بات فوراً پرویز سینیٹری اینڈ ہارڈ ویئر والے کی سمجھ میں جا بیٹھی۔ وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''جناب! میں گھر سے خالی ہاتھ نہیں نکلا ہوں۔ آپ پہلے تو اپنی فیس وصول کریں، باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔'' جملہ مکمل کرتے ہی اس نے اپنی جیب سے چرمی بٹوا نکالا اور اسے کھولتے ہوئے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''بتائیں جناب! آپ کی فیس کتنی ہے؟''

میں نے اسے اپنی فیس کے بارے میں بتادیا اور اس کے ساتھ ہی کہا۔ ''فی الحال تم یہ بٹوا اپنی جیب میں رکھ لو۔ میں چند باتیں تم پر واضح کردوں پھر فیس بھی وصول کرلوں گا۔''

اس نے چرمی والٹ کو اپنی جیب میں منتقل کیا اور... سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے سمجھانے لگا۔ ''اول، تو میں پہلی فرصت میں ملزمہ زاہدہ سے ایک تفصیلی ملاقات کرنا چاہوں گا تاکہ یہ اندازہ لگاسکوں کہ اس کیس کی نوعیت کیا ہے۔ دوم، میں اس وقت تک یہ کیس اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا جب تک ملزمہ کی ماں یا اور کوئی قریبی رشتے دار اس کیس کی پشت پناہی کے لیے موجود نہ ہو۔''

میں نے سانس لینے کے لیے تھوڑا توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''.....اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ آپ زاہدہ کی ماں خدیجہ کو لے کر میرے پاس آجائیں۔ پھر بات کرتے ہیں۔ انشاءاللہ! اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔''

''ہم ابھی اسے لے کر آپ کے پاس آتے ہیں۔'' انہوں نے بڑے عزم سے بیک زبان ہوکر کہا۔

میں نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا پھر کہا۔ ''اتنی تیز رفتاری دکھانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ تم لوگوں کے آنے جانے میں اچھا خاصا وقت لگے گا اور اس دوران میں، میں اپنا دفتر بند کرکے گھر جاچکا ہوں گا اور پھر یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ جاتے ہی خدیجہ تم لوگوں کو مل بھی جائے..... اور تمہارے ساتھ یہاں آنے کے لیے تیار بھی ہوجائے اس لیے تم لوگ اس کام کو کل کے لیے بچا کر رکھو۔ ویسے بھی فوری طور پر کسی قانونی کارروائی کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

انہوں نے بیک وقت اثبات میں گردنیں ہلا کر اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ میری باتوں کے مقصد تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں میرے دفتر سے رُخصت ہوگئے۔

☆☆☆

میں ''یک نہ شد، دو شد'' ایسی صورتِ حال سے دوچار تھا۔ غلام مرتضیٰ ہی کچھ کم نہیں تھا کہ وہ اپنے ساتھ پرویز کو بھی نتھی کرلایا تھا۔ دونوں اپنے خیالات اور انداز میں ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ میں ابھی تک یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ آخر وہ خدیجہ کے گھر کے معاملات میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہے تھے۔

ان کے جانے کے بعد اور رات کو گھر آکر بھی میں زیادہ تر انہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ غلام مرتضیٰ کو جہاں تک میں سمجھ پایا تھا وہ ایک دلبرداشتہ، مایوس اور ناکام شخص تھا اور اس کا سب سے بڑا سبب اس کی بے وقوفی اور احمقانہ طرزِ عمل تھا۔ اسے زندگی کو برتنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا اور اپنی تمام تر ناکامیوں کا ذمے دار وہ قسمت اور مقدر کو ٹھہراتا تھا جو کہ کسی بھی طور درست نہیں تھا۔

ویسے غلام مرتضیٰ میں، میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی اور وہ یہ کہ اس کے دل و دماغ میں انسانی ہمدردی البتہ ضرور موجود تھی۔ اس کے اسی وصف کی بنا پر میں نے اسے اپنے ساتھ منتھی کرنے کے بارے میں فیصلہ کیا تھا۔ چلو، وہ جیسا بھی لولا لنگڑا چلتا رہے گا، اپنے لیے روزی روٹی تو کما ہی لے گا مگر پرویز کا معاملہ مجھے خاصا ٹیڑھا نظر آ رہا تھا۔

اس کی انسانی ہمدردی کسی اور ہی سمت میں کئی ہاتھ آگے بڑھی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ وہ ہارڈ ویئر اور سینیٹری کی دکان چلاتا تھا مگر خدیجہ وغیرہ سے اس کی کوئی رشتے داری نہیں تھی۔ اس کے باوجود بھی وہ اپنی جیب سے زاہدہ کا کیس لڑنے کا عزم رکھتا تھا۔ میں نے ان دونوں سے یہ تو معلوم کر لیا تھا کہ وقوعہ والے گھر میں صرف تین افراد رہتے تھے۔

نمبر ایک، لیاقت حسین..... جسے قتل کر دیا گیا تھا۔ نمبر دو، زاہدہ..... جو لیاقت حسین کے قتل کے الزام میں اس وقت تھانے کی حوالات میں بند تھی۔ نمبر تین، خدیجہ..... جس پر اچانک ہی دو طرفہ اُفتاد آن پڑی تھی۔

اس واضح صورتِ حال میں اگر پرویز کی یہ خواہش تھی کہ میں زاہدہ کا کیس لڑ کر اسے بے گناہ ثابت کر کے، باعزت بری کروالوں تو اس کا مطلب تھا، اس کی تمام تر دلچسپی زاہدہ کی ذات سے جڑی ہوئی ہے وگرنہ اگر صرف انسانی ہمدردی کی بات ہوتی تو وہ یہی کام خدیجہ کے توسط سے کرتا اور ایسا جذباتی بھی دکھائی نہ دیتا جیسا نظر آ رہا تھا۔ میرے دماغ کی سوئی اسی مقام پر اٹک کر رہ گئی کہ پرویز کا زاہدہ کے ساتھ کوئی نہ کوئی سنجیدہ تعلق ضرور ہے جبھی وہ اسے بے گناہ سمجھتے ہوئے اس کی آزادی کا خواہاں ہے اور..... اس خواہش کی تکمیل کے لیے اس کی بے قراری ساتویں آسمان کو چھو رہی ہے۔

میں نے اپنے طور پر جو بھی نتیجہ اخذ کیا تھا اس کی بنیاد حقیقت پسندی اور منطق تھی۔ میرا دماغ مجھے کسی اور زاویے میں سوچنے کی اجازت ہی نہیں دے رہا تھا۔ بہرحال، اگر وہ اگلے روز خدیجہ کو اپنے ساتھ میرے دفتر تک لانے میں کامیاب ہو جاتا تو اس معاملے میں مزید روشنی پڑ سکتی تھی۔ خدیجہ کے انٹرویو سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی کہ پرویز اور اس کی ہمدردی کی حقیقت کیا تھی۔

میں اپنے خیال میں یہی توقع کر رہا تھا کہ خدیجہ ان دونوں کے ساتھ میرے پاس نہیں آئے گی لیکن اگلے روز جب وہ تینوں سہ پہر کے بعد میرے چیمبر میں داخل ہوئے تو مجھے حیران ضرور ہونا پڑا۔ اس حیرانی میں خدیجہ کی آمد سے زیادہ اس کے حلیے کا ہاتھ تھا۔ اس کی نک سک کو دیکھ کر کوئی بھی شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اسے بیوہ ہوئے ابھی صرف دو ہی دن ہوئے ہیں۔

وہ پوری تیاری کے ساتھ مجھ سے ملنے آئی تھی جیسے کسی ڈاکٹر کے کلینک میں یا پھر شاپنگ کے لیے گھر سے نکلی ہو۔ اس کے اس غیر معمولی رویے نے مجھے بڑی شدت سے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ان تینوں کے سلام کا مشترکہ جواب دیا پھر جب انہوں نے نشستیں سنبھال لیں تو میں بغور خدیجہ کا جائزہ لینے لگا۔

اس کے بارے میں میرے اکثر اندازے غلط ثابت ہوئے۔ میں نے اس کی عمر کے بارے میں یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ انتیس تیس سے زیادہ کی نہیں ہوگی اور اس بات پر مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کیونکہ دونوں ہمدردوں کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا، زاہدہ کی عمر اٹھارہ انیس سال کے قریب ہے۔ اس حساب سے زاہدہ کی ماں کی عمر... اٹھائیس انتیس سال کسی بھی صورت نہیں ہو سکتی تھی لیکن جب ازاں بعد مجھے پتا چلا کہ خدیجہ اپنی زندگی کی چالیس بہاریں دیکھ چکی ہے تو میری حیرت لمحے بھر میں زائل ہو گئی تھی۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جسے دیکھ کر اس کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی اصل عمر سے کم از کم دس سال چھوٹی نظر آتی تھی۔

ازیں علاوہ اس کی صحت بھی ایسی تھی کہ ڈھلتی ہوئی عمر کو چھپانے میں بڑی معاون ثابت ہو رہی تھی پھر اس پر قدرت کی مہربانی سے حسن اور جوانی نے بھی کسی کنجوسی اور بخل سے کام نہیں لیا تھا پھر اس کی تیاری کے انداز نے اس کیفیاتی تاثر کو فائنل ٹچ لگا کر اسے ایک یادگار شخصیت بنا دیا تھا۔

یہ ساری خوبیاں اور کمال تو رہے ایک طرف، مجھے جس بات سے حیرت کا جھٹکا لگا تھا وہ یہ تھی کہ اس موقع پر تو اسے ''خیال'' رکھنا چاہیے جو اس نے ''بالکل'' نہیں رکھا تھا۔ اس کا یہ طرزِ عمل غیر فطری اور ناشائستہ تھا جو موقع محل اور حالات کی سنگینی سے میل نہیں کھاتا تھا۔

خدیجہ کے بارے میں تفصیل سے بتانے کا مقصد صرف اتنا سا ہے کہ آپ اس کی شخصیت سے بڑے بھرپور انداز میں متعارف ہو جائیں تاکہ بعد میں کسی خلافِ معمول بات پر آپ کا ذہن کسی اُلجھن کا شکار نہ ہو۔

ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو خدیجہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وکیل صاحب! ان دونوں نے آپ کی بہت تعریف کی ہے۔ میں تو اپنی بچی کے لیے ایک وکیل سے بات کرنے آئی تھی لیکن پرویز اور مرتضیٰ کی باتوں نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ آپ سے ملنے چلی آئی ہوں۔''

پھر وہ ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے رسمی سے لہجے میں بولی۔

''آپ دونوں کا بہت بہت شکریہ!''

الفاظ کے اعتبار سے اس نے پرویز اور مرتضیٰ کا شکریہ ادا کیا تھا لیکن انداز ایسا تھا جیسے وہ ان سے کہہ رہی ہو، میں اپنی منزل پر پہنچ گئی ہوں۔ آپ چاہیں تو مجھے یہاں چھوڑ کر واپس اپنے اپنے گھروں کو جاسکتے ہیں۔ ازاں بعد یہ بات سولہ آنے درست ثابت ہوئی۔

میں پوری طرح خدیجہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! کیا یہ ممکن ہے کہ میں تنہائی میں آپ سے بات کرسکوں؟''

جملہ مکمل کرنے کے بعد اس نے یکے بعد دیگرے غلام مرتضیٰ اور پرویز کی طرف دیکھا اور سوالیہ انداز میں مجھے تکنے لگی۔ میں فوراً سے پیشتر اس کی بات کی تہ میں اتر گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ایک لمحہ نہ لگا کہ وہ ان دونوں کی غیر موجودی میں مجھ سے گفتگو کرنا چاہتی تھی۔ یہ بات تو میں نے اس کے رویے ہی سے جھلکتی محسوس کرلی تھی۔ بہرحال، اس نے اتمامِ حجت میں بھی کسی تامل یا تاخیر سے کام نہیں لیا تھا۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ''کیوں نہیں، یہ تو آپ کا حق ہے خدیجہ بیگم۔''

پھر میں نے پرویز اور مرتضیٰ کی جانب دیکھتے ہوئے قدرے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''آپ دونوں باہر جاکر انتظار گاہ میں بیٹھیں۔ کسی مرحلے پر آپ کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں آپ کو بلوالوں گا۔''

انہوں نے ایک لمحے کے لیے حیرت اور مایوسی کے ملے جلے تاثرات سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر وہ کرسیوں سے اٹھے اور زبان سے ایک لفظ ادا کیے بغیر میرے چیمبر سے نکل گئے۔ ان کے رخصت ہوتے ہی خدیجہ بیگم نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔

''وکیل صاحب! بڑی مہربانی..... آپ نے میری ایک پریشانی کو تو ٹالا۔''

اس کا اشارہ پرویز اور مرتضیٰ کی سمت تھا اور لہجے سے بے حد بیزاری بھی ٹپکتی تھی، تاہم میں نے احتیاطاً تصدیقی انداز میں پوچھ لیا۔ ''آپ نے ان دونوں کو پریشانی کہا ہے نا؟''

''یہ دونوں کسی مصیبت سے کم نہیں ہیں۔'' وہ اُکتاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ''میں نے تو صرف پریشانی کہہ کر گزارہ چلالیا ہے۔''

خدیجہ کے رویے نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''میں نے ان دونوں کو آپ کے معاملات میں خاصا سنجیدہ اور پُرخلوص پایا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے آپ شکریہ ادا کرنے والے انداز میں ان کی تعریف بھی کرچکی ہیں پھر.....؟''

میں نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جھٹ سے بولی۔ ''ان کے خلوص، ہمدردی اور سنجیدگی کا سبب کچھ اور ہے.....!''

''ہاں ہاں، بتائیں..... کیا سبب ہے؟'' میں نے دھیمے لہجے میں استفسار کیا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے، اس موضوع پر ہم بعد میں بھی بات کرسکتے ہیں۔ زاہدہ کا معاملہ فی الحال زیادہ اہم ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' میں نے ہاں میں ہاں ملانے پر اکتفا کیا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''وکیل صاحب! لیاقت جیسا تیسا بھی تھا بہرحال، وہ میرا شوہر تھا۔ اس کی موت کا مجھے افسوس ہے لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں، زاہدہ اتنا بڑا قدم نہیں اٹھاسکتی۔ آپ کسی بھی طرح میری بچی کو بچالیں۔''

''آپ نے جب شروع میں یہ کہا تھا کہ..... میں تو اپنی بچی کے لیے ایک وکیل سے بات کرآئی تھی..... تو میں نے اسی وقت یہ اندازہ ..... کرلیا تھا کہ آپ اپنی بیٹی زاہدہ کو بے گناہ سمجھتی ہیں۔ آپ کے خیال میں زاہدہ نے لیاقت کو قتل نہیں کیا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ لیاقت کا قتل ہوا ہے.....'' میں سانس لینے کے لیے لمحے بھر کو رکا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لیاقت آپ کا شوہر تھا۔ آپ نے اس کے لیے ''جیسا تیسا'' جیسے الفاظ استعمال کرکے یہ ظاہر کردیا ہے کہ آپ کی اس کے ساتھ زندگی اچھی نہیں گزر رہی تھی۔ پرویز اور مرتضیٰ کی زبانی مجھ تک جو خبریں پہنچی ہیں ان کی روشنی میں مقتول بہت ظالم اور سفاک شخص تھا۔ وہ آپ کو زدوکوب کرتا تھا اور زاہدہ کے ساتھ بھی اس کا رویہ مناسب نہیں تھا۔ اسی بنا پر زاہدہ مقتول سے شدید نفرت کرتی تھی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

جواب دینے سے پہلے اس نے متذبذب نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''آپ غلط نہیں کہہ رہے وکیل صاحب!''

''ان حالات کے دوران میں لیاقت کا قتل ہوجاتا

ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور پولیس زاہدہ کو اپنے سوتیلے باپ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے تھانے میں بند کر دیتی ہے۔ آپ کی نظر میں زاہدہ اس معاملے میں بے قصور ہے۔ پھر پولیس نے کس بنیاد پر اسے ایک قاتل کی حیثیت سے گرفتار کیا ہے؟ یہ سارا معاملہ اس قدر اُلجھا ہوا ہے کہ کوئی بھی شے اپنی جگہ پر ٹھہری ہوئی دکھائی نہیں دیتی..... خاص طور پر پرویز اور مرتضیٰ کے کردار عجیب سا تاثر پیش کرتے ہیں۔ جب تک آپ مجھے اس کیس کے پس منظر سے آگاہ نہیں کریں گی اور میں حالات کو سمجھ نہیں پاؤں گا، اس وقت تک میں آپ کی بھرپور مدد نہیں کر سکوں گا۔''

وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی جیسے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو کہ میں قابلِ بھروسا وکیل ہوں یا نہیں پھر کسی فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور تھکے ہوئے انداز میں بولی۔

''اس کا مطلب ہے، یہ کہانی مجھے شروع سے سنانا ہوگی۔''

''بالکل! جب ہی صورتِ حال واضح ہو سکے گی۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''اور اس کہانی میں پرویز اور مرتضیٰ کے کرداروں کا بھی ذکر ہونا ضروری ہے۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی، چند لمحے خاموش رہ کر بکھرے ہوئے خیالات کو ایک جگہ مجتمع کیا اور ٹھہرے ہوئے انداز میں اپنی زندگی کی کہانی سنانے لگی۔

آگے بڑھنے سے قبل میں ان حالات و واقعات کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ عدالتی کارروائی کے دوران میں کسی ذہنی اُلجھن کا شکار نہ ہوں۔ ان میں بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں مگر ربط و ضبط کے تقاضے نبھاتے ہوئے میں انہیں ایک ترتیب سے پیش کر رہا ہوں۔ اسی طرح خدیجہ کے بیان کی بہت سی غیر ضروری باتوں کو میں نے حذف کر دیا ہے۔

☆☆☆

ملزمہ زاہدہ کا باپ ایک ٹیکسٹائل مل میں کام کرتا تھا۔ مذکورہ ٹیکسٹائل مل کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں ہوگا کیونکہ اس مل کے ساتھ ایک انتہائی افسوس ناک واقعہ بھی منسلک ہے۔ اگر نام لے کر اس مل کا ذکر ہوگا تو پھر اس واقعے کو زیرِ بحث لانا ضروری ہو جائے گا اور موجودہ کیس سے اس کا کوئی تعلق نہیں نکلتا لہٰذا ہم یہیں تک رہتے ہیں کہ..... زاہدہ کا باپ مظفر علی ایک ٹیکسٹائل مل میں کام کرتا تھا.....!

مظفر اور خدیجہ میں کبھی بنی نہیں تھی۔ صبح و شام چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کے درمیان لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا۔ زاہدہ ان کی اکلوتی اولاد تھی اور والدین کے تنازع سے اسے بے حد ذہنی کوفت ہوتی تھی۔ وہ جب تنہائی میں بیٹھ کر ان رویوں پر غور کرتی تو کسی حتمی فیصلے پر نہیں پہنچ پاتی تھی۔ کبھی تو وہ دونوں ہی اسے غلط نظر آتے اور کبھی دونوں درست دکھائی دیتے۔ جن معمولی باتوں پر خدیجہ اور مظفر کے درمیان ''جنگ'' کا آغاز ہوتا ان میں سرِفہرست ''کم آمدنی اور زیادہ خرچ'' تھا۔ ہمارے ملک کے نوے فیصد گھروں کا یہ مشترکہ مسئلہ ہے۔ صرف دس فیصد گھر ایسے ہوں گے جہاں آمدنی خرچے کی راہ میں رکاوٹ نہ بنتی ہو۔

مظفر علی مذکورہ ٹیکسٹائل مل میں ایک مشین آپریٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا لہٰذا اس کی آمدنی بھی محدود تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی آمدنی میں اس تناسب سے اضافہ نہ ہو سکا جس تناسب سے مہنگائی بڑھی تھی اسی لیے مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ خدیجہ کا رونا اپنی جگہ درست تھا لیکن مظفر بھی اس معاملے میں بے قصور نظر آتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، وہ معاشی عفریت کو پچھاڑنے کے لیے کون سا داؤ آزمائے۔ ایک روز یہی سوال اس نے خدیجہ سے بھی کیا۔

وہ آدھے گھنٹے سے اسی مسئلے پر چونچیں لڑا رہے تھے کہ مظفر نے جھلا کر اس سے پوچھ لیا۔ ''تم ہی بتاؤ..... میں کیا کروں؟''

''میں کیا بتاؤں۔'' وہ بے نیازی سے بولی۔ ''کرنا تمہیں ہے اس لیے سوچنا بھی تمہی کو چاہیے۔ میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ گھر میں خوشحالی آنا چاہیے۔ میں روز روز کے ان مسائل سے تنگ آ گئی ہوں۔''

''مجھ سے جو ہو سکتا ہے وہ تو کر رہا ہوں۔'' وہ برہمی سے بولا۔ ''تم جیسی ناشکری عورت میں نے کوئی اور نہیں دیکھی۔''

''میں نے کیا ناشکرا پن کیا ہے؟'' خدیجہ نے حیرت بھری نظر سے اسے دیکھا۔

مظفر نے کہا۔ ''میری حیثیت کے اور کتنے لوگ ہیں جن کے پاس اپنے ذاتی گھر ہوں۔''

مظفر نے اسی ٹیکسٹائل مل کی آمدنی میں سے جیسے تیسے بچت کر کے اپنا گھر بنا لیا تھا۔ اس کے نزدیک یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا..... اور اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش بھی نہیں نظر آتی تھی۔ اپنا ذاتی گھر چاہے ایک چھوٹی سی کٹیا ہی کیوں نہ ہو، اس کی اہمیت، افادیت اور سکون و راحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس بات کا احساس صرف انہی لوگوں کو

ہے جو اپنے گھر سے محروم کرایے کے گھروں میں زندگی بسر کررہے ہیں۔

خدیجہ، مظفر کی بات کی تہ میں اتر گئی۔ طنز بھری نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو..... کیا یہی کہ جن کے پاس اپنا گھر ہو، پھر ان کی اور کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ بس وہ دن رات بیٹھے اس گھر کی دیواروں اور کھڑکیوں، دروازوں کو چاٹتے رہتے ہیں۔ انہیں بھوک لگتی ہے، نہ پیاس اور نہ ہی ان کی اور کوئی ضرورت باقی رہتی ہے؟''

خدیجہ کے زہر میں بجھے ہوئے ان الفاظ نے مظفر کے جگر کو چھید ڈالا۔ وہ خدیجہ کے چھوٹے موٹے تلخ و ترش رویوں کو سہنے کا عادی تھا لیکن ایسا دل پاش انداز اس نے پہلے کبھی اختیار نہیں کیا تھا۔ اس نے جھگڑے کو ہوا دینے کے بجائے صرف اتنا کہا۔

''میرے کہنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔''

''پھر کیا مطلب تھا تمہارا؟'' خدیجہ نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

وہ متحمل لہجے میں بولا۔ ''میں جو کہنا چاہ رہا ہوں، تم بخوبی سمجھتی ہو۔ میں اس وقت بھی اپنی ہمت سے زیادہ محنت کررہا ہوں۔''

''تمہاری ہمت اور محنت پر مجھے کوئی شک نہیں ہے۔'' خدیجہ نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمہاری سمت درست نہیں اسی لیے ساری مشکلات پیدا ہورہی ہیں۔''

''ساری زندگی جس سمت میں کام کیا ہے، تمہاری نظر میں وہ درست نہیں۔'' مظفر نے افسوس ناک انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں لگی بندھی مل کی نوکری چھوڑ کر تمہاری خوشی کی خاطر کسی بینک میں ڈاکا ڈال بیٹھوں۔''

''اب تم اتنے بھی ہمت والے نہیں ہو۔'' وہ اُکسانے والے انداز میں بولی۔ ''ایسے کاموں کے لیے شیر کا دل گردہ درکار ہوتا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں ایسا کرتا ہوں کہ ٹیکسٹائل مل کی ملازمت کو خیرباد کہہ کر جنگل کی طرف نکل جاتا ہوں۔''

''جنگل کی طرف؟'' خدیجہ نے منہ ٹیڑھا کرکے عجیب سے انداز میں دُہرایا۔ ''کراچی جیسے بھرے پرے شہر میں تمہیں جنگل کہاں سے ملے گا.....'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی پھر چونکنے والے انداز میں بولی۔ ''کہیں تم انسانوں کے جنگل کی بات تو نہیں کررہے؟''

''انسانوں کے جنگل میں تو ہم اس وقت رہ رہے ہیں۔'' مظفر نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں انسانوں کے نہیں، جانوروں کے جنگل کی بات کررہا ہوں۔''

''اوہ..... تم اس جنگل کی طرف کیوں جانا چاہتے ہو؟'' خدیجہ نے پوچھا۔

''شیر کے شکار کے لیے۔'' مظفر بدستور سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''شیر کا شکار!'' خدیجہ لڑائی جھگڑے کو بھول کر شوہر کی باتوں میں اُلجھ گئی۔ ''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا؟''

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تک تو دماغ اپنے ٹھکانے پر ہے لیکن بعد کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔''

''پتا نہیں، تم کس قسم کی فضول باتیں کررہے ہو؟''

''میں تو تمہاری خواہش پوری کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔''

خدیجہ اُلجھن بھری نظر سے اسے تکنے لگی۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو اللہ کی بندی! تمہیں بہت ساری دولت چاہیے نا! ایک ساتھ اتنی زیادہ دولت بینک ڈکیتی ہی سے حاصل کی جاسکتی ہے لیکن تم نے یہ شرط لگادی ہے کہ ایسے کاموں کے لیے شیر کا دل گردہ درکار ہوتا ہے تو میں نے سوچا.....''

وہ بڑے معنی خیز انداز میں لمحے بھر کو متوقف ہوا تو خدیجہ تنبیہی نظر سے اسے گھورنے لگی۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ مظفر اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کررہا ہے۔ قبل اس کے کہ وہ جواب میں کوئی سخت جملہ کہتی، مظفر نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''..... میں نے سوچا سیدھا جنگل جاتا ہوں۔ شیر کا شکار کرتا ہوں۔ اسے مارگرانے کے بعد اس کا دل گردہ نکالتا ہوں اور ڈکیتی کی نیت سے کسی بھی بینک میں گھس جاتا ہوں۔ ایسے کاموں کے لیے چونکہ شیر کے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا وہ لوگ شیر کا دل گردہ دیکھتے ہی وہاں موجود ساری رقم ایک تھیلے میں ڈال کر میرے حوالے کردیں گے۔ اللہ اللہ، خیر سلا!''

اس خوبصورت اور شائستہ مذاق پر خدیجہ بے اختیار ہنسنے لگی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''مظفر! ایسے پُرمزاح لطیفوں سے ہمارے مسائل حل نہیں ہوں گے..... کچھ

سوچو..... کچھ کرو.....!''

''خدیجہ!'' وہ خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔ ''مجھے تنگ نہ کیا کرو۔ ہم اس وقت بھی ہزاروں سے اچھے ہیں۔ انسان کو ہمیشہ اپنے نیچے دیکھنا چاہیے۔ ہم کسی رات بھوکے نہیں سوئے۔ معقول اور مناسب لباس بھی پہنتے ہیں۔ رہنے کے لیے اللہ نے اپنی زمین اور چھت دے رکھی ہے۔ ہم اس ذات کا جتنا بھی شکر ادا کریں، کم ہے.....'' بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔

''تم مجھ سے جھگڑا کرتی ہو نا..... لیکن دیکھ لینا..... جب میں نہیں رہوں گا تو تم دہاڑیں مار مار کر مجھے یاد کرو گی..... میں بہت یاد آؤں گا.....!''

''میں اپنے لیے کچھ تھوڑی چاہتی ہوں۔'' خدیجہ نے اس کی ذہنی کیفیت کے پیش نظر جلدی سے کہا۔ ''میں تو روکھی سوکھی کھا کر بھی گزارہ کر سکتی ہوں لیکن زاہدہ.....؟''

خدیجہ نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو مظفر تڑپ کر بولا۔ ''کک..... کیا ہوا ہے میری زاہدہ کو؟''

مظفر کو اپنی اکلوتی اولاد زاہدہ سے بے پناہ محبت تھی۔ ہر والدین اپنی اولاد سے محبت کرتے ہیں اور بیٹی کا معاملہ تو اور بھی حساس اور نازک ہوتا ہے..... اور بیٹی بھی اکلوتی ہو تو محبت کی شدت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ دنیا میں کوئی باپ ایسا نہ ہوگا جسے اپنی بیٹی سے محبت نہ ہو اور..... اگر ہوگا تو پھر وہ انسان نہیں ہوگا۔ ایسے شخص کو گوشت و پوست کی متحرک مشین کہا جا سکتا ہے جس کے سینے میں دھڑکتے ہوئے کسی لوتھڑے کے بجائے ایک ڈیجیٹل آلہ رکھا ہو جس میں احساسات اور جذبات پیدا نہ ہوتے ہوں بلکہ بڑی سرعت سے ہندسوں کی جمع تفریق کا عمل جاری رہتا ہو۔

خدیجہ نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''زاہدہ کو ابھی تو کچھ نہیں ہوا لیکن اگر تم یونہی آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے تو بہت کچھ ہو جائے گا۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

''صاف صاف بات کیوں نہیں کرتی ہو۔''

خدیجہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''زاہدہ نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا ہے۔ وہ جوان ہو گئی ہے تو اس کا مطلب ہے ہمیں اس کی شادی بھی کرنا ہے اور تم جانتے ہو یوں خالی پیلی شادی نہیں ہو جاتی۔ لڑکے والے لڑکی کو بعد میں اور اس کے گھر کو پہلے دیکھتے ہیں۔ اس کے گھر کے مالی وسائل کا اندازہ لگایا جاتا ہے کہ وہاں سے کیا کچھ ملنے کی توقع باندھی جائے اور یہاں..... ہمارے گھر میں.....!''

خدیجہ نے ایک مرتبہ پھر معنی خیز، سوالیہ انداز میں جملہ نامکمل چھوڑ دیا اور اپنے شوہر کو تکنے لگی۔ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''میں مانتا ہوں تم نے جو حالات بیان کیے ہمارے معاشرے کا ایسا ہی چلن ہو گیا ہے لیکن میں نصیب پر یقین رکھتا ہوں اور مجھے قوی اُمید ہے..... بنانے والے نے میری زاہدہ کا نصیب بہت ہی اچھا بنایا ہے۔''

''نصیب..... اونہہ!'' خدیجہ نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

ان کے درمیان جب بھی بحث یا تلخ کلامی ہوتی، ''نصیب'' پر آ کر موقوف ہو جاتی۔ اس کے بعد کہنے اور سننے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا تھا۔ نصیب کے معاملے میں دونوں کی سوچ اور زاویہ نظر الگ الگ تھا۔ اختلاف رائے پر عموماً جھگڑا شروع ہوتا ہے لیکن اس کے بالعکس وہ دونوں اس نقطے پر پہنچ کر شانت ہو جاتے تھے۔ شاید وہ منزل پر کھڑے ہو کر تلاشِ منزل کے لیے نکلتے تھے۔

لہٰذا اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔

حالات اسی انداز اور رفتار سے ایک لگی بندھی ڈگر پر آگے بڑھ رہے تھے کہ مظفر کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ حادثہ ٹیکسٹائل مل کے اندر ہی پیش آیا تھا۔ غلطی مظفر کی تھی لہٰذا زیادہ ہنگامہ نہیں پھوٹ پایا ورنہ مل والوں کو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ انسانی ہمدردی اور متوفی کی فیملی کی مالی مدد کے طور پر مل والوں نے مبلغ پچیس ہزار روپے خدیجہ کو دیے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

مظفر نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ جب وہ زندہ نہیں رہے گا تو بہت یاد آئے گا۔ خدیجہ نے اس کی کمی کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ زاہدہ ماں کی بہ نسبت باپ کے زیادہ نزدیک تھی لہٰذا مظفر کی ابدی جدائی نے اسے ذہنی اور جذباتی طور پر توڑ کر رکھ دیا۔ وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی، اپنے آپ میں گم ہو کر رہ گئی۔

خدیجہ کے سامنے سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ اب اس گھر کی معاشی گاڑی کیسے چلے گی۔ مظفر کم زیادہ جتنا بھی کما کر لا رہا تھا اس سے گزر بسر تو ہو رہی تھی۔ اس کے انتقال کے بعد آمدنی کا مستقل ذریعہ تو بند ہو گیا تھا۔ مل والوں نے جو پچیس ہزار روپے دیے تھے وہ کتنے دن چلتے۔ ان میں سے چار پانچ ہزار تو مظفر کی تجہیز و تکفین پر خرچ ہو گئے تھے۔ اگر وہ ہاتھ روک کر بھی خرچ کرتی تو پانچ چھ ماہ چل جاتے، اس کے بعد کیا ہوتا؟

یہ ایک ایسا سوال تھا جس نے ان ماں بیٹی کو بے حد

پریشان کر دیا تھا۔ زاہدہ نے فیصلہ کن انداز میں اپنی ماں سے کہہ دیا۔ ''امی! میں آپ کی عدت پوری ہونے تک گھر میں بیٹھوں گی۔ اس کے بعد ملازمت کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑی ہوں گی..... اور سن لیں، آپ میری ملازمت کی مخالفت نہیں کریں گی۔''

زاہدہ کا انداز دوٹوک اور جارحانہ تھا۔ خدیجہ اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئی پھر پوچھا۔ ''نادان! تم کون سی ملازمت کرو گی۔ تمہیں تو کچھ آتا جاتا بھی نہیں۔''

''میرے پاس ہنر نہ سہی مگر تعلیم ہے۔'' زاہدہ نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ''کوئی چھوٹی موٹی نوکری تو مل ہی جائے گی۔''

زاہدہ نے میٹرک تک تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ اگرچہ یہ کوئی بہت زیادہ تعلیم نہیں تھی لیکن اس زمانے میں آج کل کی طرح تعلیم اتنی بے وقعت نہیں ہوئی تھی پھر مسابقت کا وہ عالم نہیں تھا جو آج کل دکھائی دیتا ہے۔ ایک میٹرک پاس لڑکے یا لڑکی کو بہ آسانی کہیں بھی نوکری مل جاتی تھی۔ زاہدہ بڑی ہونہار اسٹوڈنٹ رہی تھی۔ اس نے میٹرک میں اے گریڈ حاصل کیا تھا اور آگے بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتی تھی لیکن گھریلو حالات اس کی راہ میں رکاوٹ بن گئے تھے۔ پچھلے دو تین سال سے وہ گھر میں ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

خدیجہ کی عدت کی مدت ختم ہوئی ہی تھی کہ ان ماں بیٹی کی زندگی میں ایک نیا کردار داخل ہوا۔ اس کردار کا نام تھا..... لیاقت حسین!

خدیجہ اور زاہدہ، لیاقت حسین کو نہیں جانتی تھیں۔ وہ اس سے زندگی میں پہلی مرتبہ مل رہی تھیں لیکن اس چرب زبان شخص نے کچھ ایسے گھماؤ پھراؤ سے اپنا تعارف کرایا کہ وہ اس کے چکر میں آ گئیں۔ خدیجہ کے اپنے قریبی رشتے دار یا تو زیادہ تر اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے..... یا پھر ان میں سے کوئی باقی بھی تھا تو اس سے میل ملاقات نہیں تھی۔ لیاقت نے رشتے داروں کا ایسا اُلجھا ہوا منظر کھینچا کہ وہ کئی قسم کی جمع تفریق اور ضرب تقسیم کے بعد خود کو خدیجہ کا کزن ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ بھی ان دُکھ اور پریشانی کے لمحات میں اس پُرخلوص، ہمدرد اور نیک سیرت ماموں زاد لیاقت حسین سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ اس ملاقات کے اختتام پر لیاقت حسین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''خدیجہ! میں تمہارے گھریلو حالات سے پوری طرح آگاہ ہو چکا ہوں اس لیے مجھے کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں زاہدہ نوکری وغیرہ کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کا جذبہ اپنی جگہ قابلِ قدر ہے لیکن میں اس بچی کو کمانے کی غرض سے گھر سے نہیں نکلنے دوں گا۔ آج کے بعد اس گھر کی کفالت کا میں ذمہ لیتا ہوں۔''

''لیکن.....!'' خدیجہ نے اُلجھن بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم اتنی بڑی ذمے داری..... میرا مطلب ہے، تمہارا اپنا بھی گھر ہوگا، سو مسئلے مسائل ہوں گے پھر تم.....!''

''بس خدیجہ!'' وہ بڑے حتمی انداز میں قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''گھر یا دِلا کر میرے زخم ہرے نہ کرو۔ کبھی میں بھی گھر اور بیوی والا ہوتا تھا لیکن اب کچھ بھی باقی نہیں ہے۔'' وہ بڑے گمبھیر انداز میں یکدم خاموش ہو گیا۔

خدیجہ کو کرید ہوئی کہ اس کی کہانی سے آگاہی حاصل کرے۔ تھوڑی سی ٹٹول کے بعد لیاقت نے اپنی پلاننگ کے مطابق خدیجہ کو ایک پُراثر اور جذباتی کہانی سنا دی۔ اس کہانی کی رو سے کچھ عرصہ پہلے لیاقت حسین نے ایک خوب صورت عورت سے شادی کی تھی۔ وہ اس کی خوب صورتی اور دلکشی پر اس قدر مرمٹا کہ اس نے اپنا سب کچھ اسی کے نام کر دیا۔ گھر، کاروبار اور دیگر سب کچھ اسی عورت کا ہو گیا۔ وہ کہنے کو اس عورت کا شوہر اور ہر شے کا مالک تھا لیکن قانونی اعتبار سے صورتِ حالات اس کے برعکس تھی۔ لیاقت کی حیثیت ایک ملازم ایسی ہو کر رہ گئی تھی اور پھر اس حسین عورت نے وہ چال چلی جس کی خاطر اس نے یہ سارا کھٹ راگ پھیلایا تھا۔ اس نے باقاعدہ عدالت سے رجوع کیا اور لیاقت سے الگ ہو گئی۔

وہ الگ ہوئی تو قانونی طور پر لیاقت حسین کو گھر اور چلتے ہوئے کاروبار سے بے دخل ہونا پڑا۔ وہ کچھ عرصے تک اس ٹریجڈی پر پاگلوں کی طرح دیوانہ وار اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ اس کی پوزیشن ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنی سابق بیوی کے خلاف کچھ کر سکتا۔ اس کے ساتھ حالات نے جو بھی کھیل کھیلا تھا اس میں اغلب ہاتھ خود اس کی اپنی حماقتوں کا تھا لیکن وہ اپنا سر پیٹنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق اس نے بہت جلدی خود کو سنبھال لیا۔ پہلے وہ اپنا بزنس کرتا ہے، اب وہ سائٹ کی ایک فیکٹری میں ملازم تھا اور اس کی رہائش کرایے کے ایک کوارٹر میں تھی۔ اپنی اس افسوسناک کہانی کے اختتام پر اس نے جذبات انگیز لہجے میں کہا۔

''خدیجہ! میرا اب اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔ جب سے مجھے تمہارے حالات کا پتا چلا ہے، میں بہت بے چین ہوں۔ بڑی مشکل سے ڈھونڈتے ڈھانڈتے یہاں تک پہنچا

ہوں۔ میرے قریبی رشتے داروں میں ایک تم ہی باقی بچی ہو۔ اگر میں تمہارے کسی کام آسکوں تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ مجھے اُمید ہے تم میری اس نیکی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہیں کرو گی۔''

اس چالباز نے خدیجہ کو ایک بند گلی میں لا کھڑا کیا تھا۔ اس کے پاس انکار کی کوئی گنجایش نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی لیاقت نے روزانہ رات کو ان کے گھر کا چکر لگانا شروع کردیا۔ وہ کچھ ایسی ہمدردی اور محبت سے پیش آیا تو خدیجہ اپنے دل اور گھر میں اس کے لیے اچھی خاصی گنجایش نکالنے پر مجبور ہوگئی۔ اگرچہ زاہدہ کو ماں کا یہ فیصلہ زیادہ پسند نہیں آیا تھا لیکن کوئی اختلاف یا احتجاج کرنے کے بجائے اس نے خاموشی اختیار کرلی۔ ایک رات خدیجہ نے لیاقت حسین سے بڑے واضح الفاظ میں کہہ دیا۔

''تم خوامخواہ کوارٹر کا کرایہ کیوں بھرتے ہو۔ یہ گھر بھی تمہارا اپنا ہی ہے۔ تم اپنا سامان اٹھاؤ اور یہاں آجاؤ۔''

خدیجہ کے منہ سے یہی الفاظ سننے کے لیے تو لیاقت نے اتنے دن تک ''محنت'' کی تھی۔ گویا اس رات اس کی محنت رنگ لے آئی تھی۔ اس نے خدیجہ کی پیشکش کے سامنے کمزور سی مزاحمت کی پھر بڑے رضا کارانہ طور پر ہتھیار پھینک دیے اور..... آیندہ روز وہ کرایے کے کوارٹر کو چھوڑ کر خدیجہ کے گھر میں مقیم ہوگیا۔

لیاقت گزشتہ چند روز سے ان ماں بیٹی کے ساتھ جس حسنِ سلوک کا مظاہرہ کررہا تھا اس کے اثرات تو اپنی جگہ تھے ہی، اس کے علاوہ بھی نگاہوں ہی نگاہوں میں اس نے خدیجہ پر بھی ایک خاص ''کام'' کیا تھا جس کے نتیجے میں وہ اس کے دل میں ایک خاص ''جگہ'' پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

زاہدہ نے لیاقت کا اپنے گھر میں آکر رہنا تو کسی حد تک گوارا کرلیا تھا لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد جب ماں نے اسے اپنے ''فیصلے'' سے آگاہ کیا تو وہ بھڑک اٹھی۔ وہ کسی بھی شخص کو اپنے باپ کے مقام پر ''فائز'' دیکھنے کی روادار نہیں تھی، چاہے وہ شخص کتنا بھی مہربان اور ہمدرد انسان کیوں نہ ہو۔

ماں نے اسے زمانے کی اونچ نیچ سے روشناس کرایا۔ حالات کے تقاضوں سے آگاہ کیا اور سمجھانے بجھانے کے اختتام پر کہا۔ ''مجھ سے شروع میں بھول ہوگئی کہ میں نے لیاقت کو اپنے گھر میں رہنے کی پیشکش کردی۔ ٹھیک ہے، وہ ہمارا اپنا ہے لیکن لوگ تو یہ بات نہیں سمجھتے نا۔ تمہیں کیا معلوم میں لوگوں کی کیسی کیسی معنی خیز نظروں کا سامنا کرتی ہوں۔''

''تو مت سامنا کریں۔'' زاہدہ نے دوٹوک انداز میں کہہ دیا۔ ''کسی اچھے انداز میں اس سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی رہایش کا الگ کہیں بندوبست کرلے۔''

''یہ بات لیاقت کو بری بھی لگ سکتی ہے۔'' خدیجہ نے کہا۔ ''اور پھر یہ بھی دیکھو، وہ کتنی ہمدردی اور اپنایت سے ہماری مالی مدد بھی تو کررہا ہے۔''

زاہدہ پتا نہیں اس روز کس موڈ میں تھی، اُکھڑے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں نے تو ابو کے انتقال کے وقت ہی آپ کو بتادیا تھا کہ روزی اور ملازمت کی تلاش میں گھر سے نکلوں گی لیکن آپ نے اور آپ کے اس کزن نے میرا راستہ روک لیا۔ مجھے یقین ہے اگر میں نے کوئی جاب کرلی ہوتی تو ہمیں کسی کی مالی مدد کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ میں اب بھی یہ کرسکتی ہوں۔ اس گھر کی معاشی ذمے داریاں اٹھانے کا حوصلہ ہے مجھ میں۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں تمہاری بات سے اتفاق کرتی ہوں۔'' خدیجہ نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تم جو کہہ رہی ہو، وہ کر کے بھی دکھا سکتی ہو لیکن اس کے علاوہ بھی کوئی فیصلہ کرتے وقت بہت سی باتوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔ تم میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

زاہدہ نے شاکی نظر سے خدیجہ کی طرف دیکھا اور زخمی لہجے میں بولی۔ ''میں آپ کی بات بڑی اچھی طرح سمجھ گئی ہوں امی! آپ نے ایک فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اس کے لیے جواز تلاشنے اور تراشنے کی کوشش نہ کریں لیکن.....''

وہ لمحے بھر کو رکی پھر چٹانی الفاظ میں بولی۔ ''لیکن امی! مجھ سے کبھی یہ توقع نہ رکھنا کہ میں اس شخص کو اپنے ابو کا درجہ دے سکوں گی..... کوئی بھی شخص وہ مقام حاصل کر ہی نہیں سکتا جو میرے دل میں میرے ابو کے لیے ہے۔''

ماں اور بیٹی میں دوبارہ اس موضوع پر بات نہیں ہوئی لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد نہایت ہی سادگی کے ساتھ خدیجہ اور لیاقت کی شادی ہوگئی۔ لیاقت حسین نے ایک خاص پلاننگ کے تحت خدیجہ کو اپنے شیشے میں اتارا تھا اور اس کا یہ مقصد بڑی حد تک پورا ہوگیا تھا۔ یہ شادی اس کے لیے ایک ایسی بنیاد تھی جس پر وہ اپنے عزائم کی من چاہی عمارت کھڑی کرسکتا تھا۔

شادی کے بعد کچھ عرصے تک تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا پھر میاں بیوی میں آئے روز جھگڑے ہونے لگے۔ زاہدہ اول روز ہی سے اپنے سوتیلے باپ کو ناپسند کرتی تھی۔ جب لیاقت نے اس کی ماں کے ساتھ غیر انسانی سلوک شروع کیا تو اس کا رویہ ناپسندیدگی سے بڑھ کر غم و غصے میں بدل گیا اور

جب وہ اس پر بھی بری نظر ڈالنے لگا تو زاہدہ لیاقت سے شدید نفرت کرنے لگی۔

دراصل لیاقت حسین جس مقصد کے حصول کی خاطر اس گھر پر ''نازل'' ہوا تھا، اس میں وہ بڑی حد تک کامیابی حاصل کر چکا تھا۔ اب اسے وہاں سے آف ہونا تھا..... کسی بھی وقت اور کسی بھی بہانے لیکن اس فرار سے پہلے ہی موت نے اسے اپنے سفاک جبڑوں میں بھینچ لیا۔

اس کہانی کے چند پہلوؤں کو میں نے دانستہ آپ سے چھپالیا ہے۔ ان کی نقاب کشائی عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر کی جائے گی۔

جب میں خدیجہ سے مختلف سوالات کرنے کے بعد مطمئن ہوگیا تو میں نے غلام مرتضیٰ اور پرویز کے بارے میں بھی استفسار کیا۔ وہ یوں چونکی جیسے اسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو پھر میز پر قدرے آگے جھکتے ہوئے بولی۔

''وکیل صاحب! آپ ان دونوں کو اس کیس سے دور ہی رکھیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ ان کی وجہ سے خوامخواہ میری پریشانی بڑھے گی۔ ویسے میں ان کے بارے میں آپ کو بتاتی ہوں۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''یہ جو مرتضیٰ ہے نا..... اسے تو آپ خدائی فوج دار سمجھ لیں۔ دنیا بھر کے انسانوں کا درد شاید اسی کے دل میں سما گیا ہے۔ جہاں بھی کوئی مسئلہ دیکھتا ہے، فوراً مدد اور تعاون کے لیے کود پڑتا ہے لیکن ہے بالکل احمق۔ اس کی شمولیت سے اکثر بنتے بنتے معاملات بھی بگڑ جاتے ہیں۔ میں اس کے خلوص اور نیت پر شک نہیں کر رہی ہوں بلکہ حقیقت یہی ہے کہ اس کی حماقتیں بجائے فائدہ پہنچانے کے نقصان کا باعث بن جاتی ہیں اور یہ جو پرویز ہارڈ ویئر والا ہے نا.....''

وہ ایک مرتبہ پھر رُکی، ایک گہری سانس لی اور سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگی۔ ''یہ شخص مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اس کے دل میں ہماری ہمدردی صرف زاہدہ کی وجہ سے ہے۔ یہ مردود خود بھی زاہدہ پر نگاہ رکھے ہوئے ہے اور کسی نہ کسی بہانے آگے بڑھنے کی کوشش میں ہے۔ اب یہ جو لیاقت کی موت کا موقع ہاتھ آیا ہے تو وہ پوری طرح سرگرم عمل نظر آ رہا ہے۔''

غلام مرتضیٰ کے بارے میں خدیجہ کی رائے سے مجھے اتفاق تھا۔ میں نے خود بھی اسے ایسا ہی چغد اور بے وقوف پایا تھا۔ خدیجہ نے بڑی حد تک پرویز کے حوالے سے بھی میرے اندازے کی تصدیق کی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ زاہدہ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ خدیجہ نے بھی کچھ ایسی ہی بات بتائی تھی لیکن اس سلسلے میں، میں اپنا اطمینان بھی ضروری سمجھتا تھا لہٰذا خدیجہ سے پوچھ لیا۔

''زاہدہ پر نگاہ رکھنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا پرویز، زاہدہ سے شادی کا ارادہ رکھتا ہے۔''

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''یہ بات اس نے براہِ راست مجھ سے تو نہیں کہی لیکن اگر وہ ایسا سوچتا بھی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میرا ایسا کوئی خیال نہیں ہے لہٰذا اس کی ہر حرکت مجھے اوچھی اور کمینی نظر آتی ہے۔''

''اگر آپ کا واقعی ایسا کوئی ارادہ نہیں تو پرویز کو صاف الفاظ میں بتا دینا چاہیے۔'' میں نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ ''تاکہ وہ کسی خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے۔''

''میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی ہوں۔'' وہ رُوکھے لہجے میں بولی۔

میں نے اس گھرانے کے لیے پرویز کی تڑپ کو خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کیا تھا۔ وہ واقعی بہت فکرمند اور پریشان دکھائی دیتا تھا۔ اسی تناظر میں، میں نے خدیجہ سے پوچھا۔

''آپ کو اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس سلسلے میں پرویز سے بات کروں؟''

''وکیل صاحب! میں نے کہا ہے نا..... آپ ان لوگوں کو بھول جائیں۔'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''آپ میری بچی کو جلد از جلد اس وبال سے نکالنے کی کوشش کریں تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے پُریقین انداز میں کہا۔ ''میں اپنی پوری توجہ زاہدہ پر مرکوز کر رہا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے دل میں کہا، میں پرویز کو یکسر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ جتنی شدومد سے زاہدہ کی رہائی اور بریت کا خواہاں نظر آتا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ زاہدہ کو چاہتا ہے اور اسے خدیجہ سے بھی دلی ہمدردی ہے جبھی تو وہ لیاقت کے ظلم و ستم کی داستانیں سنانے میرے پاس آیا تھا۔

میں نے اپنی یادداشت میں سے اس کیس کی حد تک غلام مرتضیٰ کو ڈیلیٹ کیا اور پرویز کے نام پر سرخ دائرہ بنا دیا۔ یہ وہ شخص تھا جو ملزمہ زاہدہ سے محبت کرتا تھا اس لیے اسے اس کیس سے نکالنا چاہتا تھا۔ وہ ملزمہ کی بے گناہی کے لیے بھی پُریقین تھا۔ دوسری جانب ملزمہ، مقتول سے شدید نفرت کرتی

تھی۔ اس کی گرفتاری کا ایک سبب یہ کھلی نفرت بھی تھی۔ ازیں علاوہ اسی بنا پر پرویز بھی مقتول کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجایش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کہ لیاقت حسین کو موت کے گھاٹ اتارا جاچکا تھا۔ اگر یہ قتل زاہدہ نے نہیں کیا تھا تو پھر قاتل کون تھا؟

اس خطرناک سوال کے ممکنہ جواب کے سلسلے میں پرویز کا نام سرفہرست چمکتا دکھائی دیتا تھا اسی لیے میں نے اسے سرخ دائرے میں بند کردیا تھا۔

خدیجہ سے ضروری معاملات طے کرنے کے بعد میں نے اسے اپنے دفتر سے رُخصت کردیا اور ''پرویز اینڈ کمپنی'' کو اپنے پاس بلالیا۔ ان کے چہرے... اُلجھن آمیز سنسنی سے سجے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے پرویز نے مجھ سے پوچھا۔

''کیا رہا بیگ صاحب؟''

یہ سوال غلام مرتضیٰ کے خیالات کی ترجمانی بھی کرتا تھا لہٰذا میں نے جواب دینے سے پہلے باری باری ان دونوں کو دیکھا اور کہا۔

''آپ لوگوں کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے زاہدہ کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ انشاءاللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

انہوں نے میری بات سننے کے بعد اُلجھن زدہ نظر سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر غلام مرتضیٰ نے مجھ سے پوچھا۔

''لیکن بیگ صاحب! خدیجہ نے تو ہم سے بات تک نہیں کی، کچھ بتایا بھی نہیں اور خاموشی سے چلی گئی۔ ہم اسے اپنے ساتھ لے کر یہاں آئے تھے اور.....''

''وہ بہت زیادہ پریشان ہے نا اس لیے۔'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''اور میں آپ لوگوں کو بتا رہا ہوں نا، فکر اور تردد والی کوئی بات نہیں۔ جب میں نے زاہدہ کا کیس پکڑ لیا ہے تو اسے باعزت بری بھی کراؤں گا۔ آپ لوگ اطمینان سے گھر جاسکتے ہیں اور ہاں.....'' میں نے چونکنے کی اداکاری کی اور مزید کہا۔ ''خدیجہ کی خواہش ہے کہ آپ دونوں اس کے معاملے میں کہیں نظر نہ آئیں۔''

غلام مرتضیٰ نے یہ سن کر بے پروائی سے کندھے اُچکا دیے جبکہ پرویز بے حد متفکر دکھائی دینے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کیس سے الگ ہوتے ہوئے وہ بڑی تکلیف محسوس کررہا ہو۔ میں نے اس سے کہا۔

''پرویز! تم ایک آدھ روز میں مجھ سے ملنے آنا۔ میں نے تم سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ میں اس رنگ کو کوئی نام نہ دے سکا کہ وہ خوشی کا رنگ تھا یا غم کا۔

غلام مرتضیٰ نے کہا۔ ''بیگ صاحب! میں چند دنوں کے لیے حیدرآباد جانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ مجھے چھٹی دے دیں تو میں کل صبح روانہ ہوجاؤں؟''

وہ مجھ سے کچھ اس انداز میں رخصت مانگ رہا تھا جیسے کوئی باقاعدہ میرا ملازم ہو۔ میں نے تو اس کی بے روزگاری اور پریشان حالی پر ترس کھا کر اسے اپنے ساتھ نتھی کرلیا تھا ورنہ وہ جس قسم کی ''صلاحیتوں'' کا مالک تھا ان سے میں بخوبی واقف تھا اور ماشاءاللہ! اب تو آپ بھی مکمل آگاہی حاصل کرچکے ہوں گے..... چنانچہ میں نے اس سے کہہ دیا۔

''ہاں ٹھیک ہے، تم حیدرآباد کا چکر لگا آؤ۔ میری طرف سے تمہیں پوری اجازت ہے۔''

اس کے بعد وہ دونوں مجھے ''خدا حافظ'' کہہ کر میرے دفتر سے رخصت ہوگئے۔

اگلے روز میں فرصت نکال کر متعلقہ تھانے پہنچا اور اس کیس کی ملزمہ زاہدہ سے ایک بھرپور ملاقات کی۔ مجھے چونکہ اس کی وکالت کرنا تھی لہٰذا اس سے ملاقات ضروری تھی۔ آدھے گھنٹے کی اس ملاقات میں زاہدہ کی زبانی مجھے بہت سی اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ ان میں سے بعض تو خدیجہ کے بیان کی تصدیق میں تھیں اور بعض انکشافات کی حیثیت کی حامل تھیں۔ میں نے وکالت نامے اور چند ضروری کاغذات پر زاہدہ کے دستخط لیے اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''تم ایک ذہین اور باصلاحیت لڑکی ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اُمید ہے بہت جلد اس کیس سے تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔''

وہ متذبذب نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیس سے جان چھوٹ جائے گی والی بات تو سمجھ میں آرہی ہے کہ آپ کو اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر اعتماد ہوگا لیکن میری صلاحیت اور ذہانت کا اندازہ آپ نے کس شے سے لگایا ہے؟''

یہ سوال کرکے اس نے اپنی ذہانت ہی کا ثبوت تو دیا تھا۔ بہرحال، میں نے اس کے تذبذب کو دور کرنے کی خاطر کہہ دیا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ میں نے تمہیں دستخط کرتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''دستخط کرتے ہوئے دیکھا ہے..... کیا مطلب؟'' اس کی آنکھوں میں اُلجھن تیرنے لگی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بائیں

ہاتھ سے دستخط کیے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوا کہ تم لیفٹ ہینڈر ہو۔ میں نے سن اور پڑھ رکھا ہے بلکہ میرے تجربے میں بھی آیا ہے کہ بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے لوگ بڑے باصلاحیت اور ذہین ہوتے ہیں۔''

وہ خوش ہونے کے بجائے ایک دم اُداس ہوگئی۔ میں نے اس کی تعریف کی تھی۔ فطری طور پر اسے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ بجھ سی گئی تھی اور میں اس کی وجہ بھی سمجھ رہا تھا۔ وہ جس قسم کے حالات سے گزر رہی تھی اس کا تقاضا بری طرح اس پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ میری وضاحت کے جواب میں اس نے صرف اتنا کہا۔

''ذہین اور باصلاحیت ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ میں ایک ناکردہ جرم میں اس وقت یہاں پڑی ہوئی ہوں۔''

''یہ عارضی پریشانی ہے۔'' میں نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''جب یہ بات طے ہے کہ تمہارا جرم ناکردہ ہے تو تمہیں بہت جلد اس مصیبت سے نجات بھی مل جائے گی۔ میں تمہیں آزادی دلانے کی خاطر ہی تو کوشش کرنے جا رہا ہوں۔''

وہ قدرے مطمئن دکھائی دینے لگی۔ میں نے اسے چند ضروری باتیں سمجھائیں اور وہاں سے واپس آ گیا۔ اب ہماری ملاقات عدالت کے کمرے ہی میں ہوئی۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں اس کیس کا چالان پیش کر دیا۔ اس دوران میں، میں خاصی تیاری کر چکا تھا لہٰذا میں نے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزمہ کی درخواستِ ضمانت بھی دائر کر دی۔

قتل کے ملزم کی ضمانت ناممکن کی حد تک مشکل ہوتی ہے اور وہ بھی پہلی پیشی پر..... تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا چنانچہ جج نے میرے پیش کردہ دلائل کو رد کرتے ہوئے ملزم زاہدہ کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا۔

آئندہ دو تین پیشیاں عدالت کی تکنیکی کارروائی کی نذر ہوگئیں۔ عدالت کی باقاعدہ کارروائی شروع ہونے میں کوئی دو ماہ لگ گئے لیکن آگے بڑھنے سے قبل میں چند ضروری باتیں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ اس میں سب سے اہم پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہے۔

اس رپورٹ کے مطابق مقتول لیاقت حسین کی موت بارہ اپریل کی رات سات اور آٹھ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اسے گھر کے اندر گردن کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ رپورٹ میں اس بات کی وضاحت موجود تھی کہ جب اس کی گردن پر کسی تیز دھار آلے کی مدد سے وار کیا گیا اس وقت وہ حالتِ نیند میں تھا، گویا سوتے میں اسے قتل کیا گیا تھا۔

اس دوران میں پرویز گاہے بہ گاہے میرے پاس چکر لگاتا رہتا تھا۔ میں نے اسے ہر زاویے سے ٹھوس کر دیکھ لیا۔ اس نے تھوڑے سے تامل کے بعد اس بات کا اقرار تو کر لیا تھا کہ وہ ملزم زاہدہ سے محبت کرتا تھا اور اس سے شادی کا خواہش مند تھا لیکن ہزار کوشش کے باوجود بھی اس نے یہ مان کر نہیں دیا کہ کسی بھی حوالے سے لیاقت حسین کی موت میں اس کا ہاتھ رہا ہو۔ اس سلسلے میں وہ بڑی بڑی قسمیں کھانے کے بعد بولا۔

''بیگ صاحب! اگر مجھے یہی کام کرنا ہوتا تو بہت پہلے کر چکا ہوتا۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھو پرویز! تمہارا دعویٰ ہے کہ زاہدہ نے اپنے سوتیلے باپ کو قتل نہیں کیا۔ وہ بے گناہ اور بے قصور ہے۔ وکیل صفائی ہونے کے ناتے میرا اندازہ بھی یہی ہے لیکن ہمارے ان خیالات اور اندازوں کی عدالت میں کوئی اہمیت نہیں۔ عدالت ہر بات کے لیے ٹھوس ثبوت مانگتی ہے۔ کیا تم اپنے دعوے کی سچائی ثابت کرنے کے لیے کوئی مضبوط دلیل دے سکتے ہو؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''دلیل اور ثبوت تو کوئی نہیں ہے میرے پاس لیکن میرا دل کہتا ہے، زاہدہ کو کسی گہری سازش کے تحت اس کیس میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ قاتل نہیں ہے۔''

''عدالت دل کے کہے کا اعتبار نہیں کرتی پرویز!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وہ اُلجھن زدہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''پرویز! لیاقت حسین قتل ہوا ہے تو اس کا مطلب ہے اسے کسی نے قتل بھی کیا ہے۔ اگر زاہدہ قاتل نہیں..... جیسا کہ ہمارا خیال ہے تو پھر ہمیں یہ پتا چلانا ہوگا کہ لیاقت حسین کو کس نے قتل کیا ہے؟ یہ بہت ضروری ہے۔ کیا تم اس بارے میں کوئی اندازہ قائم کر سکتے ہو؟''

وہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ''جناب! سچی بات پوچھیں تو میرا دھیان زاہدہ کی ماں خدیجہ کی طرف جا رہا ہے۔ خدیجہ کوئی اچھی عورت نہیں ہے۔''

میں نے اس کے فروعی تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہارا دھیان کس بنا پر خدیجہ کی طرف جا رہا ہے؟''

وہ مجھے کوئی مدلل جواب نہ دے سکا۔ میں نے اسے یہ ڈیوٹی سونپ کر رخصت کر دیا کہ وہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے..... اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ لیاقت حسین کا اصل قاتل کون ہے؟ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ میری ہدایت پر عمل کرے گا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے عدالت کی باقاعدہ کارروائی میں کوئی دو ماہ لگ گئے تھے۔ جس روز اس پیشی کا وقت آیا، عدالت کا کمرا سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ جج اپنے چیمبر سے نکلا اور کرسی انصاف پر براجمان ہوگیا۔ چند لمحات تک وہ حاضرینِ عدالت کو ٹٹولتی ہوئی نگاہ سے دیکھتا رہا پھر کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ اس کی مخاطب اس کیس کی ملزمہ اور میری مؤکل زاہدہ تھی۔

''بی بی! تم پر الزام ہے کہ بارہ اپریل کی رات سات اور آٹھ بجے کے درمیان تم نے اپنے سوتیلے باپ لیاقت حسین کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ کیا تم اپنے اس جرم کا اقرار کرتی ہو؟''

جج کے استفسار کے جواب میں ملزمہ زاہدہ نے صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کی باری آئی لیکن اس سے پہلے کہ گواہوں کے بیانات کا سلسلہ شروع ہوتا، میں نے جج سے درخواست کی کہ میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ کسی بھی آئی او (انکوائری آفیسر) کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر انکوائری آفیسر کو عدالت کے کمرے میں موجود رہنا پڑتا ہے۔

جج نے میری درخواست کو لائقِ توجہ جانا اور اس کے اشارے پر تفتیشی افسر وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوگیا۔ شاید میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ اس کیس کے تفتیشی افسر کا نام شفیع شاہ تھا۔ وہ عہدے کے اعتبار سے ایک انسپکٹر تھا اور متعلقہ تھانے کا انچارج بھی وہی تھا۔

''شاہ صاحب!'' میں نے آئی او کی طرف دیکھتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''آپ ایک طرح سے استغاثہ کے والی وارث ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں جناب!'' وہ بھی دوستانہ انداز میں بولا۔ ''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں نے استغاثہ کی رپورٹ کا بغور مطالعہ کیا ہے اور میری سمجھ میں یہ بات آئی ہے کہ ملزمہ زاہدہ کو صرف اس بنا پر گرفتار کیا گیا ہے کہ وہ مقتول سے شدید نفرت کرتی تھی؟''

''اس کی گرفتاری کی ایک وجہ نفرت بھی ہے۔'' آئی او نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''اس کے علاوہ سب سے مضبوط جواز یہ ہے کہ مقتول نے اپنی موت سے ایک روز قبل تھانے میں آکر اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ ملزمہ کی طرف سے اس کی جان کو خطرہ ہے۔ وہ اس گھر میں خود کو بہت غیر محفوظ محسوس کرتا ہے۔ اس رپورٹ کے اگلے روز ہی وہ اپنی خواب گاہ میں قتل کر دیا گیا لہٰذا مقتول کے آخری خدشاتی بیان کو ہم نے بہت زیادہ اہمیت دی اور ملزمہ کو گرفتار کر کے تفتیش شروع کر دی۔''

''ہوں!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تو کیا اس تفتیش کے دوران میں ملزمہ نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا؟''

''نہیں جناب! وہ صحتِ جرم سے انکاری ہے۔'' اس نے اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن استغاثہ کے پاس کچھ ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ ملزمہ کا جرم معزز عدالت کے روبرو ثابت ہو جائے گا۔''

میں نے سلسلۂ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''شاہ صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ اپنی موت سے ایک روز قبل مقتول آپ کے پاس آیا تھا اور اس نے اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ ملزمہ اس کی جان لینا چاہتی ہے۔ مقتول کی موت بارہ اپریل کی رات واقع ہوئی ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ گیارہ اپریل کو آپ کے پاس آیا تھا؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔

''شاہ صاحب! آپ کو یاد ہوگا، وقوعہ سے دو روز قبل یعنی دس اپریل کو مقتول کے محلے کے چند افراد آپ کے پاس آئے تھے اور انہوں نے مقتول کے ظالمانہ رویے کی شکایت کرتے ہوئے آپ سے تعاون کی درخواست کی تھی؟''

''ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں نے ان کی شکایت پوری توجہ سے سنی تھی۔''

''لیکن اس شکایت پر کوئی قانونی کارروائی کرنے کے بجائے انہیں سوکھا ٹرخا دیا تھا۔'' میں نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ ترش لہجے میں بولا۔ ''وکیل صاحب! آپ تو قانون داں ہیں۔ میں بھلا آپ کو کیا سمجھاؤں گا۔ کوئی بھی قانونی کارروائی کرنے کے لیے ہمیں بھی کچھ دیکھنا اور سوچنا پڑتا ہے۔ ان لوگوں کی شکایت 'مدعی سست، گواہ چست' کی زندہ

مثال تھی۔ اُصولی طور پر زاہدہ یا خدیجہ کو میرے پاس آنا چاہیے تھا اور میں نے ان سے کہا بھی یہی تھا وہ ان ماں بیٹی میں سے کسی کو میرے پاس لے آئیں تو میں ان کی شکایت دور کرنے کی کوشش کروں گا لیکن.....!'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''.....لیکن ان کے بجائے اگلے روز مقتول خود مجھ سے ملنے تھانے آ گیا اور اس نے مجھے بالکل مختلف کہانی سنائی۔ میں نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ اس کے خلاف میرے پاس ایک سنگین نوعیت کی شکایت درج کرائی گئی ہے۔ وہ اپنی بیوی خدیجہ اور سوتیلی بیٹی زاہدہ کے ساتھ بڑا ظالمانہ برتاؤ کرتا ہے۔ اس پر وہ بڑی بڑی قسمیں کھا کر مجھے یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ مجھے بالکل غلط بتایا گیا ہے جبکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ وہ اپنی بیوی اور سوتیلی بیٹی کا بہت خیال رکھتا ہے۔ بیوی سے چھوٹا موٹا جھگڑا ہو جانا الگ بات ہے لیکن اس نے کبھی زاہدہ کو اُف تک نہیں کہی۔ بہرحال، میں نے اسے سمجھا بجھا کر رُخصت کر دیا تھا۔ اس سے اگلے روز اسے قتل کر دیا گیا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''آئی او صاحب! آپ نے بتایا ہے، مقتول اس خدشے کے ساتھ آپ کے پاس پہنچا تھا کہ ملزمہ سے اس کی جان کو خطرہ ہے۔ کیا اس نے اس خدشے کا کوئی سبب بھی بتایا تھا؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس کا کہنا تھا، ملزمہ اس سے شدید نفرت کرتی ہے۔''

''اس نے اس شدید نفرت کی وجہ بھی بتائی ہوگی؟''

''ملزم کو گوارا نہیں تھا کہ کوئی دوسرا شخص اس کے باپ کی جگہ لے۔'' آئی او نے جواب دیا۔

''پھر تو اسے اپنی ماں سے بھی نفرت کرنا چاہیے تھی؟'' میں نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔ ''کیونکہ اس کی مخالفت کے باوجود بھی خدیجہ نے اپنی مرضی سے یہ شادی کی تھی؟''

''ہوسکتا ہے وہ اپنی ماں خدیجہ سے بھی نفرت کرتی ہو۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''مجھے ان کے گھریلو حالات کا تفصیلی علم نہیں ہے۔''

میں نے سوالات کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے انکوائری آفیسر سے پوچھا۔ ''مجھے پتا چلا ہے، آلۂ قتل تلاش کرنے میں آپ کو ایک بھی پاپڑ نہیں بیلنا پڑا تھا۔ وہ تیز دھار چھری جس کی مدد سے مقتول کی شہ رگ کاٹی گئی وہ مقتول کے بیڈ کے نیچے پڑی مل گئی تھی۔ اس خون آلود چھری کو آپ نے فوراً اپنے قبضے میں کر لیا تھا؟''

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ''آپ کو بالکل درست پتا چلا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''آلۂ قتل کو قبضے میں کرتے ہی آپ نے اس پر سے فنگر پرنٹس تو ضرور اٹھائے ہوں گے لیکن پتا نہیں، فنگر پرنٹس کی رپورٹ دیکھنے کو کیوں نہیں ملی؟''

''وہ رپورٹ اس لیے آپ کی نظر سے نہیں گزری کہ فنگر پرنٹس اٹھانے میں کامیابی نہیں ہوسکی تھی۔'' شفیع شاہ نے جواب دیا۔

''کیوں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ اس لیے کہ آلۂ قتل پھل سے لے کر دستے تک خون میں لتھڑا ہوا تھا۔'' آئی او وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ایک آدھ معمولی سی کھلی جگہ ملی لیکن وہاں کوشش کرنے کے باوجود بھی قاتل کی انگلیوں کے نشانات کو حاصل نہیں کیا جا سکا۔ آپ اسے ایک اتفاق سمجھیں..... یا پھر ملزمہ کی خوش قسمتی!''

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور معنی خیز انداز میں کہا۔ ''میں اسے اتفاق سے زیادہ ملزمہ کی بدقسمتی سمجھوں گا۔''

''بدقسمتی.....!'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں دُہرایا۔ ''وہ کیوں وکیل صاحب؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''بدقسمتی اس لیے کہ اگر آپ آلۂ قتل پر سے قاتل کی انگلیوں کے نشانات اٹھانے میں کامیاب ہو جاتے تو اسی لمحے میری مؤکل کی بے گناہی ثابت ہو جاتی کیونکہ آپ کو کہیں بھی ملزم کے فنگر پرنٹس نہ ملتے اور جو پرنٹس آپ کو حاصل ہوتے وہ ملزم کی انگلیوں کے نشانات سے قطعی مختلف ہوتے۔''

میرا بیان کردہ نکتہ پتا نہیں اس کی سمجھ میں آیا تھا یا نہیں، بہرحال وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''یقیناً آپ نے جائے وقوعہ کا بڑی تفصیل سے معائنہ کیا ہوگا۔ میں نے اپنی کوشش کے تحت کچھ معلومات حاصل کر لی ہیں۔ آپ سے ان کی تصدیق چاہوں گا۔ واضح رہے کہ ملزمہ کی والدہ خدیجہ ان معلومات کی تصدیق کر چکی ہے.....!''

''ٹھیک ہے، پوچھیں، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا یہ دُرست ہے کہ جائے وقوعہ یعنی مقتول کا بیڈروم دس ضرب بارہ فٹ کی پیمایش کا حامل کمرا ہے اور اس ایک کونے میں بیڈ بچھا ہوا ہے۔ بیڈ کی پیمایش پانچ

بائی چھ فٹ ہے؟''

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی معلومات درست ہیں۔''

اس کے جواب دینے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے توقع کر رہا ہو، میں جرح کی پٹاری میں سے کوئی خطرناک سانپ برآمد کرنے والا ہوں۔ میں نے اس کی توقع کو پورا کرتے ہوئے کہا۔

''آئی او صاحب! اس بیڈروم میں داخل ہونے کا راستہ مغربی دیوار میں ہے جبکہ مذکورہ بیڈ مغربی اور شمالی دیوار کے اتصال سے بننے والے کونے میں بچھا ہوا ہے..... اور وہ بھی اس طرح کہ بیڈ کا سرہانہ دیواروں سے بننے والے کونے کی سمت ہے۔ اسی بیڈ پر لیاقت حسین کو سوتے میں قتل کیا گیا ہے..... اور اسی بیڈ کے نیچے سے آپ کو آلۂ قتل ملا تھا؟''

''جی..... جی۔ آپ بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے استفسار کیا۔ ''آپ نے آلۂ قتل یعنی اس خطرناک چھری پر بھی تحقیق فرمائی ہے جس کے نتیجے میں آپ کو پتا چلا تھا کہ وہ اس گھر میں استعمال ہونے والی چھری نہیں تھی بلکہ وہ اس گھر کے لیے ایک نئی چیز تھی؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''جی ہاں، خدیجہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس چھری کا ان کے گھر سے کوئی تعلق نہیں۔''

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہمیں بتاتی ہے کہ مقتول کو سوتے میں قتل کیا گیا تھا۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''اور اس کی موت کا وقت رات سات اور آٹھ بجے کے درمیان ہے۔ یہ ایک ایسا وقت ہے جب رات کا آغاز ہوتا ہے۔ کیا آپ مجھے بتانا پسند فرمائیں گے کہ مقتول رات شروع ہوتے ہی ایسی بے خبری کی نیند کیوں سو رہا تھا کہ کسی نے اس کی گردن کاٹ کر اسے موت کی نیند سلا دیا اور اسے مطلق خبر نہ ہو سکی؟''

''آپ کے اس سوال کا بالکل منشی جواب تو ملزمہ کی ماں خدیجہ ہی دے سکتی ہے۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''میری معلومات یہ ہیں کہ اس روز مقتول کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔''

''او کے! میں آپ کی موجودگی میں یہ سوال مقتول کی بیوہ خدیجہ سے ضرور پوچھوں گا۔'' میں نے مصالحانہ انداز میں کہا۔ ''آپ یہ بتائیں کہ جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو آپ نے مقتول کو کس حالت میں دیکھا تھا؟''

''مردہ حالت میں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''میں اس کی لاش کی پوزیشن کے بارے میں پوچھ رہا ہوں؟''

''وہ اپنے بستر پر چت لیٹا تھا۔'' آئی او میرے سوال کی تہ میں اترتے ہوئے بولا۔ ''اور اس کی گردن، شہ رگ پر سے کٹی ہوئی تھی.....!''

''یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب اس کی گردن پر چھری چلائی گئی تو اس نے خاموشی سے جان دے دی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ''وہ جیسا چت لیٹا تھا، بالکل ویسا ہی پڑا رہا؟''

وہ جلدی سے بولا۔ ''آپ میرا مطلب سمجھ نہیں سکے یا پھر میں اپنی بات کی وضاحت نہیں کر سکا ہوں.....''

''جی، میں سن رہا ہوں۔ آپ ارشاد فرمائیں!'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''میں دراصل یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ میرے خیال میں جب مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تو وہ اپنے بیڈ پر چت سویا ہوا تھا۔ گردن کٹنے کے سبب اس کے بدن میں حرکت پیدا ہوئی اور اس کی پوزیشن وہ نہ رہی جو پہلے تھی..... میں نے جب اس کی لاش کو دیکھا تو وہ کم و بیش کروٹ کے بل بیڈ کے سرے پر پہنچا ہوا تھا.....!''

''کون سے سرے پر؟'' میں نے اس کے خاموش ہوتے ہی سوال داغ دیا۔

''وہ سرا جو دیوار کی جانب ہے۔'' آئی او نے جواب دیا۔

''شمالی دیوار والا سرا نا؟''

اس نے آنکھیں بند کر کے اپنے ذہن میں جائے وقوعہ کے نقشے کو تازہ کیا پھر آنکھیں کھولتے ہوئے بولا۔ ''بالکل..... بالکل! بیڈ کی ایک سائیڈ کمرے کی شمالی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ہے اور دوسری سائیڈ سے بیڈ پر اترنا چڑھنا ہوتا ہے۔ اگر اس کا مردہ جسم اس سمت میں بیڈ پر پڑا ہوا ملتا تو پھر دیوار کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''بستر کی حالت اور اس پر لگے ہوئے خون کے دھبوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ موت کے منہ میں جانے سے قبل مقتول بیڈ کی دیوار والی سائیڈ ہی میں چت لیٹا ہوا تھا۔''

''تھینک یو آئی او صاحب!'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا پھر اچانک ہی اس سے پوچھ لیا۔ ''کیا آپ کو معلوم

ہے، اس کیس کی ملزمہ اور میری مؤکل زاہدہ لیفٹ ہینڈر ہے؟''

''نن..... نہیں.....'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''ہاں..... ہاں.....''

جج نے چونک کر انکوائری آفیسر کی طرف دیکھا اور قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''شاہ جی! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ آپ نے وکیل صاحب کے ایک سوال کے دو مختلف جواب دیے ہیں..... کیوں؟''

وہ اُلجھ تو چکا ہی تھا، سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے وضاحت پیش کی۔ ''وہ جناب عالی! بات دراصل یہ ہے کہ وکیل صفائی نے اتنا اچانک یہ سوال کیا ہے کہ میں تھوڑا اِدھر اُدھر ہوگیا تھا۔ میرا مطلب ہے میرا دھیان اِدھر اُدھر ہوگیا تھا جبکہ..... میں جانتا ہوں، ملزمہ بائیں ہاتھ سے لکھنے اور کام کرنے کی عادی ہے۔ میں نے اس کی حرکات وسکنات کا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے اور ایک دو ضروری کاغذات پر اسے دستخط کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے.....''

''یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آپ نے ملزمہ کی حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لیا ہے۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔

اس پیشی پر ہمارے کیس کا نمبر خاصا پیچھے لگا ہوا تھا اس لیے کارروائی کے لیے زیادہ وقت نہ مل سکا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے سلمٰی نامی ایک عورت کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ سلمٰی بھی گولیمار ہی کی رہنے والی تھی۔ اس کا گھر خدیجہ والی گلی میں چار گھر چھوڑ کر واقع تھا۔ وہ واجبی سی شکل وصورت کی مالک ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔

سلمٰی نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کروادیا۔ اس کے بعد وکیلِ استغاثہ جج کی اجازت سے گواہوں والے کٹہرے کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور استغاثہ کی گواہ سلمٰی کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ کو اس محلے میں رہتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، خود کو گولیمار ہی کی گلیوں میں دیکھا ہے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ ''بزرگ بتاتے ہیں کہ وہ شروع سے وہیں رہ رہے ہیں۔''

''شروع'' سے پتا نہیں اس کی کیا مراد تھی۔ یہ دنیا شروع ہوتے وقت یا قیامِ پاکستان کے ابتدائی دنوں سے؟ چونکہ وکیلِ استغاثہ نے اس سلسلے میں کوئی وضاحت ضروری نہیں سمجھی تھی اس لیے گواہ نے ازخود کوئی تفصیل بیان کرنے کی کوشش نہیں کی۔

''پھر تو آپ ملزمہ اور اس کے گھر والوں کو بڑی اچھی طرح جانتی ہوں گی؟'' وکیلِ استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

گواہ نے ملزمہ زاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''جی..... بہت اچھی طرح!''

''ملزمہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

''یہ بہت ہی غصہ ور ہے۔'' استغاثہ کی گواہ نے جواب دیا۔ ''ایک دم آگ کا گولا!''

''اس کا مطلب ہے ملزمہ سے اکثر آپ کی بات چیت ہوتی رہتی تھی؟''

''جب ایک محلے..... ایک گلی میں رہیں گے تو لازمی بات ہے، اٹھتے بیٹھتے..... آتے جاتے بات چیت تو ہوگی ہی۔''

وکیلِ استغاثہ نے اس سے پوچھا۔ ''ٹھیک ہے، بعض لوگوں کو کم غصہ آتا ہے اور بعض افراد کو زیادہ لیکن آپ نے خاص طور پر ملزمہ کے لیے ''آگ کا گولا'' کے الفاظ کیوں استعمال کیے ہیں..... کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

میں بخوبی سمجھ رہا تھا، وکیلِ استغاثہ اس انداز میں جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کون سی منزل تک پہنچانا چاہتا ہے لہٰذا خاموشی سے اس کی کارروائی دیکھتا رہا۔

استغاثہ کی گواہ سلمٰی نے اس کے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''میں نے ملزمہ کو آگ کا گولا اس لیے کہا ہے کہ اس کے غصے میں ایک خاص قسم کا انتقامی جارحانہ پن پایا جاتا ہے۔ یہ جسے نشانے پر رکھ لیتی ہے پھر اس کے خلاف سوچتے ہوئے اسے کسی بات کی پروا نہیں رہتی۔ اسے کچھ پتا نہیں ہوتا کہ یہ کیا کررہی ہے..... کیا کہہ رہی ہے..... آپ اسے آتشی مزاج کہہ سکتے ہیں.....''

''ہوں!'' وکیلِ استغاثہ نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ''کیا آپ معزز عدالت کے روبرو ملزم کی آتش مزاجی کی کوئی مثال پیش کرسکتی ہیں؟''

میں وکیلِ استغاثہ کی چال کو شروع ہی میں سمجھ گیا تھا۔ اب اس کے عزائم کھل کر سامنے آرہے تھے۔ سلمٰی نے اس کے استفسار کے جواب میں بڑے دھڑلے سے ملزمہ کی سمت

انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''سب سے بڑی مثال تو آپ کے سامنے ہے وکیل صاحب! ملزمہ اپنے سوتیلے باپ سے شدید نفرت کرتی تھی اور بالآخر اس نفرت نے ملزمہ کو آج عدالت میں لا کھڑا کیا ہے۔ اگر یہ لڑکی اپنے غصے اور جلال کو قابو میں رکھتی تو اسے یہ دن نہ دیکھنا پڑتے۔''

وکیل استغاثہ بڑی پلانگ سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے گواہ کے جواب ہی میں سے ایک نکتے کو اُچک لیا اور قدرے اضطراری انداز میں استغاثہ کی گواہ سلمٰی سے پوچھا۔

''کیا کبھی ملزمہ نے آپ کے سامنے اپنی اس نفرت کا اظہار بھی کیا تھا جو وہ سوتیلے باپ یعنی مقتول لیاقت حسین کے لیے اپنے دل میں رکھتی تھی؟''

''کوئی ایک بار کیا؟'' سلمٰی نے مخصوص انداز میں اپنے ہاتھ کو حرکت دی اور جواب کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''اس نے کئی مرتبہ اس سلسلے میں مجھ سے بات کی تھی۔ میں نے ہر دفعہ اسے سمجھایا کہ اس کی ماں خدیجہ نے جو بھی کیا وہ حالات کا تقاضا تھا۔ دوسری شادی کرنا کوئی جرم یا گناہ کا کام نہیں ہے۔ ٹھیک ہے، وہ اپنے باپ مظفر علی سے بہت زیادہ محبت کرتی تھی۔ میں مانتی ہوں، مظفر تھا بھی اسی لائق کہ دوسرے اس سے محبت کریں مگر یہ تو کوئی طریقہ یا اُصول نہیں کہ وہ سگے باپ کی محبت کو سوتیلے باپ سے نفرت میں بدل دے۔ وہ مقتول کو مرحوم کا مقام نہیں دینا چاہتی، نہ دے لیکن اس کے بدلے میں شدید نفرت کی تو کوئی تک نہیں بنتی نا۔ میں آپ کو بتاؤں.....'' وہ تھوڑی دیر کے لیے متوقف ہوئی، دو چار گہری گہری سانسیں کھینچیں پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں، تو میں آپ کو بتا رہی تھی کہ میں نے ایک دو بار ملزمہ کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا تھا کہ یہ مقتول سے اس قدر نفرت کرتی ہے کہ اگر اسے موقع ملا تو وہ اس کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرے گی اور..... آپ دیکھ لیں.....'' وہ معنی خیز انداز میں متوقف ہوئی پھر ایکوزڈ باکس میں کھڑی ملزمہ کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''..... اس آگ کے گولے نے آخر اپنے سینے میں دہکتے ہوئے نفرت اور انتقام کے الاؤ کو ٹھنڈا کر ہی لیا۔''

وکیل استغاثہ اپنے گواہ کی زبانی معزز عدالت کو جو کچھ باور کرانا چاہتا تھا، اپنی عقل و فہم کے مطابق وہ اس میں کامیاب ہو گیا تھا لہٰذا اس نے فاتحانہ انداز میں میری جانب دیکھتے ہوئے جرح کے سلسلے کو موقوف کر دیا۔ میں اپنی باری پر اٹھا اور گواہ والے کٹہرے کے نزدیک پہنچ گیا۔

میں نے استغاثہ کے گواہ سلمٰی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے براہِ راست سوال کیا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے بتایا ہے کہ ملزمہ آپ کی گلی میں رہتی تھی اور اکثر و بیشتر آپ کو اس کے خیالات جاننے کا بھی موقع ملتا رہتا تھا۔ ذرا سوچ کر جواب دیں، کیا کبھی ملزمہ نے آپ کو بھی کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش کی؟''

''مجھے وہ کیوں نقصان پہنچائے گی؟'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''مجھ سے اس کی کیا دشمنی؟''

''یعنی آپ تسلیم کرتی ہیں کہ ملزمہ آپ کی دشمن نہیں ہے؟''

''ہاں..... ہاں۔ اس میں ایسی اُلجھن والی کون سی بات ہے۔''

''اگر وہ آپ کی دشمن نہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اسے اپنا دوست سمجھتی ہیں؟''

وہ میرے سوالات میں اُلجھ کر رہ گئی۔ متاملانہ انداز میں بولی۔ ''یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ آپ جسے اپنا دشمن نہ سمجھیں وہ آپ کا دوست بھی ہو۔ میری ملزمہ سے کبھی دوستی رہی ہے اور نہ ہی دشمنی۔''

''جب آپ کی ملزمہ سے کبھی دشمنی نہیں رہی تو پھر آپ اس کیس میں اس سے دشمنی کرتے ہوئے کیوں دکھائی دے رہی ہیں؟'' میں نے خاصے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔

وہ گڑبڑا کر رہ گئی، مجھ سے پوچھنے لگی۔ ''مم..... میں نے..... کیا دشمنی کی ہے.....؟''

میں نے اسے تیز نظر سے گھورا اور خاصے سخت الفاظ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''سلمٰی بیگم! آپ نے وکیلِ استغاثہ کی جرح کے جواب میں معزز عدالت کے روبرو بتایا ہے کہ ملزمہ انتہائی غصہ ور، منتقم مزاج اور جارحانہ انداز کی مالک ہے۔ یہاں تک کہ آپ نے اسے آگ کے گولے سے تشبیہ دے ڈالی۔ یہ بھی کہا کہ ملزمہ جس شخص کو نشانے پر رکھ لیتی ہے، اس کے خلاف سوچتے اور عمل کرتے ہوئے اسے کسی بات کی پروا نہیں ہوتی۔ انہی خصوصیات کی بنا پر آپ نے ملزمہ کو ''آگ کا گولا''، ''آتش مزاج'' اور پتا نہیں، کون کون سے خطاب دے ڈالے ہیں۔ جو شخص آپ کا دوست ہو اور نہ ہی دشمن، اس کے بارے میں اس نوعیت کی بیان بازی کیا معنی رکھتی ہے؟ کیا یہ ملزمہ کے لیے آپ کی کھلی دشمنی نہیں ہے؟''

اس نے بوکھلاہٹ آمیز انداز میں اپنے زیریں ہونٹ کو

دانتوں سے دبایا پھر خاصے منتشر لہجے میں بولی۔ ''میں نے ملزمہ کی عادت واطوار اور مزاج کو جیسا پایا وہی بیان کیا ہے۔ میرے اس عمل سے کہیں بھی دشمنی نہیں جھلکتی۔''

''بہت خوب.....!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''تو اس کا مطلب ہے آپ نے معزز عدالت کو حقائق سے آگاہ کر کے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے کیونکہ استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے یہ آپ کا حق بنتا تھا۔'' میں لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''سلمٰی بیگم! آپ کے بیان سے تو یہی تاثر اُبھرتا ہے کہ آپ نے ملزمہ کو اپنی آنکھوں سے وہ جرم کرتے دیکھا ہے جس کے الزام میں وہ اس وقت ملزموں والے کٹہرے میں کھڑی نظر آرہی ہے؟''

''مم..... میں نے ایسی تو..... کوئی بات نہیں کی..... کہ میں نے.....'' وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''..... کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ملزمہ کو اپنے سوتیلے باپ کا قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے..... آپ شاید میری بات سمجھ نہیں سکے یا..... آپ اس کا غلط مطلب نکال رہے ہیں.....!''

وہ اپنے قدموں سے اُکھڑ چکی تھی۔ اس کی بنیاد کو ہلا کر میں نے اپنے لیے راہ ہموار کرلی تھی۔ وکیلِ استغاثہ نے اسے جہاں تک سبق یاد کروا رکھا تھا، میں نے پرچۂ امتحان اس سے تھوڑا آگے سے ترتیب دے ڈالا تھا اسی لیے میرے سوالات کے جواب دیتے ہوئے وہ خاصی دقت محسوس کررہی تھی۔ میں نے جرح کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا۔

''سلمٰی بیگم! الفاظ کو گھمانے پھرانے سے اگرچہ مفہوم میں تھوڑی بہت تبدیلی پیدا کی جاسکتی ہے لیکن اس سے اصل واقعے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ میں نے آپ کے الفاظ کا غلط مطلب نکالا ہے اور نہ ہی ایسی بات ہے کہ میں انہیں سمجھ نہ پایا ہوں۔''

میں نے تھوڑا توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے چند منٹ پہلے وکیلِ استغاثہ کو بتایا ہے کہ آپ نے اکثر و بیشتر ملزمہ کو یہ کہتے سنا تھا کہ وہ اپنے سوتیلے باپ سے شدید نفرت کرتی ہے اور اگر اسے موقع ملا تو وہ اس کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ پھر آپ نے ملزمہ پر اُنگلی اٹھاتے ہوئے بڑے وثوق سے کہا..... دیکھ لیں، اس آگ کے گولے نے آخر اپنے سینے میں دہکتے ہوئے نفرت اور انتقام کے الاؤ کو ٹھنڈا کر ہی لیا۔ آپ کے یہ دوٹوک الفاظ اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ آپ ملزمہ کے مجرم ہونے کے لیے پُریقین ہیں۔ یعنی آپ نے اپنی آنکھوں سے ملزمہ کو لیاقت حسین کا قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے؟''

میں نے اسے ایک ایسی بند گلی میں لا کھڑا کیا تھا کہ وہ گھبرا کر راستے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے لگی اور بالآخر اس کی متلاشی نظر وکیلِ استغاثہ کے چہرے پر جا ٹکی لیکن قبل اس کے کہ وکیلِ استغاثہ ''آبجیکشن یور آنر!'' کا نعرہ لگاتا، میں نے گواہ کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے خاصے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''سلمٰی بیگم! آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اگر کوئی کنفیوژن ہو تو میں اپنا سوال دُہرا دیتا ہوں۔''

وہ جلدی سے بولی۔ ''کوئی کنفیوژن نہیں..... میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی..... میرا مطلب ہے، میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ میں نے ملزمہ کو قتل کی واردات کرتے ہوئے دیکھا ہے.....!''

''اس بات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ملزمہ کو بے گناہ سمجھتی ہیں؟'' میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''مم..... میں نے ایسی بھی کوئی بات نہیں کی.....!'' وہ بری طرح اُلجھ کر رہ گئی تھی۔

وکیلِ استغاثہ فوراً اس کی مدد کو لپک آیا۔ میں نے گواہ سلمٰی بیگم کو سوالات کی جس منجدھار میں لا پھینکا تھا اگر وہاں بھی وکیلِ استغاثہ اسے بچانے کے لیے اپنا ہاتھ آگے نہ بڑھاتا تو پھر اس کی وکالت کا کیا جواز باقی رہ جاتا تھا۔

''مجھے سخت اعتراض ہے جنابِ عالی!'' وکیلِ استغاثہ کی چیختی ہوئی آواز عدالت کے کمرے میں اُبھری۔ ''میرے فاضل دوست، استغاثہ کی معزز گواہ کو ذہنی اُلجھاؤ میں ڈال کر زِچ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ انہیں اس قسم کی حرکتوں سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔''

میں نے اس کے حملے کا جواب دینا ضروری جانا اور جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یور آنر! میں نے فی الواقعہ ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ گواہ کے بیان میں موجود الفاظ کے جو معنی اور مفہوم اُبھر کر سامنے آتا ہے، میں نے تو اس تاثر کی بات کی ہے۔ استغاثہ کے گواہ سلمٰی بیگم نے جس اعتماد کے ساتھ میری مؤکل کو آگ کا گولا قرار دیتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے اپنے سینے میں دہکتے ہوئے نفرت اور انتقام کے الاؤ کو ٹھنڈا کرلیا ہے..... اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ گواہ کو پورا یقین ہے کہ مقتول کی موت کی ذمے دار صرف اور صرف ملزمہ ہے۔ یہ وثوق، یہ اعتماد اور یہ یقین اسی صورت میں پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر گواہ نے اپنی آنکھوں سے ملزمہ کو قتل

کی واردات کرتے دیکھا ہو۔ دیٹس آل یور آنر!''

جج نے سوالیہ نظر سے وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ کیا کہتے ہیں وکیل صاحب، اپنے گواہ کے بیان کے بارے میں؟''

وکیلِ استغاثہ نے جج کو جواب دینے سے پہلے گھور کر معاندانہ نظر سے میری طرف دیکھا پھر روئے سخن جج کی سمت موڑتے ہوئے بولا۔

''جنابِ عالی! استغاثہ کے گواہ ایک سیدھی سادی گھریلو عورت ہے۔ وہ میرے فاضل دوست کی طرح الفاظ کے گھماؤ پھراؤ کے فن سے آشنا نہیں اس لیے وکیلِ صفائی نے اس کے الفاظ کو پکڑ کر اتنا بڑا طوفان کھڑا کر دیا ہے کہ وہ اس کے نیچے دبی اور پھنسی ہوئی دکھائی دیتی ہے حالانکہ اس کا مطلب ہرگز وہ نہیں تھا جو وکیلِ صفائی سمجھ رہے ہیں.....!''

''پھر کیا مطلب تھا اس کا؟'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی گیپ دیکھ کر تیز شاٹ کھیل دیا۔ ''آپ وکیلِ استغاثہ ہیں۔ استغاثہ کے گواہ کے بیان کی وضاحت آپ ہی بہتر انداز میں کر سکتے ہیں۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے معنی خیز انداز میں جج کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور سوالیہ نظر سے وکیلِ استغاثہ کی سمت دیکھنے لگا۔ وکیلِ استغاثہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔

''جنابِ عالی! بات دراصل یہ ہے کہ استغاثہ کے گواہ سلمٰی بیگم نے ملزمہ کو اپنی آنکھوں سے قتل کی واردات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو یہ ''عینی شاہد'' کہلاتی۔ استغاثہ کی طرف سے اسے کہیں بھی ''آئی وٹنس'' یعنی عینی شاہد نہیں کہا گیا۔ اس بے چاری نے تو ملزمہ کے مزاج، عادات اور عزائم کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے مگر اپنی سادگی کے باعث وکیلِ صفائی کے شکنجے میں پھنس کر رہ گئی ہے جبکہ سیدھی اور سچی بات یہ ہے کہ.....'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

''یور آنر! انسان کی سوچ اور بیان اس کے ماحول سے ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ ملزمہ زاہدہ کو اس کے سوتیلے باپ لیاقت حسین کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے عدالت تک پہنچایا گیا ہے۔ اکیوزڈ باکس (ملزموں والے کٹہرے) میں اسے کھڑے دیکھ کر ہر دیکھنے والے کے ذہن میں یہی خیال جاگے گا کہ اس نے کوئی نہایت ہی سنگین جرم کیا ہوگا۔ گواہ چونکہ وقوعہ کی سنگینی سے بھی بخوبی آگاہ ہے لہٰذا اس نے حالاتِ حاضرہ اور ملزمہ کے خطرناک خیالات کی روشنی میں کہہ دیا..... اس آگ کے گولے نے اپنے سینے میں دہکتے ہوئے نفرت اور انتقام کے الاؤ کو ٹھنڈا کر لیا..... بس اتنی سی بات ہے۔''

وکیلِ استغاثہ نے نہایت ہی محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے اپنے گواہ کے بیان پر مرمت کاری کرنے کی کوشش کی تھی۔ جج نے اُکتائے ہوئے انداز میں اس کی وضاحت سنی اور اس کے خاموش ہونے پر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

''بیگ صاحب! یہ عدالتِ استغاثہ کے گواہ سلمٰی بیگم کے بیان کو یہاں تک محدود کرتی ہے کہ اس نے ملزمہ کی باتوں اور خیالات میں اپنے سوتیلے باپ کے لیے شدید نوعیت کی نفرت کو محسوس کیا تھا۔ اسی بنا پر اس کا اندازہ ہے کہ ملزمہ نے اپنے خیالات اور عزائم کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اپنے سوتیلے باپ لیاقت حسین کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ اس نے ملزمہ کو جرم کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''یو آر کیشن یور آنر!'' میں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔ ''آئی ایگری.....''

جج نے وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! آپ کو گواہ کے بیان کی اس شکل پر کوئی اعتراض ہو تو بتائیں؟''

وکیلِ استغاثہ اس موقع پر کوئی اعتراض اٹھا کر خود کو کسی بڑی مصیبت میں گرفتار کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ جج نے ایک انتہائی معقول اور اُصولی بات کی تھی۔ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بڑی فرماں برداری سے بولا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے جنابِ عالی!''

''آپ کو استغاثہ کی گواہ سے کوئی اور سوال پوچھنا ہے؟'' جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جنابِ عالی!''

میں نے سلمٰی بیگم کو فارغ کیا تو استغاثہ کی جانب سے یکے بعد دیگرے دو گواہوں کو شہادت کے لیے پیش کیا گیا۔ ان میں ایک قمر النسا نامی عورت تھی۔ اس کا بیان اور مقاصد سلمٰی بیگم سے بڑی حد تک ملتے جلتے تھے لہٰذا میں نے صرف دس منٹ کی جرح ہی میں اسے کلین بولڈ کر دیا۔

دوسرے گواہ کا نام طیب علی معلوم ہوا۔ اس کا بیان پولیس کے مؤقف کی حمایت کرتا تھا یعنی مقتول نے اپنی موت

سے قبل گواہ طیب علی سے اپنے اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ ملزمہ کی طرف سے اسے جان کا خطرہ ہے لیکن طیب علی کے پاس کوئی ثبوت تھا اور نہ ہی اپنی بات کو منوانے کے لیے کوئی ٹھوس دلیل۔ مقتول دوبارہ زندہ ہوکر اس کے مؤقف کی تصدیق نہیں کرسکتا تھا لہٰذا میں نے کڑی جرح کی مدد سے جلد ہی طیب علی کو کارنر کردیا۔

ان دونوں گواہوں کے بیانات میں کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی کہ جس کی تفصیل بیان کی جائے۔ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوا تو جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

''دی کورٹ اِز ایڈ جارنڈ.....!''

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا۔

گواہوں والے کٹہرے میں ملزمہ کی ماں اور مقتول کی بیوہ خدیجہ بیگم کھڑی تھی۔ آج اس نے خاصا سوبر لباس زیب تن کررکھا تھا اور میک اپ وغیرہ پر بھی محنت اور وقت صرف کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اس سیشن کی سب سے اہم گواہ تھی۔ ایک اعتبار سے اسے اس کیس میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

خدیجہ نے اپنا طویل اور سنجیدہ بیان ریکارڈ کرایا پھر دونوں طرف کے وکلا کے سوالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔ یہ بڑی عجیب صورتِ حال تھی کہ میں خدیجہ کے ایما پر اس کی بیٹی کا کیس لڑتے ہوئے ملزمہ زاہدہ کو باعزت بری کرانے کی کوشش کررہا تھا اور وکیل استغاثہ، استغاثے کی سربلندی قائم رکھنے کے لیے ملزمہ کو گواہ کے شوہر کے قتل کے الزام میں عدالت سے کڑی سزا دلوانے کا خواہاں تھا۔ اس تناظر میں مجھ پر دُہری ذمے داری عائد ہوتی تھی۔ مجھے نہ صرف یہ کہ زاہدہ کو بے قصور ثابت کرتے ہوئے اس مصیبت میں سے بڑی خوب صورتی سے نکالنا تھا بلکہ کچھ ایسا بندوبست بھی کرنا تھا کہ لیاقت حسین کے اصل قاتل کی نشاندہی بھی ہوجائے۔ میرے لیے یہ ایک طرح کی کڑی آزمایش تھی۔

جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد وکیل استغاثہ گواہ والے کٹہرے کے پاس آگیا اور جرح کے سلسلے کا آغاز کرتے ہوئے اس نے خدیجہ سے سوال کیا۔ ''خدیجہ بیگم! کیا یہ درست ہے کہ مقتول تمہارا دوسرا شوہر تھا؟''

''جی ہاں، یہ درست ہے۔'' خدیجہ نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''آپ کو اس حقیقت سے انکار تو نہیں کہ ملزمہ اپنے سوتیلے باپ کو سخت ناپسند کرتی تھی..... بلکہ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ مقتول سے شدید نفرت کرتی تھی۔''

''یہ عین فطری بات ہے۔'' خدیجہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''شدید نفرت''..... کے الفاظ مناسب نہیں ہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ زاہدہ کو یہ شادی پسند نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے سوتیلے باپ سے خاصی اُکھڑی اُکھڑی رہتی تھی اور..... جیسا کہ میں نے بتایا، یہ زاہدہ کا فطری ردِعمل تھا..... وہ اپنے باپ مظفر علی سے بہت محبت کرتی تھی۔''

وکیل استغاثہ خاصے جارحانہ انداز میں متفسر ہوا۔ ''کیا یہ غلط ہے کہ ملزمہ نے اس شادی کی بھرپور مخالفت کی تھی لیکن اس کی مخالفت اور ناپسندیدگی کے باوجود بھی آپ نے مقتول سے شادی کرلی؟''

''یہ غلط نہیں ہے۔'' خدیجہ نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

وکیل استغاثہ کی لفظی جارحیت کچھ اور آگے بڑھی۔ ''کیا آپ اس بات سے انکار کرسکتی ہیں کہ اس شادی کے سلسلے میں آپ نے اپنی بیٹی کے جذبات واحساسات کی پروا اس لیے نہیں کی کہ مقتول نے اپنی چالبازیوں کا جال پھیلا کر آپ کو بری طرح جکڑ لیا تھا۔ وہ ایک خاص پلاننگ سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے خود کو آپ کا کزن ثابت کرکے پہلے آپ کے دل میں جگہ بنائی پھر گھر میں ڈیرا ڈال لیا۔ جب آپ پوری طرح اس کے شیشے میں اتر گئیں تو آپ کو اس شادی کے لیے مجبور ہونا پڑا؟''

''میں مرنے والے کی برائی کرکے خود کو گناہ گار نہیں بنانا چاہتی۔'' خدیجہ نے سادگی سے جواب دیا۔

اس جواب سے وکیل استغاثہ کی تسلی نہیں ہوئی، وہ ترش لہجے میں بولا۔ ''خدیجہ بیگم! مجھے آپ کے گناہ وثواب سے کوئی مطلب نہیں۔ آپ میرے سوال کا جواب ''ہاں'' یا ''نہ'' میں دیں۔''

یہ تمام وہ حقائق تھے جو میں نے دانستہ آپ سے چھپا لیے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر انہیں آپ کے سامنے لاؤں گا اور..... یہ انتہائی موزوں موقع تھا۔ وکیل استغاثہ مقتول کی جن ''خوبیوں'' کا ذکر کررہا تھا وہ بالکل درست تھیں۔ مقتول ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت ہی اس گھر میں گھسا تھا۔ بہرحال، وکیل استغاثہ نے جو زاویہ پکڑ رکھا تھا وہ میری مؤکل کے خلاف جاتا تھا۔ وہ ان حقائق کے افشا سے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ملزمہ انہی ''اوصاف'' کی بنا پر مقتول سے شدید نفرت

کرتی تھی اور اسی نفرت میں بالآخر اس نے اپنے سوتیلے باپ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

خدیجہ بیگم نے وکیلِ استغاثہ کے دو ٹوک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''صورتِ حالات واقعی کچھ ایسی ہی تھی۔ میں معزز عدالت کے روبرو یہ تسلیم کرتی ہوں کہ مرحوم لیاقت حسین کی نیت شروع ہی سے اچھی نہیں تھی لیکن جب تک اس کے ارادے کھل کر سامنے آتے، بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں اس مسئلے کا کوئی مناسب حل نکالنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ لیاقت حسین قتل ہو گیا.....''

''آپ نے مقتول کی نیت کے حوالے سے بہت ہی محتاط الفاظ کا سہارا لیا ہے۔'' وکیلِ استغاثہ نے خدیجہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا پھر روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے بولا۔

''یور آنر! استغاثہ کی بنیاد یہ ہے کہ ملزمہ نے شدید نفرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے سوتیلے باپ کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ وہ اپنے سوتیلے باپ سے اس قدر نفرت کیوں کرتی تھی، یہ معزز عدالت کے علم میں آنا بہت ضروری ہے۔ اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں نہایت ہی مختصر الفاظ میں ملزمہ کی نفرت اور مقتول کی پلاننگ کا احوال بیان کرتا ہوں تاکہ ملزمہ کی ذہنی کیفیت اور جذبۂ انتقام کو سمجھنے میں آسانی رہے۔''

''اجازت ہے۔'' وکیلِ استغاثہ کے خاموش ہوتے ہی جج نے بارُعب آواز میں کہا۔

وکیلِ استغاثہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اپنی دانست میں کوئی عظیم کارنامہ انجام دینے کی کوشش کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ''جنابِ عالی! ملزمہ کے باپ مظفر علی کی موت کے بعد یہ ماں بیٹی بالکل اکیلی رہ گئی تھیں۔ چالاک اور مکار قسم کے افراد ایسے بے سہارا لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں رہتے ہیں۔ مقتول بھی ایک ایسا ہی عیار اور چالباز شخص تھا۔ وہ خدیجہ بیگم کے گھر پہنچا۔ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اسے الجھایا اور لمبی چوڑی ضرب تقسیم کے بعد اس نے خود کو خدیجہ کا کزن ثابت کر دیا پھر چند روز بعد ہی وہ ان کے گھر میں مقیم تھا۔ اس نے اپنے بارے میں ایسی دردناک کہانی سنائی کہ خدیجہ فوراً اس سے متاثر ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ پہلے وہ بزنس کرتا تھا، اب سائٹ کی کسی فیکٹری میں ملازم ہے۔ خدیجہ نے اس کی کہانی کا یقین کرتے ہوئے مقتول کو ایک انتہائی ہمدرد، مخلص اور نیک انسان تسلیم کر لیا۔ اسی دوران میں ملزمہ کی شدید مخالفت کے باوجود بھی گواہ نے مقتول سے شادی کر لی۔''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''شادی کے بعد مقتول نے اپنے منصوبے پر عمل کا آغاز کر دیا۔ اس نے گواہ خدیجہ کو یہ راہ سجھائی کہ اگر اس گھر کو بینک میں رہن رکھ کر ایک موٹی رقم حاصل کر لی جائے تو زندگی کو خوشگوار بنایا جا سکتا ہے۔ اس رقم سے وہ اپنے ڈوبے ہوئے بزنس کو دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔ گواہ کو یہ بات معلوم تھی کہ زندگی میں آسانیاں اور آسائشیں لانے کے لیے نوکری کافی نہیں ہوتی۔ اس بات پر اس کی پہلے شوہر سے ہمیشہ لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ مظفر علی مرحوم کبھی بزنس کی طرف نہیں آیا تھا۔ چنانچہ مقتول لیاقت حسین نے گواہ خدیجہ کے سامنے جب بزنس کا آئیڈیا رکھا تو وہ فوراً مان گئی۔ اس ''ماننے'' کے نتیجے میں ایک طویل عرصے کے لیے وہ گھر بینک کی ملکیت بن گیا۔ بینک نے اس رہن کے عوض جو رقم دی، وہ خدیجہ نے مقتول کے ہاتھ پر رکھی اور بڑی شدت سے سہانے دنوں کا انتظار کرنے لگی۔ میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟''

آخری سوالیہ جملہ اس نے ڈنس باکس میں کھڑی خدیجہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب!''

وکیلِ استغاثہ نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے اپنی وضاحت کو آگے بڑھایا۔ ''جنابِ عالی! مقتول نے بڑی ہوشیاری سے ایک بڑی رقم ہتھیالی۔ خدیجہ انتظار کرنے لگی کہ چند دنوں میں مقتول کا بزنس دوڑنے لگے گا اور ان کے گھر میں ہر شے کی ریل پیل ہو جائے گی۔ اس موقع پر بھی ملزمہ نے سخت مخالفت کی تھی کہ خدیجہ اتنا بڑا رسک نہ لے مگر اس کی ماں نے ایک نہیں مانی تھی۔ مقتول بڑی پلاننگ سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اول، اس نے خدیجہ سے شادی کر کے گھر کا آرام و سکون اور مزہ حاصل کر لیا تھا۔ دوم، وہ بزنس کے بہانے ایک بڑی رقم اپنے قبضے میں کر چکا تھا۔ اس نے اپنے طے شدہ مقاصد پورے کر لیے تھے۔ منصوبہ بندی کے مطابق اب اسے بن بتائے چپ چپاتے کہیں غائب ہو جانا چاہیے تھا لیکن ملزمہ کی خاطر وہ اپنے منصوبے کی توسیع میں لگ گیا۔ اس لڑکی نے قدم قدم پر مقتول کی مخالفت کی تھی۔ اس نے سوچا جاتے جاتے اس پر ہاتھ صاف کر لیا جائے مگر..... قبل اس کے کہ وہ ایک قدم آگے بڑھتا، ملزمہ نے اس کا کام تمام کر دیا.....''

''یہ غلط ہے..... میری بچی قتل نہیں کرسکتی۔'' خدیجہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''لیاقت حسین کا فراڈ اور بدنیتی اپنی جگہ۔ میں مانتی ہوں، اس نے بڑی منصوبہ بندی سے ہمیں لوٹ لیا تھا۔ میں یہ بھی تسلیم کرتی ہوں کہ لیاقت کے انہی کرتوتوں کے باعث زاہدہ اس سے نفرت کرتی تھی لیکن اس نے لیاقت کی جان نہیں لی وہ.....''

خدیجہ کی بات پوری ہونے سے قبل ہی وکیلِ استغاثہ نے قطعِ کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ دُرست ہے کہ مقتول نے ایک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے آپ سے شادی کی تھی؟''

''ہاں..... یہ درست ہے۔'' خدیجہ نے جواب دیا۔

''اور آپ یہ بھی مانتی ہیں کہ اس نے نہایت چالاکی سے اپنا مقصد حاصل کرلیا تھا؟''

''جی ہاں، مقتول کی چالبازی کو میں اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔''

''گویا آپ مقتول کی بدنیتی کو تسلیم کرتی ہیں؟''

خدیجہ نے اثبات میں جواب دیا۔

وکیلِ استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو موقوف کرتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ''مقتول کی بدنیتی جب گھر اور آپ سے آگے بڑھ کر ملزمہ زاہدہ کو چھونے لگی تو پہلی مرتبہ آپ کو مقتول سے خطرہ محسوس ہوا تھا۔ آپ نے اس روز مقتول سے شدید جھگڑا بھی کیا تھا جس میں مقتول نے اپنی صفائی بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ملزمہ کو اپنی بیٹی کی طرح سمجھتا ہے..... اور یہ کہ آپ کو اس سلسلے میں غلط فہمی ہوئی ہے..... ملزمہ نے مقتول سے اپنی شدید نفرت کے نتیجے میں اس پر الزام تراشی کی ہے..... وغیرہ .....؟''

''ہاں..... یہ واقعہ پیش آیا تھا۔'' خدیجہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

وکیلِ استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''لیکن آپ نے مقتول کی وضاحت کا یقین نہیں کیا تھا۔ زاہدہ کے حوالے سے مقتول کی بدنیتی آپ پر آشکار ہوچکی تھی..... ملزمہ نے تنہائی میسر آتے ہی دھمکی دینے والے انداز میں آپ سے کہا تھا کہ آپ پہلی فرصت میں اس بے ہودہ شخص (مقتول لیاقت حسین) کو گھر سے نکال دیں ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''ہاں..... زاہدہ نے کچھ اسی نوعیت کا احتجاج کیا تھا۔'' خدیجہ کمزور سی آواز میں بولی۔

وکیلِ استغاثہ نے آخری داؤ آزمانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ملزمہ زاہدہ نے اپنے الفاظ ''ورنہ اچھا نہیں ہوگا!'' کی وضاحت بھی تو کی تھی؟''

''جی ہاں!'' خدیجہ نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اس نے کہا تھا..... اگر میں نے مقتول لیاقت حسین کو گھر سے نہ نکالا تو وہ گھر چھوڑ کر کہیں بھی چلی جائے گی یا پھر اپنے ہاتھوں سے اس خبیث شخص کو موت کے گھاٹ اتار دے گی.....''

''اور اس کے چند روز بعد ہی آپ کے دوسرے شوہر لیاقت حسین کو قتل کردیا گیا؟''

''جج..... جی ہاں.....!'' خدیجہ نے شکستہ لہجے میں جواب دیا۔

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جنابِ عالی!'' وکیلِ استغاثہ نے جرح ختم کرنے کا اعلان کردیا۔

میں نے اپنی باری پر جج سے اجازت حاصل کی اور اس کیس کی سب سے اہم جرح کے لیے خدیجہ والے کٹہرے کے نزدیک آگیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''خدیجہ بیگم! وقوعہ کے روز آپ سہ پہر پانچ بجے سے لے کر رات ساڑھے آٹھ بجے تک اپنے گھر میں موجود نہیں تھیں۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتائیں گی کہ یہ ساڑھے تین گھنٹے آپ نے کہاں گزارے؟''

''میں اپنے پڑوس میں..... نورانی صاحب کے گھر میں تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق آپ کے دوسرے شوہر لیاقت حسین کو وقوعہ کے روز رات سات اور آٹھ بجے کے درمیان قتل کیا گیا ہے یعنی آپ کی غیر موجودی میں اس کی موت واقع ہوئی۔ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ آپ ساڑھے تین گھنٹے تک اپنے پڑوس میں کیا کرتی رہی تھیں؟''

میں نے بڑی محنت سے حاصل کردہ معلومات کو نہایت ہی احتیاط سے استعمال کرنے کا آغاز کردیا۔ اس کیس کے سلسلے میں اب تک جو جرح ہوئی تھی اس کی روشنی میں استغاثہ اور ڈیفنس کا پلّہ برابر نظر آتا تھا۔ اسی پیشی پر مجھے اس برابری کو ختم کرنا تھا۔ ڈیفنس کے پلّے میں دلائل، حقائق، ثبوت اور انکشافات کی صورت میں اتنا کچھ ڈالنا تھا کہ وہ کسی اندھے کو بھی واضح طور پر جھکا ہوا دکھائی دے اور میں یہی کوشش کررہا تھا۔

خدیجہ نے میرے سوال کے جواب میں بڑی رسان سے بتایا۔ ''اس روز نورانی صاحب کے گھر میں ان کی بیوی

نے محفلِ میلاد رکھی تھی۔ پڑھائی کا وقت عصر اور مغرب کے درمیان کا تھا۔ مغرب کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد کھانا تھا۔ میں اسی محفل میں گئی ہوئی تھی۔''

''اس تفصیل کو معزز عدالت تک پہنچانے کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''خدیجہ صاحبہ! تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ نے مقتول کے حوالے سے آپ پر بڑی سخت جرح کی ہے اور از خود بھی مقتول کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کا مظاہرہ فرمایا ہے۔ میں اس موضوع کو بالکل نہیں چھیڑوں گا۔ آپ کے شوہر لیاقت حسین نے آپ کے ساتھ کون کون سا دھوکا کیا، زیرِ سماعت کیس سے براہِ راست اس کا کوئی ناتا نہیں نکلتا۔ آپ صرف یہ بتائیں کہ جب وقوعہ کے روز سہ پہر پانچ بجے آپ نورانی صاحب کے گھر گئیں تو اس وقت آپ کے گھر میں کون کون تھا؟''

''صرف زاہدہ تھی۔'' خدیجہ نے پُراعتماد انداز میں جواب دیا تھا۔

''اس کا مطلب ہے اس وقت تک مقتول گھر نہیں پہنچا تھا؟''

''جی ہاں، اس کا یہی مطلب ہے۔''

''وہ عموماً کتنے بجے گھر آجایا کرتا تھا؟''

''کم و بیش رات آٹھ بجے۔'' اس نے جواب دیا۔

''پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق آپ کے شوہر کی موت رات سات اور آٹھ بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے وقوعہ کے روز وہ آٹھ بجے سے پہلے ہی گھر آگیا تھا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور جواب دیا۔ ''اس روز وہ ساڑھے چھ بجے گھر آگیا تھا۔''

''ساڑھے چھ بجے!'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے تیز آواز میں دُہرایا پھر پوچھا۔ ''خدیجہ بیگم! وقوعہ کے روز آپ تو سہ پہر پانچ بجے سے رات ساڑھے آٹھ بجے تک نورانی صاحب کے گھر میں تھیں پھر آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہیں کہ مقتول اس روز ساڑھے چھ بجے گھر آگیا تھا؟''

میں اس کیس میں وکیلِ صفائی کا کردار ادا کررہا تھا لیکن گواہ خدیجہ بیگم سے میں جس نکیلے انداز میں سوالات کررہا تھا اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا، میں استغاثہ کا حمایتی ہوں۔ شاید وکیلِ استغاثہ بھی یہی سمجھ رہا تھا جبھی بڑی شرافت سے خاموش کھڑا عدالتی کارروائی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میری طرف سے کسی عظیم انکشاف کی توقع رکھتا ہو..... اور میری یہ کوشش تھی کہ اس کی توقع کو ٹوٹنے نہ دوں۔

خدیجہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ مغرب کی نماز کے بعد مجھے ایک ضروری کام سے اپنے گھر آنا پڑ گیا تھا۔ کھانا شروع ہونے والا تھا اور نورانی صاحب کے گھر میں برتنوں کی کمی پیش آرہی تھی۔ میں نے سوچا اپنے گھر سے پلیٹیں اور گلاس پکڑ لوں۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''میں گھر آئی تو دیکھا لیاقت بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا وہ آج جلدی کیسے گھر آگیا؟ اس نے بتایا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں، سر میں شدید درد ہو رہا ہے اور یہ کہ وہ سونا چاہتا ہے۔ میں نے اسے سر درد کی گولی کھلائی اور برتن وغیرہ لے کر واپس نورانی صاحب کے گھر چلی گئی۔''

''آپ برتن لینے کے لیے کتنے بجے اپنے گھر آئی تھیں؟''

''اس وقت سات بجنے والے تھے۔''

''یہ بات مقتول نے آپ کو بتائی تھی کہ وہ ساڑھے چھ بجے گھر آیا ہے؟''

''جی ہاں، لیاقت کی زبانی مجھے یہ بات پتا چلی تھی۔''

''جب سات بجے آپ برتن لینے اپنے گھر میں آئیں تو کیا آپ کی بیٹی زاہدہ گھر میں موجود تھی؟''

''نہیں!'' اس نے قطعیت سے جواب دیا۔

''لیکن آپ میلاد میں جاتے وقت اسے گھر میں چھوڑ کر گئی تھیں؟''

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''کیا آپ نے مقتول سے ملزمہ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں نے لیاقت سے پوچھا تھا زاہدہ کہاں ہے؟ اس نے بتایا تھا کہ اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی وہ کہیں چلی گئی تھی۔ میں نے پوچھا کہاں چلی گئی تھی؟ اس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں نے سوچا اِدھر ہی کہیں آس پڑوس میں اپنی کسی دوست کے پاس چلی گئی ہوگی، خود ہی واپس آجائے گی۔ یہ سوچتے ہوئے میں برتن لے کر نورانی صاحب کے گھر چلی گئی اور..... بعد میں میرا یہ اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔''

''کون سا اندازہ؟'' میں نے باآواز بلند دریافت کیا۔

''یہی کہ وہ اپنی کسی دوست سے ملنے چلی گئی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''کون سی دوست؟'' میں نے فوراً اگلا سوال کر دیا۔

''سعیدہ!'' خدیجہ نے حتمی لہجے میں جواب دیا اور حاضرینِ عدالت کی طرف اُنگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''وہ جو اُدھر کونے میں اپنے باپ جہانگیر کے ساتھ بیٹھی ہے۔''

اس انکشاف کے بعد سب کی نظریں سعیدہ نامی اس لڑکی کی جانب اٹھ گئیں جس کا ذکر خدیجہ نے کیا تھا۔ یہ دراصل میری چلی ہوئی ایک شاطرانہ چال تھی۔ میں اس اسٹیپ کے ذریعے استغاثہ کی عمارت کو زمین بوس کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میری درخواست پر جہانگیر اس روز اپنی بیٹی سعیدہ کے ساتھ عدالت کے کمرے میں موجود تھا۔ سعیدہ ایک طرف سے اس کیس میں صفائی کے گواہ کی حیثیت رکھتی تھی۔

میں نے روئے سخن جج کی جانب پھیرا اور نہایت ہی مؤدبانہ لہجے میں درخواست کی۔ ''یور آنر! یہ ایک حسین اتفاق ہے کہ سعیدہ اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔'' اتنا کہہ کر میں نے غصہ دلانے والے انداز میں وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے بڑی تکلیف میں مبتلا نظر آیا۔ میرے ''حسین اتفاق'' ایسے الفاظ نے اس کے استغاثہ کی ناک پر ایک دھواں دھار پنچ رسید کر دیا تھا۔ وہ بخوبی سمجھ رہا تھا کہ میں نے خاص اہتمام کے تحت سعیدہ کو عدالت میں حاضر کر رکھا ہے۔ بہرحال، میں وکیلِ مخالف کو نظر انداز کرتے ہوئے جج کی طرف متوجہ ہو گیا اور بدستور ملتجیانہ انداز میں کہا۔

''یور آنر! خدیجہ کے بیان کی روشنی میں سعیدہ بڑی اہمیت کی حامل نظر آتی ہے۔ میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ مجھے سعیدہ سے دو چار سوال کرنے کی اجازت دی جائے۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلائی پھر اس کے حکم پر سعیدہ نامی وہ لڑکی وِٹنس باکس میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ خدیجہ کو تھوڑی دیر کے لیے کٹہرے سے باہر نکال دیا گیا۔ سعیدہ سے کوئی سوال پوچھنے سے پہلے میں نے ایک مرتبہ پھر جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! میری درخواست ہے کہ اس کیس کے تفتیشی افسر کو چند منٹ کے لیے عدالت سے باہر بھیج دیا جائے۔ میں آئی او کی غیر موجودی میں سعیدہ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

آئی او شفیع شاہ نے اُلجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ جج نے سنجیدہ لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔ ''بیگ صاحب! کیا اس کی کوئی خاص اہمیت ہے؟''

''خاص الخاص جنابِ عالی!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ اہمیت ابھی معزز عدالت کے سامنے واضح بھی ہو جائے گی۔''

جج کے حکم پر انکوائری آفیسر شفیع شاہ کو عدالت سے باہر جانا پڑا۔

میں نے سعیدہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا یہ درست ہے کہ آپ ملزمہ زاہدہ کی گہری دوست ہیں۔ آپ کا گھر پچھلی گلی (ملزمہ کی) میں واقع ہے۔ آپ لوگ آپس میں ملنے کے لیے ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے رہتے ہو؟''

یہ کئی مختصر سوالات پر مشتمل ایک طویل سوال تھا لیکن اس میں آسانی کا پہلو یہ تھا کہ تمام سوالات ایک خاص زاویے اور سیریز میں تھے لہٰذا ان کا جواب ایک ''ہاں'' یا ''ایک نہیں'' میں دیا جا سکتا تھا۔ سعیدہ کو قطعاً کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

''ہاں، یہ درست ہے۔''

''کیا وقوعہ کے روز ملزمہ آپ کے گھر آئی تھی؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔

''وہ کتنے بجے آپ کے گھر پہنچی تھی؟''

''یہی کوئی ساڑھے چھ بجے..... یا پھر چھ پینتیس پر۔''

''اور اس کی واپسی کب ہوئی تھی؟''

''ساڑھے آٹھ بجے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''پانچ چھ منٹ زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔''

''کیا وہ خود ہی واپس چلی گئی تھی یا کوئی اسے بلانے آیا تھا؟''

''اس کی امی ڈھونڈتے ہوئے ہمارے گھر آئی تھیں۔'' سعیدہ نے جواب دیا۔ ''آنٹی خدیجہ خاصی پریشان تھیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ زاہدہ کے سوتیلے باپ کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ پھر وہ دونوں چلی گئی تھیں۔''

''اوکے۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا پھر سعیدہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ اچھی طرح سوچ کر بتائیں..... کیونکہ میں اب آپ سے جو سوال کرنے والا ہوں اس کے جواب کی بڑی اہمیت ہے۔ آپ کا جواب اس کیس کا

پاسا پلٹ سکتا ہے.....''

میں نے دانستہ لمحے بھر کو توقف کیا اور حاضرین عدالت کے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔ سب سے زیادہ کھلا بلی اور سنسنی مجھے وکیل استغاثہ کے چہرے پر نظر آئی۔ وہ بے چینی اور بے قراری سے بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ میں دوبارہ سعیدہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے میرے سوال کی منتظر تھی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اس سے پوچھا۔

''ملزمہ زاہدہ وقوعہ کے روز لگ بھگ ساڑھے چھ بجے آپ کے گھر آئی اور ساڑھے آٹھ بجے اس کی واپسی ہوئی۔ سعیدہ بی بی! آپ کو سوچ سمجھ کر یہ بتانا ہے کہ کیا ان دو گھنٹوں کے دوران میں ملزمہ ایک لمحے کے لیے بھی آپ کے گھر سے باہر نکلی تھی؟''

''نہیں..... بالکل نہیں!'' اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کو یاد ہے اس روز اس کیس کی ملزمہ اور آپ کی دوست زاہدہ نے کون سا لباس پہن رکھا تھا؟''

''کاٹن کا سفید سوٹ۔'' سعیدہ نے بتایا۔ ''وہ بالکل کسی کبوتری کی طرح دکھائی دیتی تھی..... بلکہ میں نے اسے یہ کہہ کر چھیڑا بھی تھا..... چٹی کبوتری! کہاں اُڑنے کا ارادہ ہے؟''

میں نے سعیدہ پر جرح ختم کردی اور جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! اب میں ملزمہ کی ماں خدیجہ سے آخری ایک دو سوالات کرنا چاہوں گا۔''

جج نے اجازت دینے سے پہلے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا آئی او کو اندر بلالیا جائے؟''

''خدیجہ کی جرح مکمل ہونے کے بعد۔'' میں نے درخواستی لہجے میں کہا۔ ''سعیدہ کا کام ختم ہوگیا، خدیجہ بھی فارغ ہوجائے تو پھر آئی او صاحب کی باری آئے گی۔ جیسا کہ معزز عدالت اس بات سے باخبر ہوچکی ہے کہ انکوائری آفیسر سے پوچھنے کے لیے سوالات کا ایک انبار کھڑا ہوچکا ہے۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلائی پھر اس کے حکم پر سعیدہ کی جگہ خدیجہ وٹنس باکس میں آکر کھڑی ہوگئی۔ میں نے ملزمہ کی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا میں آپ کی یادداشت کا امتحان لے سکتا ہوں؟''

''جی لے سکتے ہیں۔'' وہ بڑی سادگی سے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز نورانی صاحب کے گھر میں میلاد کے سلسلے میں جو کھانا دیا گیا تھا اس میں کیا کیا شامل تھا؟''

وہ تُرت بولی۔ ''بچھیا کا تورمہ تھا، تافتان تھی..... اور میٹھے میں کھیر تھی۔''

''آپ محفلِ میلاد میں شرکت کے لیے کون سا لباس پہن کر گئی تھیں؟''

''میں نے جامنی شلوار پر پھول دار قمیص پہن رکھی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''اور دوپٹا بھی جامنی رنگ ہی کا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''جب آپ نورانی صاحب کے گھر جارہی تھیں تو زاہدہ کو کس لباس میں گھر میں چھوڑ کر گئی تھیں؟''

اس نے ایک مرتبہ پھر سعیدہ کی جانب اشارہ کیا اور بولی۔ ''زاہدہ کے لباس کے بارے میں سعیدہ نے آپ کو بتایا تو ہے۔''

''یعنی آپ سعیدہ کے بیان کی تصدیق کرتی ہیں؟''

''بالکل!'' وہ قطعیت سے بولی۔ ''زاہدہ کو سفید لباس بہت پسند ہے اور..... وقوعہ کے روز بھی اس نے کاٹن کا سفید جوڑا ہی پہن رکھا تھا۔''

''خدیجہ صاحبہ! آپ سے میرا آخری سوال ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر گہری سنجیدگی سے پوچھ لیا۔ ''وقوعہ کے روز جب آپ نورانی صاحب کے گھر سے واپس آئیں تو آپ کے بیان کے مطابق آپ نے مقتول کو بستر پر مردہ حالت میں پڑے ہوئے دیکھا۔ کسی سفاک شخص نے تیز دھار آلے کی مدد سے اس کی گردن کاٹ ڈالی تھی۔ بستر کی حالت ایسی ہورہی تھی جیسے جان دینے سے پہلے مقتول بے انداز تڑپا اور پھڑکا ہوگا۔ بستر پر جابجا خون کے چھینٹے بھی پڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔'' میں لمحہ بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ گھر سے نکلیں اور زاہدہ کو تلاش کرتے ہوئے سعیدہ کے گھر پہنچ گئیں۔ زاہدہ آپ کو وہاں مل گئی۔ آپ نے اپنی بیٹی کو بتایا کہ کسی نے اس کے سوتیلے باپ کو قتل کردیا ہے پھر آپ اسے اپنے ساتھ لے کر گھر آگئیں۔ ذرا سوچ کر بتائیں، جب آپ نے سعیدہ کے گھر میں ملزمہ کو دیکھا تو کیا آپ کو اس کے سفید لباس پر خون کا کوئی چھینٹا یا دھبا نظر آیا تھا؟''

اس نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی اور ٹھوس لہجے میں بولی۔ ''بالکل نہیں، وہ جیسا صاف ستھرا لباس پہن کر گئی تھی ویسے ہی لباس میں واپس آئی تھی۔''

''دیٹس آل یور آنر!'' میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور کندھے اُچکا دیے۔

اس کے بعد آئی او شفیع شاہ کو اندر بلالیا گیا۔ میں چونکہ جج سے کہہ چکا تھا کہ آئی او سے چند سوالات کروں گا لہٰذا شفیع شاہ کو وٹنس باکس میں کھڑے ہونے کو کہا گیا۔ حکم چونکہ جج کی طرف سے آیا تھا لہٰذا وہ کسی پس و پیش کے بغیر جا کر گواہوں والے کٹہرے میں کھڑا ہو گیا۔ میں جج کا اشارہ پا کر فوراً آئی او کے پاس پہنچ گیا۔ وہ قدرے اُلجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اب اس سے کون سا سوال کرنے والا ہوں۔

میں نے سوال کیا۔ ''آئی او صاحب! آپ کے غیاب میں سعیدہ بنتِ جہانگیر اور خدیجہ بیوہ لیاقت حسین کی یادداشت کا امتحان لیا گیا ہے اور وہ دونوں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئی ہیں۔ میں آپ کو بھی اس کڑی آزمائش میں سرخرو ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو اس امتحان کا آغاز کیا جائے؟''

اس نے متاملانہ نظر سے وکیلِ استغاثہ کو دیکھا اور جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو جو پوچھنا ہے، پوچھیں۔ میں یہاں موجود ہوں۔''

میں نے پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز جب آپ جائے واردات پر پہنچے تو آپ نے مقتول کو اپنے بستر پر مردہ حالت میں پڑے دیکھا۔ اس کی گردن کٹی ہوئی تھی اور تڑپنے پھڑکنے کے باعث بستر کی چادر کئی جگہ سے خون آلود ہو چکی تھی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟''

''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔'' وہ محتاط لہجے میں بولا۔

میں نے استفسار کیا۔ ''آپ کے بیان کے مطابق جب مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تو وہ اپنے بستر پر چت سویا ہوا تھا۔ گردن کٹنے کے سبب اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور اس کی پوزیشن پہلے والی نہ رہی۔ جب آپ نے اس کی لاش کو دیکھا تو وہ کم و بیش کروٹ کے بل بستر کے کنارے پر پہنچا ہوا تھا..... شمالی دیوار والے کنارے پر۔ ایم آئی رائٹ؟''

''جی، میں نے ایسا ہی دیکھا تھا۔'' آئی او نے جواب دیا۔

میں نے اچانک ہی سوال کیا۔ ''جب آپ نے ملزمہ زاہدہ کو اپنے سوتیلے باپ کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا تو اس نے کون سا لباس پہن رکھا تھا؟''

''سفید لباس!'' بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

''بے داغ سفید لباس؟''

''میں نے اس کے لباس کو گھما پھرا کر نہیں دیکھا تھا.....'' وہ بیزاری سے بولا۔

''میرا مطلب ہے، آپ کو اس کا لباس خون آلود تو دکھائی نہیں دیا تھا؟''

''نن..... نہیں!'' وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جنابِ عالی!'' میں نے فاتحانہ انداز میں وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھا اور جرح موقوف کر دی۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے ایک ہفتے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

☆☆☆

گواہوں کے بیانات کا سلسلہ گزشتہ پیشی پر مکمل ہو چکا تھا لہٰذا آئندہ پیشی پر دلائل کی باری تھی۔ جج اپنی مخصوص نشست پر براجمان ہوا تو عدالت کی کارروائی کا آغاز کیا گیا۔ پہلے وکیلِ استغاثہ نے ملزمہ زاہدہ کو سزا دلوانے کے لیے دلائل دیے۔ اس کے دلائل میں کوئی نئی بات یا نکتہ دیکھنے یا سننے کو نہیں ملا۔ وہ اپنے حلق اور عقل کا استعمال کر کے فارغ ہوا تو میری باری آئی۔

میں نے گزشتہ پیشی پر خدیجہ، سعیدہ اور شفیع شاہ سے جس انداز کی جرح کی تھی اس نے کیس کی صورتِ حالات کو عدالت پر واضح کر دیا تھا۔ جج اور حاضرینِ عدالت اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ حقیقتِ حال کیا ہے۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ملزمہ زاہدہ کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! اب تک کی عدالتی کارروائی سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ میری مؤکل اور اس کیس کی ملزمہ مسماۃ زاہدہ بے گناہ اور بے قصور ہے۔ اسے کسی گہری سازش کے تحت اس مقدمے میں اُلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پولیس کی تن آسانی اور زبردستی کسی ''تعریف'' کی محتاج نہیں۔ مقتول لیاقت حسین کے اصل قاتل تک رسائی حاصل کرنے کی بہ نسبت یہ فارمولا زیادہ سہل نظر آیا کہ وہ مقتول کی سوتیلی بیٹی کو قربانی کی بکری بنا ڈالیں۔ اس غریب کا صرف اتنا قصور ہے کہ یہ اپنے سوتیلے باپ سے شدید نفرت کرتی تھی اور..... اس نفرت کے لیے اس کے پاس ٹھوس وجوہ بھی تھیں جن کا تفصیلی ذکر گاہے بہ گاہے عدالتی کارروائی کے دوران ہوتا رہا ہے۔ میں یہاں پر اس قصے کو دوبارہ چھیڑ کر معزز عدالت کا وقت ضایع نہیں کروں گا۔ میں اس سلسلے میں پہلے ہی خاصا بدنام ہوں۔''

آخری جملہ میں میں نے وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھتے

ہوئے ادا کیا۔ وہ میری اس گہری اور نظر نہ آنے والی چوٹ پر بل کھا کر رہ گیا۔ اس کی حالت سے محظوظ ہونے کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا لہٰذا میں دوبارہ جج کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''جنابِ عالی! محبت اور نفرت دونوں فطری جذبے ہیں جو انسان کے اندر سے پھوٹتے ہیں۔ قانون کی کتابوں میں ایسا کوئی باب نہیں جو محبت اور نفرت کے ان جذبات کو جرم کے زمرے میں بند کرتا ہو..... اور کوئی ایسی دفعہ بھی وضع نہیں کی گئی کہ جو محبت اور نفرت کرنے والوں پر عائد کی جاسکتی ہو۔ بہرحال، میں مانتا ہوں کہ ملزمہ اپنے سوتیلے باپ سے نفرت کرتی تھی لیکن یہ کوئی جرم نہیں کہ اسے قتل جیسے خطرناک کیس میں ملوث کردیا جائے۔ میں معزز عدالت کے علم میں اس کیس کے وہ اہم زاویے لا رہا ہوں جو میری مؤکل کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔''

میں نے لمحے بھر کو توقف کرکے حاضرینِ عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور دلائل کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''نمبر ایک، گزشتہ ایک پیشی پر اس کیس کے آئی او صاحب نے جائے وقوعہ کی جو تفصیل بیان کی ہے اس کے مطابق مقتول جس بیڈ پر سو رہا تھا اس کی ایک سائیڈ اور سرہانہ دو دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے تھے یعنی سائیڈ شمالی دیوار کے ساتھ اور سرہانہ مغربی دیوار کے ساتھ۔ یہ ایک ایسی پوزیشن ہے کہ بستر پر چڑھنے اور اترنے کے لیے یا تو پائنتی کو استعمال کیا جاسکتا ہے اور یا پھر بیڈ کی جنوبی سائیڈ کو۔ آئی او کو یقین ہے کہ موت کے منہ میں جانے سے قبل مقتول شمالی دیوار والی سمت چت لیٹا ہوا تھا۔ یہ بات بھی ثابت ہوچکی ہے کہ میری مؤکل لیفٹ ہینڈر ہے۔ ایک لیفٹ ہینڈر کے لیے پائنتی پر کھڑے ہوکر یا جنوبی سائیڈ پر رہتے ہوئے مقتول کی گردن پر چھری چلانا تیکنیکی اعتبار سے ممکن نظر نہیں آتا۔ اِلا یہ کہ قاتل پہلے بستر پر چڑھے پھر قتل کرنے کی کوشش کرے۔ بستر پر چڑھنے کی صورت میں مقتول جاگ سکتا تھا اور قاتل ایسا کوئی رسک لینے کی حماقت نہیں کرسکتا! نمبر دو.....''

میں نے ایک سانس کا توقف کیا پھر سلسلۂ دلائل کو جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''.....مقتول کے بستر کی حالت اس بات کی گواہ ہے کہ موت کے منہ میں جانے سے قبل بڑی اذیت سے گزرا تھا۔ اس کی کٹی ہوئی گردن سے جاری..... اُبلتے ہوئے خون نے بستر کو متعدد مقامات سے آلودہ کردیا تھا۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ملزمہ اپنے لیفٹ ہینڈر ہونے کی ''خامی'' کو دور کرنے کے لیے بستر کے اوپر چڑھ گئی تھی تو پھر ایک ناقابلِ جواب سوال اُبھر کر یہ سامنے آتا ہے کہ ملزمہ کے سفید لباس پر خون کا ایک معمولی سا دھبا تک کیوں نہیں آیا؟..... ملزمہ کا بے داغ لباس ثابت شدہ ہے۔''

''نمبر تین..... اور سب سے اہم نکتہ!'' میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہمیں بتاتی ہے کہ مقتول لیاقت حسین کی موت رات سات اور آٹھ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ دوسری جانب ایسی ہی ایک ناقابلِ تردید مسلمہ حقیقت یہ بھی موجود ہے کہ وقوعہ کے روز شام ساڑھے چھ بجے سے لے کر ساڑھے آٹھ بجے تک ملزمہ اپنی دوست سعیدہ کے گھر میں تھی اور اس دوران میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ سعیدہ اس بات کی تصدیق کے لیے معزز عدالت کے روبرو بیان دے چکی ہے۔ جنابِ عالی! جب میری مؤکل مقتول کے متوقع وقتِ موت کے دوران میں جائے وقوعہ سے کئی گز کے فاصلے پر موجود تھی تو پھر وہ قاتل کیسے ہوسکتی ہے؟''

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میری آواز خاصی بلند ہوگئی تھی۔ جیسے ہی میری بات مکمل ہوئی، عدالت کے کمرے میں وکیلِ استغاثہ کی چیخ سے مشابہ آواز اُبھری۔

''اگر ملزمہ قاتل نہیں ہے تو پھر لیاقت حسین کو کس نے قتل کیا ہے؟''

میں نہیں جانتا..... بلکہ شاید کوئی بھی نہیں جانتا کہ وکیلِ استغاثہ نے کس کو مخاطب کرکے یہ بلند آہنگ استفسار کیا تھا۔ اس کی آواز میں بڑی بے کیفی اور حیرت پائی جاتی تھی۔ اس کے سوال کے جواب میں، میں نے ٹھوس اور چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''قاتل تک رسائی حاصل کرنا استغاثہ کی ذمے داری ہے۔ میں صرف اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے متعین ہوں اور..... اللہ کا شکر ہے، میں نے اپنا کام پورا کردیا ہے۔''

جج نے فیصلے کے لیے تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر جج نے میری، مؤکل اور اس کیس کی ملزمہ زاہدہ کو بے گناہ تسلیم کرتے ہوئے باعزت بری کردیا۔ اس کے ساتھ ہی استغاثہ کے وارث یعنی انگوائری آفیسر شفیع شاہ کو خاصی سختی سے تاکید کی کہ وہ عرصہ دس یوم کے اندر اصل قاتل کو گرفتار کرکے عدالت میں پیش کرے۔

زاہدہ کی باعزت بریت پر اس کی ماں خدیجہ بڑی خوش تھی۔ اس کیس کی کامیابی پر ظاہر ہے خوشی تو مجھے بھی بہت ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی میرا ذہن مسلسل ایک اُلجھن کو سلجھانے کی کوششوں میں مصروف تھا اور اس ''مصروفیت'' نے مجھے خاصا بے چین کر رکھا تھا۔ بے چین اور مضطرب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ لیاقت حسین کا قاتل کون ہے؟

مجھے بے قراری کی اس کیفیت میں زیادہ عرصہ مبتلا نہیں رہنا پڑا۔ زاہدہ کی بریت سے ہفتہ بھر بعد کی بات ہے۔ میں اپنے چیمبر میں بیٹھا روزمرہ کی ڈاک دیکھ رہا تھا۔ دفتر کے پتے پر روزانہ آٹھ دس خطوط آجاتے تھے اور میں نے یہ عادت بنا رکھی تھی کہ روز کے روز خطوط کھول کر پڑھ لیا کرتا تھا۔ انہی خطوط میں سے ایک خط نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ خط رجسٹرڈ ڈاک سے ارسال کیا گیا تھا اور خط کی پشت پر بھیجنے والے کا نام محمد صابر اور ایڈریس لانڈھی کا تھا۔ اس خط کی تحریر نے ثابت کر دیا کہ یہ نام اور پتا فرضی تھا۔ خط میں مجھے اس طرح مخاطب کیا گیا تھا کہ پہلا جملہ پڑھتے ہی میں خط بھیجنے والے کو پہچان گیا۔

''بیگ صاحب! میں غلام مرتضیٰ..... آپ سے اس خط کے ذریعے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں.....''

میں تیزی سے اس خط کو پڑھتا چلا گیا۔ غلام مرتضیٰ نے آگے لکھا تھا۔ ''میں آپ سے چند دن کی چھٹی لے کر حیدر آباد گیا تھا لیکن پھر واپس نہیں آیا اور میری کوشش یہ ہوگی کہ آئندہ کبھی ہماری ملاقات نہ ہو کیونکہ میں سمجھتا ہوں، میں نے اپنی دانست میں جو نیکی کی ہے اس کا بھرم قائم رہنا چاہیے۔

''سچی بات یہ ہے کہ میں کبھی حیدر آباد نہیں گیا۔ میں اِدھر کراچی ہی میں تھا اور اب بھی اِدھر ہی ہوں۔ البتہ میں گولیمار چھوڑ کر کہیں اور بس گیا ہوں اور میں نے اپنا حلیہ اور رنگ ڈھنگ بھی تبدیل کر لیا ہے اور..... یہ سب کچھ میں نے ایک خاص مقصد کے تحت کیا ہے۔ میں اپنی زندگی اور مستقبل سے بہت مایوس تھا۔ ذہن میں یہی آیا کہ کسی کے کام ہی آجاؤں۔ میرے کسی عمل سے اگر دو مصیبت زدہ افراد کی مشکل آسان ہو جائے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی، سو میں نے اپنے منصوبے پر عمل کر ڈالا۔

''بیگ صاحب! میں بات کو گھما پھرا کر آپ کا وقت برباد نہیں کروں گا اس لیے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں اور اصل موضوع ہے ''لیاقت حسین مرڈر کیس''۔ جی بیگ صاحب! لیاقت حسین کو میں نے قتل کیا ہے۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ پولیس یا کوئی بھی ان ماں بیٹی کو اس شیطان (لیاقت حسین) سے نہیں بچائے گا اس لیے یہ بیڑا میں نے اٹھا لیا۔ میں نے غلط کیا یا صحیح، مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کیونکہ میں پُرسکون ہوں کہ میں نے ایک نیک کام کیا ہے۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ زاہدہ کو اس کیس میں ملوث کر کے عدالت تک گھسیٹ لیا جائے گا۔ جب تک آپ نے یہ کیس نہیں پکڑا تھا، میں نے کئی بار سوچا، خود کو پولیس کے حوالے کر کے زاہدہ کو چھڑا لوں لیکن جیسے ہی آپ نے کیس لڑنے کی ہامی بھری، مجھے یقین ہو گیا کہ اب کوئی مائی کا لال زاہدہ کا ایک بال بھی بانکا نہیں کر سکے گا اور دیکھ لیں، آپ نے بے گناہ و بے قصور زاہدہ کو صاف بچا لیا۔ میں نے ایک ایک پل اس کیس کی خبر رکھی ہے اور آپ کی سرخروئی کے بعد یہ خط لکھ رہا ہوں۔

''آپ بھی سوچ رہے ہوں گے، میں نے آپ کو اپنے اس بھیانک راز میں کیوں شریک کیا؟ بیگ صاحب! اس کی دو وجوہ ہیں۔ نمبر ایک، آپ کے سامنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے میں خود کو بہت مطمئن اور پُرسکون محسوس کر رہا ہوں۔ نمبر دو، مجھے یقین تھا کہ جب تک آپ لیاقت حسین کے اصل قاتل کا سراغ نہیں لگا لیں گے، آپ لاشعوری اور شعوری طور پر اُلجھن کا شکار رہیں گے۔ بیگ صاحب! آپ کے پانچ سو روپے مجھ پر کسی پہاڑ کی طرح لدے ہوئے تھے۔ میں حقیقی معنوں میں آپ کو کوئی فیس تو نہیں دلوا سکا۔ سوچا، آپ کو شعوری اور لاشعوری اُلجھن ہی سے نکال دوں۔ اب میں پوری طرح مطمئن ہوں کہ میں نے آپ سے لیے ہوئے قرض کی ادائی کر دی۔

''آخر میں آپ سے ایک آخری درخواست کروں گا۔ ماننا، نہ ماننا آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ میرے اس خط کو پڑھنے کے بعد آپ فوراً تلف کر دیں۔ میری بات آپ تک پہنچ گئی، بس یہی کافی ہے۔''

میں نے غلام مرتضیٰ کے خط کو تین چار مرتبہ پڑھا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس اللہ کے بندے نے ٹھیک کیا تھا یا غلط قدم اٹھایا تھا، یہ الگ بحث ہے۔ میں نے اس خط کے جواب میں کس ردِعمل کا مظاہرہ کیا، یہ بھی ناقابلِ ذکر ہی رہے تو اچھا ہے لیکن اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ اس کا یہ عمل بڑا نتیجہ خیز ثابت ہوا تھا۔

غلام مرتضیٰ نے جذبۂ ہمدردی سے مجبور ہو کر جو سنگین قدم اٹھایا تھا اس نے زاہدہ اور خدیجہ کی زندگی کی اُلجھی ڈور کے ساتھ ساتھ اس کیس کو بھی سلجھا دیا تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)

یونس رضا بھٹو، اوباڑو

جب بھی پوچھا میرے لٹنے کا سبب دنیا نے
مجھ کو رہ رہ کے میرا جرمِ وفا یاد آیا

یونس خان روغانی، پشاور

تمہارا ظرف ہے تم کو محبت بھول جاتی ہے
ہمیں تو جس نے ہنس کر بھی پکارا یاد رہتا ہے

رانا محمد نثار، خوشاب

التجا کا ملال کیا کیجے
ان کے در پر کہیں پڑی ہوگی

قادر نواز خٹک، کرک

تیرے آنے کا انتظار رہا
عمر بھر موسم بہار رہا

عمران علی گھانگر، رانی پور

زمین مقتل شب کو سجائے جاؤ ابھی
کہ دور تک ہے ابھی سلسلہ اندھیروں کا

ساجد عباس اعوان، حافظ آباد

آدمی کو قتل کرتی ہیں لکیریں کس طرح
تم کبھی میری ہتھیلی دیکھنا، تو سوچنا

انیلہ رشید سیال، خیر پور میرس

جو میرے بعد کام آئیں کسی کے
میری آنکھیں ہیں حاضر، دان رکھ لیں

ظہور احمد فاتح، توسہ شریف

تمہیں لگی ہے محبت ملاپ جسموں کا
مری نگاہ میں ہے یہ وصال روحوں کا

رفیق الدین شیخ، سکھر

ثابت قدم رہے ہیں مصائب کے روبرو
ہر امتحان زیست میں اول ہی آئے ہیں

خالد حبیب اعوان، خوشاب

جب شب کی تیرگی میں زمانہ ہو محو خواب
دل کے حرم میں تجھ کو پکارا کریں گے ہم

ملک ثاقب غفار تنہا، خانیوال

دن بھر خفا تھی مجھ سے مگر چاند رات کو
مہندی سے میرا نام لکھا اپنے ہاتھ پر

مس پٹاخا فرام، کوٹ ادو

یاد تو ہوں گی وہ باتیں تجھے اب بھی لیکن
شیلف میں رکھی ہوئی بند کتابوں کی طرح

افتخار احمد، سرگودھا

آئینہ ساز کے ہاتھوں میں یہ خوبی تھی کہاں
آئینہ خوش ہے کہ تو نے اسے صورت دے دی

طاہر الدین بیگ، میر پور خاص

اپنی گلی میں اپنا ہی گھر ڈھونڈتے ہیں لوگ
امجد یہ کون شہر کا نقشہ بدل گیا

کامل مکرجی، سیالکوٹ

آدمی سے انسان تک آؤ گے تو سمجھو گے
کیوں چراغ کے نیچے روشنی نہیں ملتی

محمد وحید، خوشاب

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا راز داں اپنا

ظفر سعید اور محمد اشفاق خان خٹک، سانگھڑ

بچھڑے تو عجب پیار جتاتا ہے خطوں میں
مل جائے تو پھر حد سے گزرنے نہیں دیتا

رضوان اشرف، پنو عاقل

اپنے اپنے دکھ خود سہنا اچھا لگتا ہے
کہنے سننے سے چپ رہنا اچھا لگتا ہے

جویریہ کرن چوہدری، ڈیرہ غازی خان

جمال یار کی زیبائیاں ادا نہ ہوئیں
ہزار کام لیا میں نے خوش بیانی سے

آمنہ افضل، سکھر

وعدہ خلافیوں پر کیوں اس قدر ہو نادم
ہم سچ ہی مان لیں گے کرو کوئی اور بہانہ

طاہر فیاض عاصی، ننکانہ صاحب

کرنوں کی بھیک مانگتی پھرتی ہے خلق شہر
اب وقت ہے کہ گھر کو جلا دینا چاہیے

بلبل کریم، بھکھر

مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

حافظ سوہن حلوہ ملتان کی جانب سے محفل شعر و سخن کے تین بہترین اشعار پر انعامات دیئے جائیں گے

محفل شعر و سخن

کوپن برائے شمارہ اپریل 2007

نام : _____

پتا : _____

_____

نوٹ: اشعار فل اسکیپ کاغذ پر بھجوائیں مکمل نام و پتا اور فون نمبر (بصورت دستیابی) کوپن پر لازمی تحریر فرمائیں۔

خوب صورت و کل رنگ جذبوں سے گندھی ایک تیز رفتار کہانی

اناڑی

احمد اقبال

قسمت کے پھیر میں الجھے ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہانو اسے دیار غیر لے گیا جہاں وہ اناڑی تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کا اناڑی پن اسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اسے پردیس راس آگیا تھا جہاں کی ہنگامہ خیزیاں اس کا دل لبھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اس کی لاٹری کھل گئی، ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اسے لوٹنا تھا۔ اناڑی سے کھلاڑی بننے کے بعد وہ لوٹا تو ہنگامے اور شرارتیں اس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لمحہ لمحہ قہقہوں سے لبریز اس اناڑی کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

دورِ حاضر کے فتنوں اور حالات کی عکاس ایک دلچسپ رنگ بھرپور رنگ

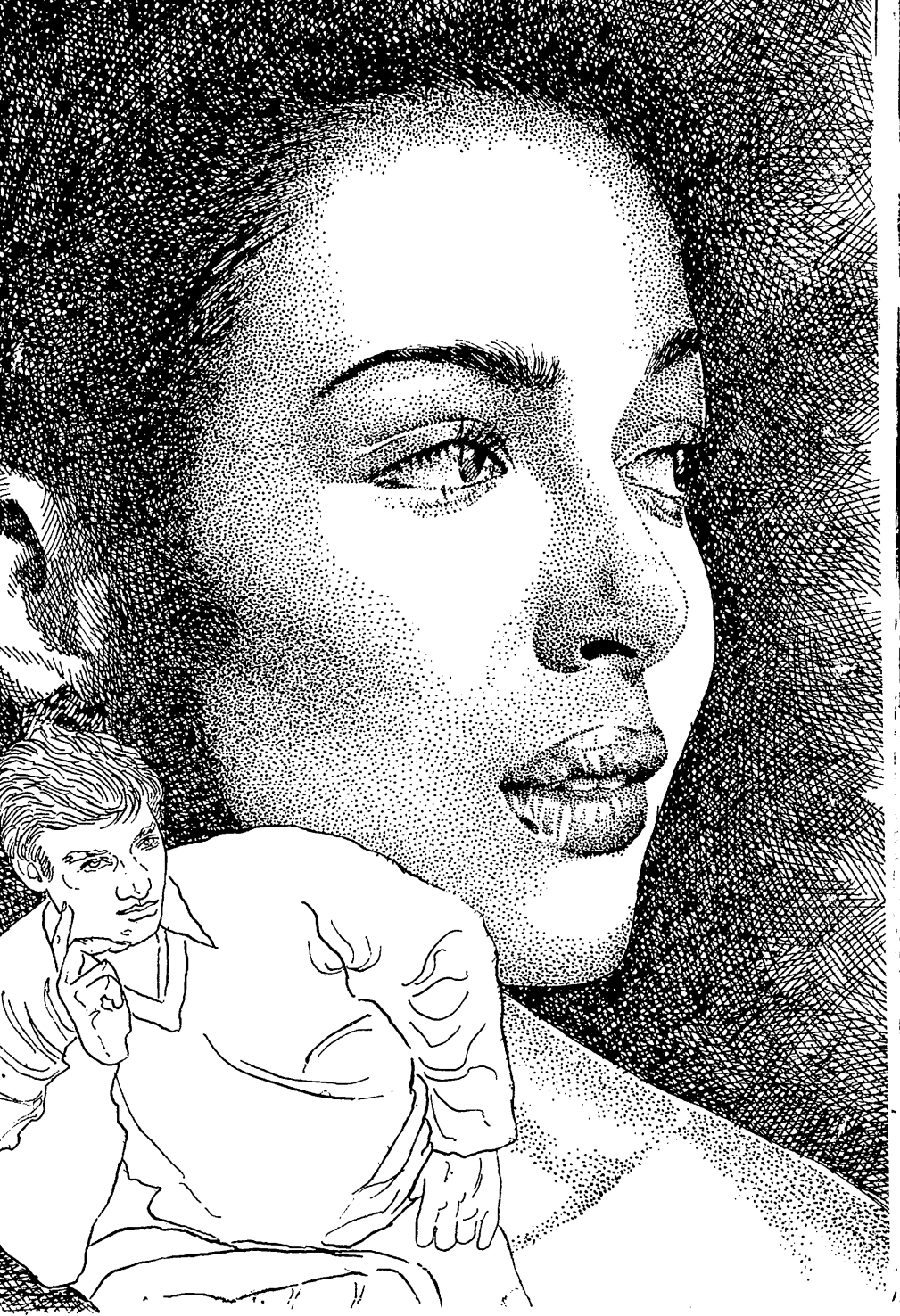

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میرا تعلق متوسط گھرانے سے ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں شاید دوسروں کی دیکھا دیکھی ایک تنظیم کا رکن بن گیا۔ حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ مجھے ملک چھوڑ کر دیارِ غیر کی راہ لینی پڑی۔ میں نے امریکا میں تعلیم مکمل کی اور پھر لندن آ گیا۔ تنظیم سے میرے روابط نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے۔ وہاں کے ایک لارڈ کی بیٹی مجھ پر فدا ہوئی۔ اس کے ساتھ میری ایک مجبوبہ فریال بھی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ لندن میں موجود تھی۔ وہ ایک بڑی اداکارہ تھی اور اپنی حماقتوں کے باعث ایک مقتدر مگر بدمعاش سیرت شخص کے چنگل میں پھنس کر اس سے شادی کا وعدہ کر چکی تھی۔ میں فریال کی زلف گرہ گیر کا اسیر تھا تو عائشہ میری وجاہت پر قربان ہونے کو تیار تھی۔ میں چکی کے دو پاٹوں کے درمیان تھا کہ مجھے پاکستان سے واپسی کا بلاوا موصول ہوا۔ مجھے ملنے والی اطلاع کے مطابق ایک بڑی لاٹری کھل گئی تھی۔ میرے پرکھوں میں کے آخری وارث نے ست بدھائی نام کی جاگیر میرے نام لکھ دی تھی، جس کی مالیت بلاشبہ کروڑوں میں تھی۔ میں پاکستان آ رہا تھا جب تنظیم کے ہیڈ کا پیغام مجھے ملا کہ میں اس سے ملاقات کرلوں۔ میں نے پیغام لانے والے قاصد کا حشر خراب کیا اور وہاں سے نکل آیا۔ پاکستان آ کر مجھے بتایا گیا، تنظیم اپنے پاس کے برطانیہ میں قانونی قیام کے سلسلے میں عائشہ کے باپ کو استعمال کرنا چاہتی تھی۔ ان کا خیال تھا، میں عائشہ کے باپ کے ذریعے یہ کام کرا سکتا تھا۔ میں اپنے گھر پہنچا جہاں نئے بنگلے میں میرے منتظر تھے۔ میں نے اپنی جاگیر کی تفصیل معلوم کی اور ایک کے بعد دوسرا در حیرت میرے لیے وا ہوتا چلا گیا۔ یہاں میرا جگری دوست راجا بھی موجود تھا۔ وہ صحافی تھا اور صحافیوں کی اس قسم سے تعلق رکھتا تھا جنہیں بلیک میلر کہا جا سکتا ہے۔ تاہم وہ مجھ سے مخلص تھا۔ میں راجا اور اس کی محبوبہ کے ساتھ اپنی جاگیر پر گیا۔ اس دوران میں مجھ پر ایک قاتلانہ حملہ بھی ہوا۔ میرے ست بدھائی پہنچنے پر میرا استقبال اچھی طرح کیا گیا مگر جلد ہی وہاں کے لوگوں کی اصلیت سامنے آ گئی۔ وہاں بہت کچھ عیاں تھا اور بہت کچھ نہاں بھی تھا۔ اکبر خان نامی شخص مجھے وہاں ملا، اس نے مجھے چکر دینے کی کئی کوششیں کیں۔ اس دوران میں میری ایک پرانی محبت فرخندہ بھی مجھ سے آن ملا، وہ مجھے اپنی بہن کے بہیمانہ قتل کا ذمے دار سمجھتے ہوئے اس کا انتقام لینا چاہتا تھا تاہم حقیقت سامنے آنے پر وہ میرا ساتھی بن گیا۔ میں نے دیکھا، میری زمین پر ایک پختہ عمارت تعمیر کی گئی تھی جو ہر طرح سے پراسرار دکھائی دیتی تھی۔ اکبر خان اس بارے میں کوئی جواب نہیں دے سکا تھا۔ اب مجھے خود ہی اس کا کھوج لگانا تھا مگر اس سے پہلے کرنے والے بہت سارے کام تھے۔ میں وہیں تھا جب فریال صفدر سلطان کے شکنجے سے نکل کر مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی۔ میں اپنی وین کا جائزہ لینے نکلا تو میرا نکراؤ رجب علی جتال کے گرگوں سے ہوا۔ میرے ہاتھوں اس اپنے کتے کی ہلاکت نے اسے غیظ و غضب کا پیکر بنا دیا۔ مجھے اندازہ تھا، وہ اس علاقے میں میرے لیے مشکلات پیدا کر کے رہے گا۔ مجھے اس سے نمٹنے کے لیے بھرپور تیاری کی ضرورت تھی۔ اس نے مجھے پیغام بھجوایا کہ وہ اپنے اس ملازم کو موت کی سزا دینے والا تھا جس کی غفلت سے اس کا کتا میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ ایک بے گناہ انسان کا خون ہونے والا تھا میں اسے بچانا چاہتا تھا مگر قانون اس معاملے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس سوچ بچار میں تھا جب کاسو کی بیوی نے مجھے دہائی دینے شروع کی وہ اپنے شوہر اور اپنی جان کی امان چاہتی تھی مجھ پر اس کی مدد واجب تھی۔ ہم اس کے ساتھ رجب علی کی حویلی پہنچے اور کمانڈو ایکشن کے ذریعے کاسو کو وہاں سے نکال لائے۔ یہ رجب علی کے منہ پر طمانچہ تھا۔ مجھے پورا یقین تھا وہ اپنی اس ہزیمت کو ہرگز نہیں بھلائے گا۔ دوسری طرف یہ گھر کے معاملات بھی درست نہیں تھے۔ وہاں سے اطلاع تھی کہ کچھ پراسرار قسم کے لوگ گھر کے آس پاس منڈلاتے رہتے ہیں۔ یہ شاید تنظیم کے گرگے تھے۔ میں واپس آیا اور اپنی حماقت کے باعث صفدر سلطان کے جال میں پھنس گیا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے مجھے ایک لڑکی کے قتل میں ملوث کرنے کی کوشش کی تھی مگر قسمت کی یاوری کے باعث میں بچ نکلا اور صفدر سلطان کو منہ کی کھانی پڑی۔ اس دوران مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ میرے گھر پر تنظیم کے بدمعاش متعین تھے میں نے تنظیم کے صوبائی چیف سے رابطہ کیا اس سے ملاقات کی اس نے میرا بھیانک ماضی میرے سامنے رکھ دیا۔ میرے لیے کوئی جائے فرار نہ تھی۔ وہ مجھے ہر صورت اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کوئی واضح جواب نہیں دیا تاہم دل میں فیصلہ کرلیا کہ وہ اور اس کے ساتھی بہت جلد میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے۔ مجھے اب چوکھی لڑنی تھی ایک طرف میرے اپنے خاندان والے تھے جنہیں ہوسِ دولت نے اندھا کر دیا تھا دوسری طرف ماضی کے وہ لوگ تھے جو ہر قیمت پر مجھے دوبارہ اپنی صفوں میں دیکھنا چاہتے تھے اس کے علاوہ میرے ہاتھوں برباد ہونے والے ستم زدگان ان کے علاوہ تھے جن سے میرا سامنا ہوتا تو وہ پرانے حساب چکانے کے لیے کوئی بھی حرکت کر سکتے تھے۔ میں اپنی جاگیر پر واپس آ گیا۔ مجھے وہاں موجود ہر اس عمارت کے بارے میں جاننے کا تجسس تھا میں وہاں گیا مگر مجھے وہاں داخلے کی اجازت نہیں ملی میں نے پولیس سے رابطہ کیا۔ پولیس نے ہماری موجودگی میں وہاں چھاپا مارا تو وہاں کچھ نہیں تھا وہ کوئی حقیقی لیبارٹری تھی یہ سب ڈراما تھا مجھے یقین تھا وہاں کوئی غیر قانونی کام ہو رہا تھا۔ میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ اس سارے ڈرامے کی حقیقت جان کر رہوں گا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں کوئی غیر قانونی کام ہو رہا تھا شاید یہ منشیات کا چکر تھا۔ میرے شک کو تقویت اس وقت ملی جب کہ اکبر خان مجھ سے ملنے آیا اور مجھے اس عمارت سے دور رہنے کے لیے اک کروڑ روپے سالانہ کی پیشکش کر کے گیا۔ اس پیشکش نے میرے ارادوں کو اور پختہ کر دیا۔ اس دوران رانا رجب علی جتال سے میری رسہ کشی جاری رہی۔ اس نے اپنے کتوں کے ذریعے میری حویلی پر شب خون مارنے کی کوشش کی مگر اسے کامیابی نہ ہوئی تاہم کاسو زخمی ہوا اور ایک رات میری حویلی سے نکل کر رجب علی جتال کے گھر پہنچ گیا۔ یہ اس کی کم مائیگی کی انتہا تھی میں نے رجب علی سے ملاقات کی وہ بھی میری حویلی کے اطراف جاری غیر قانونی کام سے واقف تھا اس نے مجھے اکبر خان کی پیشکش قبول کر لینے کا مشورہ دیا۔ میں کاسو کے معاملے میں بے بسی محسوس کر رہا تھا جب ایک ڈاکو نے مجھ سے رابطہ کیا اور کاسو کا احوال دریافت کیا۔ وہ کاسو کا ممنون احسان تھا۔ ہم اس پر غور کر رہے تھے کہ مجھے گارڈ نے کسی ملاقاتی کے آنے کی خبر بڑے پراسرار انداز میں دی ''نواب صاحب! وہ ایک جھلا فقیر ہے۔''

زورِ تخیل

رفعت رضا

کہتے ہیں بے خبری بھی کسی نعمت سے کم نہیں ..... انسان جس قدر بے خبر ہوگا اسی قدر سکون میں ہوگا کہ باخبری اسے اندیشوں میں مبتلا رکھتی ہے اور پھر اگر باخبری آیندہ مستقبل کے بارے میں ہو تو سکون کا سانس بھی لینا محال ہوتا چلا جاتا ہے۔

دو بہنوں کی کہانی جن میں سے ایک کا تخیل حقیقت میں بدل جاتا تھا

''سنو پارو! تم یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کرنے لگی ہو؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟'' پارو کی بڑی بہن مہرو نے اپنی چھوٹی بہن سے غصے کے عالم میں کہا۔

''نہیں مہرو! میں کوئی بہکی بہکی باتیں نہیں کررہی ہوں۔'' پارو نے کہا۔ ''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے یہ خواب بار بار دکھائی دیتا ہے۔ یہ محض کوئی اتفاق نہیں ہے۔ اس میں یقیناً کوئی نہ کوئی سچائی ضرور ہے۔'' پارو نے اپنی بہن کو نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے آج اسٹیج پر گانوں کے مقابلے میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔'' مہرو نے ناگواری سے کہا۔ ''صرف اس لیے کہ تمہیں وہ نامعقول خواب بار بار دکھائی دے رہا ہے جس میں تمہارے بقول میرے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے اور میں گانے کے دوران اسٹیج سے گر جاتی ہوں۔''

''میری پیاری بہن مہرو! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔'' پارو نے اپنی بہن کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''نجانے کیوں میرا دل بہت ڈر رہا ہے۔ خدا کے لیے تم آج کے گانوں کے اس مقابلے میں حصہ نہ لو۔'' پارو کی آواز میں عاجزی تھی۔

''پارو! تمہیں اندازہ ہے کہ میں نے اس مقابلے کے لیے کتنی محنت اور تیاری کی ہے؟ دن رات ایک کر دیا ہے اس کے لیے اور اب تم مجھ سے کہہ رہی ہو کہ اس میں حصہ نہ لوں۔ واہ میری بہن، واہ! تمہاری منطق بھی نرالی ہے۔ تمہارے ایک خواب کی وجہ سے..... جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں اپنا ارادہ ترک کر دوں؟ جانتی ہو کہ اگر میں نے ایسا کیا تو وہ نامعقول لڑکی شہلا ایک بار پھر اس مقابلے کی فاتح قرار پائے گی لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ پچھلے سال اس نے مجھے ہرایا تھا مگر اس بار ایسا نہیں ہوگا، ہرگز نہیں۔'' کہتے کہتے مہرو کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہوگیا۔

''اچھا تو ایک کام کرو۔'' پارو نے مہرو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم اس مقابلے میں حصہ ضرور لو لیکن اسٹیج پر کھڑی مت ہونا، اسٹیج سے ذرا آگے ہو کر کھڑی ہو جانا۔ تم یہ کام کرلو، اسے میرا وہم سمجھ لو لیکن میری تسلی ہو جائے گی۔'' پارو کے لہجے میں بڑی مسکینی تھی۔

''ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں اسٹیج کے بجائے آڈیٹوریم کے باہر دروازے پر کھڑی ہو کر گالوں۔ تمام حاضرین اور مقابلے کے جج میری خاطر وہیں آجائیں گے۔'' مہرو نے تمسخرانہ انداز میں کہا پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ پارو کے سامنے جوڑ دیے اور اس سے کہا۔ ''خدا کے لیے پارو! جاؤ اور جا کر آرام کرو۔ میرے خیال میں تمہارا ذہن بہت تھک چکا ہے جبھی تمہیں یہ الٹی سیدھی چیزیں نظر آرہی ہیں اور تم اوٹ پٹانگ باتیں کر رہی ہو۔ میری فکر مت کرو، مجھے کچھ نہیں ہو گا۔'' یہ کہہ کر مہرو پیر پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔

☆☆☆

وہ ہفتے کا دن تھا۔ پارو کے اسکول کی چھٹی تھی، جبکہ اس کی بڑی بہن مہرو کالج میں پڑھتی تھی، کالج گئی ہوئی تھی۔ اس دن کالج میں اینول ڈے سیلیبریشنز ہو رہی تھیں۔

پارو اور مہرو ایک دوسرے سے بہت پیار کرتی تھیں۔ ان کے درمیان کبھی کسی بھی موضوع پر کوئی اختلاف نہیں ہوا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب پارو نے اپنی بہن کے حوالے سے بار بار وہ خواب دیکھا تو وہ حقیقتاً بے حد خوف زدہ ہوگئی تھی۔

پارو کی سبھی کلاس فیلوز کہا کرتی تھیں کہ پارو نفسیاتی مریضہ ہے۔ ان میں سے کچھ اس کا مذاق بھی اُڑاتی تھیں مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ پارو جو بھی خواب دیکھتی تھی وہ بعد میں سچ ثابت ہوتا تھا۔

پہلا واقعہ اس وقت پیش آیا جب پارو آٹھویں کلاس میں تھی۔ ہوا یوں کہ ایک دن پارو نے اپنے تمام کلاس فیلوز سے کہا کہ فلاں فلاں سوال امتحان میں ضرور آئیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ اس نے جن سوالات کے بارے میں بتایا تھا وہ سب کے سب امتحانی پرچے میں موجود تھے۔ یہ دیکھ کر پارو کی کلاس کے سبھی ساتھی حیران رہ گئے۔ ان میں سے کچھ کا کہنا تھا کہ پارو کو کسی ٹیچر سے ان سوالوں کے بارے میں پتا چل گیا ہوگا لیکن زیادہ تر اسے پارو کی روحانی قوت کا کرشمہ قرار دے رہے تھے۔ اس سلسلے میں جب پارو سے بات کی گئی تو اس نے اپنے تمام کلاس فیلوز سے ہنستے ہوئے کہا۔ ''مجھ میں کوئی روحانی طاقت ہے اور نہ ہی مجھے کسی ٹیچر نے ان سوالوں کے بارے میں بتایا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ سوال اتنے امپورٹنٹ تھے کہ میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ امتحان میں ضرور آئیں گے اور اتفاق سے میرا اندازہ درست نکلا، بس اتنی سی بات ہے۔''

اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ اکثر و بیشتر پارو جو بھی بات کہتی، وہ پوری ہو جاتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے کوئی پُراسرار طاقت اسے مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں پہلے سے بتا دیتی ہے پھر تو وہ اپنی کلاس کی نجومی بن گئی۔ کلاس کا ہر اسٹوڈنٹ اپنے مستقبل کے بارے میں اس سے پوچھتا اور مشورہ کرتا نظر آتا تھا۔ وہ سب کوئی بھی نیا کام کرنے سے پہلے پارو سے ضرور پوچھتے تھے کہ انہیں وہ کام کرنا چاہیے یا نہیں اور اس میں کامیابی کے کیا امکانات ہیں۔ پارو ان سب کی باتیں سن کر خوب ہنستی تھی۔ وہ اس صورت حال سے جی بھر کر لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے پاس کوئی بھی خاص روحانی یا پُراسرار طاقت

نہیں ہے، وہ جو کچھ محسوس کرتی تھی، اس سے اپنے ساتھیوں کو آگاہ کردیا کرتی تھی اور یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اس کا خیال درست نکلتا تھا۔ اس کے علاوہ پارو کے حوالے سے ایک حیران کن بات یہ بھی تھی کہ وہ ہمیشہ بالکل درست فیصلہ کرتی تھی، اس کا کوئی فیصلہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ مزاجاً بہت ہی صاف ستھری اور شائستہ لڑکی تھی جو اپنے اسکول میں بھی مقبول تھی اور گھر پر بھی۔ اس کی بہن مہرو اور اس کے والدین اس سے بہت پیار کرتے تھے۔

زندگی اسی طرح گزر رہی تھی کہ پھر اچانک ہی پارو نے مہرو والا خواب دیکھا جس نے اسے واقعی خوف زدہ کردیا۔ اس نے اس سے پہلے ایسا بھیانک خواب نہیں دیکھا تھا اور اس خواب میں اپنی بہن کو دیکھ لیا تھا جس سے اس کا خوف زدہ ہونا فطری تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر خدانخواستہ اس کا یہ خواب سچ ثابت ہوا تو کیا ہوگا؟ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اسی لیے وہ مہرو کی خوشامد کررہی تھی کہ وہ گانے کے مقابلے میں حصہ نہ لے اور اگر لے تو کم از کم اسٹیج پر کھڑے ہوکر نہ گائے مگر مہرو اس کی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ اس نے مہرو والا خواب متواتر پانچ راتوں تک دیکھا تھا کہ جب مہرو اسٹیج پر گئی تو اس کے قدموں کے نیچے اسٹیج کا کچھ حصہ ٹوٹا اور بڑا شگاف نمودار ہوگیا اور مہرو اس میں گر گئی۔

یہ خواب بظاہر بہت عجیب لگ رہا تھا، کیونکہ مہرو کے نیچے اسٹیج کیسے ٹوٹ سکتا تھا؟ یہ سالانہ تقریب ایک بہت اچھے اور شاندار آڈیٹوریم میں منعقد ہورہی تھی جہاں کے اسٹیج اتنے کمزور نہیں ہوتے کہ وہ کسی کے وزن سے ٹوٹ جائیں۔

اِدھر مہرو کا وہ حال تھا کہ وہ اپنی بہن کی ان فضول باتوں سے چڑ گئی تھی۔ ماضی میں ایسا ہوتا تھا کہ وہ اپنی بہن پارو کی تمام اوٹ پٹانگ باتیں توجہ سے سن لیا کرتی تھی لیکن آج اسے غصہ آگیا تھا اور اس نے پارو کی درخواست پر کوئی توجہ نہیں دی تھی بلکہ اسے ڈانٹ کر چلی گئی تھی مگر بعد میں وہ یہ سوچ رہی تھی کہ ایسا تو نہیں ہے کہ پارو اس سے جلنے لگی ہو اور وہ یہ نہ چاہتی ہو کہ وہ یہ مقابلہ جیتے۔ وہ جانتی تھی کہ پارو کے اندر حسد کا مادہ ضرور ہے لیکن یہ مادہ ان دونوں کی محبت اور تعلق کے درمیان کبھی حارج نہیں ہوا تھا۔ مہرو ہمیشہ سے ہی نہ صرف پڑھائی میں اچھی تھی، بلکہ وہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی نمایاں تھی۔ اس نے ہمیشہ عمدہ گریڈز لیے تھے۔ دوسری

''تم یقیناً یہ جاننا چاہ رہے ہوگے کہ ریس میں حصہ لینے والے باقی گھوڑے کس طرف گئے ہیں.....''

جانب پارو نصابی اور غیر نصابی دونوں شعبوں میں اوسط درجے کی حامل تھی۔

پارو اکثر یہ سوچا کرتی تھی کہ اس کے والدین مہرو کو اس پر فوقیت دیتے ہیں اور اس سے زیادہ مہرو سے پیار کرتے ہیں۔ اس بات کا ذکر وہ کئی بار مہرو سے کر بھی چکی تھی لیکن مہرو نے ہر بار اس کے خیال کو مسترد کردیا۔

اس کا کہنا تھا۔ ''تم بالکل غلط انداز سے سوچ رہی ہو۔ ہمارے والدین ہم دونوں سے یکساں انداز سے پیار کرتے ہیں۔'' لیکن پارو اس کے خیال سے کبھی متفق نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود ان دونوں بہنوں کی محبت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ وہ دونوں بہت اچھی اور گہری دوست تھیں۔

مہرو سوچ رہی تھی کہ اگر پارو اس سے حسد کرتی تھی تو اس کا اظہار اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ اب بھی کچھ کہا سنا تھا تو صرف یہ کہ اس سے درخواست کی تھی کہ وہ گانوں کے مقابلے میں حصہ نہ لے۔ اس نے مہرو کو اس مقابلے میں حصہ لینے سے روک کر اس کے ذہن میں شک کا بیج بو دیا تھا کہ وہ اس سے حسد کرتی ہے۔ سوچتے سوچتے مہرو نے اپنے خیال کو جھٹک دیا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اس کی بہن اتنی خودغرض نہیں ہوسکتی کہ محض جلن اور حسد کی وجہ سے اسے مقابلے میں حصہ لینے سے روکے۔

اُدھر پارو بھی غلط نہیں تھی۔ وہ خودغرض نہیں تھی۔ اس نے اس سے پہلے ایسا غیر معمولی اور ڈراؤنا خواب نہیں دیکھا تھا جبھی تو وہ مہرو کو اس مقابلے میں حصہ لینے سے روک رہی تھی۔ وہ اپنی بہن سے بے حد محبت کرتی تھی اور یہ برداشت نہیں کرسکتی تھی کہ اسے کوئی ذرا سی بھی تکلیف پہنچے۔

سارا دن پارو اسی پریشانی میں مبتلا رہی۔ اس کی امی بھی اس کی کیفیت کو محسوس کر رہی تھیں۔ انہوں نے کئی بار اس سے پوچھا کہ آخر مسئلہ کیا ہے، وہ کیوں پریشان ہے؟ لیکن پارو نے انہیں کچھ نہیں بتایا بس ایسے ہی ٹال دیا۔

پھر شام ہوگئی۔ فنکشن شروع ہونے میں ابھی کافی دیر تھی۔ مہرو اپنی سہیلیوں کے ساتھ پہلے ہی آڈیٹوریم میں چلی گئی تھی جہاں اسے فائنل کی تیاری کرنی تھی۔ اس فنکشن میں مہرو کی امی، ابو اور پارو کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔

آخر کار وہ لوگ گھر سے روانہ ہوگئے اور وقت مقررہ پر ہال میں پہنچ گئے۔ امی ابو کو ان کی سیٹوں پر بٹھا کر پارو اسٹیج کے عقبی حصے میں پہنچی اور مہرو کو تلاش کرنے لگی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ مہرو اس کی کوئی بات سننے والی نہیں ہے۔ اس نے اس مقابلے میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا ہے تو ٹھیک ہے، اب چاہے کچھ بھی ہو، وہ اپنی بہن کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرے گی اور اس کے لیے کامیابی کی دعا کرے گی۔ اس نے خواب والی بات وقتی طور پر اپنے ذہن سے جھٹک دی تھی۔

چنانچہ پارو نے آگے بڑھ کر مہرو کو گلے لگایا تو مہرو کے چہرے پر اطمینان آگیا ورنہ اپنی چھوٹی بہن کے بے سروپا خوابوں کا ذکر سن کر وہ اس سے خوف زدہ ہوگئی تھی۔ اب وہ پوری یکسوئی کے ساتھ گا سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد ہی پروگرام شروع ہوگیا۔ لڑکیاں باری باری آتی رہیں اور اپنے فن کا مظاہرہ کرتی رہیں۔ پارو اپنے خواب کے بارے میں سب کچھ بھول چکی تھی۔ اس کے ذہن سے نکل چکا تھا کہ اسی اسٹیج پر مہرو کے ساتھ حادثہ پیش آنے والا ہے۔ جیسے ہی پارو نے مہرو کے نام کی اناؤنسمنٹ سنی تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس کے چہرے پر خوف نمایاں ہوگیا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ کچھ ہی دیر میں اس کا خواب حقیقت کا روپ دھار لے گا۔ اس نے ڈر کی وجہ سے اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ وہ یہ خوفناک منظر اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنی بہن کے ساتھ کوئی حادثہ ہوتے دیکھ پاتی۔

اچانک پارو کے کانوں میں اس کی بہن مہرو کی آواز آئی۔ وہ اپنی آواز کا جادو جگا رہی تھی اور اسٹیج پر پورے اعتماد کے ساتھ گا رہی تھی۔ اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک اور خوش دکھائی دے رہی تھی۔ یہ دیکھ کر پارو نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور مہرو کا گانا سننے لگی۔ آخر کار گانا ختم ہوا اور مہرو گرین روم کی طرف چل دی۔ پارو اسے بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی۔ چلتے چلتے اچانک وہ لڑکھڑائی اور کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ یکا یک اسٹیج کا فرش ٹوٹا اور مہرو اس کے اندر جا گری۔ یہ منظر دیکھ کر سبھی حاضرین ساکت رہ گئے پھر ایک دم ہال میں بھگدڑ مچ گئی۔ ہر طرف چیخ و پکار تھی۔ پہلے تو پارو کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن جب اسے صورتِ حال کا اندازہ ہوا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اسٹیج کی طرف بھاگی۔ اسٹیج کے ٹوٹے ہوئے فرش پر بیٹھ کر اس نے اپنا ہاتھ نیچے کر دیا اور مہرو کو اوپر کھینچنے کی کوشش کرنے لگی، یہ دیکھ کر کچھ لوگ بھی اس کی مدد کو آگئے اور ان سب کی کوششوں سے مہرو اس شگاف سے باہر نکل آئی۔

مہرو کے کوئی شدید چوٹ نہیں لگی تھی، معمولی سی خراشیں آئی تھیں لیکن وہ بہت زیادہ خوف زدہ نظر آرہی تھی۔ سب لوگ اس کی خیریت معلوم کر رہے تھے۔ اس کے امی ابو اسے فوراً اسپتال لے گئے جہاں معمولی مرہم پٹی کے بعد اسے فارغ کر دیا گیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ پہلے کی طرح بالکل ہشاش بشاش تھی۔ اب اس نے پارو کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ وہ کمرے کے باہر کھڑی تھی، اس کے ہاتھ میں وہ ٹرافی تھی جو اس کی بہن مہرو نے جیتی تھی۔ اس مقابلے میں مہرو نے باقی تمام لڑکیوں کو شکست دے کر پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔

''ملکہ ترنم! یہ رہی آپ کی ٹرافی لیکن پہلے مجھے یہ بتائیں کہ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' پارو نے شوخی سے کہا۔ وہ اپنی بہن کی جیت پر بہت خوش نظر آرہی تھی۔

''میں..... بالکل..... ٹھ..... ٹھیک ہوں۔'' مہرو نے رُک رُک کر جواب دیا۔

''پتا ہے تم نے اس بار شہلا کو مات دی ہے۔'' پارو نے بڑے فخر کے ساتھ کہا۔

''مگر پارو..... تم نے..... جو..... کہا تھا..... وہی ہوا!..... ہے نا؟'' مہرو نے بڑی مشکل سے کہا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے اسے اپنی جیت کی کوئی خوشی نہیں ہے۔

''اچھا بس، اب آگے کچھ نہیں سنوں گی..... جو کچھ ہوا، وہ محض ایک حادثہ تھا۔'' پارو نے پیار سے مہرو کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''اور اس بات کا ذکر کسی سے بھی نہیں کرنا۔''

''ٹھیک ہے، میں کسی کو نہیں بتاؤں گی لیکن کیا واقعی یہ محض ایک اتفاق تھا؟'' مہرو نے سوال کیا۔

پارو کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ مہرو کے سوال کا کیا جواب دے۔ اس لیے اس نے خاموشی اختیار کی لیکن مہرو کو

تاکید کر دی کہ وہ اس خواب کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائے۔

کچھ ہی روز میں مہرو سب کچھ بھول گئی اور زندگی ایک بار پھر پہلے کی طرح گزرنے لگی۔

☆☆☆

''ہائے پارو! تم تو بہت اچھا بیڈمنٹن کھیلتی ہو!''

دانیال نے کورٹ میں پارو سے کہا تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی کیونکہ دانیال بیڈمنٹن کا بہت اچھا کھلاڑی تھا اور کئی بار چیمپئن شپ جیت چکا تھا۔ وہ ایک مغرور لڑکا تھا۔ پارو جیسی لڑکیوں کو تو منہ بھی نہیں لگاتا تھا لیکن آج اس نے پارو کو خود مخاطب کیا تھا اور اس کے کھیل کی تعریف بھی کی تھی۔ پارو دانیال کی پرستار تھی۔ ایک بار اس نے دانیال کو کھیلتے دیکھا تھا، بس تبھی سے وہ اس کی فین بن گئی تھی۔ شاید یہ دانیال کی پسندیدگی ہی تھی جس کی وجہ سے پارو نے خود بھی بیڈمنٹن کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ پارو دانیال کو بہت پسند کرتی تھی بلکہ دل ہی دل میں وہ اس سے محبت بھی کرنے لگی تھی لیکن اس نے اپنی چاہت اپنے دل کے اندر چھپا کر رکھی ہوئی تھی۔ کسی پر ظاہر نہیں کی تھی، دانیال پر بھی نہیں۔ وہ دانیال سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن اس کی روایتی شرم آڑے آجاتی تھی اور اس کے دل کی بات دل ہی میں رہ جاتی لیکن آج دانیال نے اس سے بات کر کے اسے حیران کر دیا تھا۔

''تم کسی چیمپئن سے کم نہیں ہو۔'' دانیال نے پارو سے کہا۔ ''میں کئی دنوں سے تمہارا کھیل دیکھ رہا ہوں تمہیں اس سال منعقد ہونے والی بیڈمنٹن کی جونیئر چیمپئن شپ میں حصہ لینا چاہیے۔''

''کیا واقعی؟'' پارو نے حیران ہو کر دانیال کی طرف دیکھا۔ ''کیا میں.....''

''ہاں، تم ایک اچھی کھلاڑی ہو۔'' دانیال نے پارو سے کہا۔ ''تم نہ صرف اس چیمپئن شپ میں حصہ لے سکتی ہو بلکہ یہ اسے جیت بھی سکتی ہو۔''

''مگر میں اتنی اچھی کھلاڑی نہیں ہوں۔ ابھی مجھے کوچنگ اور پریکٹس کی ضرورت ہے۔ کیا آپ میری مدد کریں گے؟''

''کیوں نہیں؟'' دانیال نے کہا۔ ''میں تمہاری ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔ تم ایسا کرو کہ کل شام کو چار بجے یہاں آجانا، میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

''بہت بہت شکریہ، میں وقت مقررہ پر پہنچ جاؤں گی۔'' پارو نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا اور

میاں بیوی میں تُو تُو مَیں مَیں جاری تھی۔ شوہر بیزاری سے بولا ''بعض اوقات تو میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ تمہاری قبر پر کس مضمون کا کتبہ لکھواؤں گا؟''

''لو..... اس میں سوچنے کی کیا بات ہے.....'' بیوی فوراً تنک کر بولی ''لکھوا دینا کہ یہاں ان صاحب کی بیوی دفن ہے جن کی قبر برابر میں پہلے سے موجود ہے.....''

وہاں سے روانہ ہو گئی۔

اس وقت پارو کا یہ حال تھا کہ جیسے وہ بادلوں میں اُڑ رہی ہو۔ اس کے جسم میں گویا برقی رو دوڑ رہی تھی۔ وہ گھر کس طرح پہنچی، اسے کچھ یاد نہیں لیکن سارے راستے وہ مگن تھی اور آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔ عام طور سے وہ اپنی بہن مہرو کو ہر بات بتایا کرتی تھی۔ اس سے کچھ نہیں چھپاتی تھی لیکن نجانے کیوں آج اس نے مہرو کو دانیال سے اپنی ملاقات کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔

البتہ مہرو، پارو کو اس قدر خوش دیکھ کر حیران ضرور ہوئی۔

اس رات جب پارو اپنے بستر پر سونے کے لیے لیٹی تب بھی اس کی آنکھوں کے سامنے دانیال کا چہرہ تھا۔ وہ اسی کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گئی لیکن سونے کے بعد اس نے ایک اور خواب دیکھا۔

اس نے دیکھا کہ مہرو اپنے کمرے میں اکیلی ہے۔ وہ اپنے بیڈ پر لیٹی ڈیٹیل اسٹیل کا ایک ناول پڑھ رہی ہے جس کا عنوان ہے ''ایکسیڈنٹ'' اچانک اس کمرے میں کوئی داخل ہوتا ہے۔ مہرو آنے والے کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے اور دوبارہ اپنا ناول پڑھنے لگتی ہے پھر آنے والا کچھ کہتا ہے۔ خواب میں پارو آنے والے کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی۔ بہرحال، اس کی بات سن کر مہرو کے چہرے پر دکھ اور تشویش نمایاں ہو جاتی ہے۔ وہ جواباً کچھ کہتی ہے، اس نے کیا کہا، یہ پارو نہیں سن سکی پھر اس نے دیکھا کہ مہرو کے کمرے میں آنے والے نے نیلے رنگ کے ایک چمکدار بیگ سے کوئی چمکتی ہوئی چیز نکالی، اس بیگ پر سنو وائٹ کی تصویر بنی ہوئی تھی جو پارو نے خواب میں بھی بالکل واضح طور پر دیکھی تھی پھر اس نے مہرو کو اس حال میں دیکھا کہ وہ بستر پر بے سدھ پڑی تھی اور اس کے جسم پر خون ہی خون تھا۔

اسی لمحے پارو کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔

اس نے جلدی سے مہرو کی طرف دیکھا، وہ بڑے سکون سے سو رہی تھی مگر پارو بری طرح لرز رہی تھی۔ وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور میز پر رکھے جگ میں سے ایک گلاس میں پانی انڈیلا، وہ اس بری طرح لرز رہی تھی کہ اس نے پانی پیا کم اور گرایا زیادہ۔ پانی پینے کے بعد وہ پھر بستر پر آ کر لیٹ گئی اور اپنے تازہ خواب کے بارے میں سوچنے لگی۔ یہ سب کیا ہے؟ آخر کار کیا ہونے والا ہے؟ کمرے میں کون داخل ہوا تھا؟ اس کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی چیز کیا تھی؟ آخر مہرو کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ پارو نے اس خواب میں مہرو کو جو ناول پڑھتے دیکھتے تھا، وہ اس نے اپنے گھر میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور مہرو تو ناول پڑھتی ہی نہیں تھی پھر اس نے اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب میرا وہم ہے، خواب تو خواب ہوتے ہیں، ان کا حقیقت سے کیا تعلق؟''

سوچتے سوچتے وہ ایک بار پھر اونگھنے لگی اور آخر کار گہری نیند سو گئی۔

صبح پارو نے مہرو کو اپنے گزشتہ رات والے خواب کے بارے میں بتانا چاہا مگر پھر وہ یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ کہیں مہرو پریشان نہ ہو جائے اور وہ مہرو کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ دن کسی خاص واقعے کے بغیر آرام سے گزر گیا۔

☆☆☆

پارو بار بار وال کلاک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے بڑی بے چینی سے چار بجنے کا انتظار تھا۔ پہلے تو وہ بہت پُرجوش تھی لیکن اب کچھ نروس بھی ہو رہی تھی۔ اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ دانیال اس کی کوچنگ کرنے آ رہا ہے۔ جب وہ ہانپتی کانپتی کورٹ میں داخل ہوئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ دانیال وہاں پہلے سے موجود تھا۔ وہ سیدھی اس کے پاس پہنچی اور معذرت کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے ذرا سی دیر ہو گئی۔''

''تمہیں دیر نہیں ہوئی بلکہ میں پہلے آ گیا ہوں۔'' دانیال نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بات یہ ہے کہ میں نے آج سے پہلے کسی کھلاڑی کی کوچنگ نہیں کی اسی لیے ذرا سا نروس ہو گیا ہوں۔''

''آپ اور نروس؟ یہ لفظ آپ پر کچھ جچا نہیں۔'' پارو نے حیرت سے کہا۔ ''نروس تو مجھے ہونا چاہیے کہ آپ جیسا عظیم کھلاڑی...''

''اچھا بس اب میری تعریفوں کے پل مت باندھو، میں کیا ہوں، یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' دانیال نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تو شروع کریں؟''

''کیوں نہیں، میں آئی اسی لیے ہوں۔'' پارو نے کہا اور ان دونوں نے کھیل شروع کیا۔

دانیال واقعی بہت اچھا کھلاڑی تھا۔ دوسری طرف پارو بھی ایسا برا نہیں کھیل رہی تھی۔ اس کے بعض شاٹ دیکھ کر دانیال بہت متاثر ہوا اور اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہا۔ ایک گھنٹے تک کھیلنے کے بعد انہوں نے کچھ دیر آرام کیا۔

''پارو! تم واقعی اچھا کھیلتی ہو۔'' دانیال نے کہا تو پارو شرما گئی۔

''میں یہ بات رسماً نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ حقیقت ہے۔'' دانیال نے اسے شرماتا دیکھ کر کہا۔

بجائے اس کے کہ پارو اپنی تعریف پر خوش ہوتی، وہ کچھ اُلجھ سی گئی۔

''ارے تم تو اپنی تعریف سن کر پریشان ہو گئیں۔ میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا ہرگز نہیں تھا اگر میری بات سے تمہیں تکلیف پہنچی ہے تو اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔'' دانیال نے کہا۔

''ارے نہیں دانیال صاحب! میں پریشان نہیں بلکہ حیران ہوں کہ آپ جیسا چیمپین مجھ جیسی ناکارہ لڑکی کی تعریف کر رہا ہے۔''

''کیوں بھئی، کیا میں ایک حسین لڑکی کی تعریف نہیں کر سکتا؟'' دانیال نے کہا تو پارو نے شرما کر سر جھکا لیا۔

اس کے بعد وہ دونوں مزید ایک گھنٹے تک کھیلتے رہے۔ دانیال، پارو کو اس کھیل کے مزید رموز سکھاتا رہا اور پھر اس نے اس روز کی کوچنگ ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

''مجھے تمہاری کوچنگ کر کے بڑا مزہ آیا۔'' دانیال نے پارو سے کہا۔

''مجھے بھی آپ سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔'' پارو نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

''یہ سلسلہ روز جاری رکھو گی یا.....'' دانیال نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر پارو کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

''کیوں نہیں؟'' پارو نے خوشی سے کہا۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے، تم کل چار بجے آ جانا۔'' دانیال نے کہا اور پارو اس سے وعدہ کر کے اپنے گھر روانہ ہو گئی۔ راستے بھر وہ بہت خوش تھی۔ اس کے لیے دانیال کی رفاقت ایک بہت بڑا انعام تھی۔

وہ واقعی دانیال سے محبت کرنے لگی تھی اور ہمیشہ کے لیے اسی کی ہونے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ وہ تو نجانے کب سے دانیال کی دیوانی تھی مگر دور دور سے ہی اسے دیکھا کرتی

تھی۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ اسے دانیال سے ملنے اور بات کرنے کا موقع ملا جو بہت جلد دوستی میں بدل گیا۔

اس رات پارو کو پھر وہی خواب نظر آیا۔ اس نے مہرو کو خون میں نہایا دیکھا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ پسینے میں شرابور تھی۔ اب وہ ڈرنے لگی تھی۔ اسے اس خواب سے خوف آنے لگا تھا۔ یہ محض ایک خواب نہیں تھا بلکہ اس کے پس پردہ یقیناً کوئی نہ کوئی بات تھی جو نظر انداز کرنے والی نہیں تھی۔ کوئی بڑی گڑبڑ ہونے والی تھی یا کوئی خطرہ مہرو کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ اس خواب کے ذریعے پارو کو بار بار وارننگ دی جارہی تھی۔ وہ اپنی بہن کو نادیدہ خطرے سے بچانا چاہتی تھی مگر کیسے؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس نے اس خواب کا تذکرہ ابھی تک کسی سے نہیں کیا تھا اور اپنا خوف اپنے اندر چھپا کر رکھا تھا۔

☆☆☆

دوسرے روز صبح کا سورج طلوع ہوا۔ پارو کا اسکول میں دل نہیں لگا۔ جب وہ اسکول سے گھر واپس آئی تو مہرو بھی اپنے کالج سے واپس آچکی تھی۔ وہ حسب معمول اپنے بیڈ پر لیٹی کوئی ناول پڑھ رہی تھی۔ پارو تھکے تھکے سے انداز میں اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی اور نظر اٹھا کر مہرو کی طرف دیکھا تو وہ چونک گئی۔ مہرو ڈینیل اسٹیل کا ناول پڑھ رہی تھی جس کا عنوان تھا ''ایکسیڈنٹ''۔

اس نے لرزتی ہوئی آواز میں مہرو سے پوچھا۔ ''مہرو! تمہارے پاس یہ ناول کہاں سے آیا؟''

''یہ فائزہ کا ناول ہے۔ میں اس سے پڑھنے کے لیے لے آئی تھی۔'' مہرو نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''لیکن اس سے پہلے تو تم نے ڈینیل اسٹیل کا ناول کبھی نہیں پڑھا؟'' پارو نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''فائزہ کہہ رہی تھی کہ یہ زبردست رومانوی ناول ہے۔ بس اسی کے کہنے پر میں لے آئی۔'' مہرو نے سادگی سے جواب دیا۔

''تم کالج سے جلدی کیوں آگئیں؟'' پارو نے سوال کیا۔

''آج ہمارے لیکچرار نہیں آئے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ آج میرا ایک کلاس فیلو بھی یہاں آرہا ہے اسی لیے جلدی چلی آئی۔ وہ بے چارہ معاشیات میں کچھ کمزور ہے اور مجھ سے مدد چاہتا ہے۔''

''کون ہے وہ؟ مجھے نہیں بتاؤ گی؟'' پارو نے کہا تو مہرو نے سرد آہ بھری۔

''تم اسے نہیں جانتیں۔'' مہرو نے جواب دیا۔ ''مجھے بھی آج سے پہلے یہ پتا نہیں تھا کہ وہ ہمارے علاقے میں ہی رہتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں بھی لائبہ کے گھر جارہی ہوں۔'' پارو نے اپنی کتابیں اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں مل کر ہوم ورک کریں گے۔''

''کب تک واپس آؤ گی؟'' مہرو نے پوچھا۔

''ایک گھنٹے میں۔'' پارو نے جواب دیا۔

''امی کو بتا کر جانا ورنہ وہ بعد میں ناراض ہوں گی۔'' مہرو نے ناول پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

''ارے ہاں، مجھے بیڈمنٹن کی پریکٹس کے لیے بھی تو جانا ہے۔'' پارو نے کہا تو مہرو چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''یہ تم نے کیا مصیبت پال لی ہے؟ بیڈمنٹن بھی کوئی کھیلنے کی چیز ہے؟'' مہرو نے ناگواری سے کہا۔

''کسی کے مشورے پر میں نے یہ کھیل شروع کیا ہے۔'' پارو نے کہا۔ ''اس کا خیال ہے کہ مجھے بیڈمنٹن کے مقابلوں میں بھی حصہ لینا چاہیے۔ میں جونیئر چیمپین بھی بن سکتی ہوں۔ اسی لیے وہ میری کوچنگ کررہا ہے۔''

''اچھا؟ مگر وہ ہے کون؟'' مہرو نے سوال کیا۔

''وہ ایک چیمپین ہے اور وہی میری کوچنگ کررہا ہے۔ تم اس سے ملوگی تو بہت خوش ہوگی۔'' پارو نے فخر سے کہا۔

''نہیں بھئی، مجھے تو بیڈمنٹن کے کھیل سے الرجی ہے۔ مجھے تو معاف کرو۔'' مہرو نے کہا اور ایک بار پھر اپنے ناول میں غرق ہوگئی۔

''ہاں، واقعی کتابی کیڑوں کو کتابوں کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔'' پارو نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

ایک گھنٹے بعد پارو واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ مہرو میز صاف کررہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کا مہمان آکر جاچکا تھا۔

''تمہارا کلاس فیلو چلا گیا؟'' پارو نے مہرو سے پوچھا تو اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''اوہ، میں ذرا جلدی آجاتی تو اس سے مل لیتی۔'' پارو نے کہا۔

''پھر کبھی مل لینا وہ روز یہاں آئے گا۔'' مہرو نے سرسری انداز سے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

اس روز پارو کورٹ میں پہنچی تو دانیال موجود نہیں تھا۔ وہ پریشان ہوگئی کہ پتا نہیں آئے گا بھی یا نہیں پھر اس نے خود ہی

پریکٹس شروع کر دی۔ تھوڑی دیر میں دانیال آ گیا۔ اس نے آتے ہی دیر سے پہنچنے کی معذرت کی اور کہا۔ ''دراصل میرے امتحان سر پر ہیں۔ مجھے پڑھائی کو زیادہ وقت دینا پڑ رہا ہے۔ چند مضامین میں، میں کمزور ہوں۔ اسی کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' پارو نے کہا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس سے پوچھے گی کہ وہ کون سے کالج میں پڑھتا ہے اور کن کن مضامین میں کمزور ہے لیکن پھر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

انہوں نے کھیل کا آغاز کیا۔ اس کا کھیل آہستہ آہستہ نکھر رہا تھا۔ دانیال کی کوچنگ کام کر رہی تھی۔ انہوں نے پورے دو گھنٹے تک پریکٹس کی اور پھر کھیل روک دیا۔

''اُف میرے خدا! میرا دل ہی نہیں چاہ رہا کہ گھر جاؤں۔'' دانیال نے کہا تو پارو نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''تمہارے ساتھ اتنا مزہ آتا ہے کہ جی چاہتا ہے سارا دن یہیں رہوں۔ گھر جاؤ تو ایک بار پھر وہی پڑھائی۔ میں تو اس پڑھائی سے عاجز آ گیا ہوں۔'' دانیال نے اس کی سوالیہ نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے مضامین کیا ہیں؟'' پارو نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''میں معاشیات میں آنرز کر رہا ہوں۔ یہ میرا فائنل ایئر ہے۔'' دانیال نے کہا۔

''میری بہن بھی یہی کر رہی ہے۔'' پارو نے کہا۔ ''معاشیات بڑا مشکل اور خشک مضمون ہے۔ میری تو اس سے جان جاتی ہے۔''

''تمہاری کوئی بہن بھی ہے۔ یہ بات تم نے پہلے نہیں بتائی؟'' دانیال نے کہا۔

''وہ کتابی کیڑا ہے۔ اسے کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' پارو نے کہا۔

''اچھا پارو، میں چلتا ہوں۔ مجھے کہیں پڑھنے جانا ہے۔'' دانیال نے کہا۔

''ٹھیک ہے، کل ملیں گے۔'' پارو نے کہا تو دانیال نے جلدی سے کہا۔

''نہیں کل نہیں، کل مجھے ایک دوست کے ساتھ مل کر اسٹڈی کرنی ہے۔ پرسوں ملیں گے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' پارو نے مردہ دلی سے کہا۔

وہ مرے مرے قدموں سے اپنے گھر کی طرف چل دی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر دانیال چاہتا تو تھوڑی بہت دیر اسے پریکٹس کرا سکتا تھا لیکن اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔

اس رات اسے پھر وہی خواب نظر آیا مگر اس مرتبہ اسے چند ایک چیزیں مزید نظر آئیں۔ اس نے دیکھا کہ آنے والے کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی چیز ایک چاقو تھا اور اس شخص نے وہ چاقو مہرو کے سینے میں گھونپ دیا تھا مگر مہرو نے مرنے سے پہلے کاغذ پر کچھ لکھا تھا، جو کوشش کے باوجود پارو کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ انگریزی کے حروف orap پر مشتمل لفظ تھا۔ جب پارو کی آنکھ کھلی تو اس کا جی متلا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس نے کوئی خواب نہیں بلکہ حقیقت دیکھی ہے۔ وہ بری طرح لرز رہی تھی۔ اس کا ذہن اس لفظ پر اُلجھا ہوا تھا جو مہرو نے خواب میں مرنے سے پہلے لکھا تھا۔ کہیں وہ اس شخص کا نام تو نہیں تھا جس نے اسے قتل کیا تھا۔

صبح اٹھتے ہی پارو نے مہرو سے سوال کیا۔ ''تم کسی ایسے شخص کو جانتی ہو جس کے نام میں orap کے حروف آتے ہوں؟

''نہیں۔'' مہرو نے جواب دیا۔ ''مگر کیوں؟ کیا بات ہے؟''

''تمہاری حال ہی میں کسی سے لڑائی ہوئی ہے؟'' پارو نے پھر پوچھا۔

''نہیں بھئی، تم جانتی ہو کہ میں کسی سے نہیں لڑتی۔'' مہرو نے کہا۔ ''مگر بات کیا ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' پارو نے غائب دماغی سے کہا۔ پھر وہ سوچنے لگی کہ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو گئی ہے۔

''پارو! ٹھہرو میں تمہارے لیے کچھ لائی ہوں۔'' یہ کہہ کر مہرو نے نیلے رنگ کا ایک بیگ پارو کی طرف بڑھا دیا جس پر شہزادی سنڈریلا کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر پارو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کے ہاتھ پیر سنسنانے لگے اور اس کی رنگت زرد پڑ گئی۔

''میں آج مارکیٹ گئی تھی۔ یہ بیگ اچھا لگا تو تمہارے لیے خرید لیا۔ تمہیں پسند آیا؟'' مہرو نے بہن کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں..... بہت اچھا ہے۔'' پارو نے بڑی مشکل سے کہا۔ اس کا ذہن اپنے خواب میں اُلجھا ہوا تھا۔ سب چیزیں سامنے آتی جا رہی تھیں۔ وہ چاقو اس بیگ میں ہونا چاہیے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ اپنی بہن مہرو کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے گی؟ مگر کیوں؟ ہم دونوں تو بہت اچھی دوست ہیں۔ وہ اپنی پیاری بہن کی جان کیوں لے گی؟ یہ احساس ہی اسے

لرزائے دے رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا اور سسکنے لگی۔

☆☆☆

اگلا دن اسی پریشانی میں گزرا۔ پارو کی نظروں کے سامنے وہی خواب ابھرتا رہا۔ سہ پہر کو تھوڑی دیر کے لیے وہ اپنے کمرے میں لیٹی تو اُونگھنے لگی مگر شام چار بجے جلدی سے اٹھ گئی۔

اسے بیڈمنٹن کھیلنے جانا تھا لیکن پھر اسے یاد آیا کہ آج دانیال نہیں آئے گا تو وہ دوبارہ بستر پر لیٹ گئی۔ اسے مہرو کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ غالباً اپنے کلاس فیلو کو معاشیات پڑھا رہی تھی جس کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ اس مضمون میں کمزور ہے۔

پارو اٹھی۔ اس نے باتھ روم میں جا کر اپنے منہ پر پانی کے چھپکے لگائے اور پھر کچن کی طرف چل دی۔ کچن کی طرف جاتے ہوئے اس نے رک کر ہال میں جھانکا جہاں مہرو اپنے کلاس فیلو کے ساتھ موجود تھی۔ جیسے ہی اس کی نظر اس لڑکے پر پڑی اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ دانیال تھا۔ مہرو اسی کو پڑھا رہی تھی۔ پارو دبے پاؤں اندر داخل ہوئی تو مہرو نے اسے دیکھ کر کہا۔ ''آؤ پارو! اس سے ملو۔ یہ ہے دانیال، میرا کلاس فیلو اور دانیال! یہ میری بہن ہے، پارو۔''

''ارے پارو! تم مہرو کی بہن ہو؟'' دانیال نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، اور میں یہ نہیں جانتی تھی کہ تم مہرو کے کلاس فیلو ہو۔'' پارو نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ارے تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟'' مہرو نے حیرت سے سوال کیا۔

''ہاں، میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میں بیڈمنٹن کے ایک چیمپین سے اس کھیل کی کوچنگ لے رہی ہوں؟'' پارو نے کہا۔ ''یہی تو ہیں وہ۔''

''بھئی واہ! مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔'' مہرو نے سادگی سے کہا۔

''ارے کبھی اپنی بہن پارو کو کھیلتے دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔'' دانیال نے کہا۔

''ضرور! میں پارو کا کھیل بھی دیکھوں گی اور اس کے چیمپین کوچ کا بھی۔'' مہرو نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن مہرو کی بات سن کر پارو کو رقابت سی محسوس ہوئی۔

''بھئی پارو! تمہاری بہن پڑھائی میں پورے کالج کی چیمپین ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے کھیل کے بجائے اپنی پڑھائی پر ہی توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔'' دانیال نے کہا۔

''دانی! مجھے زیادہ کھٹن نہ لگاؤ۔'' مہرو نے کہا تو پارو کو جھٹکا لگا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس کی بہن دانیال سے اتنی بے تکلف ہے کہ اسے دانیال کے بجائے دانی کہہ کر پکار رہی ہے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''اچھا میں چلتا ہوں۔'' دانیال نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''چلو میں تمہیں دروازے تک چھوڑ دوں۔'' مہرو نے کہا اور اس کے ساتھ باہر چلی گئی۔ پارو ہکا بکا کھڑی ان دونوں کو باہر جاتے دیکھتی رہی۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ ان میں بڑی بے تکلفی ہے۔ پارو کو یہ دیکھ کر دُکھ ہوا تھا کہ دانیال نے جاتے ہوئے اس سے ہیلو ہائے بھی نہ کی۔

ان دونوں کے جانے کے بعد پارو اپنے کمرے میں چلی آئی۔ وہ بہت مایوس اور دل شکستہ تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس کی بہن بڑی باتونی ہے اور اپنی باتوں سے ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ اسے یاد آرہا تھا کہ جب بھی امی ابو بازار سے کچھ خرید کر لاتے تو مہرو ہمیشہ ہر اچھی چیز پر ہاتھ رکھتی تھی اگر کوئی چیز پارو کو پسند آتی تو وہ اس سے چھین لیا کرتی تھی۔ اس نے امی ابو کو اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا اور اب..... اب وہ اس کے دانیال کو اس سے چھیننے جا رہی تھی۔

''میں ایسا نہیں ہونے دوں گی، کبھی نہیں۔'' پارو بڑبڑائی۔

اس رات ان کے امی ابو کو کسی دعوت میں جانا تھا۔ پارو نے سوچ لیا تھا کہ وہ امی ابو کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دانیال کے مسئلے پر مہرو سے بات کرے گی۔ چنانچہ رات ہوتے ہی اس نے مہرو سے کہا۔ ''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

''ہاں بولو، کیا بات ہے؟'' مہرو نے ناول پڑھتے ہوئے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''تم دانیال کو کب سے جانتی ہو؟'' پارو نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''وہ میرا کلاس فیلو ہے اور اسے میں تین سال سے جانتی ہوں۔'' مہرو نے جواب دیا۔

''تم دونوں ایک دوسرے سے کس حد تک قریب ہو؟'' پارو نے پوچھا تو مہرو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''یہ تم مجھ سے کیسی باتیں کر رہی ہو؟ وہ اور میں اچھے دوست ہیں اور بس!''

''تم اس سے عشق لڑا رہی ہو۔'' یکایک پارو چیخ اٹھی۔

''تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو؟'' مہرو نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تمہارا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے۔ جاؤ اور آرام سے سو جاؤ۔''

''دیکھو مہرو! تم ساری زندگی مجھ سے میری من پسند چیزیں چھینتی آئی ہو۔'' پارو نے چیختے ہوئے کہا۔ ''مگر دانیال کو تم مجھ سے نہیں چھین سکتیں۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں، بالکل سچی محبت۔ میں تمہیں اس بار کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ تم مجھ سے اسے کبھی نہیں چھین سکو گی۔''

''پارو! خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔'' مہرو نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تم بہت بڑے دھوکے میں ہو۔ وہ تم سے محبت نہیں کرتا۔ وہ تم سے محبت کر ہی نہیں سکتا۔ میری بات کا یقین کرو پارو.....''

''وہ مجھ سے اس لیے محبت نہیں کر سکتا کیونکہ وہ تمہارے عشق میں مبتلا ہے؟ ہے نا؟'' پارو نے زہر خند لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں میری بہن! وہ مجھ سے ہی نہیں بلکہ کسی سے بھی محبت نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟'' مہرو نے کہا۔

''وہ دراصل.....'' اس سے آگے مہرو کچھ نہیں کہہ سکی۔ پارو نے اپنے بیگ میں سے چاقو نکالا جو وہ اپنے ساتھ لے کر آئی تھی اور مہرو کے سینے میں گھونپ دیا۔ مہرو کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی آواز ہی نہیں نکلی۔ اس نے بستر پر تڑپتے ہوئے کاغذ پر انگریزی میں پارو کا نام لکھا جس کا عکس آئینے میں ایسے نظر آرہا تھا orap۔

چند لمحوں میں ہی مہرو کا جسم ساکت ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک تو پارو سکتے کے عالم میں کھڑی رہی پھر اسے ہوش آیا تو اس نے جلدی جلدی وہاں کی صفائی کی۔ اس نے چاقو پر سے اپنی اُنگلیوں کے نشان صاف کر کے اسے مہرو کی لاش کے اوپر رکھ دیا۔ جب وہ ہر طرح سے مطمئن ہو گئی تو اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ اس کی چیخیں سن کر تمام پڑوسی گھر میں گھس آئے۔ انہوں نے پارو کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ تو کسی پاگل لڑکی کی طرح اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے امی ابو بھی آ گئے۔ مہرو کی لاش دیکھ کر اس کی امی پچھاڑ کھا کر گریں اور بے ہوش ہو گئیں۔ اس کے ابو انہیں لے کر اسپتال بھاگے۔

پولیس نے پارو کا بیان لینا چاہا مگر وہ کچھ بھی بولنے کے قابل نہیں تھی۔ سبھی لوگ جانتے تھے کہ ان دونوں بہنوں میں کتنا پیار تھا۔ پولیس نے نامعلوم قاتل کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کر لیا جس نے اس گھر میں ڈاکا مارنے کی کوشش کی تھی لیکن جب مہرو نے مزاحمت کی تو اسے قتل کر کے فرار ہو گیا۔

ایک ہفتے بعد ہر چیز نارمل ہو گئی۔ اس کے امی ابو کو اپنی جوان بیٹی کے قتل کا بہت افسوس تھا، افسوس تو پارو کو بھی تھا لیکن وہ کسی حد تک مطمئن بھی تھی۔ اس کے راستے کا کانٹا نکل گیا تھا۔ اب اس کے اور دانیال کے درمیان کوئی حائل نہیں ہو سکتا تھا۔ پارو نے ایک بار پھر دانیال سے بیڈمنٹن کی کوچنگ لینی شروع کر دی تھی۔

ایک روز کوچنگ کے بعد پارو نے دانیال سے کہا۔

''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

''ہاں کہو۔'' دانیال نے کہا۔

''وہ..... دراصل بات یہ ہے کہ..... مجھے..... تم سے محبت ہے..... اور..... میں..... تم سے..... شادی کرنا چاہتی ..... ہوں۔'' پارو نے رُک رُک کر اپنی بات پوری کی۔

''مجھے اندازہ ہے۔'' دانیال نے سر جھکا کر کہا۔ ''میں تمہارے جذبات کو سمجھتا ہوں لیکن بات یہ ہے پارو..... کہ.....'' کہتے کہتے دانیال چپ ہو گیا۔

''کہو تم خاموش کیوں ہو گئے؟'' پارو نے دانیال سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں کوئی اور پسند ہے؟''

''نہیں یہ بات نہیں ہے۔'' دانیال نے کہا۔ ''وہ میں..... یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں شادی کر ہی نہیں سکتا۔ صرف تم سے نہیں بلکہ کسی سے بھی نہیں کر سکتا۔ میرے اندر ایک پیدائشی جسمانی نقص ہے جس کے باعث میں شادی کرنے کی خواہش تک محسوس نہیں کرتا۔''

''کیا کہہ رہے ہو دانیال؟'' پارو نے کہا۔ ''کیا یہ بات دوسرے لوگوں کو بھی معلوم ہے؟''

''ہاں، یہ بات میرے ماں باپ کے علاوہ میرے کالج کے سبھی ساتھی جانتے ہیں۔''

اس وقت پارو کو مہرو کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا۔

''تم بہت بڑے دھوکے میں ہو۔ وہ تم سے محبت نہیں کرتا۔ وہ تم سے محبت کر ہی نہیں سکتا۔ میری بات کا یقین کرو پارو.....''

پارو، دانیال کے پاس سے اُٹھی اور کسی دیوانی لڑکی کی طرح اپنے گھر کی طرف بھاگنے لگی۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ ''میری بہن مہرو! تم ٹھیک کہتی تھیں۔ وہ مجھ سے کیا کسی سے بھی محبت نہیں کر سکتا۔ مجھے معاف کر دو میری بہن! مجھے معاف کر دو۔'' اس کی چیخیں دور دور تک جا رہی تھیں اور لوگ حیرت سے اس کو دیکھ رہے تھے۔

انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کی عکاس عبرت اثر کہانی

دنیا میں تباہی کا اتنا سامان موجود ہے جو اسے چند دقیقوں میں فنا سے دوچار کرنے کے لیے کافی ہے۔ روایتی گولا بارود سے لے کر ایٹم بم تک، کے باعث ہمارا مستقبل غیر محفوظ ہے۔ وہ اس حقیقت سے آشنا تھا اور بے حد خوف زدہ بھی، لہٰذا اس کا ہر عمل اس کے مطابق تھا۔

خوف

مرزا ظفر بیگ

ایڈمینسن موم بتی کی زرد اور لہراتی روشنی میں دیوار پر اپنا سایہ دیکھ رہا تھا جبکہ اوپر لوگوں کی پُرجوش آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ اسے اس پناہ گاہ میں دو دن اور دو راتیں ہو چکی تھیں، آج اسے پہلی مرتبہ انسانی آوازیں سنائی دی تھیں۔

''ایڈ! میرے دوست! میری بات سنو۔'' باہر سے ایڈ کا دوست نیل پکار رہا تھا ''سب ٹھیک ہے۔ ہم سب لوگ خیریت سے ہیں۔ ڈرو نہیں، باہر آجاؤ۔'' اس آواز میں پریشانی بھی تھی اور بے قراری بھی... مگر ایڈ اپنی اس قبر جیسی تاریک اور حبس زدہ پناہ گاہ سے نکلنے کو تیار نہیں تھا۔

''دروازہ کھولو مسٹر ایڈ!'' یہ باریک سی آواز اسپنسر کی تھی جو اس سے دو گھر چھوڑ کر رہتا تھا۔ اسپنسر کی آواز میں التجا تھی مگر ایڈ کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں تھیں۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے اس پناہ گاہ کے دروازے کی طرف دیکھا جس پر اس نے سیسے کی پوری چادر چڑھا رکھی تھی۔ اس کے علاوہ دوسرے حفاظتی اقدامات بھی کیے گئے تھے جن میں سے ایک انتظام یہ تھا کہ دروازے سے پہلے لوہے کی مضبوط سلاخیں بھی لگائی گئی تھیں، ان میں نجانے کس کس طرح کے لاک لگے ہوئے تھے۔ غرض اس دروازے کو اس طرح بند کیا گیا تھا جیسے اب یہ دوبارہ کبھی نہیں کھلے گا اور یہ زیر زمین پناہ گاہ کا واحد دروازہ تھا۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔

ایڈمینسن کو معلوم تھا کہ جس وقت دنیا میں ایٹمی جنگ چھڑے گی اور ایٹمی ہتھیاروں اور بموں کا آزادانہ استعمال ہوگا تو ساری دنیا تباہ ہو جائے گی۔ اس کے بعد انسان، انسان نہیں رہے گا بلکہ جانور بن جائے گا اور اس نازک وقت میں یہ لوگ اس کی پناہ گاہ میں زبردستی گھسنے کی کوشش کریں گے کیونکہ یہ اس پورے علاقے میں واحد محفوظ پناہ گاہ ہوگی۔

اس کے بعد میلوں تک ویرانہ ہوگا، اجاڑ اور سنسان جگہیں ہوں گی۔ اس کے بعد یہ جانور نما انسان اس کے محفوظ گھر میں گھس کر اس کی وہ ساری غذا کھا جائیں گے جو اس نے پہلے سے ہی یہاں محفوظ کر رکھی تھی۔ ظاہر ہے یہ غذا تابکاری کے مضر اور مہلک اثرات سے محفوظ ہوگی اس لیے سب اس کی طرف دوڑیں گے۔ وہ اس کا پانی بھی پی جائیں گے اور اس کے لیے زندگی بسر کرنا مشکل کر دیں گے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس پناہ گاہ میں گھستے ہی اسے مار ڈالیں اور اس کے بعد اس کی غذا اور پانی پر ٹوٹ پڑیں مگر ایڈ کوئی بچہ نہیں تھا۔ وہ پہلے ہی سے اس سارے مسئلے سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر کسی نے زبردستی گھسنے کی کوشش کی تو وہ اپنی رائفل سے اسے شوٹ کر دے گا۔

''کون ہنس رہا ہے باہر؟'' ایڈ نے ہسٹریائی انداز سے چیختے ہوئے کہا ''کان کھول کر سن لو، یہاں کوئی نہ ہنسے ورنہ میں فائر کر دوں گا۔''

''ایڈ! یہاں کوئی بھی نہیں ہنس رہا ہے۔'' باہر سے نیل کی آواز آئی۔

نیل اس کا بہت اچھا اور گہرا دوست تھا۔ وہ ایک کیمیکل فیکٹری میں فورمین کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ یہ فیکٹری اس کے گھر سے کوئی ایک میل دور واقع تھی۔ ایڈ روزانہ اپنے کام پر جاتے ہوئے نیل کو اس کی فیکٹری کے سامنے ڈراپ کرتا تھا اور واپسی میں اسے ساتھ لے کر آتا تھا۔ نیل اور اس کی بیوی، ایڈ کے برابر والے گھر میں رہتے تھے۔ ان کے درمیان گزشتہ پانچ سال سے بہت اچھے تعلقات قائم تھے مگر ایڈ چونکہ غیر شادی شدہ تھا اس لیے ان دونوں کے ساتھ زیادہ گھلتا ملتا نہیں تھا۔ ویسے بھی ایڈ کی عادت تھی کہ وہ دوسروں سے الگ تھلگ رہتا تھا۔

''ایڈ!'' باہر سے نیل کی پریشانی میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ ''تم میری آواز سن رہے ہو؟ میں اپنے ساتھ ڈاکٹر کو لے کر آیا ہوں۔ فکر مت کرو دروازہ کھول دو، باہر سب ٹھیک ہے۔ تم جسے ایٹم بم کا دھماکا سمجھ رہے ہو، وہ لیبارٹری میں ہونے والا دھماکا تھا جو کیمیکلز کے گرنے اور آگ لگنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ دروازہ کھول دو، ہم سب تمہارے لیے بے حد فکر مند ہیں۔''

''میری بات غور سے سنو!'' ایڈ نے اپنی رائفل کی نال کا رخ دروازے کی طرف کرتے ہوئے گرج کر کہا: ''میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔ تمہیں کھانا دوں گا اور نہ پانی... میں تم سب سے کہتا تھا نا کہ آج کے دن کے لیے انتظام کر لو مگر تم لوگ میری کب سنتے تھے؟ تمہیں تو میرا مذاق اڑانے سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اگر تم نے میری بات مان لی ہوتی اور میری طرح انتظام کر لیا ہوتا تو آج تمہیں بھکاریوں کی طرح میرے در پر نہ آنا پڑتا۔''

ایڈ نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ باہر قدموں کی آہٹ ہوئی تھی، اس کے بعد سناٹا چھا گیا تھا۔ وہ دروازے سے ہٹ کر اس چھوٹے سے تخت پر آن کر بیٹھ گیا جو اس نے اس پناہ گاہ میں اپنے سونے اور آرام کرنے کے لیے بچھایا تھا۔ اس نے ریڈیو کھولا مگر کوئی آواز نہ آئی تو اسے اپنی حماقت پر ہنسی آ گئی۔ اس چھوٹی سی پناہ گاہ میں اس نے چاروں طرف ریت کے بورے بھی تو بھر رکھے تھے۔ اس صورت میں ریڈیو سگنلز کو کیسے کیچ کر سکتا تھا؟ اس کے حفاظتی انتظامات کی وجہ سے سگنلز کا اندر پہنچنا بھی ناممکن ہو گیا تھا۔

اس نے دروازے پر لگی ہوئی ایک نولا دی راڈ ہٹائی تاکہ تھوڑی سی ہوا اندر آئے تو اس کا ریڈیو بھی جاگ جائے مگر اس کوشش میں وہاں لگا ہوا خطرے کا الارم بج اٹھا جو اس نے اس لیے لگایا تھا کہ اگر کوئی اس کی پناہ گاہ میں گھسنے کی کوشش کرے تو اسے پتا چل جائے۔ خطرے کے الارم کی آواز نے اسے ہڑبڑا دیا۔ وہ بوکھلا کر دروازے کی طرف لپکا تو اس دس گیلن والے ڈرم سے ٹکرا گیا جو اس نے باتھ روم کے طور پر استعمال کے لیے رکھا ہوا تھا۔

''سنو! اب ایسی حرکت مت کرنا۔'' وہ زور سے چیخا ''میرے پاس رائفل ہے جس کی ساری گولیوں سے میں اس دروازے کو چھلنی کر دوں گا۔''

''آرام سے..... ایڈ! آرام سے..... اتنے پریشان مت ہو۔'' باہر سے نیل نے کہا ''ہم صرف تمہاری بہتری چاہتے ہیں۔ تمہارے لیے ہی تو یہ سب کر رہے ہیں۔ خوا مخواہ ناراض کیوں ہوتے ہو میرے دوست؟''

ایڈ تصور کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا کہ اس وقت نیل کے ہونٹوں پر کیسی طنزیہ ہنسی ہوگی۔ آٹھ ماہ پہلے بھی تو اس نے نیل کو اسی انداز سے اسے ہنستے دیکھا تھا۔ حالانکہ اس واقعے کو آٹھ ماہ گزر چکے تھے مگر ایسا لگتا تھا جیسے ابھی کل ہی کی بات ہو۔

وہ دونوں دوست اپنے کام پر جا رہے تھے کہ ایڈ نے اسے اپنا آئیڈیا سنایا جسے سن کر نیل خوب ہنسا تھا اور اس نے کہا تھا ''تم ایٹم بم کی تباہ کاری سے بچنے کے لیے پناہ گاہ بناؤ گے؟ وہ بھی صرف اس لیے کہ تم نے ٹی وی کے ایک پروگرام میں اس حوالے سے ماہرین کی گفتگو سنی تھی؟''

''نیل! میری بات پر ہنسو نہیں۔'' ایڈ نے نیل کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا ''مقامی سول ڈیفنس آفس سے اس سلسلے میں کتابچے اور پمفلٹ بھی تقسیم کیے گئے ہیں جن میں تمام ضروری حفاظتی اقدامات کے طریقے بتائے گئے ہیں۔''

''یار! سول ڈیفنس والوں کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے۔'' نیل نے کہا تھا ''اگر وہ اس طرح کا لٹریچر تقسیم نہیں کریں گے تو اپنی کارکردگی کیسے دکھائیں گے؟ اس کے علاوہ کتابچہ مستقبل کے امکانات کے بارے میں ہے۔ ابھی اس پر عمل درآمد کا وقت نہیں آیا۔''

لیکن ایڈ نے اسی روز سے کام شروع کر دیا۔ اس نے اینٹیں، گارا، مٹی اور فولادی اشیا جمع کرنی شروع کر دیں۔ وہ سب لوگ اسے دیکھ دیکھ کر ہنستے تھے، اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ شروع میں یہ سلسلہ آہستہ چلا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ کھلم کھلا اس پر تنقید کرنے لگے مگر ایڈ کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ اس نے اپنے منصوبے کے مطابق اپنے گھر میں ہی ایک محفوظ پناہ گاہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس کے گھر میں کوئی تہ خانہ نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کا کام آسان ہو جاتا مگر تہ خانے کی عدم موجودگی کے باعث اسے زیادہ محنت کرنا پڑی۔ اس نے اپنی راتیں اس کام کے لیے وقف کر دیں۔ اپنے گھر کے عقبی حصے میں وہ مسلسل کھدائی کرتا رہا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے واقعی بم پھٹنے والا ہے۔ وہ اس کام کو جلد از جلد مکمل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تباہی سر پر کھڑی ہے۔ کسی بھی وقت بہت بڑی مصیبت نازل ہونے والی ہے۔

لگ بھگ ساری گرمیاں اس نے کھدائی میں گزار دیں۔ آخر کار وہ دس فٹ چوڑا اور سات فٹ گہرا ایک گڑھا کھودنے میں کامیاب ہو گیا۔ گڑھے کی کھدائی کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اس پناہ گاہ کو زیادہ آرام دہ اور محفوظ بنائے گا۔ اس نے پمفلٹ میں دی گئی ہدایات سے بھی آگے جا کر حفاظتی اقدامات کیے تھے۔ اس نے اس کمرے کی دیواریں اور چھت آٹھ انچ موٹی کنکریٹ سے تعمیر کی تھیں۔ اس کے بعد اس نے اندرونی دیواروں پر سیسے کی پوری تہ چڑھا دی۔

یہ بات پمفلٹ میں نہیں لکھی تھی مگر اس نے کہیں پڑھا تھا کہ سیسہ تابکاری کے خلاف ایک حفاظتی ڈھال ہے۔ اس کے بعد اس نے دیواروں کے ساتھ چھت تک ریت کی بوریاں چن دیں۔ ان بوریوں کے اوپر اس نے ڈبوں میں بند غذائیں رکھی تھیں۔ ان ڈبوں کو اس طرح پیک کیا جاتا تھا۔ کہ یہ کھانے خراب نہیں ہو سکتے تھے۔ کچھ بوریوں پر اس نے کتابیں رکھ لی تھیں۔ آخر وقت گزاری کے لیے بھی تو کچھ چاہیے تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان حالات میں بوریت اس کی سب سے بڑی دشمن ثابت ہو سکتی ہے۔ اس نے اس حفاظتی پناہ گاہ میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ اس کے تصور میں روسی فوجی آ گئے تھے جو دنیا کے امن کو تباہ کرنے آ رہے تھے۔

اس نے ایٹمی جنگوں اور ایٹمی ہتھیاروں پر کافی کتابیں پڑھی تھیں۔ اس نے ایک ناول میں یہ بھی پڑھا تھا کہ ایٹمی جنگ کے بعد ہوا تابکاری کے ذرات کو اڑا کر دور تک لے جائے گی اور یہ ذرات دنیا کے ہر کونے، ہر گوشے تک پہنچ جائیں گے۔ اس نے اس خیالی ناول کو سچ سمجھ لیا تھا اور یہ

آزمائش

ایک جوڑا سپر اسٹور میں دیر سے اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ دونوں کبھی کسی شیلف میں رکھی ہوئی چیزوں کے نام دور سے پڑھنے لگتے اور کبھی ایک دوسرے سے پوچھنے لگتے کہ فلاں شیلف میں کیا رکھا ہے۔

سیلز مین نے قریب پہنچ کر کہا "اگر آپ کو کسی خاص چیز کی تلاش ہے تو میں نکال دیتا ہوں۔"

"نہیں ... ہمیں خریدنا کچھ نہیں ہے۔" عورت نے اطمینان سے جواب دیا "ہم میاں بیوی نے نئے کونٹیکٹ لینس لگوائے ہیں ... ہم تو ذرا انہیں چیک کر رہے ہیں۔"

یقین کر بیٹھا تھا کہ یہ سب ہو کر رہے گا، اس سے بچنا ممکن نہیں ہے۔

اس نے حفاظتی پناہ گاہ کا کام تقریباً مکمل کر لیا تھا مگر اس کے بھیانک تصوّرات اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔ وہ اب خوفناک ایٹمی جنگوں کے خواب بھی مسلسل دیکھنے لگا تھا۔ اس نے کئی ماہ کے لیے راشن کا ذخیرہ کر لیا تھا جو بند ڈبوں والے کھانوں پر مشتمل تھا۔

جب کام مکمل ہو گیا تو وہ دنیا کی تباہی کا انتظار کرنے لگا حالانکہ اس کو اس زیرِ زمین حفاظتی پناہ گاہ کی تعمیر کے بعد مطمئن ہو جانا چاہیے تھا کہ وہ ایک بڑے خطرے سے محفوظ ہو گیا ہے لیکن اس کے تصور میں تو ہر طرف بکھری ہوئی لاشیں رہتی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ کرہ ارض ایک ایسی گیند بن چکا ہے جسے معمولی سی چنگاری بھی ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ اڑا دے گی۔

یہ گزشتہ سنیچر کی بات تھی۔ وہ اپنے لونگ روم میں آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور تصور میں ایٹم بم کو پھٹتے دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے میں دھماکے کے بعد مشروم کی شکل سے بادل اور گرد اوپر اٹھ رہی تھی کہ کچھ فاصلے پر ایک حقیقی دھماکا سنائی دیا۔ اس کی وجہ سے اس کے گھر کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے اور گویا کسی نادیدہ ہاتھ نے اسے کرسی سے لڑھکا دیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو تیز روشنی نظر آئی۔

''ضرور یہ تابکاری ہے۔'' اس نے سوچا اور اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دوسرے کمرے میں بھاگا اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جس خطرے کا اسے انتظار تھا۔ وہ سر پر آ پہنچا تھا۔ یکا یک زمین ہلنے لگی۔ ایسا صرف ایک لمحے کو ہوا تھا مگر اسے ایسا لگا جیسے زمین بہت دیر تک لرزی ہے۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو ہر طرف تاریکی نظر آئی۔

اس نے ڈھونڈ کر موم بتی نکالی مگر اس ڈر سے دیا کی سلائی روشن نہیں کی کہ کہیں کچھ اور نہ ہو جائے۔ پہلے وہ سمجھا کہ وہ اندھا ہو چکا ہے مگر پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کی بینائی بالکل ٹھیک ہے۔ اس نے دیا کی سلائی روشن کی اور موم بتی جلا دی۔ ہلکی زرد روشنی میں اس نے کمرے کا جائزہ لیا ہی تھا کہ ایک اور دھماکا ہوا۔

اب تو اس کے اوسان خراب ہو گئے۔ اب زیرِ زمین پناہ گاہ کے اندر جانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ تیزی سے اپنی پناہ گاہ میں داخل ہوا۔ اس نے پہلے گرل والا دروازہ بند کیا، اس کے بعد سیسے کی تہ والا دروازہ بھی لاک کر دیا۔ ساتھ ہی خطرے کے الارم والا بٹن اس سے منسلک کر دیا تاکہ اگر کوئی زبردستی اسے کھولنے کی کوشش کرے تو اسے پتا چل جائے۔ اب وہ اندر بالکل محفوظ تھا اور وہ سارے بے وقوف باہر خطرے کی زد میں تھے جو اس کا مذاق اڑاتے تھے جن سے اس نے بار ہا کہا تھا کہ مستقبل کے خطرے سے نمٹنے کے لیے کچھ کر لیں مگر انہوں نے اس کی ایک نہ سنی۔

''جہنم میں جائیں وہ سب!'' اس نے غصے سے کہا۔

اس نے ریڈیو کھولا جو وہ پہلے سے ہی اندر رکھ چکا تھا مگر ریڈیو سے کچھ سنائی نہیں دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حالات زیادہ خراب تھے جو ہنگامی نشریات تک شروع نہیں کی گئی تھیں۔

وہ پوری رات اس نے جاگتے ہوئے گزاری۔ وہ گاڑیوں اور ایمبولینسوں کی نہایت مدھم آوازیں سنتا رہا۔ اس کے کانوں میں سائرن کی ہلکی سی آواز آتی رہی۔ اس سے اسے کم از کم یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ اس ایٹمی حملے میں بہت سے لوگ بچ بھی گئے ہیں۔ کافی تھکنے کے بعد اس نے سیاہ کافی کا ایک کپ پیا جس سے اس کے کشیدہ اعصاب کو وقتی سکون مل گیا پھر وہ گہری نیند سو گیا۔

اگلے روز صبح بیدار ہوتے ہی اس نے ایک ڈبا کھولا اور ڈٹ کر ناشتا کیا۔ یکا یک اسے یاد آیا کہ اس نے اپنے گیس کے میٹر کے پاس لگا ہوا والو بند نہیں کیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ اب تک گیس آ رہی ہو گی جو بہر حال ایک خطرناک بات تھی۔ اس نے وہ دن کتابیں پڑھتے گزارا۔

اس روز بہت خاموشی تھی۔ رات سے بھی زیادہ سناٹا تھا۔ دوسری رات اس نے مہیب قسم کے سناٹے میں گزاری۔ سوائے وال کلاک کی ٹک ٹک کے، کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ یہ وال کلاک اس نے احتیاطاً ساتھ رکھ لیا تھا کہ اس کی مدد سے کم از کم وقت کا تو اندازہ ہوتا رہے گا۔ دوسرے اس کی ٹک ٹک زندگی کا احساس بھی دلائے گی مگر اب اس کی ٹک ٹک ایڈ کے لیے عذاب بن گئی تھی۔ سناٹے میں یہ آواز اس کی سماعت پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ اس نے اگلا روز شیکسپیئر کا ایک ناول پڑھتے ہوئے گزار دیا۔

یکا یک اسے احساس ہوا کہ اس سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔ اس کے پاس تابکاری کا پتا چلانے والا آلہ ہونا چاہیے تھا۔ اس کی موجودگی میں وہ مزید محفوظ ہو جاتا مگر اس نے تو ریڈیو پر انحصار کیا تھا کہ ریڈیو ہی یہ پیغام نشر کرے گا کہ اب

خوش ذوق خواتین کا خوب صورت انتخاب

ماہنامہ

دلکش کراچی

تازہ دلکش کی ایک جھلک

❋ عقیدت کے پھول، حمد و نعت کی شکل میں

❋ دل و ذہن کو منور کرتے مفاہیم قرآن و مفاہیم حدیث

❋ عطوفت راحیل، رابعہ اسلم وڑائچ اور رضیہ جوہر کے حساس قلم سے دلوں میں سوز و گداز جگاتی جگ بیتیاں

❋ قمر علی عباسی اور نیلوفر عباسی کے ساتھ ایک ''یادگار نشست'' کی دلچسپ تفصیل

❋ انجم انصار اور زاہدہ پروین کے قلم سے نکلے شاہکار سلسلے وار ناول

❋ نگہت عبداللہ کی تحریر، دل گداز اور دل نشیں ناولٹ کی صورت

❋ عطیہ عمر کی پرسوچ تحریر، صائمہ اکرم کا سبق آموز افسانہ

سیما یامین مجتبیٰ، صائمہ قیصر، تحسین اختر، ارجمند بانو، نگہت آرا اور توصیف اسلم کے دلکش افسانے

❋ ''زہے نصیب'' میں خوبصورت آواز کی مالک ''مہناز'' سے یادگار گفتگو

❋ ''دلکش رنگ'' میں ملاقات کیجیے ''انجلین ملک'' سے

مستقل سلسلے

خوشبو کا درخلا، تسکین ذوق، دلکش ذائقے، دارالصحت، قانونی راہ نمائی اور انوکھا سلسلہ اپنے نام سے خود کو پہچانیے جی ہاں آپ بھی آزمایئے۔

❋ ''خوش آمدید'' میں قدم رکھیے اور اپنے منفرد خیالات و آرا سے آگاہ کیجیے۔

خوش ذوق خواتین کا خوب صورت انتخاب ماہنامہ دلکش کی صورت ہر اچھے بک اسٹال پر دستیاب ہے

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز 63 سی فیز II ایکسٹینشن، ڈی ایچ اے، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

فون: 092 (021) 5802552,5804200 فیکس: 5802551 (021) E-MAIL: Jdpgroup@hotmail.com

باہر تابکاری بالکل نہیں ہے، لہٰذا باہر نکلا جا سکتا ہے۔

''اب جو بھی ہوگا، دیکھا جائے گا۔'' ایڈ نے خود کلامی کی اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

دن کے لگ بھگ ڈیڑھ بجے اس نے پہلی انسانی آواز سنی جو بیرونی دنیا سے آئی تھی۔ کوئی اس کے گھر میں چل رہا تھا۔ اس نے کسی کو اپنا نام پکارتے سنا۔ کوئی کہہ رہا تھا ''وہ اپنی اس زیرِ زمین پناہ گاہ میں ہوگا۔ ہم نے سب جگہ دیکھ لیا، وہ یہاں نہیں ہے۔'' یہ آواز نیل کی بیوی کی تھی۔

پھر کسی نے دروازے پر زور زور سے دستک دی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا مگر اس کے چہرے پر تناؤ اور آنکھوں میں سختی آ گئی تھی۔

''وہ اندر ہی چھپا بیٹھا ہوگا۔'' نیل نے کہا ''ممکن ہے دھماکے میں وہ بھی زخمی ہو گیا ہو یا وہ اندر بے ہوش پڑا ہو۔ ہمیں دروازہ کھولنا ہوگا۔''

''خبردار!'' ایڈ یہ سنتے ہی چیخا ''اگر تم نے یہ حماقت کی تو میں فائر کر دوں گا۔ دور ہو جاؤ اس جگہ سے..... مجھے اکیلا چھوڑ دو..... اگر کسی نے زبردستی دروازہ کھولا تو میں اسے شوٹ کر دوں گا۔''

ایک لمحے کو باہر خاموشی چھا گئی پھر کسی نے باہر سے چیخ کر پوچھا ''ایڈ! تم وہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں کیا کر رہا ہوں؟'' اس نے چیخ کر جواب دیا ''میں اپنے آپ کو، اپنی زندگی کو بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سمجھے؟''

''زندگی کو بچا رہے ہو؟'' باہر سے کسی نے الجھن آمیز لہجے میں کہا ''تمہیں اس بل میں گھسے ہوئے دو دن ہو چکے ہیں۔ جب سے دھماکے ہوئے ہیں، اس کے بعد سے کسی نے بھی تمہیں نہیں دیکھا ہے۔ باہر آ جاؤ، باہر کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''کیا تم نہیں جانتے کہ میں نے اپنے لیے یہ دفاعی قلعہ کیوں بنایا ہے؟'' ایڈ نے استہزائیہ لہجے میں کہا ''میں نے ایٹم بم کی تباہ کاری سے بچنے کے لیے یہ جگہ بنائی ہے۔ اور اسی لیے یہاں موجود ہوں۔''

''ایٹم بم؟ کیسا بم؟ کیا کہہ رہے ہو؟'' باہر سے پوچھا گیا۔ یہ سوال نیل نے کیا تھا ''وہ دھماکے لیبارٹری میں ہوئے تھے۔ ایک حادثہ پیش آ گیا تھا۔ کوئی بم نہیں پھٹا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی کسی نے دروازے پر زور آزمائی شروع کر دی۔ ایڈ نے رائفل کا رخ دروازے کی طرف کیا اور فائر کر دیا۔ باہر سے کسی عورت کے چیخنے کی آواز آئی اور پھر کوئی دھم سے گرا۔

''بے وقوف آدمی!'' باہر سے نیل نے کہا ''تم نے اپنی پڑوسن مس ولیم کو زخمی کر دیا ہے۔ وہ بے چاری تو تمہاری ہمدردی میں آئی تھی۔ یہ صلہ دیا ہے تم نے اس کی ہمدردی کا؟''

ایڈ خالی خالی نظروں سے کبھی اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا اور کبھی رائفل کو پھر اس نے نفرت سے وہ رائفل زمین پر پھینک دی۔ اس نے اپنے سر کو دو تین جھٹکے دیے۔ اپنی آنکھوں کو ملا اور اس طرح آنکھیں کھول دیں جیسے ابھی ابھی نیند سے یا کسی بھیانک خواب سے بیدار ہوا ہو۔

''یہ میں نے کیا کر دیا؟'' وہ بڑبڑایا ''مس ولیم کو زخمی کر دیا! وہ بے چاری تو میری ہمدردی میں آئی ہے، میں نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟''

تھکے تھکے قدموں سے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازے کے قفل میں چابی داخل کی اور ایک تیز ''کلک'' کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ اس نے گرل والا دروازہ بھی کھول دیا۔ وہ سب ایک ساتھ اندر کی طرف دوڑے تو ایڈ لڑکھڑا گیا مگر اس نے بروقت خود کو سنبھال لیا۔ ان کے چہروں پر تشویش تھی مگر جب انہوں نے ایڈ کو صحیح سلامت دیکھا تو ان کی جان میں جان آئی مگر وہ سب زخمی تھے۔ ان کے چہروں، بازوؤں اور ہاتھوں پر جلنے کے نشان تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایڈ کو دیوانگی سی محسوس ہوئی دراصل ان آنکھوں نے گزشتہ دو روز میں خاصے المناک واقعات دیکھے تھے اسی لیے ان میں ڈر اور خوف نمایاں تھا۔

''کس قدر چالاک لوگ ہیں یہ!'' ایڈ نے سوچا۔

''سب ٹھیک ہے کہہ کر مجھے بے وقوف بنا دیا۔ دراصل یہ لوگ مجھ سے میری محفوظ غذا اور پانی چھیننے آئے ہیں۔ کاش میں ان کی نیت کو پہلے ہی سمجھ جاتا!''

''آؤ ایڈ! ہمارے ساتھ آؤ، سب ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر نے آگے آتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر کے چہرے پر بھی زخم کا نشان تھا۔ اسے دیکھ کر ایک لمحے کو ایڈ کو خوف محسوس ہوا مگر جب اس نے نیلے آسمان پر نظر ڈالی اور پرندوں کی چہچہاہٹ سنی تو اسے یقین آ گیا کہ ابھی اس کی زمین محفوظ ہے۔ وہ ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر باہر آ گیا۔ اس نے نیل کو دیکھا، اس کی بیوی کو دیکھا، زخمی مس ولیم کی طرف شرمندگی سے دیکھا اور پھر مسکرا دیا۔

اپنے انجام سے چونکا دینے والی خوب صورت کتھا

آج کا دور رابطوں کا دور ہے جس کے روابط جس قدر وسیع ہوں گے اس کے لیے مشکلات اسی قدر کم سے کم ہوں گی۔ یہ امر اس کے علم میں تھا تاہم اس کے روابط زیادہ نہیں تھے بس ایک ہی رابطہ تھا مگر وہ لاکھوں پر بھاری تھا

اصلیت

رضوانہ منظر

کویتا بڑبڑاتی ہوئی اِدھر اُدھر چکرا رہی تھی۔ سنک میں برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ صفائی کا کام بھی باقی تھا اور ملازمہ ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ گوتم اس سے بے نیاز اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ آج چھٹی کا دن تھا اور وہ کوئی بدمزگی نہیں چاہتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مختصر سے گھر میں صرف دو افراد کی ضروریات ہی کتنی ہوتی ہیں جن کے لیے ملازمہ رکھی گئی تھی۔ اگر کویتا خود گھر کے کام کاج میں دلچسپی لیتی تو آج وہ کوشت کا پہاڑ نہ ہوتی۔

کویتا کسی زمانے میں دُبلی پتلی اور نازک سی عورت تھی

مگر اس کی کاہلی نے اس کی تمام سنسنی کو ختم کر دیا تھا۔ مٹاپے کے سبب قیمتی ساڑی بھی اس کے وجود پر نہیں جچتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی ڈرم کے گرد رنگین کپڑے لپیٹ دیا گیا ہو۔

''ارے..... گوتم، یہ کیا؟'' کویتا کی چیختی آواز سن کر گوتم نے سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھا۔ وہ لیٹر بکس سے خطوط نکال کر میز پر اس کے قریب آ بیٹھی تھی اور اس کے ایک ہاتھ میں کھلا ہوا لفافہ اور دوسرے ہاتھ میں چند کاغذ تھے۔ وہ خط یقیناً کل شام کی ڈاک میں آیا تھا جو کویتا کی سستی کے سبب رات بھر لیٹر بکس میں پڑا رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' گوتم نے قدرے بیزاری سے کہا۔ ''اس خط میں ایسا کیا لکھا ہے جو تم ایک دم پریشان ہو گئی ہو؟''

''یہ خط تمہارے دوست کے بارے میں ہے۔''

''میرے دوست کے بارے میں؟''

''ہاں، اسی چکرورتی کے بارے میں..... اونہہ، شکل پر ہر وقت پھٹکار برستی رہتی ہے اور نام چکرورتی (شہنشاہ) کسی نے اس کا کچا چٹھا لکھ بھیجا ہے۔'' اس نے جلے بھنے لہجے میں کہا اور خط گوتم کی طرف بڑھا دیا۔

گوتم نے اخبار ایک طرف رکھ کر کویتا سے خط لے لیا۔ اس میں لکھا تھا۔

''چکر باز چکرورتی سے ہوشیار رہیے۔ آپ کے پڑوس میں ایک سفاک قاتل رہتا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ چار سال پہلے اسے ممبئی میں گرفتار کیا گیا تھا کیونکہ وہ لوگوں کو قتل کرانے کا درمیانی ذریعہ بنا ہوا تھا۔ لوگ اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو قتل کرانے کے لیے اس کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ سپاری لے کر قتل کرنے والے سفاک قاتل اس کے رابطے میں رہتے تھے۔ اس کا پورا نام مکیش چکرورتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی گرفتار ہوئی تھی جسے بعد میں پولیس نے رہا کر دیا تھا۔ پولیس کا خیال تھا کہ ایک سال کے دوران میں اس نے گیارہ افراد کو ٹھکانے لگوایا تھا۔ ڈیڑھ سال تک کیس چلتا رہا لیکن اس کے وکیل نے چکر چلا کر اور رقم خرچ کر کے تمام ثبوت غائب کرا دیے، ایک گواہ بھی غائب کر دیا گیا تھا۔ ڈیڑھ سال بعد اسے رہا کر دیا گیا..... اب وہ ممبئی چھوڑ کر دہلی آ گیا ہے۔ اس سے ہوشیار رہیے۔''

خط کے ساتھ ایک اخباری تراشہ بھی تھا جس میں ایک جوڑے کی دھندلی سی تصویر تھی۔ گوتم نے اندازہ قائم کیا کہ وہ تصویر چکرورتی اور اس کی بیوی کی ہوگی۔ وہ حیران تھا کہ ایک شریف اور سادہ سا نظر آنے والا شخص اس قدر سفاک بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی معصوم صورت دیکھ کر کوئی شخص شبہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ممبئی کے پیشہ ور قاتلوں کا ایجنٹ ہوگا۔

''میں تو اس کی صورت دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ شخص ایسا نہیں ہے، جیسا نظر آتا ہے۔'' کویتا نے دیدے گھماتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں۔ تم تو مہا جیوتشی کی بچی ہو نا۔'' گوتم نے جل کر کہا۔ ''تم آدمی کے باطن تک میں جھانک سکتی ہو۔''

''اس کے لیے جیوتشی ہونا ضروری نہیں ہے۔'' کویتا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''اس کی شکل سے جو نحوست ٹپکتی ہے، اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ.....''

''بس، بس۔'' گوتم نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''میں نہیں مان سکتا کہ وہ ایسا ہو سکتا ہے۔ کسی کو قتل کرانا..... نہیں، یہ اس کے بس کی بات نہیں۔''

''تم تو نرے..... مم..... میرا مطلب ہے بہت سیدھے سادے آدمی ہو۔'' کویتا اسے نرا احمق قرار دینے لگی تھی لیکن اس کے تیور دیکھ کر بات بدل دی۔ ''اس کی بیوی کو نہیں دیکھتے، عمر میں اس کی بیٹی لگتی ہے۔''

''تو یوں کہو نا، تم اسی وجہ سے اس سے جلتی ہو۔''

''جلتی ہے میری جوتی۔'' کویتا اس کی بات پر سلگ اٹھی تھی۔ ''میں تو بھتی ہوں کہ تم اس چکر باز کی دوستی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس دیوی کے درشن لینے اس کے گھر کے چکر لگاتے رہتے ہو۔''

''فضول بکواس مت کرو۔'' گوتم دھاڑا۔ ''چکرورتی میرا دوست ہے اور بس..... سیدھی سی بات کو ڈم سے پکڑ کر مت گھماؤ ورنہ تھپڑ مار کر تمہارا منہ گھما دوں گا۔''

''ہاں، تم سے یہی ہو سکتا ہے۔'' کویتا رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تم اس منحوس صورت چکرورتی کی محبت میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ اسے محلہ کمیٹی کا ممبر بنوا دیا۔ محلے کے ہر آدمی سے اسے متعارف کرایا..... بہانے بہانے سے اس کے گھر جا کر جم کر بیٹھ جاتے ہو۔ کبھی شطرنج کھیلنے تو کبھی تاش کی بازی جمانے..... میں بچی نہیں ہوں، سب سمجھتی ہوں۔''

گوتم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ وہ زبانی جواب دینے کے بجائے کویتا کو گھورتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے تیور دیکھ کر کویتا سہم گئی۔ عین اسی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ کویتا جلدی سے اٹھ کر فون کی طرف بڑھی اور ریسیور اٹھا لیا۔ اس

ایک رات ابا (سجاد ظہیر) بڑی دیر سے گھر لوٹے۔ امی کو شاید ان کے دیر سے آنے کی خبر نہیں تھی کیونکہ وہ بھی جگی ہوئی تھیں، کچھ کام کر رہی تھیں۔ رسوا در میں کھا کر سو چکے تھے جب ابا لوٹے۔ امی نے دروازہ کھولا اور ابا نے دوڑ کر امی کو بانہوں میں بھر لیا پھر گول گول گھوم کر امی کے ساتھ ناچنے لگے۔ کمرا چھوٹا تھا اور کیونکہ لوگ اکثر بہت آتے تھے اس لیے اس میں کچھ کرسیاں، اسٹول بھی زیادہ تھے۔ دونوں بار بار چیزوں سے ٹکرا رہے تھے۔ اسٹول الٹ رہے تھے، امی بیچ بیچ میں چیخ پڑتی تھیں لیکن ابا تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ خوشی جیسے ان سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی اور چاروں طرف پھوٹ پڑ رہی تھی، اس شور وغل میں، میں جگ کر باہر آ گئی۔ امی ابا کو روکنے کی کوشش کر رہی تھیں ''کیا ہوا، کیا ہے؟ اتنی رات میں کیوں لوٹے ہو؟''

ابا نے ناچتے ہوئے جواب دیا ''آج کچھ نہ کہو۔ آج کچھ نہ کہو۔'' اتنے میں امی نے ایک کونے میں مجھے اور رسو کو کھیسے نپورتے دیکھ لیا۔ خود کو چھڑاتے ہوئے ساڑی کا پلو سنبھالتے ہوئے بولیں۔

''کم سے کم دیر سے آنا ہو تو فون کر دیا کرو۔ پریشان تو نہ ہوں۔''

''رضیہ! آج تم کیسے ناراض ہو سکتی ہو؟'' ابا کے اس حیرانی بھرے سوال پر ذرا ناراض ہوتے ہوئے امی بولیں۔

''کیوں، آج میں کیا خاص بات ہے؟''

''آج..... آج الجیریا آزاد ہو گیا ہے۔''

''ہے..... کیا کہتے ہو۔'' امی کی ساری ناراضی ہوا ہو گئی ''تو اتنی دیر سے کیوں نہیں بتایا، اکیلے ہی خوش ہو رہے ہو۔ لوٹے بھی گیارہ بجے ہو، جب ساری مٹھائی کی دکانیں بند ہو چکی ہیں۔ کوئی بات نہیں، ہم ابھی حلوا بناتے ہیں۔'' اور آدھی رات کو ہم نے گرم گرم سوجی کا حلوا کھایا کیونکہ دور افریقا میں الجیریا نام کے دیش نے اپنی غلامی کی بیڑیاں جھٹک کر توڑ دی ہیں۔ ایک قوم جس کے ایک بھی باشندے کو ہم نہیں جانتے تھے، اس نے اپنے اوپر سے منڈلاتے سامراجواد کے کالے سائے کو دور دھکیل دیا ہے۔ ہم اس لیے خوشی منا رہے ہیں کیونکہ یہ صرف اس دیش کی جیت نہیں ہے۔ یہ ہماری جیت ہے، یہ انسانیت کی جیت ہے۔

میرے حصے کی روشنائی از نور سجاد ظہیر

حاصل مطالعہ: اقتدار احمد خان۔ آب حیات، باغ و بہار

نے اس موقع کو غنیمت سمجھا تھا ورنہ گوتم یقیناً اسے ایک آدھ ہاتھ جڑ دیتا۔

گوتم دوبارہ کرسی پر بیٹھ کر اسے گھورتا رہا اور وہ فون پر کسی سے بات کرتی رہی۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ سنتی رہی اور شوہر کی طرف سر گھما کر بولی۔ ''اس قسم کے خطوط محلے کے دو اور آدمیوں کو بھی ملے ہیں۔ اب تو تمہیں مان لینا چاہیے کہ.....''

''اور کن کن لوگوں کو ایسے خطوط ملے ہیں؟'' گوتم نے اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں پوچھا۔

''کرشن اور گردھاری لال کو۔'' کویتا نے لٹھ مارنے کے سے انداز میں جواب دیا۔

ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی۔ کویتا نے ریسیور اٹھایا اور پھر گوتم سے بولی۔ ''گپتا صاحب تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

گپتا ایک نجی بینک میں منیجر کے عہدے پر فائز تھا اور اپنی چار بلاک پر مشتمل محلہ کمیٹی کا جنرل سیکریٹری تھا۔

''ہیلو گپتا صاحب!'' گوتم نے ریسیور تھامتے ہوئے کہا۔ ''کیسے ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' دوسری طرف سے گپتا کی آواز آئی۔ ''مسٹر گوتم! یہ محلے میں کیا ہو رہا ہے؟''

''کیا ہوا گپتا صاحب؟'' گوتم نے محتاط انداز میں کہا۔

''بہت سے لوگوں کو چکورتی کے بارے میں خطوط ملے ہیں۔ ان میں اخباری تراشے بھی موجود ہیں۔''

''یہ اخباری تراشے کسی قسم کا مذاق بھی تو ہو سکتے ہیں گپتا صاحب!''

''یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟''

''دیکھیے گپتا صاحب! چکورتی میرا دوست ضرور ہے لیکن میں اس ناتے سے اس کا دفاع نہیں کر رہا بلکہ ایک عام بات بیان کر رہا ہوں۔ سب محلے والے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایک شریف آدمی ہے۔ آج تک اس نے محلے کے کسی آدمی کو تکلیف نہیں پہنچائی۔''

''ہاں، تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔''

''جو آپ مناسب سمجھیں جناب، میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

''ایسا کرتے ہیں کہ آج رات آٹھ بجے تم میرے گھر آجاؤ۔ میں محلے کے چند اور لوگوں کو بھی بلوا لیتا ہوں۔ چائے کے ساتھ ساتھ چکرورتی کے متعلق اخباری تراشوں پر بھی بات ہوگی۔'' یہ کہہ کر گپتا نے فون بند کر دیا۔

ریسیور رکھ کر گوتم پلٹا اور کویتا سے بولا۔ ''اٹھ کر برتن وغیرہ دھولو۔ لگتا ہے آج نوکرانی نہیں آئے گی۔''

''میں اس شانتی کی بچی کو نوکری سے نکال دوں گی۔'' کویتا غصے سے بولی۔ ''ہر ہفتے ایک دو دن غائب ہو جاتی ہے۔''

''اچھی بات ہے۔'' گوتم اپنے کمرے کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ ''اسے نوکری سے جواب دے دو اور گھر کا کام خود کیا کرو۔ اس طرح کم سے کم تمہارے ''پھیلاؤ'' میں کمی تو آجائے گی۔''

کویتا دانت بھینچ کر اسے جاتا دیکھتی رہی۔

☆☆☆

گوتم رات کا کھانا کھا کر گپتا کے گھر پہنچا تو اس وقت سوا آٹھ بجے تھے۔ اسے پندرہ منٹ کی تاخیر ہو گئی تھی۔ گپتا کے ڈائننگ روم میں محلے کے آٹھ نو افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ صوفوں پر جگہ نہ ہونے کے سبب وہ دیوار کے ساتھ رکھی تپائی پر بیٹھ گیا۔ چائے پینے کے دوران اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر گپتا نے قدرے بلند آواز میں کہنا شروع کیا۔

''چکرورتی کے بارے میں آپ لوگوں کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہوگا۔ اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں دن بھر اس مسئلے پر سوچتا رہا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایسے خطرناک شخص کا ہمارے محلے میں رہنا کسی طور بھی مناسب نہیں ہے۔ کل کوئی اُونچ نیچ ہو گئی تو پورے محلے کی بدنامی ہوگی۔''

''اس سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے؟'' وکیل نارائن بابو نے کہا۔ وہ کورٹ کے سامنے درخواستیں اور اسٹیمپ پیپر ٹائپ کرتا تھا اور ''وکیل صاحب'' کہلانا پسند کرتا تھا۔ ''مجھے تو اس کی بیوی کے لچھن بھی اچھے نہیں لگتے۔ ایک ادھیڑ عمر قاتل کی نوجوان، چلبلی اور قاتل ادا بیوی بھی محلے کے لیے کم خطرناک نہیں ہے۔ محلے کے نوجوان.....''

''ہاں، میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔'' گپتا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اس سلسلے میں چکرورتی سے بات کرنی ہوگی لیکن وہ کیا کہتا ہے۔ اگر وہ اپنے ماضی سے انحراف کرتا ہے تو ہم ممبئی پولیس سے رابطہ کریں گے تاکہ اس کے ماضی کے ''کارناموں'' کی تصدیق ہو سکے۔''

''اگر وہ اعتراف کر لے، پھر؟'' گوتم نے پوچھا۔

''پھر تو اسے بلا تاخیر یہ محلہ چھوڑنا ہوگا۔'' گپتا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور تمام حاضرین نے گویا اس کے فیصلے کی توثیق کرتے ہوئے اوپر نیچے گردن ہلائی۔

''یہ تو آپ لوگوں کو معلوم ہی ہوگا کہ جس مکان میں وہ رہتا ہے۔ وہ اس نے خرید لیا تھا۔ مکان اسے فروخت کرنا پڑے گا۔ اس لیے اسے کچھ مہلت بھی دینی ہوگی۔'' گردھاری لال نے کہا۔

''وہ مکان میں خرید لوں گا۔'' کرشن نے فوراً کہا۔ اس کا کاروبار یہی تھا، سود پر رقوم دینے کے علاوہ اس نے کئی مکان خرید کے کرائے پر اٹھا رکھے تھے جن سے خاصی ماہانہ آمدنی ہو جاتی تھی۔ ''میں مختصر نوٹس پر اس کے مکان کی قیمت ادا کر کے یہ مسئلہ حل کر سکتا ہوں۔''

''یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔'' گپتا نے گویا گفتگو کو سمیٹنے اور مجلس برخاست کرنے کی نیت سے کہا۔ ''اس سے بات کون کرے گا؟''

''اس سے بات کرنے کے لیے گوتم بابو کو جانا چاہیے۔'' وکیل نارائن بابو نے کہا۔ ''اس کام کے لیے ان سے بہتر کوئی شخص نہیں۔ ان کا اس سے میل جول بھی ہے اور یہ گفتگو کا ڈھنگ بھی جانتے ہیں۔''

''کیا خیال ہے گوتم، تم یہ ذمے داری قبول کرتے ہو؟'' گپتا نے اس سے پوچھا۔

''ٹھیک ہے جناب۔'' گوتم نے جواب دیا۔ ''اگر آپ سب لوگوں کی یہی رائے ہے تو کل ہی میں دفتر سے واپسی پر اس سے ملوں گا۔''

''نہیں، تم کل صبح دفتر جانے سے پہلے اس سے مل کر بات کر لو۔ ہمیں وقت ضایع نہیں کرنا چاہیے۔''

☆☆☆

اگلی صبح گوتم جب چکرورتی کے گھر کی طرف جا رہا تھا تو خاصا پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ چکرورتی سے گفتگو کا آغاز کیسے کرے گا۔

دروازہ چکرورتی کی نوجوان اور حسین بیوی پوجا نے کھولا۔ وہ جینز اور چست شرٹ میں ملبوس تھی۔ تراشے ہوئے بال اس کے کندھوں تک آ رہے تھے۔ اس کے

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

مارچ 2007ء کے حکایت آفریں شمارے کی جھلکیاں

ظالم مظلوم

دہشت ناک عالمی کھیل کے راز فاش کرتی سنسنی خیز داستان
اپنے کلائمکس کی طرف گامزن علیم الحق حقی کا شاہکار

دیوی

مقبولیت کی نئی منزلوں کی طرف بڑھتا.... جذبوں، نزاکتوں
اور ہنگاموں کے منظر نگار طاہر جاوید مغل کا یادگار سلسلہ

مستقبل شناس

دست شناس، ستارہ شناس، اعداد شناس.... مستقبل شناس
راؤ پرویز کی دلچسپ مہم جوئی، ایچ اقبال کی لفظ آرائی۔

سرورق کے رنگ

آپ کے پسندیدہ مصنفین کاشف زبیر،
غلام قادر اور رضوانہ منظر کے قلم کے شہ پارے

اس کے علاوہ

مغرب کے جرم نگار ایڈورڈ ڈی ہاک کی تازہ ترین مجرم کہانیاں اور دیگر تحریریں۔ ساتھ میں
ہماری کاوشوں اور قارئین کی باہمی آویزشوں کی جلوہ گاہ، چینی نکتہ چینی کے ہنگامہ خیز صفحات!

مارچ 2007ء کا پُر ہنگام جاسوسی فوری طلب کیجیے۔

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 5895313
فیکس: 5802551
E-mail:jdpgroup@hotmail.com

متناسب اعضا پر نگاہ نہیں ٹکتی تھی۔ گوتم نے تصور میں اس کا موازنہ اپنی... بیوی سے کیا اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کویتا کی عمر بھی اتنی ہی تھی مگر اب وہ گوشت کا پہاڑ بن چکی تھی۔

''ارے گوتم جی آپ.....!'' پوجا نے مسکرا کر کہا۔ ''آج صبح کے وقت کیسے آ گئے؟''

''میں چکرورتی سے ملنے آیا ہوں۔ اس سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ کہاں ہے وہ؟''

''وہ چھت پر دھوپ میں بیٹھا ہے۔ آپ اوپر چلے جائیے..... شما کیجیے گا، میں آپ کو وقت نہیں دے سکوں گی کیونکہ آج کچھ مہمان آنے والے ہیں اور مجھے مارکیٹ سے کچھ سامان خریدنے کے لیے جانا ہے۔''

''کوئی بات نہیں دیوی جی!'' وہ خوش اخلاقی سے دانت نکالتا ہوا اس کے قریب سے گزر کر لاؤنج سے ہوتا ہوا دائیں ہاتھ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ چھت پر چکرورتی کرسی پر نیم دراز سینٹرل ٹیبل پر پاؤں رکھے دھوپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کرسی کے قریب فرش پر وہسکی کی بوتل رکھی تھی اور میز پر اس کے پاؤں کے قریب گلاس رکھا تھا جس کی تہ میں تقریباً ایک انچ شراب موجود تھی۔

''ہیلو چکرورتی!'' وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''آج صبح سے ہی بوتل لے کر بیٹھ گئے۔''

''ارے گوتم!'' اس نے چونک کر نیم وا آنکھوں سے گوتم کی طرف دیکھا اور ٹیبل سے پاؤں ہٹا کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''بہت دنوں کے بعد دکھائی دیے..... تم کچھ پریشان لگ رہے ہو، پینے کا موڈ ہے؟''

''نہیں شکریہ، میں اس وقت تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ مجھے ابھی دفتر جانا ہے۔'' گوتم نے اس کے برابر پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے ایک اہم بات کرنے آیا ہوں۔''

''اہم بات.....؟ خیریت تو ہے نا؟''

گوتم نے کوئی جواب دیے بغیر اپنی جیب سے اخباری تراشے نکالے اور چکرورتی کی طرف بڑھا دیے۔ اس نے تراشے اس کے ہاتھ سے لیے اور چند لمحے انہیں گھورتا رہا پھر تراشوں کو ٹیبل پر پٹختے ہوئے تاسف آمیز لہجے میں بولا۔

''انہوں نے مجھے یہاں بھی تلاش کر لیا.....''

''تم کن لوگوں کی بات کر رہے ہو؟'' گوتم نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''اس سے پہلے لکھنؤ اور مدراس میں بھی ایسا ہی ہو چکا ہے۔ تاہم وہ کوئی بات ثابت نہیں کر سکے تھے۔ وہاں انہیں منہ کی کھانی پڑی تھی۔'' چکرورتی نے گہرا سانس لے کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہ اخباری تراشے ان کی گھٹیا ذہنیت کی دلیل ہے..... تم انہیں ان کی اوچھی حرکتیں کہہ سکتے ہو۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کہانی میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے جو ان تراشوں میں بیان کی گئی ہے۔'' گوتم نے خشک لہجے میں کہا۔ ''تم لوگوں کو کرائے کے قاتل فراہم کرتے رہے ہو؟''

''دیکھو اتنی جلدی نتائج اخذ مت کرو۔ ان تراشوں میں دی گئی اطلاع خاصی خوفناک معلوم ہوتی ہے مگر.....''

''مگر درست ہے۔'' گوتم نے اس کی بات کاٹ کر گویا اس کا جملہ مکمل کیا۔ ''یہاں رہائش اختیار کرنے اور پھر محلہ کمیٹی کا ممبر بننے وقت کم سے کم تم مجھے استعمال نہ کرتے تو بہتر تھا۔ میری سفارش پر تمہیں محلہ کمیٹی کا ممبر بنایا گیا..... تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ اب میری کتنی بدنامی ہوگی۔ میں کل تک تمہاری وکالت کرتا رہا اور لوگوں سے کہتا رہا کہ انہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ اس سلسلے میں میری اپنی بیوی سے بھی بحث ہو چکی ہے کہ تم ایسے نہیں ہو سکتے..... مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں ہی غلطی پر ہوں۔ بہرحال، اب تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ جلد سے جلد یہ مکان چھوڑو اور کسی اور طرف نکل جاؤ۔''

''یہ بات تم اپنی طرف سے کہہ رہے ہو؟''

''نہیں، میں محلہ کمیٹی کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ کل رات گوپال صاحب کے گھر پر میٹنگ بلوائی گئی تھی جس میں محلے کے معزز لوگ شامل تھے۔ یہ انہی کا فیصلہ ہے کہ تم جیسے خطرناک اور سفاک شخص سے محلے کو جلد سے جلد پاک کیا جائے۔''

''میں یہاں سے نہیں جاؤں گا.....''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔'' گوتم نے تلخ لہجے میں اس کی بات کاٹی۔ ''تمہیں محلہ ہر حال میں چھوڑنا ہوگا۔ یہاں رہ کر تم خود کو ایک عذاب میں مبتلا کر لو گے۔''

''عذاب، کیسا عذاب؟ کیا تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟''

''دھمکی.....!'' گوتم عجیب انداز میں ہنسا۔ ''بے وقوف آدمی! تم نے یہاں رہ کر دیکھ لیا ہوگا کہ پورے دہلی شہر کے مقابلے میں ہمارے چار بلاک پر مشتمل روشن نگر کے علاقے میں جرائم کی شرح نسبتاً بہت کم ہے۔ یہاں کے اکثر نوجوان تعلیم یافتہ اور برسرروزگار ہیں۔ یہاں کی گلیاں اور

سڑکیں دوسرے علاقوں سے بہتر ہیں۔ صفائی، بجلی، پانی، گیس اور ٹیلی فون کا نظام تمہارے سامنے ہے۔ اس حوالے سے کبھی تمہیں شکایت پیدا ہوئی.....؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ صرف یہ کہ یہاں کے لوگوں نے اتحاد کرلیا ہے۔ محلہ کمیٹی تشکیل دے کر ہر مسئلے کو حل کرتے ہیں۔ یہاں، ان چار بلاکوں کے محلے میں دو سو خاندان رہتے ہیں اور سب کے سب.....''

''بس کرو یار!'' چکرورتی نے اُکتائے ہوئے انداز میں اس کی بات کاٹی۔ ''میں سب جانتا ہوں اور پچھلے ڈیڑھ سال سے میں بھی اسی محلے میں رہتا ہوں اور اسی محلہ کمیٹی کا ممبر بھی ہوں۔ ویسے تم یہ سب مجھے کیوں سنا رہے ہو؟''

''اس لیے کہ تم صورت حال کو صحیح انداز میں سمجھ سکو۔ مجھ سمیت محلے کے تمام لوگ تمہارے خلاف ہو چکے ہیں۔ تمہارا معاشرتی بائیکاٹ کیا جائے گا۔ تمہارے خلاف پولیس سے بھی مدد لی جاسکتی ہے..... تمہیں یہاں سے بھگانے کے لیے نوجوانوں سے تمہاری وقتے وقتے سے پٹائی بھی کرائی جاسکتی ہے..... اور تو اور تمہارا فون کٹ سکتا ہے۔ تمہارے گھر کی بجلی منقطع ہوسکتی ہے۔ اس کے باوجود تم یہاں سے دفعان نہیں ہوئے تو تمہارے گھر کو ''اتفاقی'' آگ بھی لگ سکتی ہے۔ سب تمہاری بے بسی کا تماشا دیکھیں گے اور کوئی مدد نہیں آئے گی۔''

''ایسی غنڈا گردی ہوتی میرے ساتھ؟'' چکرورتی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ ''شریفوں کے محلے میں ایسا ہوتا ہے؟''

''ہاں، ناپسندیدہ لوگوں سے چھٹکارا پانے کے لیے چھوٹی موٹی غنڈا گردی ضروری ہوتی ہے۔ اگر اس سے محلے کا ماحول تم جیسے سفاک لوگوں سے پاک رہ سکتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ مناسب اقدام ہوگا۔''

چکرورتی چند لمحے اس کو گھورتا رہا پھر گلاس میں بچی ہوئی شراب کو حلق میں اُنڈیل کر ہونٹوں کو پونچھتا ہوا دھیرے سے بڑبڑاہٹ کے سے انداز میں بولا۔ ''اس مکان کو فوری طور پر فروخت کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ میں نے اس پر کافی رقم خرچ کی ہے۔ میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟''

''اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' گوتم نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''محلہ کمیٹی ہی کا ایک ممبر تمہارا مکان خریدنے کو تیار ہے۔ اس سلسلے میں بات ہوچکی ہے۔''

''اوہ، بہت خوب..... گویا مجھے یہاں سے دھکیلنے کے تمام انتظامات ہوچکے ہیں۔'' چکرورتی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''بہرحال، میں آپ لوگوں سے درخواست کروں گا اس معاملے کی زیادہ تشہیر نہ کی جائے کیونکہ اس کے بعد ہم جہاں بھی جائیں گے وہاں بھی یہی مسئلہ درپیش ہوگا۔''

''مسئلہ خود تمہارا اپنا پیدا کیا ہوا ہے۔'' گوتم بولا۔ ''نہ تم ایسا کام کرتے، نہ تمہیں یہ دن دیکھنا پڑتا۔'' یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے اٹھنے لگا۔ چکرورتی نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''کیا تم یہ جاننا نہیں چاہو گے کہ میں اس دلدل میں کیسے پھنسا؟ سماج سدھار مہم چلانا بہت آسان ہے لیکن لوگوں کو روزگار فراہم کرنا اور معاشی استحکام دینا مشکل ہے..... یہ کہانی میری پہلی بیوی کی بیماری سے شروع ہوتی ہے۔ اس کی بیماری نے مجھے بدحال کردیا تھا۔ جمع پونجی اس کے علاج میں خرچ ہوگئی۔ ان دنوں میں صرف بائیس سو روپے ماہانہ پر ملازمت کرتا تھا۔ میری بیوی کو ایک اسکول میں پڑھانے کے پندرہ سو روپے ماہانہ ملتے تھے۔ ظاہر ہے بیمار پڑنے کے بعد اس کی ملازمت چھوٹ گئی۔ صرف میری تنخواہ باقی رہ گئی تھی جس میں سے آٹھ سو روپے کمرے کے کرائے میں اٹھ جاتے تھے۔ باقی کیا بچتا تھا۔ کھانے پینے کے اخراجات مشکل سے پورے ہوتے تھے۔ علاج معالجے کو جاری رکھنے کے لیے رقم کہاں سے آتی؟ مجبور ہوکر میں نے اپنے دفتر میں قرض حاصل کرنے کے لیے درخواست دی مگر وہ نامنظور ہوگئی۔ میں مایوسی کے عالم میں چوپاٹی کے علاقے میں ایک غلیظ اڈے پر ٹھرا پینے کے لیے جانے لگا۔ یہ حالات سے فرار حاصل کرنے کی ایک کوشش تھی۔ وہیں پر میری ملاقات وکرم سے ہوگئی۔ وہ مجھے ایک ایسے کام پر لگانا چاہتا تھا جس کے بارے میں کبھی میں نے سوچا تک نہیں تھا۔ وکرم خود وہی کام کرتا تھا..... یعنی پیشہ ور قاتلوں کے ایک گروہ کے لیے گاہک تلاش کرنا۔ اس کے بعد میرے حالات سدھرنے لگے۔ اب میں ان کے لیے گاہک فراہم کرتا ہوں۔ میری پہلی بیوی مرچکی ہے مگر میں ان لوگوں کے ہاتھ میں کھلونا بن چکا ہوں۔ نکلنا بھی چاہوں تو اس دلدل سے نہیں نکل سکتا۔''

''تمہارے جو بھی حالات رہے ہوں.....'' گوتم نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''بہرحال، دوسروں کی زندگی سے کھیلنا ایک انتہائی سفاکانہ فعل ہے.....''

''اگر میں ان لوگوں کو قتل نہ کراتا تو مجھے موت کو گلے لگانا پڑتا۔ اپنی جان بچانے کے لیے مجھے ایسا کرنا پڑا۔ بعد میں اگر میں اس گروہ سے منہ موڑتا تو وہ مجھے بھی ہلاک کرنے

سے گریز نہ کرتے۔ یقین کرو گوتم! میں نے جن لوگوں کو ٹھکانے لگوایا وہ اسی کے مستحق تھے بھی۔''

''یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ انسانی جانیں لینے کے سلسلے میں درمیانی ذریعہ بن کر تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا؟ تم نے قاتلوں کی مدد کی، انہیں کاروبار فراہم کیا..... نتیجے میں کتنے ہی لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے..... لیکن اس کے باوجود تمہیں دوشی نہ سمجھا جائے؟'' گوتم کے لہجے میں استہزا تھا۔

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پولیس مجھ پر کوئی الزام ثابت نہیں کرسکی۔ اس لیے کہ لوگ اپنے کاروباری حریفوں کو ختم کراتے ہیں اور وہ ایسا انتظام کرتے ہیں کہ پولیس کوئی ثبوت حاصل نہیں کرپاتی..... اور دوسری بات یہ کہ جو لوگ قتل کیے جاتے ہیں وہ انتہائی درجے کے بے ایمان، عیار اور مکار ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے لوگوں کو نقصان پہنچ رہا ہوتا ہے۔ ان کا ختم ہونا ہی بہتر ہوتا ہے۔''

''تراشوں میں بتایا گیا ہے کہ پولیس نے تمہیں گرفتار کیا تھا اور تم پر کیس بھی چلا تھا..... وہ کیا معاملہ تھا؟'' گوتم نے پوچھا۔

''وہ ایک ایسے آدمی کا معاملہ تھا جو ممبئی میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔ وہ بہت دولت مند شخص ہے۔ اس کی بیوی نے اس کی زندگی تلخ کر رکھی تھی۔ میں ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتا تھا لہٰذا میں نے اس سے رابطہ کیا اور معاملہ طے کرکے اس کا ''کیس'' رگھو کے حوالے کردیا۔''

''رگھو.....! یہ رگھو کون ہے؟'' گوتم نے چونک کر پوچھا۔

''میں اس سے کبھی نہیں ملا۔ میرا فون پر اس سے رابطہ ہوتا ہے۔ اس کے ''ریٹ'' مقرر ہیں۔ کسی کو راستے سے ہٹانے کے لیے وہ تین لاکھ روپے وصول کرتا ہے۔ اگر قتل کو حادثاتی رنگ دینا ہو تو اس کے دو لاکھ روپے الگ ہوتے ہیں۔ ہر ''کیس'' کا مجھے بیس فیصد کمیشن ملتا ہے۔ اپنا دوست سمجھ کر میں نے تمہیں یہ سب کچھ بتادیا ہے، کسی اور سے اس کا ذکر مت کرنا۔'' چکرورتی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

گوتم کے تصور میں اس کی بیوی کا سراپا تیر آیا۔ اس کے دل پر کچوکا سا لگا۔ اس کی بیوی پوجا کے مقابلے میں کس قدر بے ہنگم اور بے ڈول تھی۔ اس نے چکرورتی کی طرف جھکتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

''رگھو کا فون نمبر تو تمہیں یاد ہے نا؟''

☆☆☆

اس شام پوجا نے چکرورتی کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اخباری تراشے بڑی خوبی سے تیار کیے تھے۔ کسی کو تمہاری اس جعل سازی پر شبہ تک نہ ہوسکا۔''

''ہاں۔'' چکرورتی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''کرشن نامی شخص فوراً میرا مکان خریدنے پر آمادہ ہوگیا اور وہ منہ مانگی قیمت دینے پر تیار ہے..... اور بہت سارے لوگوں نے اپنے بزنس پارٹنرز کو قتل کرانے کے لیے مجھ سے رجوع کیا ہے بلکہ ایک نے تو پیشگی فیس بھی ادا کردی ہے جبکہ میں نہ تو کسی رگھو نام کے شخص کو جانتا ہوں اور نہ میرے پاس اس کا فون نمبر ہے۔'' اپنی بات مکمل کرکے وہ ہنس دیا۔

''تم سے کتنے لوگوں نے رابطہ کیا ہے؟'' پوجا نے مسکرا کر پوچھا۔

''پانچ افراد نے..... گوتم اپنی بے ڈول بیوی کو ٹھکانے لگانا چاہتا ہے۔ گپتا اپنے باس کا پتا صاف کرانے کا خواہش مند ہے تاکہ وہ بینک کا نائب صدر بن جائے۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے یہاں لمبا ہاتھ مارا ہے۔ ممکن ہے ایک دو شکار اور پھنس جائیں۔ ہم یہاں سے جائیں گے تو ہمارے پاس کم سے کم پندرہ سے بیس لاکھ روپے تک ہوں گے..... اور ہاں، تمہارا بھائی رگھو کا کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہے نا؟''

''ہاں۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔ میں ان لوگوں کو اس کا فون نمبر دے دیتا ہوں تاکہ وہ اس سے خفیہ طور پر گفتگو کرکے رقم ادا کردیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ لوگ جنہیں قتل کرانا چاہتے ہیں، ہم انہیں پن بھی نہیں چبھونے دیں گے۔''

''ہاں۔'' پوجا نے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس معاملے کو پولیس تک بھی نہیں لے جاسکتے۔ ظاہر ہے وہ کیسے اعتراف کریں گے کہ انہوں نے کسی کو قتل کرانے کے لیے سپاری دی ہے۔ اس عرصے میں ہم یہاں سے دور نکل جائیں گے..... ویسے اب کہاں چلنے کا ارادہ ہے؟''

''کول کتہ۔''

''ہاں، کول کتہ ہی جانا مناسب ہوگا.....'' پوجا نے کہا اور پھر گہرا سانس لے کر بولی۔ ''مجھے تو گوتم پر حیرت ہوتی ہے کہ اس جیسے بہ ظاہر شریف نظر آنے والے شخص نے تمہاری خدمات حاصل کرلی ہیں۔''

''اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں میری جان!'' چکرورتی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ہر شریف آدمی اپنی بیوی سے بیزار ہوتا ہے۔''

اس کی بات پر پوجا کھلکھلا کر ہنس دی۔

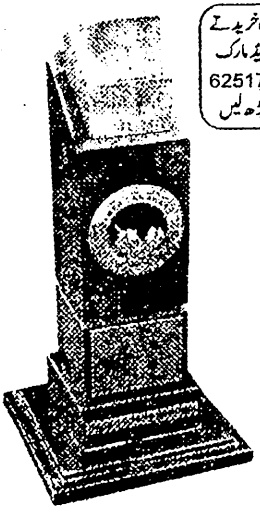

انتباہ
ہمیشہ حلوہ خریدتے
وقت ٹریڈ مارک
رجسٹرڈ نمبر 62517
ضرور پڑھ لیں

حافظ

ملتانی سوہن حلوہ

حافظ حبیب الرحمٰن حسین آگاہی ملتان

دو مرتبہ انٹرنیشنل کوالٹی ایوارڈ یافتہ

غیر معیاری اور جعلی حلوہ سے پاک
معاشرے کی تشکیل میں ہمارا ساتھ
دیں اور اپنے لذت ذوق کی تسکین
اور پیسے کے صحیح نعم البدل کیلئے اصل
حافظ کا ملتانی سوہن حلوہ خریدتے وقت
رجسٹرڈ ٹریڈ مارک نمبر 62517
حافظ حبیب الرحمٰن حسین آگاہی ملتان
ضرور پڑھ لیں

دل سے دل کی بات

حافظ ملتانی سوہن حلوہ کیساتھ

محبت اور اپنائیت

حافظ ملتانی سوہن حلوہ کی روایت

وہی بھرپور ذائقہ توانائی اور اعتماد لیے
دور جدید کے تمام تقاضوں سے ہم آہنگ

حافظ کا ملتانی سوہن حلوہ

حافظ کا ملتانی سوہن حلوہ

حافظ حبیب الرحمٰن حسین آگاہی ملتان
Tel:+92-61-4781725
Fax:+92-61-4543396
www.hafizhalwa.com
e-mail hafizhalwa@quality service com

طاہر فیاض، ننکانہ صاحب

رہنے دے میرے دل میں لہو کی کوئی اک بوند
شاید تیرا ناخن کبھی محتاج حنا ہو

ولید احمد عباسی، ایبٹ آباد

شمِ زندگی کا حسرت سب اور کیا بتاؤں
میری سوچ کی بلندی میری ہمتوں کی پستی

محمد شفیق ناز، جہلم

دو دن خوشی کے دیکھ نہ پائے تو کیا ہوا
سب کچھ لٹا کے ہوش میں آئے تو کیا ہوا

اخوندزادہ جاوید خان جوجی، لاہور

ایک یہ آس ہی کافی ہے میرے جینے میں
دل نہیں آپ دھڑکتے ہیں میرے سینے میں

وقف مہدی بخاری، ڈی آئی جی خان

وہ پرندہ جسے پرواز سے فرصت ہی نہ تھی
آج تنہا تھا تو دیوار پہ آ بیٹھا ہے

رانا محمد نثار، خوشاب

سویا ہوا تھا شہر کسی سانپ کی طرح
میں دیکھتا ہی رہ گیا اور چاند ڈھل گیا

محمد اشفاق خان خٹک، سانگھڑ

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے

محمد فراز کاٹھیا، شورکوٹ

یہ گزرتے ہوئے پل ہیں کہ تیری آنکھیں ہیں
دن ہے آنسو کی طرح، رات ہے کاجل کی طرح

یونس خان روغانی، پشاور

ذرا بھی ان کے چہرے سے پتا چلتا نہیں دل کا
عبارت اتنی مشکل ہے کہ ہم تفسیر پڑھتے ہیں

چوہدری محمد اویس نڈھانہ، نڈھرانجھا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

ملک منیر محی الدین اعوان، کوٹ اُدو

ان ہواؤں میں کئی ہاتھ چھپے ہیں لوگو
پھول چہرے نہ دریچوں میں سجا کے رکھا

نذیر احمد ڈوگر، اوکاڑہ

ہم کہیں بھی ہوں پلٹ آئیں گے
شام ہوجائے تو گھبرانا نہیں

خالد حسن چیمہ، پنڈی بھٹیاں

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

رانا ادیب الرحمٰن، رحیم یار خان

کیوں آنکھ بند کرکے مراقب ہوئے ہو میر
جاتے ہیں کیسے کیسے حسین چشم وا کرو

محمد سلیم زاہد حافظ، میانوالی

اپنے بھی خفا مجھ سے، تو بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

راشد حبیب تابش، اٹک

رنگ و خوشبو، لب و رخسار، دادا کچھ بھی نہیں
اب جو اجڑے ہیں، تو سوچا ہے وفا کچھ بھی نہیں

مسز سائرہ ثاقب، ساہیوال

کاسۂ رزق نے ہم کو تو کہیں کا نہ رکھا
کون وہ لوگ ہیں جو شام کو گھر جاتے ہیں

منصف خان سیماب، ہری پور

دم گفتار ترے ہونٹوں سے رستی ہوئی بات
جیسے ہر پربت کا جگر چیر کہ جھرنا پھوٹے

امجد علی، اسکاٹ لینڈ، یوکے

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

ایس محمد علی آثم، ڈیرہ اسماعیل خان

یوں لگا آج تیرا مجھ سے خفا ہوجانا
جس طرح پھول سے خوشبو کا جدا ہوجانا

چوہدری محمد اویس نڈھانہ، سرگودھا

کہا تھا شہر ہے اندھوں کا آئینے مت بیچ
زیاں تو ہونا ہی تھا، کاروبار ایسا تھا

ریاض بٹ، چوک بازار حسن ابدال

پھول کی ہو سکی نہ عمر دراز
مانگتی رہ گئی دعا خوشبو

جھرنا علی، ملتان

کسی کا ہاتھ ملے اور اس طرح امجد
کہ وقت چلتا رہے ، راستہ ٹھہر جائے

عرفان اللہ چٹھہ، سرگودھا

پھر بدل گیا موسم، سبز ہیں شجر لیکن
اڑ گئے تھے جو طائر لوٹ کر نہیں آئے

ڈاکٹر روبینہ نفیس، بکھر

ہوس نے کردیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہوجا، محبت کی زباں ہوجا

محمد عمار احمد فقیر والی، بہاول نگر

دل سے جب دل کلام کرتا ہے
لفظ آتے ہیں درمیان میں کیا

نسرین یاسین، حیدرآباد

وہ ذوق وہ شوق محبت کی واردات نہ پوچھ
جو آج خود بھی سنوں میں تو اک فسانہ لگے

محمد رشید سیال، سکھر

زخم بھرتا ہے نیا زخم لگانے کے لیے
کیا مسیحا ہے کہ اچھا نہیں ہونے دیتا

مولانا سعیدالدین بغدادی کی عمر ستر سے تجاوز کر چکی تھی لیکن ابھی تک ان کی صحت میں پیرانہ سالی کے باعث کسی خرابی کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ موسم کی تبدیلی سے ہونے والے معمولی نزلہ زکام یا بخار کے سوا انہیں کوئی بیماری نہیں ہوئی تھی۔ ان کی نظر بھی ٹھیک تھی۔ صرف قرآن کی تلاوت کرتے وقت انہیں چشمہ لگانے کی ضرورت پیش آتی جو ڈاکٹر کی رائے میں پچاس سال کی عمر کے بعد نارمل بات تھی..... پریشانی انہیں صرف اپنے اضافی وزن سے تھی جو بڑھتے بڑھتے اس سطح پر آ گیا تھا کہ اٹھتے بیٹھتے ان کے گھٹنوں کے کمزور جوڑ درد سے کراہنے لگتے تھے اور ان کا چلنا دوبھر ہو گیا تھا۔

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مسجد میں ان کا زیادہ وقت بیٹھ کے گزرتا تھا..... وہ نماز کے لیے صرف امامت کرتے وقت کھڑے ہوتے تھے باقی وقت وہ تلاوت کرتے تھے۔ محلے کے بچوں کو قرآن پڑھاتے تھے یا نماز عشا کے بعد درس دیتے تھے۔ دوسری وجہ ان کی خوش خوراکی تھی۔ ان کے پیچھے نماز پڑھنے والوں میں دو ڈاکٹر تھے جن کا مشورہ ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ وہ خوراک کم کریں اور سادہ روٹی کے ساتھ دال یا سبزی کے سوا کچھ استعمال نہ کریں اس کے علاوہ ورزش کریں اور جب وقت ملے مسجد کے صحن میں تیز قدموں سے چکر لگائیں۔

ایسے تمام مشورے ان کے لیے ناقابل عمل تھے۔ انہیں مسجد کی طرف سے ملا ہوا دو کمروں کا چھوٹا سا گھر ضرورت پوری کرتا تھا لیکن اس میں دو جوان بیٹیوں اور ایک بیوی کی موجودگی میں ورزش یا اچھل پھاند کرنا ان کی عمر اور وقار کے

بے گناہ

صبا احمد

ذرا سی غفلت کبھی کبھی ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کردیتی ہے، خصوصاً آج کے حالات میں آنکھیں اور کان ہر وقت کھلے رکھنے کی ضرورت ہمیشہ سے زیادہ ہے، اسی تنبیہہ کی عکاس آج کے دور کی چشم کشا کہانی۔

فتنہ پرور عاقبت نااندیش فسادیوں کی نئی فتنہ گری کا سبق آموز احوال

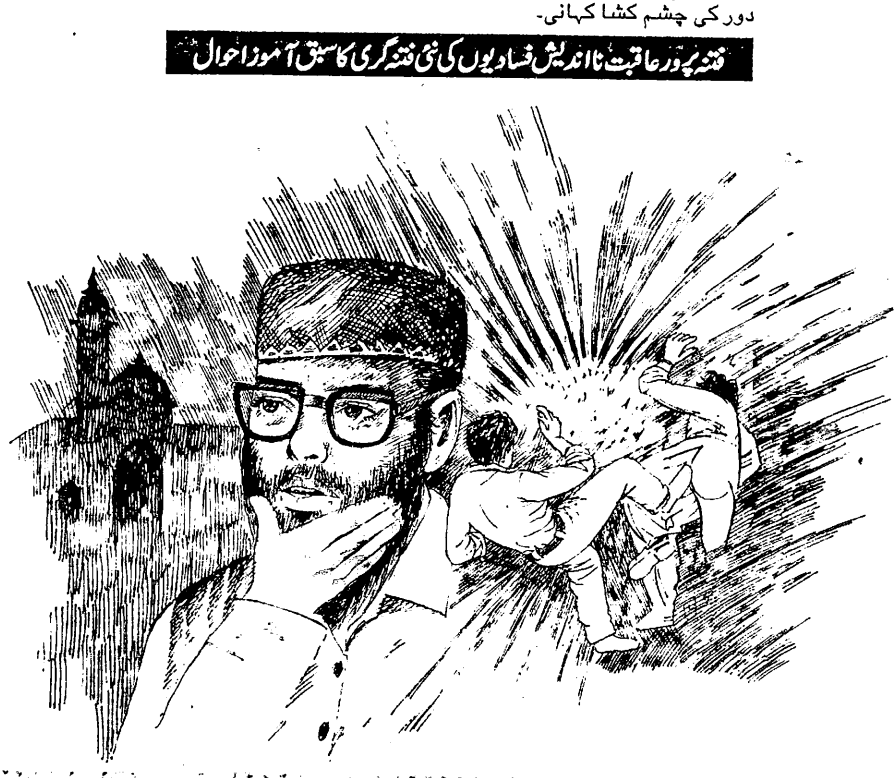

منانی تھا۔ اوقات نماز کے علاوہ بھی مسجد بالکل خالی نہیں ہوتی تھی..... کبھی طلبہ موجود ہوتے تھے تو کبھی قضا نماز یا نوافل ادا کرنے والے یا کسی کے سوئم چہلم کے شرکا۔ بے شک صحن خالی ملتا تھا مگر اس میں دیوانہ وار چکر پہ چکر لگانا دیکھنے والوں کے لیے ایک مضحکہ خیز عمل بن جاتا۔

تاہم آج وہ بہت افسردہ اور جھنجھلائے ہوئے تھے۔ اچھی عمر کے سب لوگوں کی طرح انہوں نے بھی وقت کی رفتار کے ساتھ رونما ہونے والے تغیر و تبدل کو محسوس کیا تھا اور بہ امر مجبوری قبول بھی لیکن وہ معاشرے کے اخلاقی انحطاط کو تر قی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ امت کا زوال تھا جو مغرب کی تقلید میں اپنے دین کی تعلیمات سے بھی منحرف ہوتی جارہی تھی۔

اس مسجد میں امامت کرتے انہیں چالیس برس بیت گئے تھے۔ ایسا افسوسناک واقعہ کبھی پیش نہ آیا تھا۔

ایک زمانہ تھا جب مسجد کے دروازے چوبیس گھنٹے کھلے رہتے تھے یہاں مسافر بھی قیام کر سکتے تھے اور بے گھر بھی۔ وہ مسجد کے غسل خانے استعمال کرتے تھے اور مختلف گھروں سے بھیجا جانے والا کھانا کھا کے پیٹ بھر لیتے تھے نہ چوری کا کھٹکا تھا نہ شر پسندی کا۔ پھر مسجد کی توسیع ہوئی اس میں پنکھے اور جہازی فانوس لگے۔ فرش پر سنگ مرمر کے ٹائل بچھے اور پھر قالین۔ دیواروں پر کلاک اور کالم اسپیکر لگے۔ اس کی خوب صورتی اور شان و شوکت بڑھتی گئی لیکن نمازیوں کی تعداد اسی نسبت سے گھٹتی چلی گئی۔ مسجد اب نماز عشا کے بعد مقفل کر دی جاتی تھی کیونکہ چوریوں کا ڈر تھا۔

چوریوں کی ابتدا نمازیوں کے جوتوں سے ہوئی۔ لوگ محتاط ہو گئے اور مسجد میں پرانے چپل پہن کر آنے لگے۔ پھر بھی وہ لوگ نئے یا قیمتی جوتے پہن کر آجاتے تھے جو دفاتر سے نماز پڑھنے آتے تھے یا دن کے وقت کام سے باہر نکلتے تھے۔ جوتوں کی حفاظت کے لیے مسجد کے صحن میں شیلف اور اسٹینڈ بنا دیے گئے پھر یہ شیلف مسجد کے اندر بھی ستونوں اور دروازوں کے ساتھ لگا دیے گئے جہاں نمازی موجود ہوتے تھے۔ مولانا سعید الدین بغدادی نے شروع میں اس پر اعتراض کیا تھا کہ جوتے ناپاک ہوتے ہیں ان کو اٹھا کے اندر لانا غلط ہے اور اندر رکھنا تو بالکل ہی غلط ہے مگر بعد میں انہیں لوگوں کی پریشانی کی وجہ سے اس انتظام کو قبول کرنا پڑا معلوم نہیں وہ کون ملعون تھے جو اللہ کے گھر سے نمازیوں کے جوتے چرا کے بیچتے تھے تاہم ایسے شرمناک واقعات پورے پاکستان میں عام ہو گئے تھے۔

پھر ایک دن کوئی مسجد کا کلاک اتار لے گیا۔ مسجد کے لیے کلاک دینے والے بہت تھے۔ چوری ہونے والے کلاک کی جگہ دوسرا کلاک لگا دیا گیا مگر انتظامی کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ اب سامنے والا صدر دروازہ نماز عشا کے بعد مقفل کر دیا جائے۔ نماز کے بعد درس کے لیے رکنے والے وضو خانے کے عقبی دروازے سے نکل جاتے تھے۔ مولانا صاحب بھی اپنی آمد و رفت کے لیے اسی دروازے کو استعمال کرتے تھے۔ اس انتظام کے بعد رات کے وقت قیام کرنے والے مسافروں کی مشکل ہو گئی تاہم مولانا نے یہ رعایت دی کہ ضرورت مند اپنی شناخت بتا کے مسجد میں رہ سکتا تھا۔ ایسے لوگ عام طور پر وہی ہوتے تھے جو کسی عدالتی معاملے میں پیشی یا اسپتال میں کسی کے علاج معالجے کے لیے گاؤں دیہات سے آتے تھے اور ہوٹل میں قیام کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔ مولانا کو اللہ کے گھر کو بند کرنا سخت ناگوار تھا مگر چوریاں روکنے کا اور کوئی طریقہ ہی نہ تھا۔

اس روک ٹوک کے باوجود ایک رات یہ ہوا کہ کوئی قالین والی صفیں اور دیوار پر سے کالم اسپیکر اتار کے چلتا بنا حالانکہ مسجد میں کم سے کم ایک درجن افراد سو رہے تھے۔ اس کے بعد مسجد میں رات کے وقت داخلہ مکمل طور پر بند کر دیا گیا۔ اس کا مولانا سعید الدین بغدادی کو بہت رنج تھا اب نہ کسی گھر سے کھانا آتا تھا اور نہ کوئی کھانے والا مسافر..... بیس برس میں مسجد کی وسعت اور آرائش میں بہت اضافہ ہوا تھا۔ محلے کی آبادی بھی دُگنی ہو گئی تھی مگر نمازی پہلے کے مقابلے میں آدھے بھی نہیں آتے تھے سوائے نماز جمعہ کے مسجد کا صحن بھرتا ہی نہ تھا۔ ہال میں فجر کی نماز کے وقت مشکل سے دو صفیں بنتی تھیں لیکن چوریاں بہت بڑھ گئی تھیں۔

اس کے بعد والے بیس برسوں میں مسجد اور پھیل گئی۔ اس میں ایک دار العلوم قائم ہو گیا اور دوسری منزل پر طلبہ کی رہایش کے لیے قیام گاہ تعمیر ہو گئی۔ سامنے کے رخ دو نئے مینار بنائے گئے جن کی بلندی ایک سو بیس فٹ تھی۔ مسجد کو موصول ہونے والے عطیات اور چندے کی مد میں سالانہ آمدنی لاکھوں تک پہنچ گئی تاہم مولانا نے مسجد کو ہر قسم کے فرقہ وارانہ تعصب سے دور رکھا۔ دینی تعلیم میں بھی فقہی اختلافات متنازعہ مسائل اور نظریاتی انتہا پسندی کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی گئی۔ اسلام امن، اخوت اور سلامتی کا دین ہے یہی مولانا کے عقیدے کی بنیاد تھی۔

خود مولانا نے کبھی کسی کے عقیدے کے خلاف اشارے کنائے میں بھی بات نہیں کی تھی اور وہ دوسروں کو بھی اس سے

روکتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ان کا دشمن کوئی نہیں لیکن آج یہ خیال بھی غلط ثابت ہو گیا تھا۔

ہوا یوں کہ عشا کی نماز کے بعد وہ درس سے فارغ ہوئے اور لوگ چلے گئے تو وہ عقبی دروازہ بند کرنے کے لیے اٹھنے لگے۔ دیر تک بیٹھنے کے بعد اٹھنا زیادہ مشکل ہوتا تھا۔ وہ ''یا اللہ'' کہہ کر آگے جھکے ہاتھوں پر زور دے کر اٹھے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر سیدھے کھڑے ہوئے اور ابھی دروازے کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ انہیں کوئی شخص تیزی سے اپنی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ وہ رک گئے۔

''کون ہو بھائی تم؟'' انہوں نے تشویش سے پوچھا کیونکہ وہ شخص اپنے منہ کو لپیٹ کر آیا تھا۔

اس شخص نے قریب آ کے اچانک ریوالور نکال لیا۔

''مولانا بغدادی..... تم اکثر ہمیں شیطان کا ایجنٹ کہتے ہو میں نے آج کے درس میں خود سنا ہے.....''

مولانا نے ذہن پر زور ڈالا۔ ''میں نے تو یہ کہا تھا کہ ذات پات صوبے یا زبان اور رنگ و نسل کی بنیاد پر مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے والے شیطان کے ایجنٹ ہیں کیا تم ایسا کرتے ہو؟''

اس نے ریوالور مولانا کے پیٹ پر دبایا۔ ''میں ایک قوم پرست تنظیم سے تعلق رکھتا ہوں..... جو اپنے حقوق کے لیے لڑ رہی ہے۔''

''حق کے لیے ضرور لڑنا چاہیے مگر تم کس قوم کی بات کر رہے ہو ہم مسلمان ایک ہی قوم ہیں نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک تک جیسا کہ علامہ اقبال نے فرمایا تھا.....''

اس نے برہمی سے کہا۔ ''جمعے کے خطبے میں تم نے کہا تھا کہ جو لوگ ٹی وی کو حرام کہتے ہیں وہ دین کی روح کو نہیں سمجھتے۔''

''ہاں، کوئی چیز خود بری نہیں ہوتی جیسے چاقو جو سبزی یا پھل کاٹنے کے لیے بنایا ہے اگر اس سے گلا کاٹ دیا جائے.....''

''ایسی ہی باتیں تم شاعری مصوری اور موسیقی کے بارے میں بھی کہتے ہو۔ تم اپنے علاوہ دوسروں کو کم عقل اور جاہل سمجھتے ہو.....؟''

''دیکھو، میں اپنی عقل اور فہم کے مطابق بات کرتا ہوں کسی کو غلط نہیں کہتا۔''

''تم سرکاری ملا ہو۔ حکومت کی خوشنودی چاہتے ہو اور حکومت مغربی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے جو روشن خیال اسلام رائج کرنا چاہتی ہے تم اس کی تبلیغ کرتے ہو۔'' وہ چیخ کر بولا۔

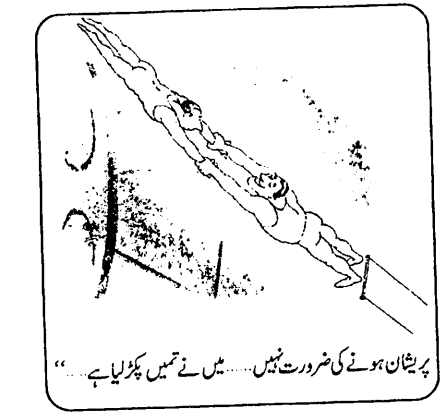

پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..... میں نے تمہیں پکڑ لیا ہے.....''

''خدا اور رسولؐ کے سوا مجھے کسی کی خوشنودی نہیں چاہیے۔'' مولانا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں وہ بات کہنے سے نہیں ڈرتا جو میرے نزدیک درست ہو۔''

''تم کیا سمجھتے ہو حکومت تمہیں رویت ہلال کمیٹی کا چیئرمین بنا دے گی یا اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن.....''

''لاحول ولا قوۃ..... میری ساری زندگی اسی مسجد کی خدمت کرتے گزر گئی میں نے کبھی اپنے لیے کچھ نہیں چاہا۔'' مولانا کا غصہ اور بڑھ گیا۔

''مگر اب تم حکومت کے وظیفہ خوار بن کر اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف بولو گے تو ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس مرتبہ تمہیں سمجھانے آیا ہوں۔ اگلی بار.....'' اس نے خطرناک انداز میں ریوالور لہرایا۔

مولانا نے بے خوفی سے نظر ملا کے کہا۔ ''مرنے سے صرف کافر ڈرتا ہے۔ زندگی اتنی ہی ہو گی جتنی خدا نے لکھی ہے۔''

وہ ایک دم پلٹا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا عقبی راستے سے باہر نکل گیا۔ اگر وہ خالی ہاتھ ہوتا تب بھی وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ وہ نوجوان اور پھرتیلا تھا۔ انہوں نے باہر ایک موٹر سائیکل کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی..... اگر وہ دوڑ سکتے تو شاید دروازے تک جا کے اس کا نمبر نوٹ کر لیتے.....

اگلے روز انہوں نے انتظامی کمیٹی کے ارکان کو بلایا اور ساری صورت حال ان کے سامنے رکھی۔

''یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔ ہم تو کسی کے خلاف نہیں۔'' ایک بزرگ نے کہا۔

''مگر کسی کے خلاف نہ ہونا اور ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہونے والوں کو برا کہنا بھی کچھ لوگوں کو گوارا نہیں۔ اختلافِ رائے برداشت نہ کرنے والے تشدد پسندی کے رجحان کو فروغ دے رہے ہیں دوسرے بزرگ نے کہا جو اپنے علم و دانش کے باعث بقراط مشہور تھے۔

''سوال یہ ہے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ کیا ہم اس دھمکی کے بارے میں پولیس کو بتائیں۔'' تیسرے رکن نے کہا۔

''پولیس کچھ نہیں کرسکتی۔ انہی کی نااہلی کی وجہ سے سارا ملک دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔'' ایک وکیل نے کہا جو مسجد اور دارالعلوم کے تمام قانونی امور کا مشیر تھا۔

بقراط نے کہا۔ ''ہمیں خود اپنی حفاظت کرنی ہوگی۔ اپنا دفاع مضبوط کرنا ہوگا۔''

وکیل نے کہا۔ ''ہمیں سخت سکیورٹی چیک رکھنے ہوں گے۔''

مولانا نے بڑے دکھ سے کہا۔ ''اب کیا اللہ کے گھر آنے والوں کی تلاشی لی جائے گی۔ ان کے شناختی کارڈ دیکھے جائیں گے اور شناخت نہ رکھنے والے کو نماز سے روک دیا جائے گا۔ کون کرے گا یہ کام؟''

''ہم ایک سکیورٹی گارڈ رکھ سکتے ہیں۔ کیمرے لگا سکتے ہیں۔ آتشیں اسلحہ کا سراغ لگانے والے آلات اور فائر الارم نصب کرسکتے ہیں۔ ہمارے پاس فنڈز ہیں۔'' وکیل نے کہا۔

مولانا نے صاف انکار کردیا۔ ''نہیں، یہ مسجد ہے کوئی خفیہ نوعیت کا سرکاری ادارہ نہیں۔''

پہلے بزرگ نے کہا۔ ''فی الحال صرف اتنا کیا جائے کہ آنے جانے والوں پر نظر رکھی جائے۔ زیادہ تر لوگوں کو ہم جانتے ہیں وہ اسی علاقے کے پرانے رہائشی ہیں لیکن اجنبی بہرحال آتے ہیں۔''

بقراط نے کہا۔ ''اب یہ نوجوان بھی تو درس میں شامل تھا۔ کسی نے نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے۔''

''آئندہ کوئی مشکوک..... میرا مطلب ہے نامانوس چہرہ نظر آئے تو پوچھ لیا جائے۔ اس کے علاوہ اس بات پر خاص توجہ دی جائے کہ کوئی اپنے ساتھ بریف کیس یا بیگ وغیرہ لے کر نہ آئے۔ اور لائے تو چھوڑ کر نہ جائے۔ تحریک کار ایسے ہی بم رکھ جاتے ہیں۔'' وکیل نے کہا۔

سکیورٹی کے سخت انتظامات کی تائید کے بعد' جلاس برخواست ہوگیا۔ سب لوگ اب بے حد مستعد ہوگئے تھے اور اجنبی لوگوں پر نظر رکھتے تھے۔ ایک روز مولانا نماز ظہر سے فارغ ہوئے تو ایک باریش اور نورانی چہرے والے نوجوان نے ان سے بڑی عقیدت کے ساتھ مصافحہ کیا۔ اس نوجوان کو وہ اکثر نماز ظہر میں ہی دیکھتے تھے۔

''جناب، میرا نام احتشام الدین ہے۔ میں ایک کاروباری ادارے میں سیلز اینڈ مارکیٹنگ منیجر ہوں۔ اکثر نماز ظہر یہاں پڑھتا ہوں۔''

مولانا نے کہا۔ ''کیا آپ کا آفس یہیں قریب ہی ہے۔''

''قریب تو نہیں لیکن ایسا ہے کہ بچپن میں آپ سے قرآن ناظرہ پڑھا پھر بائیس سال کی عمر تک پانچوں وقت اسی مسجد میں نماز کے لیے آتا رہا۔ میری رہائش قریب تھی۔ آپ کی تعلیمات سے بے حد متاثر ہوں۔ مجھے پتا چلا تھا کہ کسی بدخواہ نے آپ کو دھمکی دینے کی جسارت کی تھی۔''

مولانا نے کہا۔ ''دھمکی سے کیا ہوتا ہے احتشام الدین۔''

''دیکھیے ..... گستاخی معاف چھوٹا منہ بڑی بات..... زمانہ ایسا نہیں ہے کہ آپ خطرات کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں۔ مساجد اور عبادت گاہوں میں دہشت گردی کے واقعات کتنے بڑھ گئے ہیں۔ آپ کے سکیورٹی کے انتظامات فول پروف ہونے چاہئیں۔''

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے اور لوگوں نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ مسجد میں کیمرے اور خودکار الارم نصب کرا دیے جائیں مگر میں نے انکار کردیا۔ مسجد کوئی آرڈیننس ڈپو یا بجلی گھر جیسا ادارہ نہیں ہے جہاں عام لوگوں کے داخلے پر پابندی عائد کی جائے۔ اس کے علاوہ مسجد کا فنڈ ایسی فضولیات پر خرچ کرنا میرے نزدیک ناجائز ہے۔''

''انہیں آپ فضولیات کیسے کہہ سکتے ہیں۔ یہ چیزیں آپ کی اور مسجد کی املاک کی حفاظت کو یقینی بناتی ہیں۔ ذرا غور فرمایئے کتنے سالوں میں یہ مسجد اور دارالعلوم مکمل ہوئے۔ اس میں لاکھوں روپے خرچ ہوئے۔ اگر عام آدمی کے حساب سے مالیت دیکھی جائے تو یہ کم سے کم بھی ایک کروڑ کی پراپرٹی ہے۔ اس کو بچانے کے لیے تھوڑا بہت خرچ کردینا غلط نہیں ہو سکتا لیکن میں آپ کے خیال سے متفق ہوں کہ مسجد کا فنڈ ایک امانت ہے اور سکیورٹی کی مد میں خرچ نہیں کیا جاسکتا۔''

مولانا نے کہا۔ ''یہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ بس میرا دل نہیں مانتا۔''

''اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں؟''

''کہو بھئی ..... تکلیف کیسا۔''

''مولانا صاحب اس مسجد کے بھی مجھ پر حقوق ہیں اور

اس کے لیے میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ سکیورٹی کیمرے اب زیادہ مہنگے نہیں رہے اور میرا کاروباری ادارہ ایسی بہت سی چیزیں باہر سے برآمد کرتا ہے تو ان کی لاگت بہت کم ہو جاتی ہے اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں اپنے خرچ پر یہ کیمرے نصب کرادوں۔''

مولانا صاحب نے حیران اور خوش ہو کے کہا۔ ''مگر احتشام الدین اس پر ہزاروں خرچ ہو جائیں گے تمہارے۔''

احتشام الدین نے کہا۔ ''جناب اللہ نے اتنی توفیق دی ہے اور یہ میری خواہش ہے..... زیادہ نہیں بس تین کیمرے نصب ہوں گے ایک صدر دروازے پر۔ ایک وضو خانے کی چھت میں اور ایک اندر ہال کی چھت میں۔ کوئی کیمرا نظر نہیں آئے گا مگر مسجد کے ہر گوشے کو فوکس کرے گا۔ اونچائی سے کوریج زیادہ ہو جاتی ہے۔ تینوں کیمروں کا ایک سینٹرل پروسیسر ہوگا۔ ایک مانیٹر پر ہر جگہ کا منظر بٹن دبانے سے سامنے آتا جائے گا۔''

مولانا بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے احتشام الدین سے کہا کہ اگر وہ رات کو عشا کے بعد آجائے تو انتظامی کمیٹی کے اراکین اس سے مل کر بہت خوش ہوں گے اور بلاشبہ ایسا ہی ہوا۔ نوجوان کے جذبے نے سب کو بے حد متاثر کیا۔ وہ انہیں اس سکیورٹی نظام کے بارے میں بتاتا رہا جو بھروسے کے قابل تھا اور کئی جگہ استعمال ہو رہا تھا۔ اس نے ان مقامات کی نشاندہی بھی کی جہاں وہ خود یہ سسٹم نصب کرا چکا تھا۔

''اس پورے نظام کی لاگت کیا ہوگی؟'' بقراط نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اگر کوئی اپنے گھر میں لگوانا چاہے؟''

احتشام الدین نے کہا۔ ''اللہ کے گھر کی بات الگ ہے۔ یہاں میں لاگت لگاؤں تو یوں سمجھ لیں کہ بیس ہزار میں سب ہو جائے گا۔ یہی سسٹم جب ہم کاروباری اداروں میں لگاتے ہیں تو چالیس ہزار وصول کرتے ہیں۔''

''یعنی دوگنا..... اور بعد میں مرمت اور دیکھ بھال کا کیا لیتے ہیں؟''

وہ مسکرایا۔ ''دیکھیے اس سسٹم میں دیکھ بھال کا خرچ کوئی نہیں۔ کیمرا اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ مانیٹر پر تصویر آتی رہتی ہے۔ اگر کبھی کوئی خرابی پیدا ہوگی تو میں ہوں نا۔ یہ ذمے داری میری۔ کاروباری اداروں سے ہم ایک ہزار روپے ماہانہ لیتے ہیں۔''

''یہ سسٹم اگر میں اپنے گھر میں لگواؤں.....'' بقراط نے کہا۔

''تو آپ کو خصوصی ڈسکاؤنٹ مل جائے گا۔ اس لیے کہ آپ کو اصل قیمت پتا چل گئی ہے جو ہم کسی کو نہیں بتاتے۔ آپ کے لیے صرف ایک ہی کیمرا کافی ہوگا۔ دس ہزار سے بھی کم لگیں گے۔''

''تو میاں احتشام الدین تم یوں کرو پہلے میرے گھر پر لگادو۔ آزمایش بھی ہو جائے گی۔ اس کے بعد مسجد میں بھی نصب کرالینا..... کیا خیال ہے۔'' بقراط نے دوسروں کی طرف دیکھ کے کہا۔

اپنا خیال کسی نے ظاہر نہیں کیا اور مسجد سے پہلے سکیورٹی سسٹم بقراط صاحب کے گھر پر لگ گیا۔ انہوں نے اس کی کارکردگی کی تعریف بھی کی مگر ادائیگی کے طلبے کہا کہ دوسرے سسٹم کے ساتھ ہی کر دی جائے گی..... احتشام الدین نے قطعی اعتراض نہیں کیا اور اگلے ہی روز سے مسجد میں کیمرے لگوانے میں مصروف ہو گیا۔ اس کا معاون بھی اسی کے جیسا پابند صوم وصلوٰۃ اور باریش تھا۔ دونوں دن کے اوقات میں جینز اور جوگرز پہنتے تھے اور اپنے کام کے ماہر تھے۔ یہ تکنیکی اور الیکٹرانک انجینئرنگ کے معاملات تھے جو بقراط صاحب کی سمجھ میں بھی بہت کم آتے تھے۔

احتشام الدین اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ آخری روز جاتے وقت اس نے مولانا کو ایک ریموٹ کنٹرول دیا۔ ''ویسے تو کیمرے خودکار ہیں۔ ہر پانچ منٹ کے بعد اپنا رخ تبدیل کرتے ہیں اور تین سو ساٹھ ڈگری یعنی ایک مکمل دائرے میں گھوم کے ہر گوشے کی تصویر اتار لیتے ہیں..... لیکن ریموٹ سے آپ کیمروں کو اپنی مرضی سے حرکت دے سکتے ہیں اور چاہیں تو ایک ہی جگہ فوکس بھی کر سکتے ہیں..... زوم سے آپ اس کے منظر کو قریب کر کے ملاحظہ کر سکتے ہیں۔''

مولانا گھبرا گئے۔ ''نہیں یہ سب ہمارے بس کا نہیں، ہمیں تو ریموٹ پر لکھے ہوئے حروف بھی عینک سے نظر نہیں آتے بس چلنے دو کیمروں کو۔''

احتشام الدین مسکرایا۔ ''یہ بہت آسان کام ہے۔ آپ کا کوئی نوجوان معاون کر سکتا ہے جو یہاں رہتا ہو۔''

مولانا نے مؤذن کو بلا لیا۔ ''بھئی یہ ہیں ہمارے مقابلے میں نوجوان۔''

مؤذن کی عمر بھی چالیس سے اوپر تھی۔ اس نے سکیورٹی کے پورے سسٹم کو، ریموٹ مانیٹر اور کیمروں کے فنکشن اور آپریشن کو سمجھا اور ایک طرح سے سکیورٹی افسر کی ذمے داری سنبھال لی۔ مانیٹر اسی حجرے میں رکھ دیا گیا تھا جہاں سے وہ اذان دیتا تھا اور جہاں ایمپلی فائر، بیٹری اور انورٹر وغیرہ بھی

رکھے ہوئے تھے۔ یہاں ایک دری بھی بچھی ہوئی تھی جس پر وہ فارغ وقت میں آرام کرتا تھا۔

''کیا مجھے ہر وقت مانیٹر کے سامنے بیٹھنا ہوگا؟'' موذن نے ایک خیال کے تحت کہا۔ ''ایسے تو نہ میں اذان دے سکوں گا اور نہ نماز پڑھ سکوں گا۔''

احتشام الدین نے کہا۔ ''اس میں ایک وڈیو کیسٹ ہے جو آٹھ گھنٹے چلتی ہے پھر خود ہی ریوائنڈ ہو جاتی ہے اور دوبارہ ریکارڈ کرنے لگتی ہے لیکن سکیورٹی کا صحیح مقصد اسی وقت پورا ہوگا جب کوئی ذمے داری سے یہ کام کرے۔ خصوصاً نماز کے اوقات میں جب لوگ آتے ہیں۔''

پھر تو اس کام کے لیے کسی کو ملازم رکھنا پڑے گا۔'' مولانا نے سوچ کر کہا۔ ''جو صبح مسجد کے کھلنے سے بند ہونے تک مانیٹر کو دیکھتا رہے۔''

موذن نے ریموٹ کو چلانے کی کوشش کی۔ ''ابھی تو یہ کام بھی نہیں کر رہا ہے۔''

احتشام الدین نے کہا۔ ''سسٹم کام کر رہا ہے۔ دیکھیے تصویر آرہی ہے یہ گیٹ کی۔ یہ وضو خانے کی اور یہ اندر کی۔ ریموٹ میں خاص قسم کے سیل پڑتے ہیں جو میں لانا بھول گیا۔ شام کو لا دوں گا۔''

شام کو بقراط صاحب بڑی تشویش زدہ صورت کے ساتھ مولانا سعید الدین بغدادی کے پاس آئے۔ ''مولانا، یہ جو نوجوان احتشام الدین ہے آپ اسے ذاتی طور پر جانتے تھے۔''

''ذاتی طور پر تو نہیں، لیکن اس نے بتایا کہ پہلے وہ یہیں رہتا تھا اسی علاقے میں۔''

''اسی علاقے میں کہاں؟''

''یہ تو میں نے نہیں پوچھا۔ آخر بات کیا ہے؟''

''دراصل میرے ایک دوست بھی ایسا ہی سکیورٹی کا نظام اپنے گھر میں نصب کرانا چاہتے تھے مگر جو پتا احتشام الدین نے بتایا تھا وہاں تو ایسی کوئی کمپنی ہی نہیں.....''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''میں خود گیا تھا..... بلڈنگ میں پھرتا رہا سب سے پوچھ لیا مگر لوگوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔''

''بھئی ہو سکتا ہے آپ غلط بلڈنگ میں چلے گئے ہوں۔''

بقراط صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ ''فون نمبر ہے آپ کے پاس؟''

''نہیں..... اس کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی۔''

بقراط صاحب نے کہا۔ ''اسے دینا چاہیے تھا۔ عام طور پر ایسے لوگ کارڈ پہلے دیتے ہیں اس پر سب لکھا ہوتا ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ پریشان کیوں ہیں؟''

بقراط صاحب نے کہا۔ ''نہیں پریشان تو نہیں بس ایسے ہی خیال آرہا تھا کہ ہم نے تصدیق نہیں کی شناختی کارڈ تک نہیں دیکھا۔''

''کمال کرتے ہیں آپ..... وہ اتنے خلوص سے سب کچھ کر رہا ہے ہم سے کچھ مانگا بھی نہیں۔ آپ کے گھر میں سکیورٹی سسٹم لگا دیا اور ایک پیسا نہیں لیا ابھی تک۔''

''وہ تو خیر ٹھیک ہے۔ بس ایسے ہی خیال آرہا تھا کہ آدمی کسی سے کام کرائے تو پہلے اس کے بارے میں تسلی کر لے.....''

مولانا نے کہا۔ ''شام کو کر لیجیے گا۔ وہ آئے گا ریموٹ کے سیل دینے۔ سسٹم تو لگا دیا ہے پورا اور کام بھی کر رہا ہے۔''

بقراط صاحب نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ ''کام تو میرے گھر میں بھی بالکل ٹھیک کر رہا ہے۔ دراصل یہاں اور بھی لوگ یہی کام کرتے ہیں۔ میرے دوست نے پہلے ان سے معلومات حاصل کی تھیں۔ دوسروں نے کہا کہ کم سے کم پچاس ہزار لگیں گے۔ احتشام الدین نے صرف دس ہزار لیے۔ یہ مجھے کچھ عجیب لگا۔''

''آپ تو حد کرتے ہیں۔ اگر کوئی دس کے پچاس وصول کر لیتا تب بھی شکایت کرتے۔ اس شریف آدمی نے اصل لاگت پر منافع لیے بغیر آپ کا کام کر دیا آپ کو تو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔''

بقراط صاحب نے سر ہلایا۔ ''میرے دوست نے ایک کمپنی کو فون کر کے کہا کہ احتشام الدین نام کے ایک صاحب نے یہ کام دس میں کرا دیا ہے جس کے آپ پچاس مانگ رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ یہ ناممکن ہے۔ جو سسٹم آپ بتا رہے ہیں وہ جاپانی ہے اس کی تو لاگت ہی تیس ہزار بیٹھ جاتی ہے۔ تب سے میرا دماغ اُلجھن میں ہے۔''

اب مولانا سعید الدین بغدادی کی صورت پر بھی الجھن کے آثار عیاں ہوئے انہوں نے کہا۔ ''اجی بقراط صاحب کھل کر صاف کہیے۔''

''مولانا..... کہیں یہ چوری کا مال تو نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے کہیں سے اس کے ہاتھ لگ گیا ہو..... یا اس کا مقصد کچھ اور ہو.....''

''اتنا فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں شام کو اپنی تسلی کر لیجیے گا۔ اس نے تو مقصد یہی بتایا تھا کہ وہ مسجد کے لیے کچھ

کرنا چاہتا ہے۔''

رات نماز عشا تک احتشام الدین کا کہیں پتا نہ تھا۔ نماز سے فراغت ہوئی تو کچھ لوگ درس کے لیے رک گئے۔ نو بجے کے قریب احتشام الدین عقبی دروازے سے اندر آیا اور موذن کو ریموٹ کے سیل دے کر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد مؤذن نے ریموٹ کا وہ حصہ کھولا جہاں سیل لگائے جاتے تھے۔ سیل فٹ کرنے کے بعد اس نے ریموٹ کا رخ کیمرے کی طرف کیا اور بٹن دبایا۔

اس کے ساتھ ہی جیسے قیامت آ گئی۔ یکے بعد دیگرے تین دھماکے ہوئے۔ پہلے دھماکے سے اندر کے حصے کی چھت گنبد اور دیواروں کے ساتھ منہدم ہو گئی۔ دوسرے دھماکے نے وضو خانے کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا۔ تیسرے دھماکے سے مرکزی دروازے اور پھر مینار گر گئے۔

☆☆☆

باریش اور نورانی چہرے والے نوجوان نے ادب سے سر جھکا کے کہا۔ ''آپ نے جو کام میرے سپرد کیا تھا۔ بخیر و خوبی پایہ تکمیل تک پہنچا حضور..... الحمدللہ۔ میں نے سوچا یہ خوش خبری خود آپ کو دوں۔''

بارعب جلالی شخصیت والے بھاری بھرکم چغہ پوش نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ''جزاک اللہ..... ہمیں تم پر ناز ہے۔''

''مگر میں یہ محسوس کرتا ہوں حضور کہ..... ان سب بے گناہوں کا خون میری گردن پر ہے۔''

چغہ پوش نے برہمی سے کہا۔ ''تم انہیں بے گناہ کیوں کہتے ہو؟ اس کے علاوہ تم بری الذمہ ہو۔ تم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ تباہی کا ذمے دار خود وہ شخص ہے جس نے بٹن دبایا۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ قتل کا الزام اس پر نہیں آ سکتا جو بندوق میں گولی ڈالے اور اسے فائر کے لیے تیار رکھے۔ قاتل وہی سمجھا جائے گا جو گولی چلائے۔ تم بے گناہ ہو۔''

''ماشاءاللہ۔'' نوجوان کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ ''آپ نے ایک منطقی وضاحت سے میرے دل کو سکون بخش دیا۔ اب ہمارے لیے کیا حکم ہے حضور؟''

''ہم ایک اور خدمت تمہارے سپرد کر رہے ہیں۔ اُمید ہے تم اپنی ذہانت اور ہمت سے اس مشن میں بھی کامیاب رہو گے۔''

''انشاءاللہ.....'' نوجوان نے کہا اور اس کا چہرہ عزم صمیم کی تصویر بن گیا۔

ماہنامہ دلکش کی پہلی سالگرہ کے موقع پر

جاسوسی | سسپنس | پاکیزہ | سرگزشت

کے قارئین کے لئے ماہنامہ دلکش کا 1 شمارہ تحفتاً حاصل کرنے کا سنہری موقع

بس درج ذیل کوپن پر کیجیے اور ماہنامہ دلکش کا ایک شمارہ

گھر بیٹھے وصول کیجیے

کوپن

نام _____

پتا _____

فون نمبر _____ مصروفیت: خانہ دار/ ملازمت/ کاروبار/ ڈاکٹر/ وکیل/ انجینئر/ دیگر

فطرت کی بوالعجبیوں اور محبت کی خود فراموشیوں کی دلگداز کتھا

تماشائے فطرت

ایچ اقبال

جذبات اور احساسات خمیر انسانی کا حصہ ہیں، ان پر قابو پانے کی کوشش تو کی جاتی ہے جس کے ذریعے انہیں کسی دائرے میں محدود بھی کیا جاسکتا ہے مگر انہیں پروان چڑھنے سے روکنا یہ ممکن نہیں ہوسکتا۔ محبت بھی ایک جذبہ ہے، خوبصورت اور کیف پرور جذبہ کوشش کرکے اس کی بے مہار و بے مہابہ شدتوں کو کم تو کیا جاسکتا ہے تاہم یہ ممکن نہیں، اس کی کونپل کو پھوٹنے ہی نہ دیا جائے یہ تو وہ کونپل ہے جو وقت حالات، عمر اور رتبہ دیکھے بغیر دل کا سینہ چیر دیتی ہے۔ پھر جہاں محبت ہو وہاں بے خودی نہ ہو یہ ممکن نہیں، عقل چاہے لاکھ سمجھائے، محتاط روی کا مشورہ دے مگر اس بے خودی کا خمار گہرا سے گہرا تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی محبت کی دل نواز خوشبو سے مہکتی اور عالم بے خودی کے مہربان لمحات سے مزین یہ داستان سسپنس کے ان صفحات پر پیش کی جارہی ہے۔

محبت اور ہوس کاری کے فرق کو اجاگر کرتی داستان صد رنگ

تماشائے فطرت
از ع اقبال

پچپن سالہ رشید خاں کوشش تو کر رہا تھا کہ اس کی بیسا کھی کی آواز اتنی زیادہ نہ ہو کہ برابر کے کمرے میں لیٹی ہوئی اس کی جوان بیٹی صبیحہ اور نو عمر بیٹے عاصم کی نیند میں خلل پڑے اور وہ بے دار ہو جائیں لیکن اسی کمرے میں لیٹی ہوئی اس کی بیوی ساجدہ کو اندیشہ تھا کہ رات کے سناٹے میں ''کھٹ کھٹ'' کی وہ کم آواز بھی سوتے ہوئے دماغوں پر ہتھوڑے کی طرح برس سکتی ہے۔

شریک حیات اگر سمجھ دار ہو تو شوہر کا مزاج سمجھنے میں اسے بہت کم وقت لگتا ہے لیکن ساجدہ تو رشید خاں کے ساتھ ایک چوتھائی صدی سے کچھ زیادہ ہی گزار چکی تھی۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ اس وقت اس کے شوہر کے دل پر کیا گزر رہی تھی اور دماغ میں کیسا کہرام برپا تھا۔

بستر پر لیٹے لیٹے رشید خاں کے جسم میں بے چینی کے اتنے کانٹے چبھے تھے کہ اس نے بیسا کھی کے سہارے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ جب سے ایک حادثے میں اس کی دائیں ٹانگ ضایع ہوئی تھی، وہ بیسا کھی اس کے جسم کا لازمی حصہ بن گئی تھی اور دس مہینے میں شاید وہ بھول بھی گیا تھا کہ وہ بیسا کھی اس کے جسم کا اضافی حصہ تھی۔

جب رشید خاں کو ٹہلتے ہوئے زیادہ دیر ہو گئی تو ساجدہ سے چپ نہ رہا گیا اور وہ بول پڑی۔ ''نیند نہیں آ رہی ہے تو بیٹھ جاؤ، بیٹھے رہو۔ اس طرح آخر کب تک.....'' ساجدہ کی آواز بھرا گئی۔ وہ اپنا جملہ پورا نہیں کر سکی۔

ساجدہ کی آواز سن کر رشید خاں میکانکی انداز میں، جہاں تھا وہیں رک گیا۔ وہ اس وقت ساجدہ کے پلنگ کے قریب ہی تھا۔ چند لمحے وہ ساجدہ کی طرف دیکھتا رہا پھر ایک قدم بڑھا کر اسی کے پلنگ پر بیٹھ گیا اور ساجدہ کو بھی یہ اچھا نہ لگا کہ وہ لیٹی رہتی۔

''ساجدہ!'' رشید خاں سپاٹ اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''میں سارا دن یہی سوچتا رہا تھا کہ آج جب ہماری پیاری بیٹی اپنی پہلی تنخواہ لے کر دفتر سے آئے گی تو اس گھر کے در و دیوار سے لپٹی ہوئی غربت کے سائے مدھم پڑنے لگیں گے اور ہمیں کچھ سکون کا سانس ملے گا لیکن.....'' رشید خاں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خاموش ہو گیا۔

ساجدہ نے رشید خاں پر ایک نظر ڈالی اور سر جھکا لیا۔

چند لمحے بعد رشید خاں پھر بولا۔ ''ہماری صبیحہ بہت سیدھی ہے ساجدہ! وہ تو کچھ سمجھی ہی نہیں ہے۔ اس نے تو آ کر بڑی خوشی خوشی بتا دیا کہ پہلی تنخواہ ملنے پر اس کے باس نے اسے مبارک باد کے ساتھ گل دستے کا تحفہ دیا ہے لیکن مجھے تو وہ گل دستہ لگا ہی نہیں۔ وہ تو کانٹوں کا ایک ڈھیر تھا جس نے میری روح میں ان گنت زخم ڈال دیے۔''

''جانتی ہوں میں۔'' ساجدہ نے ٹھنڈی سانس لی۔

''بچی تو ہوں نہیں کہ اس گل دستے کا مطلب نہ سمجھتی۔ یہ تو ایک طوفان کی آہٹ ہے لیکن میرا دماغ تو یہ سوچ سوچ کر بھی تھکا ہے کہ آنے والے دوسرے طوفان کو کس طرح روکا جا سکتا ہے۔''

''دوسرا طوفان؟'' رشید خاں نے سوالیہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔'' ساجدہ نے سر ہلایا۔ ''سبھی کو تو معلوم ہو چکا ہے کہ صبیحہ کو پندرہ ہزار روپے کی ملازمت مل گئی ہے۔ اب تو خاموش قرض خواہوں کے تیز، نوکیلے تقاضے ہمارے گھر کے دروازے میں سوراخ ڈال دیں گے..... جنرل اسٹور والے، دودھ والے یا سبزی والے جیسے لوگوں کو تو شاید کچھ سمجھایا بھی جا سکتا ہے مگر ان عزیزوں کی زبانیں بڑی زہریلی ہو جائیں گی جن کے ہم قرض دار ہیں۔ ہر شخص یہ چاہے گا کہ پہلے اس کا قرض ادا کیا جائے۔''

رشید خاں آہستگی سے اثبات میں سر ہلانے لگا پھر عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''لیکن..... یہ ممکن تو اسی صورت میں ہے نا کہ صبیحہ کی ملازمت برقرار رہے۔''

ساجدہ نے چونک کر رشید خاں کی طرف دیکھا۔

''ہاں ساجدہ۔'' رشید خاں نے کہا۔ ''میں بس یہی فیصلہ کر سکا ہوں کہ صبیحہ کل سے ملازمت پر نہ جائے۔ جو بات گل دستے سے چلی ہے، وہ آگے تو بڑھے گی لہٰذا اس سے پہلے کہ اس کی آنچ ہماری عزت کے دامن تک پہنچے، ہمیں اس پر پانی ڈال دینا چاہیے۔'' پھر یکا یک رشید خاں کے لہجے میں ایک عجیب سی سختی اور آواز میں غصے کی لہر آ گئی۔ ''یہ دولت مند..... یہ پیسے والے..... شاید اپنا حق سمجھتے ہیں غریبوں کی عزت سے کھیلنا۔''

ساجدہ کی نظریں جھک گئیں۔ وہ کچھ توقف سے بولی۔ ''یہ فیصلہ اتنی جلدی نہ کرو۔''

رشید خاں نے چونک کر ساجدہ کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتی ہو تم؟ کیا میں یہ فیصلہ اس وقت کروں جب ہماری عزت کا دامن جل کر خاک ہو چکا ہو؟''

''دیکھو۔'' ساجدہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اس میں تو شک نہیں کہ ہماری صبیحہ بہت سی لڑکیوں کی طرح تیز طرار نہیں ہے۔ اسی لیے وہ اس گل دستے کا مطلب فوراً نہیں سمجھ سکی، لیکن وہ بے وقوف بھی نہیں ہے اگر بات آگے

بڑھتی نظر آئی تو اس کی سمجھ میں سب کچھ آجائے گا۔ وہ خود ہی چھوڑ دے گی ملازمت۔''

''یہ تم کیوں چاہتی ہو ساجدہ؟'' رشید خاں نے کچھ حیرت سے کہا۔ ''یہ فیصلہ صبیحہ پر کیوں چھوڑا جائے؟''

''بس یہ سوچ رہی ہوں کہ بات شاید وہ نہ ہو جو ہمارے دماغ میں آئی ہے۔''

''یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟''

''دنیا میں سبھی تو برے نہیں ہوتے..... ہوسکتا ہے، صبیحہ کا باس بھی برا آدمی نہ ہو، وہ مکمل دستہ اس نے خلوص نیت اور صاف دل سے دیا ہو۔''

رشید خاں کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آگئی۔ ''تم یہ خطرہ اس لیے مول لینا چاہتی ہو کہ ہم ایک اذیت ناک زندگی گزار رہے ہیں اور میں کچھ کرنے کے قابل نہیں رہا ہوں؟'' رشید خاں نے کہا اور پھر کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''نہیں ساجدہ!... میں اس قابل تو ہوں کہ خودکشی کرسکوں۔''

ساجدہ نے رشید خاں کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''زندگی سے کچھ ایسا پیار تو مجھے بھی نہیں رہا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''خودکشی میں بھی کرسکتی ہوں لیکن..... اس کے بعد کیا ہوگا؟..... آصف کی بیماری طول کھینچ گئی ہے، اسے اچھے علاج کی ضرورت ہے اور پھر ہماری صبیحہ ہے۔ ہماری جوان بیٹی جو ہمارے بعد دنیا کے طوفانوں میں تھپیڑے کھانے کے لیے بے سہارا ہو جائے گی..... کیا پھر ہماری روحوں کو سکون مل سکے گا؟ کیا مر کر بھی ہم چین پاسکیں گے؟''

اس بات پر رشید خاں کی آنکھوں سے بھی آنسو ابل پڑے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر سسکیاں لیتے ہوئے بولا۔ ''خدا ہم جیسے بدنصیبوں کو آخر بیٹی دیتا ہی کیوں ہے؟''

ساجدہ کچھ نہیں بولی۔ اس نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں خشک کیں، اٹھ کر ایک گلاس میں پانی لائی، رشید خاں کو پلایا پھر کہا..... ''اب جاکے بستر پر لیٹو! سونے کی کوشش کرو۔''

''مجھے نیند نہیں آئے گی ساجدہ۔''

''نیند تو..... کہتے ہیں، کانٹوں پر بھی آجاتی ہے۔''

''مجھے تو بستر پر کانٹے نہیں..... انگارے بچھے ہوئے لگ رہے ہیں۔''

''کوشش تو کرو۔'' ساجدہ کے لہجے میں درد تھا۔ ''ساری رات بیٹھے تو نہیں رہ سکتے..... نڈھال ہوجاؤ گے، طبیعت خراب ہوجائے گی۔''

ساجدہ کے سمجھانے بجھانے پر رشید خاں نے بیساکھی سنبھالی۔ ساجدہ نے اسے سہارا دیا اور وہ اٹھ کر اپنے بستر پر جالیٹا۔

اپنے بستر پر ساجدہ بھی لیٹ گئی لیکن نیند اس کی آنکھوں سے بھی اڑی ہوئی تھی، بے کلی کے عالم میں تو وہ بھی تھی، دل تو اس کا بھی بھر رہا تھا۔

صرف دس مہینے میں اس گھر کی دنیا بدل گئی تھی۔

رشید خاں زیادہ تعلیم یافتہ تو نہیں لیکن محنتی آدمی تھا۔ اس کی زندگی ملازمتیں کرتے گزری تھی۔ کم آمدنی کے باوجود اس نے اپنے بچوں کی تعلیم کا خاص خیال رکھا تھا۔ صبیحہ بی اے کر چکی تھی اور دس سال کا بیٹا عاصم اسکول کا طالب علم تھا مگر سال بھر سے اسکول نہیں جاسکا تھا۔ اس کی جان کو ایک ایسی بیماری لگ گئی تھی جس کا علاج ٹھیک سے نہیں ہو پا رہا تھا یا ڈاکٹر اس کی بیماری سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ اس کے معدے میں تکلیف رہتی تھی۔ کچھ کھایا نہیں جاتا تھا اگر زبردستی کچھ کھاتا تھا تو معدے میں جلن اور تکلیف کے بعد قے ہو جاتی تھی۔ اسی لیے وہ بہت کمزور، بہت لاغر ہوگیا تھا۔

سال بھر پہلے تک رشید خاں ایک ریکروٹنگ ایجنٹ کا ملازم تھا۔ ملازمت کو پانچ سال گزر چکے تھے کہ ریکروٹنگ ایجنٹ کوئی غیر قانونی کام کرتے ہوئے گرفتار ہوگیا۔ ریکروٹنگ ایجنسی بند ہوگئی۔ رشید خاں کسی اور ملازمت کی تلاش میں دو مہینے تک سرگرداں رہا لیکن ایک حادثے میں اس کی دائیں ٹانگ ضائع ہوگئی۔ بہت دن تک اسے ایک اسپتال میں رہنا پڑا اور پھر جب وہ گھر لوٹا تو بیساکھی کے سہارے۔

ساجدہ کسی نہ کسی سے کچھ قرض لے کر گھر چلاتی رہی تھی۔ اور چند مہینوں میں اچھا خاصا قرض ہوگیا تھا۔ اس کی ادائیگی کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آرہی تھی کہ پچھلے مہینے صبیحہ کو پندرہ ہزار روپے کی ملازمت مل گئی۔ ملازمت کے لیے کوششیں وہ خود بھی کرتی رہی تھی۔ اسے ملازمت ملی تو ساجدہ اور رشید خاں کو ایسا لگا جیسے کوئی خزانہ ہاتھ میں آنے والا ہو۔ ساجدہ منصوبے بنانے لگی کہ وہ گھریلو اخراجات، کم سے کم کر کے باقی رقم سے دھیرے دھیرے لوگوں کا قرض اتارے گی لیکن صبیحہ نے بیا نگ دہل کہہ دیا تھا کہ پہلے وہ اپنے بھائی عاصم کا علاج کسی بڑے ڈاکٹر سے کرائے گی، چاہے کتنی بھی فیس ادا کرنی پڑے۔ وہ عاصم کو بہت چاہتی تھی۔

لیکن اب۔

ماں اور بیٹی..... دونوں ہی کو اپنے خواب بکھرتے ہوئے سے لگ رہے تھے لیکن اس وقت ساجدہ کو اپنی بیٹی کے جذبات کا علم نہیں تھا۔

☆☆☆

دوسرے کمرے میں صبیحہ تکیے میں منہ دیے خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ اس نے اپنے والدین کی ساری باتیں سنی تھیں۔ ان باتوں نے اسے شدید اذیت میں ڈال دیا تھا۔ وہ بار بار عاصم کی طرف بھی دیکھتی رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بیساکھی کی ''کھٹ کھٹ'' سے عاصم کی آنکھ کھل جائے۔

صبیحہ روتی رہی اور سوچتی رہی کہ اب کیا ہوگا؟ اگر دوسرے دن اسے ملازمت پر نہ جانے دیا جاتا تو پھر کسی اچھے ڈاکٹر سے اس کے بھائی کا مستقل علاج نہیں ہوسکتا تھا اور قرض خواہوں کے تقاضوں کی شدت بھی بڑھے گی۔ وہ ضرور پوچھیں گے کہ اتنی معقول ملازمت آخر کیوں چھوڑ دی گئی اور انہیں ان کے سوال کا جواب بھی نہیں دیا جاسکے گا۔

صبیحہ روتی رہی، سوچتی رہی اور اس کے دماغ میں اپنے والدین کی باتیں بھی گونجتی رہیں۔ اس نے کل دستہ پاکر واقعی وہ سب کچھ نہیں سوچا تھا جو وہ اپنے ماں باپ کی زبان سے سن چکی تھی، اور وہ اتنی بے وقوف بھی نہیں تھی کہ ان باتوں کو بے بنیاد قرار دے دیتی۔ وہ ساری باتیں تو کسی کوڑیالے سانپ کی طرح اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھیں لیکن ماں نے جو باتیں کہی تھیں، اسے ان باتوں سے کچھ ڈھارس بھی مل رہی تھی کہ دنیا میں سبھی لوگ برے تو نہیں ہوتے۔

رات کسی نہ کسی طرح گزر ہی گئی۔ صبح وہ کوشش کرتی رہی کہ اس کے چہرے کے تاثرات یا حرکات وسکنات سے یہ ظاہر نہ ہوجائے کہ اس نے اپنے ماں باپ کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ عاصم سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہی۔ اس نے عاصم کو یہ یقین بھی دلایا کہ آج وہ کسی اچھے ڈاکٹر کے بارے میں معلومات بھی حاصل کرے گی تاکہ اس سے عاصم کا علاج جلد از جلد شروع کرایا جائے۔

رشید خاں اور ساجدہ چپ چپ سے تھے لیکن صبیحہ ایسی بنی رہی جیسے ان دونوں کی خاموشی میں وہ کوئی معنی خیزی محسوس نہ کرسکی ہو پھر جب ناشتا کرنے کے بعد وہ دفتر جانے کے لیے تیار ہونے لگی تو اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے دفتر جانے دیا جائے گا یا نہیں۔

لیکن اسے نہیں روکا گیا۔

مگر جب وہ اپنے دفتر جانے والے روٹ کی بس میں سوار ہوئی تو بھی اسے مکمل اطمینان نہیں تھا۔ وہ یقین اور بے یقینی کے دو پاٹوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس کے لیے اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ مستقبل میں کیا حالات پیش آئیں گے اور اسے کیا فیصلہ کرنا پڑے گا۔

☆☆☆

پینتالیس سالہ ارسلان شاہ جب اپنے خوب صورت بیڈ روم میں داخل ہوا تو اس کی چالیس سالہ بیوی احمر سلطانہ بھی اس سے گھریلو قسم کی باتیں کرتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ بیڈ روم میں جب ارسلان شاہ اپنا کوٹ اتارنے لگا تو احمر سلطانہ نے اس کی مدد کی۔ ارسلان شاہ کا کوٹ لے کر وہ وارڈ روب کی طرف بڑھی۔ وارڈ روب سے اس نے ہینگر نکالا۔ اس وقت ارسلان شاہ اپنی ٹائی ڈھیلی کرکے بستر پر بیٹھا اپنے جوتے کے فیتے کھول رہا تھا۔

''آج خانساماں سے میں نے ایک چیز بنوائی ہے۔'' احمر سلطانہ نے وارڈ روب بند کرتے ہوئے کہا اور پھر کمرے سے جانے کے لیے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

''ابھی آتی ہوں، ذرا کچن کا ایک چکر لگالوں۔''

''کھانے میں تو ابھی دیر ہوگی۔'' ارسلان شاہ نے خیال ظاہر کیا۔

احمر سلطانہ نے اپنی کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں، ابھی ایک گھنٹا تو لگے گا۔''

''اچھا تو مجھے ایک ڈرنک بنا کے دیتی جاؤ ذرا تھکن اتر جائے گی، چاق و چوبند ہوجاؤں گا۔''

احمر سلطانہ ہنس کر پلٹتی ہوئی بولی۔ ''آپ کو تو بس بہانہ چاہیے۔''

ارسلان شاہ جوتے اتار کر موزے بھی اتار چکا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے احمر سلطانہ کی طرف دیکھا اور پھر سائیڈ ٹیبل سے پائپ اٹھا کر اس میں تمباکو بھرنے لگا۔

احمر سلطانہ نے اس کے لیے ایک گلاس بنا دیا اور پھر دروازے کی طرف بڑھی۔

ارسلان شاہ نے دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی احمر سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا، خوب صورت تو اب بھی ہے میری بیوی..... لیکن.....

جانے کیا خیال آیا تھا اس کے ذہن میں کہ وہ دھیرے سے ہنس دیا اور پھر گلاس ہونٹوں سے لگا کر ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا۔ گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ اپنے گلے میں جھولتی ہوئی ٹائی اتارتے ہوئے بستر سے اٹھا۔ جب احمر سلطانہ واپس آئی، وہ کپڑے تبدیل کرکے بستر پر نیم دراز ہوچکا تھا اور شراب کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔

''ایک ڈرنک تم اپنے لیے بھی بنالو۔'' ارسلان شاہ نے احمر سلطانہ سے کہا۔

''نہیں۔'' احمر سلطانہ نے کہا۔ ''مجھے کچھ بات کرنا ہے آپ سے۔''

''ارے تو ایک ڈرنک سے کیا فرق پڑ جائے گا..... بلکہ..... ڈرنک کرتے ہوئے باتیں کرنے میں مزہ بھی آتا ہے۔''

''معاملہ بہت سنجیدہ ہے ارسلان!'' احمر سلطانہ نے کہا اور ایک کرسی بستر کے قریب گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ ''کل سے سوچ رہی تھی کہ اس معاملے میں آپ سے بات کروں بھی یا نہیں!''

''کوئی بہت گمبھیر مسئلہ ہے کیا؟''

''ہاں، گمبھیر تو ہے۔''

ارسلان شاہ نے ایک گھونٹ لے کر احمر سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم تو بہت ہی سنجیدہ نظر آرہی ہو۔''

''بات ہی کچھ ایسی ہے۔'' احمر سلطانہ واقعی بہت سنجیدہ تھی۔ ''شاید آپ کو یاد بھی نہ ہو میری ایک دوست ہے، فیروزہ..... چند سال پہلے وہ اپنے شوہر کے ساتھ امریکا جا کے وہیں سیٹل ہوگئی ہے۔''

''مجھے واقعی یاد نہیں۔'' ارسلان شاہ نے کہا۔ ''تمہاری دوستوں کی کمی تو ہے نہیں۔ مجھ جیسا شخص کیسے یاد رکھ سکتا ہے ان سب کو۔''

احمر سلطانہ کسی طرف دیکھتی ہوئی کچھ سوچنے لگی۔ ارسلان شاہ نے گھونٹ لیتے ہوئے بھی احمر سلطانہ کے چہرے پر نظر رکھی۔

''اچھا پہلے آپ ایک بات بتائیں۔'' احمر سلطانہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اپنے دوستوں میں انسانی فطرت کے بارے میں بہت کچھ کہتے رہتے ہیں۔ آج آپ مجھے اس بارے میں کچھ بتائیں..... کیا یہ ممکن ہے کہ شادی شدہ عورت جو، جوانی کی حد سے بھی گزر چکی ہو، اپنے شوہر کے علاوہ کسی سے محبت کرنے لگے۔''

''اوہ!'' ارسلان شاہ کے منہ سے نکلا اور پھر اس نے دو بڑے گھونٹ لے کر گلاس خالی کر دیا۔ ''بات شاید میری سمجھ میں آگئی ہے۔ مسئلہ واقعی گمبھیر ہے۔ مجھے ایک ڈرنک اور بنا دو۔''

اس مرتبہ احمر سلطانہ اٹھی تو اس نے ارسلان شاہ کے لیے ڈرنک بنانے کے ساتھ اپنے لیے بھی ایک گلاس بنا لیا۔

''گڈ!'' ارسلان شاہ نے سر ہلایا۔ ''ایسے گمبھیر مسئلے پر بات کرتے ہوئے ڈرنک لینا ضروری ہو جاتا ہے۔''

''میرے ذہن پر واقعی بہت بوجھ ہے۔'' احمر سلطانہ نے کرسی پر بیٹھ کر ایک گھونٹ لیا۔

ارسلان شاہ بولا۔ ''یہ کوئی ایسا معاملہ بہرحال نہیں ہے جس کا تجزیہ کرنے کے لیے بہت زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہو۔ محبت تو کیا، کوئی بھی جذبہ انسان کے دل میں کسی وقت بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس میں عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔''

''میں شادی شدہ عورت کی بات کر رہی ہوں اور میرا سوال خاص طور سے محبت کے جذبات کی طرف ہے۔''

ارسلان شاہ نے ایک گھونٹ لے کر کہا۔ ''میں اسی طرف آرہا ہوں۔ کیا ہمارے سامنے ایسی مثالیں نہیں ہیں کہ شادی شدہ مرد کسی دوسری عورت یا لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو کر اس سے شادی کر لیتے ہیں۔''

''میں عورت کی بات کر رہی ہوں ارسلان۔''

''وہی میں بھی کہنے جا رہا ہوں کہ عورت بھی انسان ہی ہوتی ہے اگر کسی شادی شدہ مرد کے من میں کسی دوسری عورت کی محبت پیدا ہو سکتی ہے تو کسی شادی شدہ عورت کے دل میں بھی کسی دوسرے مرد کی محبت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس میں فساد بس یہ ہے کہ ہمارے یہاں کی عورت معاشرتی قید و بند کی وجہ سے اپنی دوسری محبت کو اپنے اندر ہی اندر کچلتی رہتی ہے اور اس کا ذکر کبھی اپنی زبان پر کبھی نہیں لاتی۔''

''اب میں آپ سے بہت صاف صاف سوال کروں گی۔'' احمر سلطانہ نے کہا۔ ''کسی شادی شدہ عورت کا یہ فعل کیا مجرمانہ ہے؟''

''کم از کم میں تو اسے مجرمانہ نہیں مانتا۔'' ارسلان شاہ نے کہا۔ ''یہ سب کچھ تو ایک فطری معاملہ ہے۔ انسان اپنے جذبات کچل تو سکتا ہے لیکن یہ اس کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ ان جذبات کو پیدا ہونے دے، یا اُبھرنے نہ دے۔''

''اور اگر وہ عورت اپنے محبوب سے زیادہ قریب ہو جائے تو؟''

ارسلان شاہ نے فوراً گلاس منہ سے لگا کے ایک بڑا گھونٹ لیا، پھر سر ہلاتے اور کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اگر بڑے کینوس میں دیکھا جائے تو تمہارا یہ سوال خاصا پیچیدہ ہے۔''

''آپ اسے بڑے کینوس میں کیوں دیکھ رہے ہیں۔ اس سوال کو بھی اسی کینوس میں دیکھیے جس میں آپ محبت کے معاملے میں عورت اور مرد کو یکساں سمجھ رہے ہیں۔''

''دراصل یہاں سے بات آجاتی ہے اخلاقی حدود کی اور مختلف معاشرے یا بعض افراد ان حدود کا تعین اپنی سوچ اور اپنے نظریات کے مطابق کرتے ہیں۔''

''آپ اپنی اخلاقی حدود کا کیا تعین کریں گے؟ میں تو اس معاملے میں آپ کا نظریہ جاننا چاہتی ہوں۔''

ارسلان شاہ دھیرے سے ہنس پڑا اور محبت بھری نظروں سے احمر سلطانہ کی طرف دیکھنے لگا۔

''جواب دیجیے ارسلان!..... آپ اس طرح میری

طرف کیا دیکھنے لگے؟''

''مجھے کالج کا زمانہ یاد آگیا۔ تم کالج کی سب سے کامیاب ڈیبیٹر تھیں۔ تمہاری اسی صلاحیت نے مجھے تمہارا گرویدہ بنایا تھا۔''

''اب وہ زمانہ آپ کہاں یاد کرنے لگے۔'' احمر سلطانہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔

''اس لیے کہ تم آج بھی ویسی ہی سنجیدگی سے کسی گمبھیر مسئلے پر بات کرسکتی ہو۔''

''ان باتوں میں آپ میرا سوال کیوں ٹال رہے ہیں؟''

''ٹال نہیں رہا ہوں۔ بس خوشی ہورہی ہے مجھے کہ تم آج بھی، عام قسم کی بیویوں کی طرح روایتی قسم کی باتوں کے بجائے اتنے سنجیدہ مسائل پر سوچ سکتی ہو۔''

''سوچنے کی ضرورت تو مجھے اپنی دوست کی وجہ سے پڑی ہے۔''

''وہ تو خیر میں تمہاری باتوں سے سمجھ گیا ہوں کہ وہ اپنے شوہر کے ہوتے ہوئے بھی کسی اور سے محبت کرنے لگی ہے۔''

''اور بہت پریشان ہے اس سلسلے میں ایک ہفتے سے تقریباً روزانہ ہی مجھے فون کررہی ہے۔ بہت دیر تک باتیں کرتی رہتی ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اسے کیا جواب دوں۔ اسی لیے میں آپ سے مشورہ کررہی ہوں لیکن آپ میرے اس سوال کا جواب دینے سے گریز کررہے ہیں کہ عورت اگر اپنے محبوب سے بہت زیادہ قریب ہوجائے تو اسے کیا سمجھا جائے گا۔ آپ میرا مطلب تو سمجھ گئے ہوں گے۔ قربت سے میری مراد یہ ہے کہ.....''

''میں سمجھ رہا ہوں تمہاری بات۔'' ارسلان شاہ بول پڑا اور پھر ایک گھونٹ لے کر احمر سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا تمہاری دوست اپنے محبوب سے اتنا قریب جاچکی ہے؟''

''ابھی تو نہیں گئی لیکن اس کے جذبات کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے میں سمجھ رہی ہوں کہ ایسا کسی وقت ہوتو سکتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس کا امکان تو ہے۔ محبت کے معاملات میں یہ حیوانی جذبہ بھی کسی وقت سر اٹھا لیتا ہے اور اگر وقت اور ماحول اس میں حارج نہ ہوں تو انسان اس دھارے میں بے بس تنکے کی طرح بہہ جاتا ہے۔''

''میری دوست بھی اسی خیال سے پریشان ہے کہ کسی وقت ایسا نہ ہوجائے۔''

''وہ اپنے شوہر سے طلاق کیوں نہیں لے لیتی؟ پھر وہ اپنے محبوب سے شادی کرسکتی ہے۔''

''مشکل تو یہی ہے کہ وہ اپنے شوہر سے بھی محبت کرتی ہے اور اسے چھوڑنا نہیں چاہتی۔''

''ہوں۔'' ارسلان شاہ نے متفکر انداز میں سر ہلایا۔ ''بعض اوقات یہ بھی ممکن ہے کہ محبت دو طرف تقسیم ہو جائے۔''

''اسی لیے تو میں آپ کا مشورہ چاہتی ہوں کہ ان حالات میں میری دوست کو کیا کرنا چاہیے؟''

ارسلان شاہ نے ایک بڑا گھونٹ لے کر اپنا گلاس خالی کردیا لیکن احمر سلطانہ کا گلاس ابھی خالی نہیں ہوا تھا اور وہ سوالیہ نظروں سے ارسلان شاہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

وہ کچھ رک کر سوچتے ہوئے بولا۔ ''وہ لوگ..... میرا خیال ہے کہ قابل رحم ہوتے ہیں جو اس قسم کی صورت حال سے دوچار ہوجائیں۔ انہیں کوئی بھی مشورہ دیا جائے، وہ ان کے لیے قابل عمل نہیں ہوتا کم از کم میں یہی سمجھتا ہوں۔ اس قسم کے لوگ بس حالات کے دھارے پر بہتے رہیں۔ وہ دھارا انہیں کہیں بھی لے جاسکتا ہے۔''

''میرے سوال کا جواب تو آپ نے اب بھی نہیں دیا۔''

''اس کا ایک ہی جواب ہے ڈارلنگ..... شادی شدہ عورت اپنے محبوب سے اگر اتنی قریب ہوجائے تو یہ بات اپنے شوہر سے پوشیدہ رکھے۔ دراصل یہ شوہر کے مزاج پر بھی منحصر ہے کہ وہ یہ بات برداشت کرسکتا ہے یا نہیں۔''

''لیکن اس طرح عورت کے ضمیر پر ایک بوجھ تو ہو جائے گا۔''

''اس کا انحصار عورت کے مزاج پر ہے کہ وہ اسے جرم سمجھتی ہے یا نہیں۔''

''آپ اسے جرم نہیں سمجھتے؟''

''نہیں۔'' ارسلان شاہ دھیرے سے ہنس دیا۔ ''میرے دوست احباب تو میرے اس قسم کے خیالات پر بہت چراغ پا ہوتے ہیں لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ انسان اگر اپنے اس وحشی جذبے کے ہاتھوں بے بس ہوجاتا ہے تو یہ کوئی جرم نہیں ہے۔''

''مرد یا عورت؟''

''دونوں۔''

''تو میں اپنی دوست کو کیا مشورہ دوں؟''

''مشورہ تو..... میں نے کہا نا کہ ان حالات میں کسی کے لیے قابل عمل ہو ہی نہیں سکتا اگر اس سے کہا جائے کہ وہ اپنے

محبوب کو نظر انداز کرنے کی، اسے بھولنے کی کوشش کرے تو یہ اس کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ اپنے شوہر سے وہ طلاق بھی نہیں لینا چاہتی۔ ایسی صورت میں تو بس یہی ہوسکتا ہے کہ انسان خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دے۔''

''تو یہ ہے آپ کا مشورہ؟''

''ایسے مشورہ تو نہیں کہا جا سکتا ڈارلنگ..... ہاں اگر تم اسے مشورہ سمجھتی ہو تو اور بات ہے۔ تم اپنی دوست سے وہی سب کچھ کہہ دو جو میں ابھی تم سے کہہ چکا ہوں۔''

احمر سلطانہ نظریں جھکا کر کچھ سوچنے لگی پھر اس نے اپنا گلاس خالی کیا اور کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ ''میں جا کے کھانا لگواتی ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد ارسلان شاہ سوچنے لگا کہ مسئلہ واقعی احمر سلطانہ کی کسی دوست کا ہے یا احمر سلطانہ کو اس پر شبہ ہو گیا ہے کہ وہ اپنے دفتر میں ملازم لڑکی صبیحہ کو پسند کرنے لگا ہے؟

نہیں، ارسلان شاہ نے اپنا سر جھٹکا، ابھی تو اس کا علم صبیحہ کو بھی نہیں کہ وہ اسے پسند کرنے لگا ہے۔ ایسی صورت میں احمر سلطانہ کو اس کا شبہ کیسے ہوسکتا ہے؟

☆☆☆

صبیحہ نے پہلے ہی دن اپنی تنخواہ ماں کے ہاتھ پر رکھ دی تھی۔ دوسرے دن جب وہ آفس سے گھر پہنچی تو اسے یہ جان کر اچھا خاصا ذہنی دھچکا لگا کہ دس ہزار تو لوگوں کا قرض دینے دلانے میں خرچ ہو گئے تھے اور اب بس پانچ ہزار باقی تھے جن سے کسی نہ کسی طرح مہینے بھر کا خرچ چلانا تھا۔

''یہ آپ نے کیا کر دیا اماں!'' صبیحہ نے بے اختیار کہا۔

''ایسا تو کئی مہینے تک ہوتا رہے گا بیٹی۔'' ساجدہ بولی۔ ''تمہیں تو پتا ہے، قرضہ بہت ہے لوگوں کا۔''

''وہ تو بہت دن سے ہے اماں..... اگر مجھے ملازمت نہ ملتی تو وہ اب بھی رہتا، بلکہ بڑھتا رہتا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب کوئی بہانہ بھی تو نہیں ہے کسی کو قرض نہ لوٹانے کا..... سبھی کو پتا چل گیا ہے کہ تمہیں اچھی خاصی ملازمت مل گئی ہے۔''

''کسی طرح کچھ دن تو اور ٹالا جا سکتا تھا لوگوں کو۔'' صبیحہ نے کہا۔ ''عاصم کی حالت نہیں دیکھ رہی ہو..... میں چاہتی تھی کہ اسے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤں۔ آج کسی نے مجھے آغا خاں کے ایک ڈاکٹر کا نام بھی بتایا ہے۔''

''کس نے بتایا ہے؟'' ایک طرف خاموش بیٹھے ہوئے رشید خاں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''دفتر میں ہی کسی نے بتایا ہے۔'' صبیحہ نے جواب دیا۔

گل دستے کے معاملے میں رشید خاں اتنا چراغ پا ہو چکا تھا کہ صبیحہ نے اپنے باس ارسلان شاہ کا نام لینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

''گھر کے معاملات تم نے دفتر کے لوگوں کو بتانا شروع کر دیے۔''

''سبھی بتاتے ہیں ابا۔'' صبیحہ نے دبی زبان سے جواب دیا۔ ''زیادہ دن ساتھ رہے تو دفتر کے لوگ ایک خاندان کی طرح کے ہو جاتے ہیں۔''

''سبھی اپنے اپنے گھروں کے مسئلوں پر ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہیں۔''

اس سے پہلے کہ رشید خاں کچھ کہتا، ساجدہ بول پڑی۔ ''ہاں خیر ایسا تو ہوتا ہوگا لیکن بیٹی، آغا خاں تو بہت بڑا اسپتال ہے۔ وہاں کے ڈاکٹروں کی فیس تو بہت زیادہ ہوگی۔''

''فیس تو ادا کی جا سکتی تھی اگر تم دس ہزار روپے لوگوں کو نہ دے دیتیں۔''

''اور اس کے بعد کیا ہوتا؟'' رشید خاں بول پڑا۔ ''علاج کہاں سے ہوتا عاصم کا؟..... یہ بڑے ڈاکٹر تو دوائیں بھی بہت مہنگی بتاتے ہیں۔''

''وہ تو بعد میں سوچ لیا جاتا اماں۔'' صبیحہ نے باپ کو جواب دینے کے بجائے ساجدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کم از کم یہ تو صحیح طرح سے پتا لگ جاتا کہ عاصم کی بیماری آخر ہے کیا۔''

''جب مہنگا علاج نہ کروایا جا سکے تو بیماری جان لینے سے بھی کیا حاصل۔'' رشید خاں نے تلخی سے کہا۔

''بس تو ٹھیک ہے۔ مر جانے دیں عاصم کو تڑپ تڑپ کر۔'' صبیحہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ رشید خاں اور ساجدہ اسے جاتے دیکھتے رہ گئے۔

رشید خاں نے افسردہ سے لہجے میں کہا۔ ''یہ لڑکی آخر کیا سمجھتی ہے ساجدہ؟ عاصم کی بیماری کی فکر کیا ہمیں نہیں ہے؟ کیا عاصم میرا بیٹا نہیں ہے؟ کیا اسے تم نے اپنی کوکھ سے نہیں جنا؟''

''جذباتی ہو گئی وہ۔'' ساجدہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''بہت محبت کرتی ہے وہ عاصم سے۔''

''اور ہمیں تو نفرت ہے عاصم سے۔'' رشید خاں کے لہجے میں اب تلخی تھی۔

☆☆☆

صبیحہ کے کمرے میں ایک بستر پر عاصم لیٹا کہانی کی کوئی

کتاب پڑھ رہا تھا۔ سال بھر پہلے جب اس کی بیماری نے شدت اختیار کی تھی تو اسکول جانا اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ تبھی سے صبیحہ اس کی وقت گزاری کے لیے کسی لائبریری سے کہانیوں کی کتابیں لا دیا کرتی تھی۔

عاصم کی طرف سے منہ پھیرے وہ اپنے بستر پر جا لیٹی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عاصم اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہوئے دیکھے۔

''کیا ہوا باجی؟'' عاصم بول پڑا۔

''کچھ نہیں، یوں ہی سر میں ہلکا سا درد ہو گیا ہے۔'' صبیحہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''سر دبا دوں؟'' عاصم نے بڑی محبت سے پوچھا۔

اس بات پر صبیحہ کا دل اور بھر آیا لیکن کسی نہ کسی طرح وہ عاصم سے اپنے آنسو چھپانے میں کامیاب رہی۔

پھر اسی دن رات کو لگ بھگ دو بجے ایسا ہوا کہ عاصم کی چیخ نما کراہ سے صبیحہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھی۔ عاصم اپنے بستر پر بیٹھا دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑے اس طرح کراہ رہا تھا کہ کبھی کبھی اس کی آواز اتنی بلند ہو جاتی تھی جیسے وہ کراہا نہ ہو، چیخ پڑا ہو۔

''عاصم، میرے بھیا۔'' صبیحہ اپنے بستر سے اٹھ کر لپکی۔ ''میں ابھی تجھے دوا دیتی ہوں بھیا۔'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اس نے ایک چھوٹی سی الماری کھول کر دو شیشیاں نکالیں۔ ایک شیشی کی بناوٹ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ڈراپس کی تھی اور دوسری شیشی میں چھوٹے چھوٹے ٹیبلٹس تھے۔

شیشیاں لے کر صبیحہ جھپٹنے کے سے انداز میں عاصم کے بستر پر گئی۔ اسی وقت بیساکھیوں کی ''کھٹ کھٹ'' کی آواز کے ساتھ رشید خاں اور اس کے ساتھ ساجدہ بھی بوکھلائی ہوئی سی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس وقت صبیحہ نے تقریباً زبردستی عاصم کو اپنی گود میں لٹا لیا تھا اور اس کے منہ میں ڈراپس ٹپکانے کی کوشش کر رہی تھی۔ خود اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں.....

ساجدہ بستر کے پائینتی بیٹھ گئی۔

''میرا بچہ..... میرا بچہ.....'' اس کے منہ سے نکل رہا تھا اور وہ دونوں ہاتھوں سے عاصم کے پیر دبا رہی تھی حالانکہ اسے معلوم تھا کہ پیر دبانے سے عاصم کی تکلیف میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

رشید خاں بیساکھیوں کے سہارے بستر کے قریب کھڑا بے بسی سے عاصم کی طرف دیکھ رہا تھا اور چہرے کی کیفیت ایسی تھی جیسے بیٹے کی اذیت اس کے لیے بھی ناقابل برداشت ہو۔

''میرا بھیا تو مرد ہے اماں۔'' صبیحہ کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''برداشت کر لیتا ہے یہ۔ تم جلدی سے پانی تو لے آؤ۔''

ساجدہ جلدی سے اٹھ کر کمرے سے چلی گئی۔

عاصم کے منہ میں ڈراپس ٹپکانے کے بعد صبیحہ نے وہ شیشی ایک طرف رکھ دی اور عاصم کو اپنی آغوش میں لیے بیٹھی رہی۔ رشید خاں پر اس نے بس ایک اچٹتی سی نظر ڈالی تھی۔

عاصم کی تڑپ میں ابھی بالکل کمی نہیں آئی تھی۔ کچھ کھاتے ہوئے تو اس کے معدے میں تکلیف ہوتی ہی تھی لیکن کبھی کبھی شدید اذیت کا دورہ بھی پڑ جاتا تھا۔ ایسے موقع کے لیے ڈاکٹر نے ڈراپس اور کچھ ٹیبلٹ دیے تھے۔ وہ ٹیبلٹ، ڈراپس کے تین منٹ بعد کھلائے جاتے تھے جن سے تکلیف میں بہ تدریج کمی ہوتی چلی جاتی تھی۔

ساجدہ پانی کا گلاس لے آئی۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''بس ایک منٹ اور میرے بھیا۔'' صبیحہ نے کہتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی۔

ڈراپس عاصم کے حلق میں ڈالے ابھی دو منٹ ہوئے تھے۔

صبیحہ نے دوسری شیشی سے چار ٹیبلٹ نکال لیے تھے اور تڑپتے ہوئے عاصم کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''اگلے مہینے تو میں کسی کا قرضہ نہیں لوٹاؤں گی۔'' ساجدہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''کوئی بڑا ڈاکٹر ہی میرے بچے کو ٹھیک کر سکتا ہے۔'' پھر اس نے رشید خاں کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ''سن لیا تم نے؟''

رشید خاں چپ چاپ کھڑا رہا لیکن اس کے ہونٹوں پر خفیف سی کپکپاہٹ صاف ظاہر کر رہی تھی کہ شدید جذباتی وہ بھی ہو رہا تھا۔ عاصم کی کراہیں اس کا جگر بھی کاٹ رہی تھیں۔

عاصم کے بری طرح تڑپنے کے باعث صبیحہ اسے ٹیبلٹس بڑی مشکل سے کھلا سکی۔

''بس اب آرام آجائے گا۔'' صبیحہ نے عاصم کا سر سہلایا۔

نمی اب صبیحہ کی آنکھوں میں بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے آنسو روکنے کی بے حد کوشش کر رہی تھی لیکن اس کا دل بے تحاشا رو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد عاصم کی کراہوں سے ''چیخ'' کی کیفیت ختم ہو گئی۔ سال بھر میں اس پر یہ دورہ چوتھی مرتبہ پڑا تھا۔ تیسرا دورہ پڑے ہوئے ڈھائی ماہ سے زیادہ گزر چکے تھے۔

عاصم کی تکلیف پوری طرح ختم ہونے میں پندرہ منٹ لگے۔ اب وہ بس لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ اتنی دیر تک شدید تکلیف کے باعث اس کے چہرے پر زردی پھیل گئی تھی۔

ساجدہ نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں خشک کیں اور عاصم کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''اب تو بالکل تکلیف نہیں ہے نا بیٹا۔''

''نہیں اماں، اب تو نہیں ہے۔'' عاصم نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''تم اب جاؤ اماں۔'' صبیحہ نے کہا۔ ''سو جاؤ، نہیں تو صبح وقت پر نہیں اٹھا جاسکے گا تم سے۔''

''تم بھی جاؤ ابا۔'' عاصم نے رشید خاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''باجی تو ہے نا میرے پاس۔''

رشید خاں نے آہستہ سے سر ہلایا اور دروازے کی طرف مڑ گیا۔ ساجدہ نے عاصم کو لپٹا کے پیار کیا اور صبیحہ سے بولی۔ ''تم بھی لیٹو اب۔''

''میں لیٹ جاؤں گی اماں..... فکر تو مجھے بھی ہے۔ صبح دفتر تو وقت پر جانا ہوگا۔''

ساجدہ گم صم سی اٹھی اور رشید خاں کے پیچھے کمرے سے چلی گئی۔

''اب بالکل ٹھیک ہے نا میرا بھیا؟'' صبیحہ نے پوچھا۔

''ہاں باجی، بس اب ڈر لگنے لگا ہے مجھے۔''

''ڈر؟..... ڈر کیسا؟''

''کہیں کسی دن میں.....''

صبیحہ کا دل بڑی زور سے اُچھلا۔ اسے خیال آ گیا تھا کہ عاصم کیا کہنا چاہتا تھا۔ اس نے جلدی سے عاصم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ایسی باتیں زبان پر نہیں لاتے بھیا۔'' وہ جلدی سے بولی۔

اس وقت صبیحہ کی طرف دیکھتے ہوئے عاصم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''یہ کیا۔'' صبیحہ نے جلدی سے اپنا دوپٹا عاصم کی آنکھوں پر رکھ دیا۔ ''مرد کبھی نہیں روتے بھیا۔''

عاصم کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔

''ابھی اماں نے کہا ہے نا۔'' صبیحہ پھر بولی۔ ''اگلے مہینے تمہیں کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھائیں گے۔''

''کیسے دکھاؤ گی باجی۔'' عاصم نے افسردگی سے کہا۔

''میری تنخواہ ملے گی نا۔''

''تنخواہ تو کل بھی ملی تھی۔''

''اماں سے غلطی ہوگئی۔ لوگوں کو دے دلا دیے۔''

''وہ تو دینا ہی پڑیں گے نا باجی، قرضہ ہی اتنا چڑھ گیا ہے۔'' بارہ سال کی عمر میں بھی عاصم بہت ذہین تھا، بہت دور تک سوچتا تھا۔

''آج جمن خالو سے تو اماں کا خاصا جھگڑا ہو گیا تھا۔'' وہ پھر بولا۔ ''اماں ان سے کہہ رہی تھیں کہ وہ اپنے ایک ہزار ابھی لے لیں اور باقی پندرہ سو اگلے مہینے لے لیں مگر وہ مانے ہی نہیں۔ اماں کو ڈھائی ہزار ہی دینے پڑے۔''

صبیحہ کو عاصم سے معلوم ہوا کہ اس دن کتنے قرض خواہوں نے گھر پر گویا دھاوا بولا تھا اور ساجدہ کو کس کس سے کیا کیا کہنا اور کیا کیا دینا پڑا تھا۔

عزیزوں کے اس روپے کی کہانی سن کر صبیحہ کے رگ و پے میں کڑواہٹ پھیل گئی۔ وہ جب دفتر سے لوٹی تھی اور اسے معلوم ہوا تھا کہ دس ہزار روپے لوگوں کو دے دلا دیے گئے تھے تو اسے بہت غصہ آیا تھا لیکن اب اسے اپنی ماں کی بے بسی کا احساس ہوا۔

ساجدہ نے عاصم کی تکلیف اور اس کی تڑپ دیکھ کر کہہ تو دیا تھا کہ وہ اگلے مہینے کسی کا قرض ادا نہیں کرے گی لیکن صبیحہ نے عاصم سے سب کچھ سننے کے بعد محسوس کیا کہ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ قرض خواہوں سے ڈٹ کر لڑا جاتا جو مناسب بھی نہیں تھا اور ساجدہ کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

احمر سلطانہ نے ارسلان شاہ سے جو باتیں کی تھیں، ان میں ''فیروزہ'' کا حوالہ بالکل جھوٹ تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ احمر سلطانہ خود ہی زریاب کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔

زریاب، ارسلان شاہ کا بچپن کا دوست تھا۔ مصوری اس کی گھٹی میں پڑی تھی لیکن یہ کام وہ پیسے کے لیے نہیں کرتا تھا۔ مرحوم باپ سے ورثے میں اسے ایک اچھی کثیر رقم مل گئی تھی کہ اسے کوئی ذریعہ معاش تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ باپ کے بعد چھوٹی بہن کے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ لاابالی زریاب کے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کا خیال وہی رکھتی تھی۔ زریاب کی شادی کے بعد یہ فرض اس کی بیوی نے سنبھالا تھا۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی۔ زریاب کی بہن نے بی اے کر لیا تو وہ اس کی شادی کی تیاریوں میں دل و جان سے لگ گئی لیکن شادی سے چند دن پہلے زریاب کی بہن ایک حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے چل بسی۔ زریاب کے لیے وہ تو ایک بڑا صدمہ تھا ہی لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ جھٹکا بھی لگا کہ اس کی بیوی کو کینسر ہو گیا۔ زریاب نے اپنے لاابالی

طرز زندگی کے باوجود اس کے علاج معالجے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن چند سال بعد وہ بھی دنیا سے چل بسی۔

زریاب لاابالی تو تھا ہی، ان صدموں کے بعد وہ اپنی طرف سے بہت ہی بے پروا ہوگیا۔ مصوری میں وہ پہلے سے زیادہ غرق رہنے لگا۔ اپنے کھانے پینے کا خیال اسے پہلے بھی نہیں رہتا تھا، اس لیے بہن اور بیوی کے بعد اس کی یہ عادت اس کی صحت پر اثر انداز ہونے لگی۔ ایک مرتبہ وہ بیمار پڑا تو اسے زبردستی ایک اسپتال میں داخل کرانے والا ارسلان شاہ ہی تھا۔

اسپتال میں اس کی دیکھ بھال ہوئی تو وہ تندرست ہو گیا۔ اسے کوئی خاص بیماری تو تھی نہیں، بس بڑھتی ہوئی کمزوری کے باعث ہی وہ ڈھیر ہوگیا تھا۔ اسپتال سے اپنے گھر جانے کے بعد وہ پھر اپنا یہی حال کرتا جس کا ارسلان شاہ کو پوری طرح اندازہ تھا۔ اسی لیے وہ زریاب کو زبردستی اپنے گھر لے آیا۔ اس نے ملازمین کے علاوہ اپنی بیوی کو بھی تاکید کی کہ وہ زریاب کا خیال رکھا کرے۔

شوہر کی تاکید سے قطع نظر احمر سلطانہ نے خود ہی زریاب کا ہر طرح خیال رکھا۔ اس کی مصوری وہ ہمیشہ ہی سے پسند کرتی تھی۔

زریاب کی خواہش تھی کہ وہ تصویر کشی کا سارا ساز و سامان بھی اپنی خواب گاہ میں ہی رکھنا چاہتا ہے لہٰذا اس کے لیے بنگلے کا ایک ایسا کمرا وقف کیا گیا جو خاصا کشادہ تھا۔ لاابالی زریاب نے خود کو اسی کمرے تک محدود کرلیا۔ اپنا کھانا وغیرہ بھی وہ وہیں منگوالیتا تھا۔ ارسلان شاہ کے اصرار پر وہ کبھی کبھی ان میاں بیوی کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے لان میں آبیٹھتا تھا یا ڈائننگ روم میں آکر ان کے ساتھ کھانا کھالیتا تھا۔

احمر سلطانہ کو جب فرصت ہوتی تھی تو وہ زریاب کے کمرے میں جا کے ایک کرسی گھسیٹ کر اس طرح بیٹھ جاتی تھی کہ زریاب کو کینوس پر رنگوں سے کھیلتے ہوئے دیکھ سکے۔ اس طرح کبھی کبھی دو ڈھائی گھنٹے بھی گزر جاتے تھے۔ زریاب اس سے بے خبر اپنی دھن میں رہتا تھا لیکن پھر شاید دھیرے دھیرے یا اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ اس طرح ایک غیر اخلاقی حرکت کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس احساس کے بعد وہ کبھی کبھی جھجکن کا بہانہ کر کے احمر سلطانہ کے ساتھ بیٹھ جاتا۔ ابتدا میں ان کی گفتگو صرف فن مصوری پر ہوتی تھی لیکن یہ فن انسانی جذبات سے گہرا تعلق رکھتا ہے اس لیے ان کی گفتگو کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ احمر سلطانہ کیونکہ پڑھی لکھی اور نہایت ذہین تھی اس لیے ان کی گفتگو میں بعض اوقات بڑے نازک مسائل بھی چھڑ جاتے تھے جس کے نتیجے میں وہ ایک دوسرے سے کچھ بے تکلف ہوتے چلے گئے اور پھر شاید ان دونوں ہی کو پتا نہیں چل سکا کہ وہ کب ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوگئے تھے۔

اس کے بعد زریاب پر کیا گزری، احمر سلطانہ کو اس کا علم نہیں ہو سکا لیکن خود اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی کہ یہ کیا ہوگیا۔ وہ ارسلان شاہ سے محبت بھی کرتی تھی اور اس سے بے وفائی کا تصور بھی اس کے لیے محال تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی محسوس کرنے لگی تھی کہ اب زریاب سے دور ہو جانا بھی اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ ہمہ وقت اس مسئلے پر سوچنے لگی۔ جب اس سوچ بچار کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو اس نے یہ مسئلہ اپنی ایک دوست کی آڑ لے کر ارسلان شاہ کے سامنے رکھ دیا۔

مسئلہ اتنا پیچیدہ تھا کہ ارسلان شاہ بھی اس کی رہنمائی نہیں کر سکا۔ لے دے کر ارسلان شاہ کی ایک ہی بات اس کے ذہن میں گونجتی رہ گئی کہ خود کو حالات کے دھارے پر بہتا ہوا چھوڑ دے اور قدرت کے فیصلے کا انتظار کرے لیکن اسے یہ احساس بہرحال رہا کہ قدرت کا فیصلہ جو بھی ہو، وہ اس کے لیے کسی بھی پہلو سے خوشگوار نہیں ہوگا۔

دوسرے دن جب ارسلان شاہ دفتر چلا گیا تو احمر سلطانہ نے بوتل نکال کر ایک پیگ بنایا اور وقفے وقفے سے گھونٹ لیتی ہوئی کمرے میں ٹہلنے لگی۔ ارسلان شاہ کے سامنے خود کو نارمل رکھنے کے لیے اسے شدید جدوجہد کرنا پڑتی تھی اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی رہتی تھی لیکن تنہائی ملتے ہی اس کی بے چینی عود کر آتی تھی۔ اس کا تعلق نہایت پاڑن گھرانے سے تھا جہاں شراب نوشی بری نہیں سمجھی جاتی تھی اور ارسلان شاہ بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتا تھا اس لیے احمر سلطانہ پارٹیوں میں شرکت کے علاوہ گھر میں بھی کسی وقت ایک آدھ ڈرنک لے لیا کرتی تھی لیکن کچھ عرصے سے اس نے کچھ زیادہ پینا شروع کردیا تھا۔ ارسلان شاہ کے سامنے خود کو نارمل رکھنے کی کوشش میں وہ اعصابی طور پر اتنا تھک جاتی تھی کہ اس کے بعد شراب کا سہارا لینا اس کے لیے ضروری ہو جاتا تھا۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ اگر اس نے یہ سہارا نہ لیا تو اس کے اعصاب تڑخ جائیں گے یا وہ کسی دماغی خلل کا شکار ہو جائے گی۔

پیگ اس نے پندرہ منٹ میں ختم کرلیا۔ خواہش تو دوسرے پیگ کی بھی تھی لیکن اس نے خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔ وہ اتنی ذہین تھی کہ شراب کے معاملات کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ ان حالات میں دوسرے پیگ کے بعد تیسرے پیگ کی خواہش بھی ہوگی اور

کوشش کے باوجود صبیحہ سے گریزاں نہیں رہ سکا۔ جب صبیحہ کو دفتر سے پہلی تنخواہ ملی تو ارسلان شاہ نے اسے ایک خوب صورت گل دستہ دیا۔ اپنے تئیں وہ اس کی محبت کا تحفہ تھا لیکن صبیحہ سے اس نے بس اتنا کہا تھا کہ یہ تحفہ وہ اسے اس کی پہلی تنخواہ کی خوشی میں دے رہا ہے۔

انہی حالات میں جب اس کی بیوی نے اسے اپنی ایک شادی شدہ دوست کی محبت کے بارے میں بتایا تو اس جذبے کے بارے میں ارسلان شاہ کے خیالات کو دوسری سنیدل گئی۔ اسے یہ شبہ بالکل نہیں ہوا تھا کہ ''فیروزہ'' کا نام لے کر اس آڑ میں احمر سلطانہ نے اسے اپنی محبت کی کہانی سنائی تھی۔

یہ ایک طرفہ تماشا تھا کہ دونوں میاں بیوی کسی نے کسی کی محبت میں گرفتار ہو چکے تھے لیکن ایک دوسرے کو بھی بہت چاہتے تھے، ایک دوسرے سے الگ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ان دونوں کی محبتوں میں ایک فرق یہ تھا کہ احمر سلطانہ اور زریاب ایک دوسرے کے جذبات سے واقف ہو چکے تھے جبکہ ارسلان شاہ کو اب تک ہمت نہیں ہو سکی تھی کہ صبیحہ کو اپنی محبت سے آگاہ کر دیتا۔ اب تک وہ سوچتا ہی رہا تھا کہ صبیحہ کو اپنے جذبات سے کس طرح آگاہ کرے لیکن آج تو وہ ڈر گیا تھا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو صبیحہ بری طرح بھڑک جائے گی۔ شاید وہ دفتر آنا بھی چھوڑ دیتی جو ارسلان شاہ کے لیے اذیت ناک ہو جاتا۔

ارسلان شاہ کو یہ خوف اس لیے ہوا تھا کہ جب وہ بے اختیار ہی صبیحہ کو اس کے ادھورے نام سے مخاطب کر بیٹھا تھا تو صبیحہ نہ صرف چونکی تھی بلکہ چند لمحے تک اس کے چہرے کا رنگ بھی بدلتا رہا تھا۔

اس کے بعد ارسلان شاہ نے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ سب کچھ اس کا وہم تھا۔ اپنے اس خیال کی تصدیق یا تردید کے لیے اس نے صبیحہ کو ایک بار پھر اس کے ادھورے نام سے مخاطب کیا تھا اور اس کے اس خیال کی تردید ہو گئی تھی کہ اسے وہم ہوا تھا۔ دوسری بار بھی صبیحہ کے چہرے کے تاثرات میں تبدیلی آئی تھی۔

ارسلان شاہ کا دل بجھ گیا تھا لیکن پھر اس نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی تھی کہ محبت کرنے کا مطلب سودا گری تو نہیں ہوتا کہ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے۔ صبیحہ اگر اس کے جذبات کی پذیرائی نہیں کرے گی تو وہ اپنے دل سے اس کی محبت نکال تو نہیں دے گا، بلکہ جب دل میں کسی کی محبت پنپ جائے تو اسے دل سے نکال دینا ممکن ہی نہیں ہوتا۔

کچھ دیر تک اپنے انہی خیالات میں منہمک رہنے کے بعد وہ ایک لمبی سانس لے کر آگے جھکا اور ٹیلے فون کا ریسیور اٹھا کر آغا خان اسپتال کا نمبر ملانے لگا۔

پھر پانچ منٹ بعد اس نے انٹر کام پر صبیحہ سے کہا کہ وہ اس کے کمرے میں آئے۔

صبیحہ کاپی پینسل سنبھالے اس کے کمرے میں آئی۔ اس کی دانست میں اس کی طلبی کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ ارسلان شاہ کو پھر کوئی ڈکٹیشن دینا ہوگا۔

''نہیں۔'' ارسلان شاہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تم غلط بھی ہو صبیحہ!'' اس نے خیال رکھا تھا کہ وہ صبیحہ کا ادھورا نام نہ لے۔ ''میں نے تمہیں ڈکٹیشن دینے کے لیے نہیں بلایا ہے۔''

''صبیحہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''دراصل۔'' ارسلان شاہ پھر بولا۔ ''میں نے ابھی آغا خان فون کیا تھا۔ تھوڑے بہت تعلقات ہیں میرے اس ڈاکٹر سے جس کا نام میں نے تمہیں بتایا تھا۔ اس سے میں نے تمہارے بھائی کے لیے کل کا ٹائم لے لیا ہے۔ کل تم دفتر لنچ کے بعد آجانا۔ صبح نو بجے اپنے بھائی کو دکھانے اسپتال لے جانا۔ تم سے فیس نہیں لی جائے گی۔ اس کا بل دفتر کے نام پر بنایا جائے گا اور یہاں بھیج دیا جائے گا۔''

صبیحہ نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہیں سکی۔ اب پھر انکار کرنے میں اسے بے بسی کا احساس ہوا تھا۔

''بس اب جاؤ۔'' ارسلان شاہ نے کہا۔ ''یہی بتانا تھا تمہیں۔''

صبیحہ مڑ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے جانے لگی۔ ارسلان شاہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے بے حد مسرت حاصل ہوئی اگر اس کی وجہ سے صبیحہ کے بھائی کی طبیعت ٹھیک ہو جاتی اور اس لڑکی کے ذہن سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ جاتا جس سے وہ محبت کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

زریاب کے کمرے کے دروازے سے لوٹتے وقت احمر سلطانہ کو اپنے آپ سے ایسی جنگ لڑنا پڑی تھی کہ وہ نڈھال ہو گئی تھی۔ جب وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو اس نے محسوس کیا کہ پیے ہوئے پیگ کے اثرات اس کے دماغ سے زائل ہو چکے تھے۔ اس نے بڑی وحشت میں ایک پیگ اور بنایا اور آدھا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر گئی پھر وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتی ہوئی کمرے میں ٹہلتی اور سوچتی رہی کہ حالات کا یہ دھارا اسے بہا کر کہاں تک لے جا سکتا ہے؟

کہاں تک لے جا کر رہے گا یہ اسے؟

پندرہ منٹ میں اس نے باقی آدھا گلاس بھی ختم کر لیا اور سوچنے لگی کہ حالات کے دھارے پر بہنا جب اس کا مقدر بن چکا ہے تو وہ خود کو اذیت کیوں دے رہی ہے؟

وہ کمرے سے نکلی اور پھر زریاب کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو کینوس کے سامنے مصروف زریاب نے سر موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''آیئے احمر!..... آج آپ نے تھوڑی سی دیر نہیں کر دی؟''

''ہاں وہ..... بس یوں ہی ..... ایک کام میں الجھ گئی تھی۔''

''ہوں۔'' زریاب رنگوں کی پلیٹ کی طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے سوچ رہا ہو کہ اب کس رنگ کا انتخاب کرے۔

احمر سلطانہ اس کے عقب میں اس کے قریب جا کھڑی ہوئی اور کینوس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''اس پر آپ دو دن سے کام کر رہے ہیں۔''

''جی ہاں، اور ابھی دو دن اور لگ سکتے ہیں۔ بعض پینٹنگز کبھی کبھی بہت الجھا دیتی ہیں۔ آپ بیٹھیے نا!''

احمر سلطانہ قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

زریاب کچھ توقف سے بولا۔ ''پینٹنگز میں زندگی کے رنگ اُجاگر کرنے کے لیے رنگوں کا انتخاب مجھے ہمیشہ اُلجھاتا ہے۔ غالباً میں اب تک ایک اچھا پینٹر نہیں بن سکا ہوں۔''

''ایسا نہیں ہے زریاب!'' احمر سلطانہ نے جواب دیا۔ ''کبھی کبھی زندگی کے رنگ اتنے ہی مبہم نظر آتے ہیں کہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے اور سوچنا پڑتا ہے کہ سب کچھ وہی ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں یا کچھ اور ہے!''

زریاب نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا اور وہ مسکرا دی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ دوسرا پیگ پینے سے پہلے اس کا یہ خیال غلط تھا کہ پہلے پیگ کا اثر زائل ہو چکا ہے۔ وہ اس وقت خود کو اس قابل پا رہی تھی کہ زریاب سے کچھ زیادہ بے باک انداز میں گفتگو کر سکے۔

زریاب پھر پینٹنگ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا لیکن اس کا وہ ہاتھ حرکت میں نہیں آیا جس میں برش تھا۔ احمر سلطانہ نے محسوس کر لیا کہ زریاب کی نگاہیں تو پینٹنگ پر تھیں لیکن ذہن کہیں اور تھا۔

چند لمحوں کے توقف سے احمر سلطانہ بولی۔ ''آپ کچھ سوچنے لگے زریاب!''

''ہوں۔'' زریاب نے ایک طویل سانس لی پھر برش اور رنگوں کی پلیٹ ایک طرف رکھ کر آہستگی سے چلتا ہوا احمر سلطانہ کے قریب آیا اور دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''ایک بات کہوں آپ سے؟''

''ضرور کہیے!'' احمر سلطانہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ اس وقت ہم ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ ڈالیں۔''

زریاب نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا آج آپ نے ایک پیگ سے زیادہ پی لی ہے؟''

وہ احمر سلطانہ کے ایک پیگ کی عادت سے تو واقف تھا۔

''ہاں!'' احمر سلطانہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''بس غلطی ہو گئی..... لیکن شاید اچھا ہی ہوا۔ اس وقت مجھ میں اتنی ہمت آ گئی ہے کہ سارس کی طرح ریت میں سر نہ چھپاؤں۔''

''شاید آپ تھک گئی ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''کچھ دن سے آپ مجھ سے گریزاں رہنے کی کوشش کر رہی ہیں جس میں آپ کو ناکامی ہوئی ہے اور ایسی صورت میں اعصاب پر اتنا دباؤ پڑتا ہے کہ انسان خود کو تھکا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے۔''

''یہ آپ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ایک دن میں گھنٹا بھر تک نہیں آئی تھی تو آپ نے ایک ملازم کے ذریعے مجھے بلوایا تھا۔''

''اور میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں آنے ہی والی تھی۔''

''ہاں۔'' زریاب نے کہا ''اور کچھ دیر پہلے آپ نے یہ کوشش پھر کی تھی۔''

احمر سلطانہ نے کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

زریاب کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ ''آپ دروازے تک آ کر لوٹ گئی تھیں۔ میں نے آپ کے قدموں کی آہٹ سن لی تھی۔''

''میں تو بہت دبے قدموں آئی تھی۔''

''جب کان شدت سے کوئی آواز سننے کے مشتاق ہوں تو انہیں وہ آواز سنائی دے ہی جاتی ہے، خواہ وہ کتنی ہی مدھم ہو۔''

''اوہ!'' احمر سلطانہ کے منہ سے نکلا اور پھر اس نے بھرائی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ''یہ شدت ہی تو میرا خوف بڑھاتی چلی جا رہی ہے زریاب۔''

''کچھ کم خوف زدہ میں بھی نہیں ہوں۔'' زریاب نے سنجیدگی سے کہا پھر بولا۔ ''غالباً میں ایک بہت گھٹیا انسان ہوں۔''

''یہ خیال کیوں آیا آپ کو؟''

''اگر کوئی اپنے دوست ہی کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دینا چاہے تو اسے کیا کہیں گے؟''

''خنجر گھونپنے کی خواہش اور خنجر گھونپنے کا عمل دو مختلف باتیں ہیں اور مجھے یقین ہے کہ عمل آپ سے نہیں ہوگا۔''

''مگر اذیت تو مجھے پہنچے ڈال رہی ہے احمر!'' زریاب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ''کئی بار تو میں نے سوچا کہ یہاں سے کہیں دور بھاگ جاؤں لیکن ایسا کر نہیں سکا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں نے ایسا کیا تو میری سانسیں میرا ساتھ چھوڑ دیں گی۔''

''کچھ ایسا ہی میں بھی محسوس کرتی ہوں زریاب۔'' اور یہ جو آپ نے گھٹیا انسان والی بات کہی ہے، یہ میرے ذہن میں اپنے لیے بھی تھی لیکن کل مجھے اطمینان سا مل گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''کل میں نے ارسلان سے اس بارے میں بات کی تھی۔''

''کیا!'' زریاب اچھل پڑا۔

''پریشان نہ ہوں۔'' احمر سلطانہ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''بات میں نے دوسرے انداز میں کی تھی۔''

زریاب کے چہرے پر اب بھی پریشانی کے تاثرات قائم رہے اور وہ سوالیہ نظروں سے احمر سلطانہ کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کے چہرے سے پریشانی اسی وقت ختم ہوئی جب احمر سلطانہ نے ارسلان سے اپنی گفتگو دہرانا شروع کی اور احمر سلطانہ کی فرضی دوست فیروزہ کا حوالہ آ گیا۔

''شکر ہے۔'' زریاب نے سب کچھ سننے کے بعد ایک طویل سانس لی۔ ''آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔''

''ڈرانے والا خیال آپ کے ذہن میں آیا ہی کیوں زریاب؟ کیا مجھے اتنی ہمت ہو سکتی ہے کہ آپ کے اور اپنے بارے میں ارسلان سے کھل کر بات کر سکوں؟''

''بس خیال ہی تو ہے۔'' زریاب نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''کبھی کبھی اچانک ذہن میں آنے والے خیال کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔''

احمر سلطانہ کچھ سوچنے لگی۔ زریاب کی بات پر اس کے ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔ وہ زریاب کی طرف دیکھے بغیر دھیمی آواز میں بولی۔ ''کبھی کبھی زندگی میں اچانک آنے والی تبدیلی کا بھی کوئی جواز نہیں ہوتا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں احمر!'' زریاب نے کہا۔ ''اور جواز نہ ہونے ہی کی وجہ سے اذیت کا احساس ہوتا ہے۔ انسان خود کو غلطی پر سمجھتا ہے۔''

''لیکن ارسلان نے جو کچھ کہا، اس کی روشنی میں ہم غلطی پر نہیں ہیں۔ جذباتی سطح پر ہماری زندگی میں جو تبدیلی آئی ہے، وہ ایک فطری امر ہے۔''

''لیکن وہ فطری امر جو کسی خوشگوار انجام سے دور محسوس ہو، اذیت ناک تو ہوتا ہے۔''

''انجام ناخوشگوار سہی لیکن وہ کیا ہوگا۔ کبھی آپ نے سوچا تو ہوگا۔''

''اکثر سوچا ہے اور سوچتے سوچتے شدید گھبراہٹ ہوئی ہے۔''

''میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو گھبراہٹ ہونے ہی لگتی ہے۔ شاید اب اس بارے میں سوچا ہی نہ جائے تو اچھا ہے۔''

''یعنی بہ قول ارسلان، ہم خود کو حالات کے دھارے پر بہنے دیں۔''

''ہاں۔''

''لیکن اس بارے میں سوچا ہی نہ جائے، یہ بس کہنا آسان ہے۔ اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔''

احمر سلطانہ نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔ اچانک وہ بہت اُداس نظر آنے لگی تھی۔

☆☆☆

اسی دن رات کو رشید خاں نے متفکر انداز میں ساجدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مہینے بھر کے خرچ کے لیے جو روپے بچائے ہیں، کیا وہ تم صبیحہ کو دے رہی ہو؟''

''نہیں۔''

''پھر وہ کل عاصم کو اسپتال کیسے لے جائے گی؟.....اور پھر وہ بھی آغا خان..... وہ ڈاکٹر کی فیس کیسے دے گی۔''

''فیس صبیحہ کا دفتر ادا کرے گا۔'' ساجدہ نے شوہر سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''وہ صبیحہ کے لیے دفتر کی طرف سے ایڈوانس ہوگا جو بعد میں اس کی تنخواہ سے کٹا رہے گا۔''

رشید خاں کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے۔ ''ابھی صبیحہ کو ملازمت ملے صرف ایک مہینا گزرا ہے اتنی جلدی اسے ایڈوانس؟'' رشید خاں نے حیرت کے عالم میں اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

ساجدہ خاموش رہی۔

رشید خاں کچھ توقف سے بولا۔ ''ایڈوانس کی یہ منظوری..... ظاہر ہے کہ اسے اپنے پاس سے ہی ملی ہوگی۔''

ساجدہ سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ اب بھی رشید خاں سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔ غالباً وہ سمجھ گئی ہوگی کہ رشید خاں اس وقت بھی اسی انداز میں سوچ رہا ہوگا جس انداز میں اس نے صبیحہ کو گل دستہ ملنے پر سوچا تھا۔

رشید خاں مضطربانہ انداز میں بستر سے اٹھا اور اپنی بیساکھیاں سنبھال کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کمرے میں بیساکھی کی ''کھٹ کھٹ'' صبیحہ کو اپنے اعصاب پر دھماکوں کی طرح محسوس ہونے لگی۔ وہ دروازے سے کان لگائے اپنے ماں باپ کی گفتگو سن رہی تھی۔ عاصم کو آغا خان لے جانے کے بارے میں اس نے صرف اپنی ماں کو بتایا تھا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ رات کو ساجدہ یہ بات اپنے شوہر کو بتائی۔ اسی لیے صبیحہ نے اس وقت دروازے سے کان لگا رکھے تھے۔ وہ اپنے باپ کا ردعمل جاننا چاہتی تھی۔

''ساجدہ!'' رشید خاں بکھری ہوئی سی آواز میں بولا۔ ''کیا میں اب بھی وہ بات نہ سوچوں جو میں نے صبیحہ کو گل دستہ ملنے پر سوچی تھی؟''

''کون سی بات؟''

''صبیحہ سے یہ ملازمت چھڑا دی جائے۔''

''پھر عاصم کا کیا ہوگا؟'' ساجدہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''کل رات وہ کیسا تڑپا تھا، دیکھا نہیں تھا تم نے۔''

''تڑپ تڑپ کے مر جائے گا وہ..... اس سے زیادہ اور کیا ہوگا۔ ہمارے گھر سے جنازہ اٹھ جائے گا اس کا، ہماری عزت کا جنازہ تو نہیں اٹھے گا۔''

''خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔'' ساجدہ رونے لگی۔

''پھر کیسی باتیں کروں ساجدہ؟'' رشید خاں کی آواز میں کرب تھا۔ ''کیا عاصم صرف تمہارا بیٹا ہے؟ میرا دل نہیں تڑپتا اس کے لیے؟''

''تو پھر صبیحہ کی ملازمت چھڑانے کے بارے میں نہ سوچو۔ پانی ابھی سر سے اونچا تو نہیں ہوا ہے۔''

''سر سے اونچا ہو جانے کے بعد سوچنے سے کیا فائدہ ہو گا۔''

''پانی سر سے اونچا ہونے والا ہو تو اس کے آثار کچھ پہلے سے دکھائی دے جاتے ہیں۔ جس طرح تم سوچ رہے ہو، اسی انداز میں صبیحہ سے بات کر چکی ہوں میں۔ وہ خود کہہ رہی تھی کہ اگر اسے ایسی کسی بات کا شبہ ہوا تو وہ خود ہی یہ ملازمت چھوڑ دے گی۔''

بیساکھی کی ''کھٹ کھٹ'' بند ہو گئی۔ رشید خاں بستر پر بیٹھ گیا تھا۔

''اسے کیسے شبہ ہو جائے گا ساجدہ؟'' رشید خاں کا لہجہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ''دنیا نہیں دیکھی ہے ابھی اس نے..... یہ پیسے والے لوگ بڑے عیار ہوتے ہیں۔ یہ کب کیا کر گزریں، پتا بھی نہیں چلتا، اور اس وقت پتا چلتا ہے جب پتا چلنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔''

''تم کچھ بھی کہو، مجھے تو بھروسا ہے صبیحہ پر۔''

رشید خاں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''یہ تم نہیں، تمہاری ممتا بول رہی ہے۔ عاصم کی حالت تم سے دیکھی نہیں جاتی۔ اس کی خاطر تم یہ خطرہ مول لینے کے لیے بھی تیار ہو گئی ہو کہ.....'' رشید خاں نے نہ جانے کیا سوچ کر پھر ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ بات ادھوری چھوڑ دی۔

ساجدہ خاموش رہی۔ شاید اسے اپنے شوہر سے اتفاق تھا کہ وہ ایک خطرہ مول لے رہی ہے۔

''ہم جیسے لوگوں کی اولاد تو ہونا ہی نہیں چاہیے۔'' رشید خاں شکستہ سے لہجے میں بولا۔ ''خاص طور سے لڑکی اگر پیدا بھی ہو تو پیدا ہوتے ہی مر جائے۔''

صبیحہ کا دل بھر آیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ دروازے سے ہٹ کر اپنے بستر کی طرف بڑھ گئی۔

عاصم اس رات جلدی ہی سو گیا تھا اور سونے سے پہلے وہ اس بات سے بے حد خوش ہوا تھا کہ دوسرے دن صبیحہ اسے شہر کے ایک بہت بڑے اسپتال لے جائے گی۔

صبیحہ بستر پر پڑی روتی رہی اور کچھ خیالات بھی اس کے ذہن میں چکراتے رہے۔ اپنے باپ کا یہ شبہ بھی ایک سوال بن کر اس کے دماغ میں ڈنک مارتا رہا کہ ارسلان شاہ کی اس مہربانی کے پس منظر میں کوئی گھناؤنا مقصد تو نہیں ہے؟

صبیحہ کے ذہن میں یہ بات بھی کھٹک رہی تھی کہ ارسلان شاہ نے اس دن اسے دو مرتبہ صرف ''صبیح'' کہہ کر مخاطب کیا تھا اور یہ انداز تخاطب بے تکلفی کی طرف بڑھنے کے لیے پہلا قدم ہو سکتا تھا۔ صبیحہ کو یہ بات اسی وقت کھٹک گئی تھی اور اس کی سوچ کے مطابق ارسلان شاہ نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کا اندازہ بھی لگا لیا تھا۔ اسی لیے جب اس نے دوسری مرتبہ صبیحہ کو اپنے کمرے میں بلایا تھا تو اس کا پورا نام لیا تھا۔

لیکن بعد میں صبیحہ نے یہ بھی سوچا تھا کہ یہ سب کچھ اس کی غلط فہمی بھی ہو سکتی تھی۔ یہ اتفاق بھی ہو سکتا تھا کہ ارسلان شاہ نے اسے اس کے ادھورے نام سے مخاطب کیا تھا۔ صبیحہ کو

یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ دفتر کے اور لوگ بھی ایڈوانس لیتے رہتے تھے اور ان سب کا خیال تھا کہ ارسلان شاہ بہت اچھا انسان ہے جو اپنے دفتر کے لوگوں کا بے حد خیال رکھتا ہے۔

ان خیالات میں اُلجھے اُلجھے کسی وقت صبیحہ کو نیند آ گئی۔

☆☆☆

دوسرے دن صبیحہ اپنے بھائی کو لے کر ٹھیک نو بجے اسپتال پہنچ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں ایک آدھ گھنٹا لگے گا اور پھر وہ عاصم کو گھر پہنچا کے اپنے دفتر چلی جائے گی لیکن وہاں تین گھنٹے لگ گئے۔ عاصم کے نہ جانے کیا کیا ٹیسٹ ہوتے رہے تھے۔

آخر تین گھنٹے بعد صبیحہ کو ڈاکٹر سے بہ تفصیل بات کرنے کا موقع ملا۔

''معاملہ خاصا پیچیدہ ہے۔'' ڈاکٹر نے اس سے کہا۔ ''آپ کے بھائی کو ہم نے اسپتال میں داخل کر لیا ہے۔''

''داخل!'' صبیحہ چونکی۔

''جی ہاں، یہ بے حد ضروری ہے اگر اس حالت میں وہ اپنے گھر پر رہا تو کسی وقت بھی اس کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔''

''تو..... تو.....'' صبیحہ نے پہلو بدلا۔ ''اسے کتنے دن تک اسپتال میں رہنا پڑے گا؟''

''اس بارے میں یقین سے ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ایک مہینا تو ضرور لگے گا۔''

''اور اس پر کتنے پیسے خرچ ہو جائیں گے؟''

ڈاکٹر نے غور سے اس کی طرف دیکھا پھر بولا۔ ''آپ کو اس سلسلے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بل تو آپ کے دفتر جائے گا۔''

''پھر بھی..... مجھے معلوم تو ہو۔''

''ارسلان صاحب نے کہا ہے کہ آپ کو اس بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔''

''باس نے کہا ہے؟'' صبیحہ پھر چونکی۔

''جی ہاں، اس دوران میں دو مرتبہ ان کا فون آ چکا ہے۔ وہ عاصم کے بارے میں پوچھتے رہے تھے۔ وہ اس کے لیے خاصے فکرمند ہیں پھر ابھی چند منٹ پہلے میں نے بھی انہیں فون کیا تھا اور انہیں بتایا تھا کہ عاصم کو اسپتال میں داخل کرنا بے حد ضروری ہے۔ ان کی اجازت ملنے کے بعد ہی ہم نے عاصم کو اسپتال میں داخل کیا ہے۔''

صبیحہ خاصی پریشان ہو گئی۔ اس نے کبھی اتنے بڑے اسپتال میں علاج نہیں کروایا تھا لیکن اس نے لوگوں سے جو کچھ سنا تھا، اس کے مطابق وہاں کا ایک ماہ کا بل صبیحہ کے لیے ایک بہت کثیر رقم ہوتی۔ اس کا اندازہ تھا کہ اگر وہ اپنی تنخواہ میں سے ہر ماہ پانچ ہزار روپے بھی ایڈجسٹ کروائے گی تو اس میں کئی سال لگ جائیں گے۔

''آپ جا کے اپنے بھائی سے مل لیجیے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ارسلان صاحب کی ہدایت کے مطابق اسے جو کمرا دیا گیا ہے وہاں آپ یا آپ کا کوئی ایک عزیز بھی ہر وقت رہ سکتا ہے۔''

ڈاکٹر نے کمرا نمبر بھی بتایا۔

صبیحہ کے لیے اس وقت کوئی فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا۔ اسے یہ اختیار تو بہرحال تھا کہ وہ عاصم کو اسی وقت وہاں سے لے جاتی۔ کیونکہ عاصم کو داخل کیا جا چکا تھا اس لیے اسپتال کا صرف ایک دن کا بل اس کے دفتر جاتا جو وہ کسی طرح ایڈجسٹ کروا ہی دیتی لیکن ڈاکٹر کی اس بات نے اسے بری طرح ڈرا دیا تھا کہ عاصم اگر اس حالت میں گھر پر رہا تو کسی وقت بھی اس کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

ڈاکٹر کے کمرے سے نکل کر وہ انہی خیالات میں ڈوبی، عاصم کے کمرے کی طرف جانے لگی۔

جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی، اسے دیکھ کر بستر پر لیٹا ہوا عاصم جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

''یہ تو بڑا ٹھنڈا کمرا ہے باجی۔'' وہ بولا۔

یہ ضرور اسپتال کے خاص کمروں میں سے ہے۔ صبیحہ نے سوچا اور ساتھ ہی اسے بے تحاشا اخراجات کا خیال بھی آیا۔

''یہاں ٹیلی فون بھی ہے باجی۔'' عاصم کسی چھ سات سالہ بچے کی طرح خوش نظر آ رہا تھا۔

صبیحہ نے بستر پر بیٹھ کر محبت سے اس کا گال تھپتھپایا۔

''میں یہاں ضرور ٹھیک ہو جاؤں گا باجی۔'' عاصم بولتا رہا۔ ''ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ اب وہ میرے پیٹ میں اتنے زور کا درد نہیں ہونے دیں گے اور کھانے کے لیے بھی مجھے نہ جانے کیا دیں گے کہ مجھے متلی نہیں ہو گی۔ میں بس ایک مہینے میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

عاصم کی خوشی دیکھ کر صبیحہ یہ فیصلہ نہیں کر سکی کہ اسے اسی وقت اسپتال سے لے جائے۔ اس کی خوشی دیکھ کر اس کا دل بھی بھر رہا تھا۔ اس وقت وہ یہ بھی سوچنے لگی کہ عاصم کے صحت مند ہو جانے کی خاطر کیا وہ کوئی بھی قربانی دے سکے گی؟

☆☆☆

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' دوسرے دن دفتر میں ارسلان شاہ، صبیحہ سے کہہ رہا تھا۔ ''تمہیں پریشان ہونے کی

ضرورت نہیں۔ بس پانچ سو روپے ماہانہ اپنی تنخواہ سے ایڈجسٹ کرواتی رہنا۔''

''اس ایڈجسٹمنٹ میں تو بہت عرصہ لگ جائے گا ابو۔'' صبیحہ نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ ''مجھے اندازہ تو ہے کہ اسپتال کا بل کتنا ہو جائے گا۔''

''کسی بھی فکر کی ضرورت نہیں ہے صبیحہ..... میں نے کہا نا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بس یہ خیال رکھو کہ اسپتال میں تمہارا بھائی گھبرائے نہیں۔''

''وہ گھبرائے گا نہیں۔ جب تک بھی وہ اسپتال میں ہے، اماں رہیں گی اس کے پاس۔ میں نے کل ہی انہیں اسپتال پہنچا دیا تھا۔ ابا بھی اسے دیکھنے جاتے رہیں گے اور شام کو میں بھی وہاں کا چکر ضرور لگایا کروں گی۔''

''ٹھیک ہے، بس اب جاؤ۔ اپنا کام دیکھو۔''

صبیحہ گم صم سی اٹھی اور کمرے سے نکل آئی۔

دفتر سے چھٹی کے بعد وہ سیدھی اسپتال پہنچی۔ اس وقت ساجدہ بڑی محبت سے عاصم کے سر کی مالش کر رہی تھی اور رشید خاں بھی ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے صبیحہ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر دوسری طرف دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔

صبیحہ کو دیکھ کر عاصم بہت خوش ہو گیا تھا اور چہکنے لگا تھا۔

''آپ کب آئے ابا؟'' صبیحہ نے رشید خاں سے پوچھا۔

''ابھی..... تھوڑی دیر پہلے..... شاید آدھا گھنٹا ہو گیا۔'' رشید خاں نے جواب تو دیا لیکن صبیحہ کی طرف دیکھا نہیں۔

صبیحہ نے ساجدہ کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں چرا لیں۔

تھوڑی دیر بعد صبیحہ نے وہاں سے روانگی کا ارادہ کیا تو عاصم مچل گیا۔

''اتنی جلدی کیوں جا رہی ہیں باجی؟''

''اب مجھے گھر بھی تو دیکھنا ہو گا بھیا۔'' صبیحہ نے کہا۔ ''اماں تو یہاں ہیں۔ کھانا کون پکائے گا، گھر کی صفائی کون کرے گا۔ میں اب کل صبح دفتر جانے سے پہلے چکر لگا لوں گی یہاں کا۔''

''خالی گھر بھی تو زیادہ دیر تک نہیں چھوڑا جا سکتا۔'' رشید خاں نے کہا اور پھر اپنی بیساکھیاں سنبھالتا ہوا صبیحہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلا چلتا ہوں۔''

صبیحہ اس وقت خاصی پریشان تھی۔ اسے ڈر لگا ہوا تھا کہ ابا اس سے نہ جانے کیا کہے لیکن وہ راستے میں بھی چپ رہا اور گھر جانے کے بعد بھی فوراً کچھ نہیں بولا۔ صبیحہ کھانا پکانے میں مصروف ہو گئی۔ گھر کے کام کاج میں وہ خاصی پھرتیلی تھی۔ وہ نو بجے سے پہلے پہلے سب کاموں سے فارغ ہو گئی۔ کھانا اس نے اتنا تیار کر لیا تھا کہ رشید خاں دوسرے دن دوپہر کو بھی کھا لیتا اور صبح دفتر جانے سے پہلے صبیحہ اسپتال جا کر اپنی ماں کو بھی اتنا کھانا دے دیتی جو دونوں وقت ہو جاتا۔ اس نے گزشتہ روز بھی ایسا ہی کیا تھا۔

باپ کے ساتھ اس نے خود بھی کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد رشید خاں کو لیموں کی چائے پینے کی عادت تھی۔ اسے چائے دے کر صبیحہ اپنے کمرے میں جانے لگی تو بڑی دیر سے سوچ میں ڈوبا ہوا رشید خاں بول پڑا۔ ''سنو!''

صبیحہ رک گئی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔

''پانی سر سے اونچا ہونے کے آثار..... ابھی نہیں دکھائی دیے تمہیں؟''

''میں سمجھی نہیں ابا!''

''اسپتال کا بل کتنا ہو گا؟..... کچھ اندازہ ہے؟''

''جی ابا!'' صبیحہ نظریں جھکائے ہوئے بولی۔ ''اندازہ تو ہے۔''

''تمہاری صرف ایک ماہ کی ملازمت کے بعد تمہارا دفتر اتنا بڑا بل ادا کرے گا۔''

''جی۔'' صبیحہ کی آواز دھیمی ہی رہی۔ ''مجھے دفتر کے کچھ لوگوں سے بھی معلوم ہوا ہے کہ ہمارے باس اپنے دفتر کے لوگوں کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔''

''اتنا زیادہ خیال؟..... اسپتال کا بل ہزاروں میں تو نہیں ہو گا۔''

''مجھے اندازہ ہے ابا لیکن اماں سے میں ایک بات کہہ چکی ہوں۔ اماں نے بتایا تو ہو گا تمہیں۔''

''ہاں، بتایا تھا ساجدہ نے لیکن..... تمہاری آنکھیں کیا اتنی دور تک دیکھ سکتی ہیں جتنی دور تک میں دیکھ سکتا ہوں؟''

''ابا!'' صبیحہ کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔ ''اماں سے تو میں کہہ چکی لیکن اگر تم کچھ کہو گے تو میں عاصم کی بیماری بھلا کر ملازمت چھوڑ دوں گی۔''

رشید خاں کچھ نہیں بولا۔ اب تک وہ صبیحہ کی طرف دیکھتے ہوئے باتیں کرتا رہا تھا لیکن اب دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کے چہرے پر غربت کا شدید احساس اور لاچاری کا کرب صاف نظر آ رہا تھا۔

وہ پھر کئی منٹ تک کچھ نہیں بولا تو صبیحہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ بستر پر لیٹی تو بہت اُداس تھی۔

دوسری صبح وہ کچھ جلدی اٹھی۔ باپ کو ناشتا کرانے کے

بعد دفتر جانے کے لیے تیار ہوئی پھر ایک لنچ میں ماں کے لیے کھانا لے کر اسپتال روانہ ہوئی۔

پھر اسی معمول میں دس دن گزر گئے۔ اتنے کم دنوں ہی میں عاصم کی صحت کچھ بہتر ہونے لگی تھی اور وہ بہت زیادہ خوش نظر آنے لگا تھا۔

دسویں دن ڈاکٹر نے صبیحہ کو بتایا کہ عاصم کی حالت اطمینان بخش تھی اس لیے اسے مہینے بھر سے زیادہ عرصے اسپتال میں رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

☆☆☆

زریاب ایک پینٹنگ بناتے ہوئے احمر سلطانہ سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا جو کرسی پر بیٹھی تھی اور باتیں کرتے ہوئے پینٹنگ کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔

''کافی دن ہو گئے۔'' زریاب کہہ رہا تھا۔ ''ارسلان سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ کبھی وہ مجھے لان میں یا کھانے کی میز پر بلا لیتا تھا لیکن شاید دس دن سے زیادہ ہو گئے، ایسا نہیں ہوا۔ وہ خود بھی یہاں نہیں آیا حالانکہ کبھی کبھار تو آ جاتا تھا۔''

''ارسلان کی وجہ سے میں بھی الجھن میں پڑ گئی ہوں زریاب!'' احمر سلطانہ نے کہا۔ ''آج کل وہ کچھ پریشان ہیں۔ بعض اوقات تو اتنے گم صم ہوتے ہیں کہ میری آواز سن کر بری طرح چونک جاتے ہیں۔''

زریاب نے مڑ کر تشویش سے احمر سلطانہ کی طرف دیکھا۔ ''اسے ہم دونوں کے بارے میں شبہ تو نہیں ہو گیا؟''

''میرے خیال میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

''میں نے انہیں ٹٹولنے کی کوشش تو کی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ بزنس کی کسی ڈیل میں انہیں کسی بڑے خسارے کا اندیشہ ہے۔ مطلب یہ کہ اگر ڈیل نہ ہو سکی تو انہیں خسارے کا امکان نظر آ رہا ہے لہٰذا جب تک ڈیل ہو نہیں جاتی، انہیں پریشانی تو رہے گی۔''

''آپ کو یقین ہے کہ یہی بات ہو گی؟''

''میں نے ابھی کہا تھا نا کہ الجھن میں تو میں بھی پڑ گئی ہوں۔ بزنس کے کسی معاملے کی وجہ سے وہ کبھی کبھی پریشان تو نظر آتے ہیں لیکن ایسا دو ایک دن سے زیادہ کبھی نہیں ہوا۔''

''تو پھر؟''

''شاید کوئی اور ہی بات ہے۔''

''اسی لیے تو میں پوچھ رہا تھا کہ اسے ہم دونوں کے بارے میں تو شبہ نہیں ہو گیا؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ تو میں یقین سے کہہ سکتی ہوں۔ دو ایک بار آپ کا ذکر بھی چھیڑا ہے ارسلان نے لیکن اسی طرح جیسے ہمیشہ بات ہوئی ہے اگر انہیں کوئی شبہ ہوا ہوتا تو ان کے لہجے میں کوئی تبدیلی ضرور محسوس ہوتی۔ ایسے معاملات میں انسان خود کو مکمل طور پر قابو میں نہیں رکھ سکتا، وہ کتنی بھی کوشش کرے، اس کے لہجے میں کچھ تبدیلی ضرور آ جاتی ہے۔''

یہ بھی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' زریاب نے کھوئے ہوئے سے انداز میں کہا اور پھر پینٹنگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''میں کوشش کروں گی کہ ان کی پریشانی کی اصل وجہ معلوم ہو جائے۔'' احمر سلطانہ نے کہا۔ ''اور ہو سکتا ہے کہ ان کی وہی بات درست ہو جو وہ مجھ سے کہہ چکے ہیں۔ بہرحال، یہ خیال تو آپ اپنے ذہن سے نکال دیں کہ انہیں ہم پر شبہ ہو گیا ہے۔ آپ پورے سکون سے اپنی یہ پینٹنگ مکمل کریں۔ مجھے یہ آپ کی دوسری پینٹنگز سے کچھ زیادہ ہی پسند آ رہی ہے۔'' احمر سلطانہ اٹھ کر زریاب کے برابر میں جا کھڑی ہوئی۔

''اچھا!'' زریاب دھیرے سے ہنسا۔ ''زیادہ پسندیدگی کی وجہ؟''

''بعض چیزوں کی پسندیدگی کی وجہ بتانا شاید بہت مشکل ہوتا ہے۔'' احمر سلطانہ نے زریاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ خاصا معنی خیز تھا۔

زریاب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا تو وہ زریاب سے نظریں نہیں ملا سکی اور پینٹنگ کی طرف دیکھنے لگی، پھر انگلی سے پینٹنگ کے ایک حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''بس اس حصے میں مجھے کچھ ایسا لگ رہا ہے جیسے رنگ کچھ پھیکا ہے۔ اسے اور گہرا ہونا چاہیے۔''

زریاب نے پینٹنگ کے اس حصے کو غور سے دیکھا جس کی طرف احمر سلطانہ نے اشارہ کیا تھا پھر اس نے چاروں طرف سر گھما کر کمرے کی لائٹس کا جائزہ لیا اور پھر دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''اس حصے پر غالباً لائٹ شیڈ پڑ رہا ہو گا۔ آپ اسے بالکل قریب سے..... یہاں سے دیکھیے۔''

احمر سلطانہ زریاب کے دائیں ہاتھ پر کھڑی تھی۔ زریاب نے اس کے دائیں شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے قریب کیا تاکہ وہ پینٹنگ سامنے سے دیکھ سکے۔

یہ پہلا موقع تھا جب زریاب نے اسے چھوا تھا۔ اس کا جسم بھی زریاب کے جسم سے تھوڑا سا ٹکرایا تھا۔ اس ٹکراؤ اور شانے پر زریاب کے ہاتھ کا لمس ایسا تھا کہ اس کا سارا جسم

سنسنا گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس نے ہلکی برقی رو کے کسی تار کو چھولیا ہو لیکن وہ برقی رو نشاط انگیز بھی تھی۔

''یہاں سے ٹھیک لگ رہا ہے نا۔'' زریاب نے پینٹنگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ شاید اسے اس کا احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کیا حرکت کر بیٹھا تھا لیکن اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی آگئی تھی۔

جسم میں دوڑتی ہوئی نشاط انگیز لہروں نے احمر سلطانہ کو اکسایا۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ زریاب اس کے شانے پر اپنی گرفت سخت کر دے، اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں جکڑ لے۔

اسی کیفیت میں احمر سلطانہ کے دماغ میں ارسلان کی بات گونجی۔ ''محبت کے معاملات میں یہ حیوانی جذبہ کسی وقت بھی سر اٹھا لیتا ہے اور اگر وقت اور ماحول اس میں حارج نہ ہوں تو انسان اس دھارے میں بے بس تنکے کی طرح بہہ جاتا ہے۔''

''نہیں۔'' احمر سلطانہ کے دماغ میں خود اس کی آواز گونجی۔ ''اسے بے بس تنکے کی طرح نہیں بہنا چاہیے۔''

اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ خود کو زریاب سے دور کر لیا۔ زریاب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت احمر سلطانہ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''یہ..... یہ آپ نے..... یہ آپ نے کیا کیا زریاب؟'' احمر سلطانہ کی سانس پھول رہی تھی۔

زریاب نے سکتے کی سی حالت میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آئی ایم سوری احمر!''

احمر سلطانہ کے ہونٹوں میں ایسی لرزش تھی جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن اس کے منہ سے پھر ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ وہ یکا یک مڑ کر تقریباً دوڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اسی طرح وہ اپنے کمرے تک پہنچی۔ غنیمت یہ ہوا کہ گھر کے کسی ملازم نے اسے اس طرح زریاب کے کمرے سے نکلتے نہیں دیکھا ورنہ وہ جو کچھ سمجھتا، اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر احمر سلطانہ بستر پر اس طرح ڈھیر ہوئی جیسے اس وقت اپنے جسم کا وزن سنبھالنا اس کے لیے ممکن نہ ہو۔ اس کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ سینہ دھونکنی کی طرح پھول پچک رہا تھا اور چہرے پر اب بھی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ دماغ جیسے آندھیوں کی زد پر تھا۔

کوئی آدھے گھنٹے تک وہ بستر پر پڑی خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی پھر آہستہ سے اٹھی۔ اس نے الماری کھول کر شراب کی بوتل نکالی اور ایک پیگ بنا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

آدھا گلاس تو اس نے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ پھر چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔ اس طرح اس کے جسم کی، اچانک کھو جانے والی تو انائی آہستہ آہستہ واپس لوٹنے لگی۔ اسے خیال آرہا تھا کہ زریاب کے ساتھ گزرے ہوئے وہ چند لمحے شاید زندگی بھر نہ بھول سکے اور یہ بڑی خیر ہوئی تھی کہ وہ اس طوفان کی زد سے نکل آئی تھی جو شاید ایک معجزہ تھا۔ ارسلان نے تو کہا تھا کہ ایسے موقع پر انسان بے بس تنکے کی طرح بہہ جاتا ہے لیکن اس نے خود کو بروقت سنبھال لیا تھا۔

زریاب سے اپنی محبت کو تو وہ کوشش کے باوجود نہیں کچل سکی تھی لیکن زریاب سے اتنا قریب ہو جانا اس کی دانست میں اس کا ایک بہت بڑا جرم ہوتا۔

ارسلان اس قسم کے معاملات میں بڑے سفاک خیالات رکھتا تھا اور اسے ایک فطری معاملہ قرار دیتا تھا۔ دو تین روز پہلے بھی احمر سلطانہ نے اپنی دوست کی آڑ میں یہ بحث چھیڑی تھی اور ارسلان نے کہا تھا کہ اگر ایسا ہو جائے تو عورت کی جسمانی کیمسٹری میں کوئی فرق نہیں آتا اور وہ یہ بات بس اپنے شوہر سے پوشیدہ رکھے۔ اس نے یہ تک کہا تھا کہ بعض اوقات شادی سے پہلے بھی بعض لڑکیوں کے کسی سے تعلقات ہو جاتے ہیں لیکن شادی کے بعد وہ یہ بات اپنے شوہر سے پوشیدہ رکھتی ہیں اور ان کی ساری زندگی ہنسی خوشی گزر جاتی ہے لیکن احمر سلطانہ ایک نہایت ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتے ہوئے بھی اسے ایک بہت بڑا جرم سمجھتی تھی۔ اسی لیے اسے یہ احساس پرسکون کرتا چلا گیا کہ وہ ایک جرم سے بچ گئی تھی۔

پیگ ختم کر کے وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے دوسرا پیگ پینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ ایک ہی پیگ پی کر وہ اپنی حالت پر بڑی حد تک قابو پا چکی تھی۔ وہ بستر پر لیٹ کر زریاب کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس کے خیال کے مطابق زریاب کی وہ حرکت شعوری نہیں تھی۔ وہ بے اختیار ہی ایسا کر بیٹھا تھا۔ احمر سلطانہ نے اسے اگر کبھی گھٹیا انسان سمجھا ہوتا تو اس کے دل میں زریاب کی محبت کبھی پیدا نہیں ہوتی۔

احمر سلطانہ نے اپنا دل اچھی طرح ٹٹولا۔ زریاب کی اس حرکت کے باعث اس کے دل میں زریاب کی محبت کم نہیں ہوئی تھی لیکن اب احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اس سے تنہائی میں نہ ملے، اسے لان میں یا ڈرائنگ روم میں بلا لیا کرے تاکہ اس ماحول میں حیوانی جذبات اپنا رنگ دکھا ہی نہ سکیں۔ وہ آج تو کسی طرح خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گئی تھی لیکن ضروری نہیں تھا کہ ہمیشہ ہی ایسا ہو۔ تنہائی میں کسی

وقت بھی یہ ممکن تھا کہ وہ اور زریاب، دونوں ہی جذبات کے دھارے میں بے بس تنکے کی طرح بہہ جاتے اور پھر احساس جرم کم از کم احمر سلطانہ کی زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ ڈالتا۔

پھر دوسرے دن احمر سلطانہ نے ایسا ہی کیا۔ اس نے ایک ملازم کے ذریعے زریاب کو لان میں بلا لیا۔ اس نے کہلوایا تھا کہ وہ آ کر چائے پی لے۔

یہ دیکھ کر وہ چونک گئی کہ زریاب کے دائیں ہاتھ پر ڈریسنگ تھی۔

''یہ کیا ہوا؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''میں نے بستر کا سائڈ لیمپ بجھا کر اس کا شیشہ پکڑ لیا تھا اور شیشہ اتنی جلدی تو ٹھنڈا نہیں ہوتا۔'' زریاب نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

احمر سلطانہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

''اس ہاتھ کو اتنی سزا تو ملنا ہی چاہیے تھی۔'' زریاب نے اس مرتبہ بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔

احمر سلطانہ بے چین ہو گئی۔ ''ابھی ڈاکٹر کے پاس چلیے۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے احمر! میں نے خود ہی دوا لگا کر ڈریسنگ کر لی ہے۔ ایک آدھ ہفتے میں ٹھیک ہو جائے گا ہاتھ۔''

''ارسلان دیکھیں گے تو نہ جانے کیا سوچیں۔'' احمر سلطانہ نے وحشت میں کہا۔

''میں اسے کچھ بھی سوچنے کا موقع نہیں دوں گا۔ خود ہی بتا دوں گا کہ لیمپ کا شیشہ ٹھیک کرنے لگا تھا اور بھول ہی گیا تھا کہ وہ میں نے چند لمحے پہلے ہی بند کیا ہے لہٰذا اس کا شیشہ گرم تو ہو گا۔'' پھر زریاب عجیب سے انداز میں ہنسا۔ ''ہم آرٹسٹوں سے اس قسم کی حماقتوں کی توقع تو ہر ایک کو ہوتی ہے۔''

اس وقت زریاب کے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے احمر سلطانہ کی پلکیں بھیگنے لگیں..... پھر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھالا کیونکہ ملازم چائے کی ٹرے لیے ان کی طرف آ رہا تھا۔

☆☆☆

مہینے بھر بعد صبیحہ دفتر میں ارسلان بیگ کے سامنے بیٹھی بڑے پرمسرت لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''کل صبح میرے بھائی کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا جائے گا سر..... ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ اب اس کے پیٹ میں درد کبھی نہیں ہو گا۔ بس ایک دوا کی گولی عاصم کو دو مہینے تک روزانہ کھانا ہو گی۔

میرے پوچھنے پر ڈاکٹر صاحب نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ اب عاصم کو اسکول میں داخل کرایا جا سکتا ہے۔''

''مبارک ہو صبیحہ!'' ارسلان شاہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں سر۔'' صبیحہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔

''شکر گزار ہونے کی اس میں کوئی بات نہیں۔ اس کا علاج تم نے اپنے پیسوں سے کروایا ہے۔''

''میں اس خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں سر!'' صبیحہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے اب علم ہو چکا ہے کہ اس کا بل کیا آئے گا۔''

''جو بھی آئے گا، وہ تم ایڈجسٹ تو کرواؤ گی نا!''

''پانچ سو روپے مہینا۔'' صبیحہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اس بل کے آگے اس معمولی رقم کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ آپ تو میرے لیے اور میرے گھر والوں کے لیے ایک فرشتہ ثابت ہوئے ہیں سر۔ کسی لالچ کے بغیر آج کے زمانے میں کون کسی کے لیے اتنا کرتا ہے۔''

''تم سے ایک بات کہوں صبیحہ؟'' ارسلان بیگ نے جان بوجھ کر اس کا ادھورا نام لیا۔ وہ گزشتہ دنوں میں بھی دو تین بار دانستہ ایسا کر چکا تھا اور ہر مرتبہ اس نے محسوس کیا تھا کہ صبیحہ کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی۔ اس نے اس وقت بھی محسوس کیا کہ صبیحہ کی سنجیدگی کچھ زیادہ گہری ہو گئی تھی۔

''جی!'' صبیحہ نے کچھ چونکے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھا بھی تھا۔ ''جی..... جی سر!''

''کہنا تو کیا۔'' ارسلان شاہ بولا۔ ''بس کچھ پوچھنا چاہتا ہوں تم سے۔''

صبیحہ نے سوالیہ انداز میں ارسلان شاہ کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

''اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں تم نے کچھ سوچا تو ہو گا!'' ارسلان شاہ بولا۔

صبیحہ کچھ نہیں بولی۔ اس کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ سوچ میں پڑ گئی ہو کہ یہ پوچھنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔

''جواب نہیں دیا تم نے!'' ارسلان شاہ نے کچھ توقف سے کہا۔

صبیحہ نے بھی کچھ رک کر جواب دیا۔ ''عاصم کے علاج کے بعد میں اب اس کے علاوہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتی کہ مجھے اب اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ آپ کی ملازمت میں گزارنا ہے اور ساری رقم ایڈجسٹ کروانا ہے۔ میں اب اس صورت

حال میں اپنی زندگی کے بارے میں کچھ اور سوچ ہی کہاں سکتی ہوں۔''

صبیحہ کے لہجے میں جو کرب تھا، اس نے ارسلان شاہ کے دل پر چرکا سا لگایا۔ وہ نظریں جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔

صبیحہ ان باتوں سے کچھ مضطرب ہو گئی تھی۔ وہ بولی۔

''کیا میں جاؤں سر؟''

''ایک منٹ صبیحہ!'' ارسلان شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ایک بہت نجی سا سوال کر رہا ہوں میں تم سے۔ تم نے کسی شخص کے بارے میں کبھی کچھ سوچا ہے؟''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔''

''ہاں میرا سوال شاید مبہم تھا۔ مطلب یہ کہ ہر لڑکی کو زندگی گزارنے کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت تو پڑتی ہے۔ تم نے اس حوالے سے کبھی کسی کو دیکھا ہے؟''

''جی نہیں۔'' صبیحہ نے نظریں جھکا کر کہا ''زندگی کے اندھیروں میں کبھی کسی طرف دیکھنا ممکن ہی نہیں تھا۔''

''تمہارے والدین نے تو سوچا ہوگا کچھ اس بارے میں؟''

''جی۔'' صبیحہ نظریں جھکائے ہوئے بولی۔ ''سوچا تو ہو گا۔ سبھی والدین اس بارے میں سوچتے ہی ہیں لیکن میرے والد..... یہ تو میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ وہ ایک حادثے میں معذور ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد سے اب تک گھر کے جو حالات رہے ہیں، ان میں بس سوچا ہی جا سکتا ہے، کچھ کیا تو نہیں جا سکتا لیکن۔'' صبیحہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے یہ سب کچھ کیوں جاننا چاہا؟''

''بس اس لیے کہ اگر تم نے کسی کو پسند کیا ہو تو میں اس معاملے میں تمہارے والد سے مل کر ان کی کچھ مدد کروں۔''

''آپ مجھ پر اتنے احسانات کیوں کرنا چاہتے ہیں سر؟ اور پھر اب یہ ممکن بھی کہاں رہا ہے؟'' صبیحہ مغموم ہو گئی۔ ''ایڈوانس ایڈجسٹ کراتے کراتے میری زندگی کا ایک بڑا عرصہ تو اب آپ کی ملازمت میں ہی گزرنا ہے۔''

''میں نے تم سے کہا تھا کہ اس ایڈوانس کے سلسلے میں تمہیں اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''فکر مند میں شروع میں ہوئی تھی سر۔ اب تو نہیں ہوں۔ اب تو سوچ لیا ہے، سمجھ لیا ہے کہ اس ایڈوانس کو ایڈجسٹ کرانے کے لیے مجھے خاصے لمبے عرصے تک آپ کی ملازمت کرنا ہے۔''

''لیکن۔'' ارسلان شاہ کچھ سوچتے ہوئے رکا، پھر بولا۔ ''اگر اس ایڈوانس کو قرض کہہ لیا جائے اور کوئی تمہارا یہ قرض ادا کر دے تو؟''

''میں نہیں سمجھتی کہ کوئی ایسا کرے گا۔'' صبیحہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور اگر کوئی ایسا کرے گا تو اسے مجھ سے ضرور کوئی لالچ ہوگا۔ اس سے اگر میری عزت نفس کو ٹھیس پہنچتی ہے تو میں شدید اذیت میں مبتلا ہو جاؤں گی اور اگر کسی وجہ سے میں نے خود کو مجبور پایا تو خودکشی کے سوا کوئی راستہ نہیں رہے گا میرے لیے۔''

ارسلان شاہ نے اضطراب میں پہلو بدلا اور صبیحہ کی طرف دیکھتا رہا جو بہت گمبھیرتا سے نظریں جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔

''زندگی کو اتنا بے وقعت سمجھتی ہو تم؟'' وہ بولا۔

''زندگی کی وقعت تو اسی وقت تک ہے سر جب تک عزت نفس محفوظ ہو۔''

''ہوں۔'' ارسلان شاہ نے طویل سانس لی۔ ''تمہارے سوچنے کا یہ انداز بہت سنگین ہے۔''

''حالات انسان کو اس طرح سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں سر!''

''اچھا خیر!'' ارسلان شاہ سوچتا ہوا بولا ''ان باتوں کا اپنے ذہن پر کوئی بوجھ مت لینا۔ یہ مت سوچنا کہ میں نے تم سے یہ باتیں کیوں کیں۔ بھول جاؤ یہ سب، اور جاؤ کام کرو۔ کسی دن اپنے بھائی کو دفتر ضرور لانا۔ دیکھنا چاہتا ہوں میں اسے۔ مجھے خوشی ہوگی اسے دیکھ کر۔''

''بہتر۔''

صبیحہ سنجیدہ تاثرات کے ساتھ اٹھی اور کمرے سے چلی گئی۔

اس رات ارسلان شاہ کی آنکھوں سے نیند بہت دور رہی۔ اس نے آنکھیں صرف اس لیے بند کر رکھی تھیں کہ احمر سلطانہ کو اس کے جاگنے کا علم نہ ہو جائے پھر جب ایک بج گیا اور ارسلان شاہ کا یہ احساس خاصا پختہ ہو گیا کہ احمر سلطانہ اب گہری نیند میں تھی تو وہ بہ آہستگی بستر سے اٹھا۔ اس نے بڑی احتیاط سے وہ الماری کھولی جس میں شراب رکھی رہتی تھی۔

اس نے بوتل اور گلاس تپائی پر رکھ کر غور سے احمر سلطانہ کی طرف دیکھا جو گہری گہری سانسیں لے رہی تھی اور اسی سے ارسلان شاہ نے اندازہ لگایا تھا کہ اب وہ گہری نیند میں تھی۔

کھانے سے پہلے ارسلان شاہ نے دو پیگ لیے تھے لیکن اس رات اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خود کو شراب میں غرق کر لے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن تھا کہ وہ احمر سلطانہ سے کچھ

باتیں کرسکتا لیکن یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ احمر سلطانہ اسے دو پیگ سے زیادہ پینے دیتی۔ اسی لیے اس نے احمر سلطانہ کے سو جانے کا انتظار کیا تھا۔

کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس نے دوسرا پیگ پیتے ہوئے اس مرتبہ بڑے غور سے احمر سلطانہ کے خوب صورت چہرے کا جائزہ لیا۔ اسے وہ اتنی ہی خوب صورت لگی جتنی وہ جوانی میں تھی۔ جسمانی طور پر بھی وہ بالکل نہیں ڈھلی تھی۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہ ماں نہیں بنی تھی اور ''یوگا'' کی مشقیں اس کی زندگی کا لازمی حصہ اس وقت سے بنی ہوئی تھیں جب اس کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔

ارسلان شاہ پیتا رہا اور بہت کچھ سوچتا رہا۔ جب اس نے چوتھا پیگ بنا کر ہونٹوں سے لگایا تو یہ دیکھ کر چونکا کہ احمر سلطانہ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ غور سے ارسلان شاہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

نظریں ملتے ہی وہ بولی۔ ''آپ باز نہیں آئے پینے سے!''

ارسلان شاہ کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ بولا۔ ''اگر تم نہ جاگتیں تو یہ پیگ ختم کرنے کے بعد میں خود تمہیں جگاتا۔''

''کیوں؟''

''کچھ باتیں کرنا ہیں تم سے!''

احمر سلطانہ اپنے چہرے پر الجھن کے تاثرات کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔ نیند کے خمار نے اس کی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے ڈال دیے تھے اور اس کی آنکھیں زیادہ حسین نظر آنے لگی تھیں۔ شب خوابی کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں اس کا مرمریں پیکر نہایت زہد شکن نظر آرہا تھا لیکن اس وقت ارسلان کا ذہن خیالات کی ایسی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا کہ اس کی جمالیاتی حس کسی گھور تاریکی میں جا چھپی تھی۔

احمر سلطانہ بستر سے اٹھی تو ارسلان شاہ گلاس ہاتھ میں لیے جلدی سے اٹھا اور بولا۔ ''میں وہیں آرہا ہوں۔''

احمر سلطانہ پھر بستر پر بیٹھ گئی اور الجھی ہوئی نظروں سے ارسلان شاہ کی طرف دیکھتی رہی۔

ارسلان شاہ اس کے قریب جا کر اس کے پہلو میں اس طرف بیٹھا جس طرف سائڈ ٹیبل تھی۔ اس نے ایک بڑا گھونٹ لے کر گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھا اور احمر سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جو باتیں میں تم سے کرنا چاہتا ہوں، اس کے لیے مجھے ہمت کی ضرورت تھی جو مجھ میں شراب سے ہی پیدا ہو سکتی تھی۔''

''کافی دن سے مجھے اس کا اندازہ ہے کہ آپ کسی معاملے میں خاصے پریشان ہیں۔'' احمر سلطانہ بولی۔ ''لیکن یہ اندازہ مجھے نہیں تھا کہ اس پریشانی کی نوعیت ایسی ہے، جس کا اظہار کرنے کے لیے آپ کو شراب کی ضرورت ہے۔''

''ہاں۔'' ارسلان شاہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''بات کچھ ایسی ہی ہے۔''

''کہیے!'' احمر سلطانہ اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''سمجھ میں نہیں آرہا ہے، بات کہاں سے شروع کروں۔'' ارسلان شاہ نے گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔

''کتنی پی چکے ہیں اب تک؟'' احمر سلطانہ نے پوچھا۔

''یہ چوتھا ہے۔''

''اوہ!'' احمر سلطانہ کے لہجے میں تشویش تھی۔ ''آپ کے اعصاب پر یقیناً شدید دباؤ ہے۔ چوتھے پیگ نے بھی آپ پر اتنا اثر نہیں کیا جو عام حالات میں یقیناً ہوتا ہے۔''

ارسلان شاہ نے گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھا اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے سے شدید الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔ احمر سلطانہ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اب وہ کچھ پریشان نظر آنے لگی تھی۔ غالباً اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہو گا کہ بزنس کی کسی پریشانی کے بارے میں بتانے کے لیے ارسلان شاہ کو اتنی الجھن کیوں ہے کہ بات شروع کرنا بھی اس کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔

کچھ توقف سے ارسلان شاہ نے ایک کرسی کے قریب رک کر احمر سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر برا نہ مانو تو ایک بات کہوں تم سے!''

''کہیے!'' احمر سلطانہ کے چہرے پر الجھن کا تاثر بڑھ گیا۔

''تم۔'' ارسلان شاہ کچھ کہتے کہتے رکا پھر ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''تم زریاب کے کمرے میں جانا چھوڑ دو۔''

☆☆☆

احمر سلطانہ کا دل بڑی زور سے اُچھلا اور سارے جسم میں سنسناہٹ پھیلتی چلی گئی۔ اسے تو یقین تھا کہ اس کے اور زریاب کے معاملے میں ارسلان شاہ کو ذرا بھی شبہ نہیں ہوا ہو گا۔

ارسلان شاہ جلدی سے احمر سلطانہ کے قریب پہنچا اور اس کے پہلو میں بیٹھ کر اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولا۔ ''تم خوب جانتی ہو کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور بس..... اسی لیے میں کوئی خطرہ مول نہیں

لینا چاہتا۔''

احمر سلطانہ کے دل کی دھڑکنیں بہت بڑھ چکی تھیں۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''دیکھو احمر!'' ارسلان شاہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''بعض باتیں ہم پڑھتے بھی ہیں، لوگوں سے سنتے بھی ہیں لیکن وہ کسوٹی پر کھری اسی وقت محسوس ہوتی ہیں جب آدمی خود اس صورتِ حال میں پھنستا ہے۔''

احمر سلطانہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی جان نکلی جارہی ہو۔

یکایک ارسلان شاہ اٹھا اور پھر ٹہلنے لگا۔ ''سنا تو تم نے بھی ہوگا کہ ہمارے اجداد نے جو معاشرہ تشکیل دیا تھا اس میں عورت اور مرد کے درمیان ممکنہ حد تک دوری پر خاصا زور دیا تھا اور اس میں جو حکمت تھی، وہ آج پوری طرح میری سمجھ میں آچکی ہے۔ سگے بہن بھائی بھی اگر جوان ہوں تو ان کا ایک کمرے میں رہنا اسی لیے مناسب نہیں سمجھا گیا کہ بعض اوقات کوئی معمولی سی تحریک بھی انسان کے اندر چھپے ہوئے وحشی جذبے کو سامنے لے آتی ہے۔ اس وحشی جذبے کے ہاتھوں انسان کتنا بے بس ہوجاتا ہے، یہ ہمارے اجداد جانتے تھے اور اسی لیے انہوں نے ایک ایسے معاشرے پر اصرار کیا جس میں عورت اور مرد کو ایک دوسرے سے دور رکھنے پر زور دیا گیا۔''

احمر سلطانہ گم صم سی بیٹھی ارسلان شاہ کی طرف دیکھتی رہی جو اس وقت کسی مفکر کے انداز میں بول رہا تھا۔ اس نے قریب آکر سائڈ ٹیبل سے اپنا گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ لیا اور گلاس ہاتھ میں لیے لیے پھر ٹہلنے لگا۔

''لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے۔ قدریں بدل چکی ہیں۔ عورت اور مرد ایک دوسرے سے قریب رہنے لگے ہیں اور ہمارے اجداد کے خدشات رنگ لانے لگے ہیں۔'' ارسلان شاہ نے پھر بولنا شروع کیا۔ ''اخبارات میں بھی کبھی ایسی خبریں آتی رہتی ہیں جنہیں پڑھ کر انسان کانپ جاتا ہے لیکن میں سوچتا ہوں کہ ایسے بہت سے واقعات اخبارات تک پہنچتے بھی نہیں ہوں گے۔ میں یہ تو اب بھی نہیں کہوں گا کہ لوگوں کے کردار منفی ہوگئے ہیں لیکن میں وہ باتیں ضرور دہراؤں گا جو تمہاری دوست فیروزہ کے سلسلے میں تم سے کہہ چکا ہوں۔''

ارسلان شاہ نے خاموش ہوکر ٹہلتے ٹہلتے ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا۔

احمر سلطانہ کی پریشانی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق ارسلان شاہ اس پر اپنے شبہے کا اظہار کرنے کے بجائے اپنی بات دوسرے انداز میں کررہا تھا۔

''مجھے یقین ہے احمر! تم کسی ایسی لڑکی سے دوستی نہیں کرسکتیں جو اچھے کردار کی مالک نہ ہو، اس لیے فیروزہ بھی اچھے کردار کی مالک ہوگی لیکن تم جان چکی ہو کہ اس کے ساتھ کیا ہوچکا ہے۔ یہ اسی لیے ہوا تا کہ اسے مردوں سے قریب ہونے کا موقع ملا اور وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔ میں یہ تو کہہ چکا ہوں نا کہ یہ کوئی اختیاری جذبہ نہیں ہے۔ یہ تو بس ہوجاتا ہے اور انسان اس کا کھلونا بن کر رہ جاتا ہے اگر دونوں فریق غیر شادی شدہ ہوں تو اس قسم کا جذبہ پیدا ہونے کے بعد وہ آپس میں شادی کرلیتے ہیں لیکن یہ جذبہ شادی شدہ افراد کے دل میں بھی پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ جذبہ عمر یا رشتوں کی قید و بند سے آزاد ہے۔ شادی شدہ افراد کی عمر زیادہ بھی ہوچکی ہو تو عورت اور مرد کی قربت میں یہ جذبہ کسی وقت بھی سر اٹھا سکتا ہے۔''

''کیا ہر ایک کے ساتھ ایسا ہوتا ہوگا؟'' احمر سلطانہ نے ڈرتے ڈرتے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''نہیں۔'' ارسلان شاہ نے کہا۔ ''اگر ایسا ہو تو سارا معاشرہ تہ و بالا ہوجائے۔ میں بس یہ کہہ رہا ہوں کہ کبھی بھی، کسی کے ساتھ بھی ایسا ہوضرور سکتا ہے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اگر کسی ایسی پارٹی میں جاؤ جہاں مرد بھی شریک ہوں تو تمہیں اکیلا نہیں ہونا چاہیے۔ اسی لیے میں تمہیں زریاب کے کمرے میں جانے سے بھی منع کررہا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے احمر کہ مجھے تم پر بھروسا نہیں ہے لیکن اب میں جان چکا ہوں کہ یہ سرکش جذبہ، بھروسے کی بھی دھجیاں اڑا سکتا ہے۔ یہ بہت طاقت ور اور خوف ناک ہوتا ہے۔ میں تم سے التجا کروں گا ڈارلنگ کہ میری ان باتوں کا برا نہ ماننا اگر اس وقت تمہیں غصہ آرہا ہو تو پھر کسی وقت ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ میری باتوں کا تجزیہ کرنا اور اس وقت اپنی دوست فیروزہ کے معاملے کو بھی اپنے ذہن میں رکھنا۔''

احمر سلطانہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ بہ دستور دھیمی آواز میں بولی۔ ''اگر مرد ساتھ ہو تو عورت کے دل میں کسی کے لیے اس قسم کا جذبہ پیدا نہیں ہوسکتا؟''

ارسلان شاہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر سر ہلا کے بولا۔ ''اچھا سوال کیا ہے تم نے! میرا خیال ہے کہ اس صورت میں بھی ایسا ہوسکتا ہے لیکن اس کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے۔ اب ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم وقت کے ساتھ بہت آگے نکل آئے ہیں۔ یہاں سے واپسی ناممکن ہوچکی ہے۔ عورت اور مرد اب ایک دوسرے کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اب اگر ہم زمانے کے

ساتھ نہیں چلیں گے تو یہ وقت ہمیں بہت پیچھے چھوڑ جائے گا اسی لیے اب بس یہ احتیاط ہی کی جاسکتی ہے کہ عورت اور مرد کو تنہائی میسر نہ ہو۔ تنہائی میں ہی اس حیوانی جذبے کو اُبھرنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔''

احمر سلطانہ تجسّس کا شکار تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ارسلان شاہ کے دل میں اگر کوئی شبہ ہے تو صاف طور پر سامنے آجائے۔ وہ خود کو اس کے لیے بھی تیار کررہی تھی کہ ایسی صورت میں وہ اعتراف بھی کرلے۔

''زریاب تو ہمارے گھر میں کافی دن سے ہیں۔'' وہ بولی۔ ''اور میں برابر ان کے کمرے میں جاتی رہتی ہوں۔''

''تو کیا تمہیں زریاب سے محبت ہوچکی ہے؟'' ارسلان شاہ مسکرایا۔

احمر سلطانہ خود کو اعتراف کرنے کے لیے تیار کررہی تھی لیکن جب یہ سوال ارسلان شاہ کی زبان پر آیا تو اسے ایسا لگا جیسے اس کا دل اتنی زور سے اچھلا کہ اس کی ضرب اس کی پسلیوں نے بھی محسوس کی۔

ارسلان شاہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''نہ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوا ہوگا اور میں چاہتا ہوں کہ آیندہ بھی ایسا نہ ہو۔''

احمر سلطانہ نے محسوس کیا کہ چوتھے پیگ کے بعد ارسلان شاہ پر شراب کی اثر پذیری واضح ہونے لگی تھی۔

ارسلان شاہ خالی گلاس لیے ہوئے کرسی پر جا بیٹھا اور بوتل اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولنے لگا۔

''ابھی اور پئیں گے؟'' احمر سلطانہ کے انداز میں ڈرا ڈرا سا احتجاج تھا۔

''ہاں ڈارلنگ!'' ارسلان شاہ نے گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا۔ ''ابھی مجھے تم سے کچھ اور باتیں بھی کرنا ہیں جن کے لیے میں ایک اور پیگ کی خواہش یا ضرورت محسوس کررہا ہوں۔''

اور کوئی بات؟..... احمر سلطانہ کی پریشانی میں اضافہ ہوا۔

گلاس بنا کے ارسلان شاہ نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ایک گھونٹ لیا اور احمر سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''ابھی چند دن پہلے میں نے تم سے کہا تھا کہ شادی شدہ عورت اگر کسی دوسرے مرد کے زیادہ قریب ہوجائے تو اس کی جسمانی کیمسٹری میں کوئی فرق نہیں پڑتا لہٰذا اس کے شوہر کو اس کی پروا نہیں ہونا چاہیے لیکن اب مجھے محسوس ہورہا ہے کہ اس قسم کی باتیں کرنا فلگچوئل بننے کی ایک بے ہودہ سی لاشعوری کوشش ہے۔ مرد کو اگر اپنی بیوی کے بارے میں یہ بات معلوم ہوجائے تو وہ اسے برداشت نہیں کرسکتا۔''

''کیا صرف محبت برداشت کرسکتا ہے؟'' احمر سلطانہ بے اختیار پوچھ بیٹھی اور اپنی اس جرأت پر اس نے دم بھی سادھ لیا۔

''یہ بھی اچھا سوال اٹھایا تم نے۔'' ارسلان شاہ مسکرایا۔ ''خیر ویسے تو عورت اور مرد کی قربت بھی ایک فطری حیوانی جذبے کی وجہ سے عورت اور مرد کی بے بسی ہے اور محبت بھی ایک ایسا ہی بے اختیاری جذبہ ہے لیکن محبت شاید برداشت کی جاسکتی ہے یا نظرانداز کی جاسکتی ہے لیکن ابھی مجھے خیال آیا ہے کہ شاید یہ بھی ایسا کچھ آسان نہیں ہوگا۔''

ارسلان شاہ نے خاموش ہوکر پے در پے کئی بڑے گھونٹ لیے اور گلاس آدھے سے زیادہ خالی ہوگیا۔

''یہ کیا کررہے ہیں آپ؟'' احمر سلطانہ بے چین ہوکر بولی۔ ''اس طرح کیوں پی رہے ہیں؟..... چار پیگ تو پی چکے ہیں آپ۔''

ارسلان شاہ نے ایک طویل سانس لی۔ ''مجھے ابھی ایک بات اور کرنا ہے ڈارلنگ!..... اور اس کے لیے مجھے شاید ابھی ایک اور پیگ کی ضرورت بھی محسوس ہوگی۔''

''میں آپ کو اب ہرگز اور نہیں پینے دوں گی۔'' احمر سلطانہ بستر سے اٹھی، جھپٹ کر قریب آئی اور بوتل اٹھا کے الماری کی طرف جانے لگی۔

ارسلان شاہ نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا پھر گلاس ہاتھ میں لیے لیے اٹھا اور بستر کی طرف بڑھا۔

بوتل رکھ کر احمر سلطانہ بستر کی طرف لوٹی۔ ارسلان شاہ بستر پر بیٹھ چکا تھا۔ احمر سلطانہ اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔ ارسلان شاہ نے ایک گھونٹ لے کر گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھا اور احمر سلطانہ کا ایک ہاتھ بڑی محبت سے اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔ ''زریاب کے معاملے میں جو قدغن میں تم پر لگا رہا ہوں ڈارلنگ، ایسی ہی قدغن تمہیں مجھ پر بھی لگانا چاہیے تھی۔''

''کیوں؟..... کیا مطلب؟''

''حالات کا تجزیہ انسان کو بڑی سفاکی سے کرنا چاہیے ڈارلنگ!..... عورت اگر کسی جذبے کے ہاتھوں بے بس ہوسکتی ہے تو کیا مرد نہیں ہوسکتا؟ بلکہ..... مرد تو زیادہ ہوسکتا ہے..... اگرچہ عورت آج پہلے سے زیادہ آزاد ہوچکی ہے لیکن مرد تو اس سے بہت زیادہ آزاد ہے۔ اسے تو رسیاں تڑا

کر بھاگنے کا موقع ہی نہیں ملنا چاہیے۔''

''آپ بہت زیادہ پی گئے ہیں۔ ابھی میں دیکھ چکی ہوں، آپ کی چال میں لڑکھڑاہٹ بھی آگئی ہے۔''

''لیکن دماغ ابھی نہیں لڑکھڑایا۔'' ارسلان شاہ اچانک کچھ اداس نظر آنے لگا۔ ''مجھے تم سے بہت محبت ہے ڈارلنگ!'' ارسلان شاہ کی پلکیں نم ہوگئیں۔ ''میں تم سے جدا ہوجانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔''

''آپ کو یقیناً اب بہت نشہ ہوگیا ہے۔''

ارسلان شاہ نے فوراً گلاس اٹھایا پھر احمر سلطانہ اسے روکنے کی کوشش کرتی رہ گئی لیکن وہ باقی شراب بھی اپنے حلق میں انڈیل گیا۔

''لعنت ہے..... لعنت ہے مجھ پر!'' ارسلان شاہ نے کہا اور گلاس اتنی زور سے دیوار پر مارا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکھر گیا۔

احمر سلطانہ کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب وہ ارسلان شاہ کو اس طرح بہکتے دیکھ رہی تھی۔

''لیٹ جایئے اب آپ..... سونے کی کوشش کیجیے۔''

احمر سلطانہ نے بستر سے اٹھ کر ارسلان شاہ کے شانوں پر دباؤ ڈالا اور اسے لٹانے کی کوشش کی۔

ارسلان شاہ نے اس کی کلائیاں پکڑ کر اسے ایک جھٹکے سے پھر اپنے پہلو میں بٹھالیا اور بولا۔ ''تم ٹھیک سمجھ رہی ہو ڈارلنگ!..... مجھے واقعی نشہ ہوگیا ہے لیکن یہی تو میں چاہتا تھا۔ میرے بولنے میں اب لکنت بھی آگئی ہے۔ یہ جو میں نے گلاس توڑا ہے تو اس طرح دراصل میں نے اپنا غصہ اتارا ہے اس پر میں بہت برا ہوں ڈارلنگ!..... پلیز، مجھے معاف کر دینا۔'' ارسلان شاہ نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے۔

''یہ کیا کررہے ہیں آپ؟'' احمر سلطانہ روہانسی ہوگئی اور اس نے ارسلان شاہ کے جڑے ہوئے ہاتھ ایک دوسرے سے الگ کیے۔

ارسلان شاہ اس سے لپٹ گیا اور اس کے شانے پر سر رکھ کر باقاعدہ آنسوؤں سے رونے لگا۔ ''میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں ڈارلنگ!''

احمر سلطانہ نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ ''میں جانتی ہوں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے آپ کو..... بس اب لیٹ جایئے، سونے کی کوشش کیجیے۔''

''نیند اب مجھے کہاں آتی ہے ڈارلنگ؟ وہ اب میرے حواس پر..... میرے اعصاب پر بری طرح چھا گئی ہے۔''

''کوئی خواب میں نظر آتی ہے کیا؟'' احمر سلطانہ دھیرے سے ہنسی۔ اب وہ ارسلان کی باتوں کو صرف گہرے نشے کے اثرات سمجھ رہی تھی۔

''نہیں ڈارلنگ!'' ارسلان شاہ نے روتے ہوئے سسکی سی لی۔ ''مجھے اتنا نشے میں مت سمجھو۔ میں سچ کہہ رہا ہوں تم سے۔ وہ میری اسٹینوگرافر ہے۔ اس کا نام صبیحہ ہے۔''

اب احمر سلطانہ کچھ چونکی۔ اس نے ارسلان شاہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے ذرا سا دھکیلا اور اس کا چہرہ اپنے سامنے لانے کی کوشش کی لیکن وہ اس سے بری طرح لپٹ گیا۔

''نہیں..... نہیں۔'' وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ ''صبیحہ نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا ہے کہ میں تم سے نظر ملاسکوں۔ پاگل کر دیا ہے اس نے مجھے۔ میرا سکون چھین لیا ہے مجھ سے۔''

''پلیز!..... آپ میری طرف دیکھیں تو سہی۔'' احمر سلطانہ کی آواز کچھ بھرا گئی۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ صرف اسی قسم کی باتوں کا اظہار کرنے کے لیے ارسلان شاہ نے زیادہ پی لی تھی۔

''پلیز!'' احمر سلطانہ نے ایک بار پھر زبردستی اس کا چہرہ اپنے سامنے کرنا چاہا لیکن ارسلان شاہ مڑ کر بستر پر اوندھے منہ گر گیا۔ اب اس کے آنسو تکیے میں جذب ہورہے تھے اور وہ بڑبڑائے جارہا تھا۔ ''صرف دو مہینے میں وہ میرے اعصاب پر چھا گئی ہے۔ اسے یوں میری زندگی میں نہیں آنا چاہیے تھا اس نے تو مجھے ایک بے وفا شوہر بنا دیا..... مجھے اس قابل نہیں رہنے دیا کہ میں اپنی احمر سے نظریں ملاسکوں۔''

اب احمر سلطانہ کا ہاتھ ارسلان شاہ کے سر پر تھا اور وہ اس طرح بیٹھی ہوئی تھی جیسے اسے سکتہ ہوگیا ہو۔ وہ جانتی تھی کہ دو مہینے پہلے ارسلان شاہ نے صبیحہ نام کی ایک لڑکی اسٹینوگرافر کی حیثیت سے ملازم رکھی ہے۔ خود ارسلان شاہ نے ہی اسے اس بارے میں بتایا تھا اور وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کسی لڑکی سے ارسلان شاہ کی وابستگی اتنی شدید بھی ہوسکتی ہے۔

لیکن اب تو سب کچھ روز روشن کی طرح عیاں تھا۔

ارسلان شاہ تکیے میں سر دیے روتا اور بڑبڑاتا رہا پھر شاید اسے بھی پتا نہیں چلا ہوگا کہ اس کے آنسو کب رکے تھے اور کب وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا تھا لیکن احمر سلطانہ سکتے کی سی حالت میں بیٹھی ہی رہ گئی۔ نیند تو اس کی آنکھوں سے کافور ہوچکی تھی۔

☆☆☆

دوسری صبح ارسلان شاہ کی آنکھ کھلی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا اور بخار کی سی کیفیت تھی۔ یہ احساس اسے بس چند لمحوں کے لیے ہوا، اس کے بعد اس کی آنکھیں پھر بند ہوگئیں، وہ سو گیا۔ یہ بات اسے بعد میں معلوم ہوئی کہ ڈاکٹر نے اسے کوئی مسکن دوا بھی دی تھی جس کے باعث اس پر نیند کا غلبہ رہا تھا اور وہ پھر سو گیا تھا۔

ارسلان شاہ کے بخار کی شدت سے پریشان ہو کر احمر سلطانہ نے صبح ساڑھے سات بجے ہی ڈاکٹر کو بلا لیا تھا۔ اس وقت ارسلان شاہ پر غشی سی طاری تھی۔ وہ ڈاکٹر کے کسی سوال کا جواب بھی ٹھیک سے نہیں دے سکا تھا۔ احمر سلطانہ ہی ڈاکٹر کو بتاتی رہی تھی۔

گیارہ بجنے والے تھے جب ارسلان شاہ کی آنکھ دوبارہ کھلی۔ اس نے احمر سلطانہ کو بستر پر اپنے قریب ہی دیکھا۔ اس نے صبح ڈاکٹر کی آمد سے پہلے ہی شب خوابی کا لباس اتار کر ساڑی باندھ لی تھی۔

''خدا کا شکر ہے کہ اب آپ کا بخار بہت کم ہوگیا ہے۔'' احمر سلطانہ نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

ارسلان شاہ کو ایک دھندلے سے خواب کی طرح یاد تھا کہ ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا تھا لیکن رات کی باتیں اسے خاصی حد تک یاد تھیں۔ اس نے احمر سلطانہ کو صبیحہ کے بارے میں بتا دیا تھا لیکن یہ اسے یاد نہیں رہا کہ اس نے اس بارے میں کتنی تفصیل بیان کی تھی۔ صبیحہ کا ذکر کرتے وقت شراب اس پر پوری شدت سے اثر انداز ہو چکی تھی۔ وہ احمر سلطانہ سے نظریں چرانے لگا۔

''میں نے آپ کے دفتر فون کر دیا ہے۔'' احمر سلطانہ نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ''بتا دیا ہے کہ آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے اس لیے آپ دفتر نہیں آسکیں گے۔''

''ہوں۔'' ارسلان شاہ کی نظریں جھکی رہیں۔

''میری طرف تو دیکھیے!'' احمر سلطانہ نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔

''مجھے معاف کر دینا احمر!'' ارسلان شاہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''میں قصوروار ہوں تمہارا۔''

''ارے!'' احمر سلطانہ ہنس پڑی۔ ''یہ آج آپ کیسی باتیں کرنے لگے۔'' اس کا لہجہ خوشگوار ہی رہا۔ ''آپ تو ہمیشہ یہی کہتے رہے ہیں کہ یہ ایک بے اختیار جذبہ ہے جو کسی وقت بھی، کسی کے دل میں بھی پیدا ہو سکتا ہے اور انسان اس کے سامنے بے بس ہوتا ہے پھر آپ قصوروار کیسے ہوگئے؟''

ارسلان شاہ نے مضطربانہ انداز میں احمر سلطانہ کی طرف دیکھا اور اسے کچھ تعجب ہوا کہ احمر سلطانہ شوخ سے انداز میں مسکرا رہی تھی۔

''وہ خوب صورت تو بہت ہوگی جس نے آپ کا دل چرا لیا۔'' وہ بولی۔

''یقین کرو، وہ تم سے زیادہ خوب صورت نہیں ہے۔'' ارسلان شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اور یہ میں تمہیں خوش کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔''

''میں نہیں مانوں گی۔ اتنا دیوانہ تو کر دیا ہے اس نے آپ کو۔''

''نہیں احمر!'' ارسلان شاہ سنجیدہ رہا۔ ''محبت کا جذبہ کسی خوب صورتی سے مشروط نہیں ہوتا۔ کوئی اور بات بھی یہ تحریک پیدا کر سکتی ہے لیکن۔'' ارسلان شاہ نے غور سے احمر سلطانہ کی طرف دیکھا۔ ''مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ تمہاری پیشانی پر ناگواری کی کوئی لکیر نہیں ہے۔''

''وہ کیوں ہوگی جناب!'' احمر سلطانہ دھیرے سے ہنسی۔ ''مجھے آپ کے اس خیال سے سو فیصد اتفاق ہے کہ یہ جذبہ کسی شادی شدہ انسان کے دل میں بھی اور کسی بھی عمر میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اپنی دوست فیروزہ کی مثال میرے سامنے ہے۔ وہ بھی اپنے شوہر کو بہت چاہتی ہے۔ جس طرح ابھی آپ نے خود کو قصوروار کہا ہے، اسی طرح وہ بھی اسی قسم کے احساسات میں مبتلا تھی لیکن آپ سے گفتگو کے بعد میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ خود کو اس معاملے میں اپنے شوہر کا مجرم نہ سمجھے۔''

''ہاں احمر!'' ارسلان شاہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس قسم کی باتیں کہی تو تھیں اور واقعی اس قسم کے معاملے میں میرا نظریہ یہی ہے لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم نے میرے اس نظریے سے سو فیصد اتفاق کر لیا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ صبیحہ کے بارے میں جاننے کے بعد تمہیں دکھ ہوگا اور تم مجھے اس کے لیے بھی معاف نہیں کرو گی۔''

''جب مجھے آپ کے نظریے سے اتفاق ہے تو میں آپ کو قصوروار کیوں سمجھوں؟'' احمر سلطانہ نے کہا۔ ''آپ مجھے اس کے بارے میں تفصیل سے بتایئے۔''

''رات کو میں نے تمہیں کیا کیا بتایا تھا؟''

''اتنی زیادہ تو پی گئے تھے آپ..... بتاتے کیا خاک! آپ بس یہ بڑبڑاتے ہوئے مدہوش ہو کر سو گئے تھے کہ آپ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔''

ارسلان شاہ سوچ میں پڑ گیا۔ محبت کے بارے میں اپنے خیالات اور ان سے احمر سلطانہ کے متفق ہونے کے باوجود اس کے دل میں ایک چور تھا۔ اس کے خیال کے مطابق ایسا تو تھا کہ اس نے احمر سلطانہ کے حقوق میں سے کوئی چوری کی تھی۔ وہ چوری اس کی کوئی شعوری کوشش نہ سہی لیکن چوری تو تھی۔

احمر سلطانہ کے اصرار پر ارسلان کو صبیحہ کے بارے میں سب کچھ بتانا پڑا۔

''اوہ!'' سب کچھ سن کر احمر سلطانہ کے منہ سے نکلا۔ ''تو وہ ابھی تک آپ کی محبت سے بے خبر ہے؟''

''ہاں۔'' ارسلان شاہ نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن بعض باتوں کی وجہ سے اس کے ذہن میں ایک گرہ سی ضرور پڑ گئی ہے۔ شاید وہ یہ سمجھنے لگی ہے کہ پیسے والے بعض لوگوں کی طرح میں بھی ایک عیاش طبع انسان ہوں۔''

''تو آپ اس کی غلط فہمی دور کر دیں اپنے جذبات کا اظہار کر دیں اس پر۔''

ارسلان شاہ نے بڑی محبت سے احمر سلطانہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولا۔ ''تمہارے اس انداز کی وجہ سے مجھ میں یہ ہمت بڑھتی جا رہی ہے کہ میں تم سے صبیحہ کے بارے میں باتیں کرتا رہوں لیکن یہ مجھے بڑا عجیب سا لگ رہا ہے کہ ایک شوہر اپنی بیوی سے اپنی کسی محبت کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے۔''

''عجیب تو لگے گا۔'' احمر سلطانہ مسکرائی۔ ارسلان شاہ جیسے شوہر دنیا میں شاید اِکا دُکا ہی ہوں گے۔ مرد تو اپنی بیوی سے چھپ کر دنیا بھر میں گل چھرے اُڑاتے پھرتے ہیں اور بیوی کو اگر پتا چل جائے تو بھی وہ پروا نہیں کرتے اور مرد ہونے کے ناتے اسے اپنا حق سمجھتے ہیں۔

''تو پھر دنیا میں احمر سلطانہ جیسی بیویاں بھی اِکا دُکا ہوں گی جو.....''

''ہم صبیحہ کی باتیں کر رہے تھے۔'' احمر سلطانہ نے اس کی بات کاٹی۔

''ہاں۔'' ارسلان شاہ نے ایک طویل سانس لی۔ ''جب وہ پہلی مرتبہ میرے سامنے آئی تھی، تبھی وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی لیکن اس وقت میں نے اس بارے میں کچھ سوچا نہیں تھا۔ ایسا تو بیس پچیس دن بعد ہوا جب اچانک مجھ میں یہ احساس پیدا ہوا کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ گو کہ اس جذبے کے بارے میں ہمیشہ میرا ایک نظریہ رہا ہے اور فیروزہ کی وجہ سے میں تم سے اظہار خیال بھی کرتا رہا ہوں لیکن اب میں اس مرحلے سے گزر رہا ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ایسا کیوں ہو جاتا ہے، کیسے ہو جاتا ہے۔''

''یہ سب اس وقت نہ سوچیے۔'' احمر سلطانہ بولی۔ ''بس صبیحہ کے بارے میں بتاتے رہیے مجھے۔''

''وہ لڑکی۔'' ارسلان شاہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ابتدائی چند دن میں ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں ہے جو ملازمت کے بہانے گھر سے نکلتی ہی اس لیے ہیں کہ اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے لیے کوئی مناسب شخص تلاش کریں یا کوئی موٹی اسامی پھانسیں۔ اس نے یہ ملازمت حد درجہ مجبوری کے عالم میں کی تھی۔ میں نے چاہا کہ اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی ابتدا اسے کوئی تحفہ دینے سے کروں۔ مجھے اندازہ یہ بھی تھا کہ اگر میں نے اسے کوئی مہنگا تحفہ دیا تو وہ اسے قبول نہیں کرے گی اور ابتدا ہی میں میرے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کر لے گی۔ اسی لیے.....''

''آپ نے اس کی تنخواہ کے موقع پر گل دستے کا تحفہ دیا۔''

''ہاں!..... یہ میں ابھی تمہیں بتا چکا ہوں اور جب اس نے دوسرے دن مجھ سے اپنے بھائی کی حالت کے بارے میں بتایا اور ڈاکٹر کے بارے میں مشورہ کیا تو.....''

''یہ سب تو ابھی آپ مجھے بتا چکے ہیں۔'' احمر سلطانہ نے پھر اس کی بات کاٹی۔

''ہاں۔'' ارسلان شاہ نے سر ہلایا۔ ''دہرایا میں نے اس لیے کہ اس کے بعد کے حالات میری حوصلہ شکنی کرتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اب اگر میں نے اس سے کچھ کہا تو اسپتال کے بل کی وجہ سے وہ یہ سمجھے گی کہ میں اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ وہ بات چیت کے دوران میں یہ بھی کہہ چکی ہے کہ اگر کبھی اس کی عزت نفس پر تازیانہ لگا تو وہ اسے برداشت نہیں کر سکے گی اور شاید خودکشی ہی کر لے۔''

''مجھے یقین ہے..... آپ کی ایسی کوئی خواہش نہیں ہو گی جس سے اس کی عزت نفس پر تازیانہ لگے اگر کسی لڑکی کو یہ معلوم ہو کہ کوئی اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اس کی عزت نفس پر تازیانہ کیوں لگے گا؟''

شادی کی بات پر ہی ارسلان شاہ نے چونک کر احمر سلطانہ کی طرف دیکھا تھا۔

''چونک کیوں گئے؟'' احمر سلطانہ بولی۔ ''کیا میرا یہ یقین غلط ہے کہ آپ کے دل میں شادی کے علاوہ کوئی خواہش تھی؟''

ارسلان شاہ نے مضطربانہ انداز میں پہلو بدلا۔ اسی وقت احمر سلطانہ نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اس کے بخار کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

''آپ کا بخار بالکل اتر چکا ہے۔'' وہ خوش ہو کر بولی ''میرا اندازہ بالکل ٹھیک تھا کہ زیادہ شراب نوشی اور ڈپریشن کی وجہ سے آپ کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔ شراب کا اثر تو خیر زائل ہونا ہی تھا لیکن مجھ سے صبیحہ کے بارے میں تفصیل سے بات کر کے آپ کا ڈپریشن بھی ختم ہو گیا ہے۔''

''ڈپریشن تو تمہارے رویے کی وجہ سے ختم ہوا ہے۔'' ارسلان شاہ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں شدید پریشان تو اس لیے تھا کہ جب تمہیں اس کا پتا چلے گا تو کیا ہو گا۔''

''چلیں ٹھیک ہے۔'' احمر سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ ''اب تو آپ کو پتا چل گیا کہ اس سے مجھ پر کوئی ایسا ردعمل نہیں ہوا جو آپ کے لیے پریشانی کا سبب بنے۔''

''تم بہت گریٹ ہو ڈارلنگ۔'' ارسلان شاہ نے اس طرح احمر سلطانہ کی طرف دیکھا جیسے خود کو اس کا احسان مند محسوس کر رہا ہو۔

''یہ فضول باتیں چھوڑیے۔ ذکر تھا صبیحہ سے آپ کی شادی کا۔''

ارسلان شاہ کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ اس حد تک سوچنے کا مجھے موقع ہی نہیں ملا۔ میں تو بس اس خیال سے پریشان ہوتا رہا ہوں کہ صبیحہ سے اپنے جذبات کا اظہار کرنا میرے لیے ناممکن ہو چکا ہے۔''

''وہ تو کسی طرح آپ کو کرنا ہی پڑے گا۔ کل رات آپ خود کہہ چکے ہیں کہ آپ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔''

''یہ تو بس کہنے کی بات ہے۔'' ارسلان شاہ نے کہا۔ ''انسان کو زندہ تو رہنا ہی پڑتا ہے۔''

''مگر ایسا انسان بے سکون تو ہو جاتا ہے۔''

ارسلان شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بس تو پھر۔'' احمر سلطانہ نے کہا۔ ''صبیحہ سے آپ کی شادی تو ہونا ہی چاہیے۔''

''تمہاری زبان سے یہ بات سن کر مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔'' ارسلان شاہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اس طرح تمہارے دل میں کیا ایک خلش نہیں رہ جائے گی۔''

احمر سلطانہ نے نظریں جھکا لیں۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی اور یکایک بہت سنجیدہ نظر آنے لگی تھی۔ وہ کچھ توقف سے بولی۔ ''میرا خیال ہے..... مجھے اعتراف کر لینا چاہیے کہ ایک خلش تو میرے دل میں اسی وقت پیدا ہو چکی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ دھیرے دھیرے میں اس صورتِ حال کو خوش دلی سے قبول کر لوں گی۔ ویسے بھی ہمارے یہاں مرد کی دوسری شادی کوئی معیوب بات نہیں اور اگر اسے خرابی کہا بھی جائے تو جب انسان کے سامنے دو خرابیاں آ جائیں تو ان میں سے کوئی ایک برائی قبول کرنا ہی پڑتی ہے۔ اس وقت انسان سوچتا ہے کہ کم برائی کس میں ہے اور زیادہ برائی کے مقابلے میں کم برائی کو تسلیم کر لیتا ہے یا قبول کر لیتا ہے۔ میں بھی اپنے دل کی خلش تو برداشت کر سکتی ہوں لیکن۔'' احمر سلطانہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔ ''یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ آپ ایک بے سکون زندگی گزاریں۔''

ارسلان شاہ اس وقت اتنا جذباتی ہو گیا کہ نقاہت محسوس کرنے کے باوجود اٹھ کر اس نے احمر سلطانہ کو اپنے سینے سے لگا لیا، اور احمر سلطانہ کی آنکھوں سے ٹپکنے والے دو آنسو اس کے شانے پر گرے۔

''نہیں احمر!'' وہ شدید جذباتی لہجے میں بولا۔ ''میں تمہیں یہ دکھ نہیں دوں گا۔''

''مجھے کوئی دکھ نہیں ہو گا اس سے۔'' احمر سلطانہ نے اس سے الگ ہوتے ہوئے کہا اور اپنی آنکھیں خشک کرتی ہوئی مسکرائی۔

''ابھی سے تمہاری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔'' ارسلان شاہ بولا۔

''آپ کی بے سکونی کا اندیشہ ہے میرے ان آنسوؤں کا سبب۔''

''ابھی تم اپنے دل کی خلش کا اعتراف بھی کر چکی ہو۔''

''اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ خلش دھیرے دھیرے دور ہو جائے گی اور پھر آپ تو دکھ کی بات کر رہے ہیں۔ دکھ اور خلش میں فرق ہے۔''

''بس الفاظ کا فرق ہے۔ ایسے معاملات کی خلش اور دکھ میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔''

''اس پر بحث نہ کیجیے ارسلان!'' احمر سلطانہ نے سنجیدگی سے قطعیت کے ساتھ کہا۔ ''صبیحہ سے آپ کی شادی تو ہو کر رہے گی۔ آپ بات کیجیے صبیحہ سے۔''

''میں نہیں کر سکتا احمر!'' ارسلان شاہ نے بے بسی سے کہا۔

''کیوں نہیں کر سکتے؟''

''میری چند باتوں کی وجہ سے وہ میری طرف سے کچھ کھنک تو گئی ہے اس لیے اگر میں نے اس سے شادی کے بارے میں بات کی تو وہ یہی سمجھے گی کہ میں اسے دھوکا دے کر اپنے جال میں پھنسانا چاہتا ہوں اور پھر وہ کچھ ایسی آزاد خیال لڑکی بھی نہیں ہے کہ اپنی شادی کا فیصلہ خود کر سکے۔ یہ فیصلہ وہ اپنے والدین پر چھوڑے گی اور وہ آخر کیوں چاہیں گے کہ اپنی بائیس سالہ بیٹی کی شادی ایک پینتالیس سالہ شخص سے کر دیں۔''

''آپ پہلے صبیحہ سے تو بات کرلیں۔ اسے تو اپنے جذبات سے آگاہ کر دیں۔''

''میں ایسا نہیں کر سکوں گا احمر!'' ارسلان شاہ پریشان سا نظر آیا۔ ''اگر میں ناکام رہا..... میرا مطلب ہے، صبیحہ نے کچھ اور سمجھ لیا تو کیا ہوگا۔ ابھی تو صرف بے سکونی ہی مجھے اپنا مقدر نظر آرہی ہے، پھر میں ساری زندگی اس اذیت کا بھی شکار رہوں گا کہ صبیحہ نے مجھے غلط سمجھا۔''

اس مرتبہ احمر سلطانہ کچھ نہیں بولی۔ وہ کچھ متفکر نظر آنے لگی تھی۔

☆☆☆

عاصم اب بہت خوش تھا۔ اسے اب ہر چیز کھانے کی اجازت تھی اور اس نے کھائی بھی تھی۔ متلی کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا تھا۔ اسے اتنا صحت مند پا کر اس کے والدین بھی خوش تھے اور صبیحہ بھی۔

اسپتال سے عاصم کو گھر پہنچانے کے بعد جب وہ گیارہ بجے کے قریب دفتر پہنچی تو اسے معلوم ہوا کہ ارسلان شاہ اس دن دفتر نہیں آیا تھا۔ اطلاع آئی تھی کہ اس کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ اسے یہ بھی پتا چلا کہ دفتر کے چند خاص لوگ ارسلان شاہ کی مزاج پرسی کے لیے، لنچ کے وقفے میں اس کے گھر جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ صبیحہ بھی جا سکتی تھی اور شاید اسے جانا بھی چاہیے تھا کیونکہ وہ ارسلان شاہ کی احسان مند تھی لیکن اس نے وہاں جانے میں ہچکچاہٹ محسوس کی۔ اس کے دل میں کچھ شکوک تھے۔ ارسلان شاہ نے کبھی بھی اس سے کھل کر کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کی بعض باتیں ایسی تھیں جو صبیحہ کو ہمیشہ کھٹکتی رہی تھیں۔ اسے ایسا محسوس ہوتا رہا تھا جیسے ارسلان شاہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔

کیا چاہتا تھا؟

اس سوال کے جواب میں صبیحہ کے دل و دماغ میں وہ شبہات کلبلانے لگتے تھے جن کا اظہار اس کے باپ نے کیا تھا۔ دو ایک بار تو اس کے جی میں آئی بھی تھی کہ وہ یہ ملازمت چھوڑ دے لیکن اس خیال کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں بے بسی کی نمی بھی آگئی تھی۔ ایک طرف اس کا بھائی اسپتال میں ارسلان شاہ کی ہی وجہ سے زیر علاج تھا اور دوسری طرف وہ اپنے گھر کی دگرگوں حالت سے بھی بے خبر نہیں تھی۔ انہی باتوں کی وجہ سے، جب اسے ملازمت چھوڑنے کا خیال آیا تھا تو اس نے خود کو تسلی دی تھی کہ اس کے خدشات بے بنیاد بھی تو ہو سکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اس خیال کا سبب اپنی مجبوری کا احساس ہے جو اس کے لاشعور میں بھی موجود ہے۔ غرضیکہ وہ اس ایک مہینے میں شدید مخمصے کا شکار رہی تھی۔

لنچ کے وقفے سے ذرا دیر پہلے اسے معلوم ہوا کہ جو لوگ ارسلان شاہ کے گھر جانا چاہتے تھے، ان سے فون پر کہا گیا تھا کہ اب ارسلان شاہ کی طبیعت سنبھل گئی ہے اور کیونکہ ڈاکٹروں نے انہیں مکمل بیڈ ریسٹ کی تاکید کی ہے اس لیے کوئی ان کی مزاج پرسی کے لیے نہ آئے۔

دفتر سے چھٹی کے بعد جب وہ گھر پہنچی تو بھی اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ ارسلان شاہ نے ایک دن پہلے اس سے کہا تھا کہ وہ کسی وقت اپنے بھائی کو دفتر لائے کیونکہ وہ اسے دیکھنا چاہتا ہے لیکن صبیحہ یہ بات اپنے والدین سے کہنے کی ہمت ہی نہیں کر سکی تھی۔ وہ دونوں اور خصوصاً اس کا والد اس بات کو نہ جانے کیا کیا معنی پہناتا۔ دراصل خود صبیحہ کے ذہن میں یہ خیال آچکا تھا کہ ارسلان شاہ اس سے بے تکلف ہونے کے لیے شاید اب اس طرح پیش قدمی کرنا چاہتا ہو۔

اس دن صبیحہ گھر پہنچنے کے بعد بھی کچھ الجھی الجھی سی رہی تو اس کی ماں نے اسے ٹوکا۔ ''کس سوچ میں پڑی ہوئی ہو آج؟''

''کوئی خاص بات نہیں ہے اماں!'' صبیحہ نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''کوئی بات تو ضرور ہے۔'' ساجدہ نے کہا۔ ''اپنے باس سے تو آج تمہاری کوئی خاص بات نہیں ہوئی؟''

''آج تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ ان کی طبیعت کچھ خراب تھی، آج وہ دفتر ہی نہیں آئے۔''

''یہ کیا جواب دیا تم نے کہ آج تو کوئی بات نہیں ہوئی..... کیا آج سے پہلے کوئی بات ہوئی تھی؟''

صبیحہ نے کن انکھیوں سے رشید خاں کی طرف دیکھا جو ان ماں بیٹی کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

عاصم بھی وہیں موجود تھا اور ان سب کی طرف سے غافل کوئی کہانی پڑھنے میں منہمک تھا۔

''جواب دو، چپ کیوں ہوگئیں؟'' ساجدہ نے صبیحہ کو غور سے دیکھا۔

صبیحہ کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ ان لوگوں کو ارسلان شاہ کی خواہش سے آگاہ کرے یا نہ کرے۔

''جواب دو نا اپنی ماں کو۔'' رشید خاں سرد لہجے میں بولا۔

''وہ... دراصل.....'' صبیحہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''کل میں نے باس کو بتایا تھا کہ آج عاصم کو اسپتال سے ڈسچارج کردیا جائے گا۔ اس پر انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا۔''

اپنا نام سنتے ہی عاصم نے چونک کر سر اٹھایا اور ان لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔

صبیحہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''وہ چاہتے ہیں کہ میں کسی دن عاصم کو اپنے ساتھ دفتر لے جاؤں۔ وہ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔''

عاصم خوش ہو کر ایک دم بولا۔ ''تو مجھے لے چلو نا باجی۔''

''ہاں اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔'' ساجدہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

''حرج تو ہے۔'' رشید خاں تڑختی ہوئی سی آواز میں بولا۔ ''اُنگلی پکڑ کر پونچا پکڑنے کی مثال نہیں سنی تم نے؟''

''تمہارے دماغ میں تو سوئی بس ایک ہی جگہ اٹک گئی ہے۔'' ساجدہ نے کچھ ناگوار لہجے میں کہا۔

''اور میں خود کو غلطی پر نہیں سمجھتا۔'' رشید خاں بولا اور پھر اس نے صبیحہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم عاصم کو وہاں نہیں لے جاؤ گی۔''

عاصم اپنے باپ کا منہ تکتا رہ گیا اور صبیحہ نے بھی نظریں جھکا لیں۔ ساجدہ ایک نظر اپنے شوہر پر ڈال کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

اس رات جب صبیحہ اپنے بستر پر لیٹی تو بھی اس کا ذہن اُلجھا ہوا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ سوچا کہ ان حالات میں تو وہ ہمیشہ الجھنوں ہی کا شکار رہے گی جس سے اس کے اعصاب پر دباؤ بڑھتا رہے گا اور اعصاب کوئی دباؤ کسی خاص حد تک ہی برداشت کرتے ہیں اور پھر ٹوٹنے بکھرنے لگتے ہیں۔

پھر یوں ہی صبیحہ کو ناصر کا خیال آگیا۔ وہ اس کے عزیزوں ہی میں سے تھا لیکن اس کے والد نے تجارت میں اتنی ترقی کرلی تھی کہ اب ان کا گھر پیسوں میں کھیل رہا تھا۔ غرور کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی اور اسی لیے رشید خاں نے ان لوگوں سے برائے نام سا تعلق رکھا تھا۔ صبیحہ، ناصر کو پسند تھی۔ اسے کوئی سال بھر پہلے معلوم ہوا تھا کہ ناصر اس سے شادی کا خواہش مند تھا مگر اس کے والدین اس شادی پر اس لیے آمادہ نہیں تھے کہ رشید خاں ایک غریب شخص تھا۔ ناصر کی ماں کسی بڑے گھر کی بہو لانے کی خواہش مند تھی۔ ناصر نے اپنے ماں باپ کا رویہ سمجھتے ہوئے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ صبیحہ اسے پسند تو تھی لیکن وہ اس کی محبت میں گرفتار نہیں ہوا تھا اور صبیحہ تو بہت پہلے اپنی شادی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ چکی تھی۔ لیکن اس وقت اسے خیال آیا کہ اگر ناصر سے اس کی شادی ہو جائے تو اس کے ذریعے ارسلان شاہ کا وہ سارا روپیا ادا کیا جا سکتا ہے جو اس نے عاصم کے علاج پر صرف کیا تھا۔

صبیحہ کو یہ سب خیال تو آئے لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آسکا کہ ایسا کیونکر ممکن ہے؟ ناصر کے گھر والے تو کیا، خود رشید خاں کو ان لوگوں سے زیادہ میل جول پسند نہیں تھا۔ ایسے کسی اتفاق کے امکانات مفقود تھے کہ دونوں گھر ایک دوسرے سے قریب ہو جاتے اور صبیحہ کی شادی ناصر سے ہو جاتی.....

☆☆☆

ارسلان شاہ نے دوسرے دن سے دفتر جانا شروع کردیا اور پھر کئی دن گزر گئے۔ احمر سلطانہ ان دنوں خاصی دل گرفتہ سی رہی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ارسلان شاہ اب کم صم سا رہنے لگا تھا۔ احمر سلطانہ سے چھپ کر اس نے کچھ زیادہ شراب نوشی بھی شروع کردی تھی، لیکن احمر سلطانہ سے یہ بات چھپی رہ نہیں سکی تھی۔ اس نے ارسلان شاہ سے کئی بار کہا تھا کہ وہ کسی طرح بھی صبیحہ کو اپنے جذبات سے آگاہ کردے لیکن وہ ایسا نہیں کرسکا تھا۔

ارسلان شاہ پر کیا گزر رہی تھی اور آگے چل کر اس کا کیا حال ہوسکتا تھا، احمر سلطانہ اس کا اندازہ اچھی طرح اس لیے لگا سکتی تھی کہ وہ خود بھی محبت کے اس عذاب میں گرفتار تھی۔

زریاب اس کے حواس پر اتنا چھا چکا تھا کہ اب وہ اس کے خوابوں میں بھی آنے لگا تھا۔ جس سے اس کی پریشانی اور بڑھ گئی تھی۔ ارسلان شاہ کے بارے میں تو اسے اندازہ تھا کہ وہ مرد ہے اس لیے اس کی محبت کا کوئی مثبت نتیجہ نکل سکتا ہے، بس کوشش میں کچھ دیر سویر ہوسکتی تھی لیکن خود اس کی محبت کیا رنگ لائے گی؟ اس کا کوئی اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ یہ بات تو ناممکن ہی تھی کہ وہ ارسلان شاہ سے طلاق لے کر زریاب سے شادی کرلیتی۔ اس نے اپنے دل کو اچھی طرح ٹٹول لیا تھا۔ جتنی محبت اسے زریاب سے تھی، اس سے کم ارسلان شاہ سے بھی نہیں تھی۔ اسے خود بھی یہ بڑا عجیب سا لگتا

تھا کہ وہ دو مردوں سے یکساں محبت کا شکار تھی۔ زریاب کے لیے ارسلان شاہ کو چھوڑنا یا ارسلان شاہ کی خاطر زریاب کو بھلا دینا اس کے لیے یکساں ناممکن تھا اور یہ بات ممکن نہیں تھی کہ وہ دونوں کو اپنا لیتی۔ ارسلان شاہ تو مرد تھا۔ وہ ایک سے زیادہ شادیاں کر سکتا تھا لیکن وہ عورت تھی۔ یہ اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ دو مردوں کو اپنا لیتی۔

ارسلان شاہ کے اس نظریے سے وہ بالکل متفق نہیں تھی کہ شوہر ہوتے ہوئے کسی مرد سے تعلقات عورت کی جسمانی کیمسٹری میں کوئی فرق نہیں لاتے لہٰذا وہ یہ بات اپنے شوہر سے چھپا بھی سکتی ہے۔ احمر سلطانہ کی دانست میں تو یہ اس کی ارسلان شاہ سے ایک سنگین بے وفائی ہوتی۔ وہ ایسی کسی حرکت کو اپنا ایک سنگین جرم سمجھتی۔

احمر سلطانہ کی اس بڑھتی ہوئی اذیت سے زریاب بھی بے خبر نہیں تھا۔

''شاید مجھے یہاں سے کہیں دور چلا جانا چاہیے!'' اس نے احمر سلطانہ سے کہا جب وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔

احمر سلطانہ نے یاس انگیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا آپ مجھے بھول سکیں گے زریاب؟''

''کوشش کروں گا۔''

''لیکن میں تو کوشش کر کے بھی آپ کو نہیں بھلا سکتی۔ وہ تو میرے لیے اور زیادہ اذیت ناک ہو جائے گا کہ میں آپ کا چہرہ دیکھنے کو بھی ترس جاؤں۔ نہیں زریاب! آپ کو میری قسم ہے۔ آپ کہیں نہیں جائیں گے۔''

زریاب نے بڑے کرب سے احمر سلطانہ کی طرف دیکھا۔ ''سمجھنے کی کوشش کرو احمر!'' وہ پہلی مرتبہ اتنی بے تکلفی سے بولا تھا۔

بے اختیار احمر سلطانہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اسی وقت زریاب کو بھی اپنی بے تکلفی کا احساس ہو گیا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''آئی ایم سوری! مجھے اس طرح مخاطب نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''کیوں نہیں ہونا چاہیے تھا؟'' احمر سلطانہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ قائم رہی۔ ''اس وقت آپ کا اس طرح مخاطب کرنا مجھے بہت اچھا لگا ہے۔ آخر محبت کرتے ہیں آپ مجھ سے!''

''محبت تو تم بھی کرتی ہو مجھ سے!..... پھر تم کیوں مجھے اس طرح مخاطب کر رہی ہو۔''

''اب نہیں کروں گی۔''

''لیکن اس بے تکلفی سے بھی کیا حاصل احمر!'' زریاب نے بڑے کرب سے کہا۔ ''میں تمہاری اذیت بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہوں اور اب یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی ہے۔''

''برداشت کی ہر حد سے گزر کر ہی شاید ہماری محبت کسی انجام تک پہنچ سکے گی۔''

''کس انجام تک؟''

''یہ سوچ سوچ کر تو میرا دماغ پتھرانے لگتا ہے۔''

''تم تو دوہری اذیت میں گرفتار ہو احمر!..... ارسلان کے لیے بھی تو بہت پریشان رہتی ہو تم۔''

''ہاں زریاب!'' احمر سلطانہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میں دیکھ رہی ہوں کہ وہ بڑے ضبط سے کام لے رہے ہیں۔ لیکن یہ ضبط انہیں کہاں لے جائے گا، اس کا اندازہ میں ہی نہیں، تم بھی لگا سکتے ہو۔ ہم تینوں ایک ہی قسم کی کشتی میں سوار ہیں۔''

''اسی لیے تو تم مجھ سے زیادہ اذیت کا شکار ہو گئی ہو۔''

احمر سلطانہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کچھ سوچتی ہوئی کسی طرف دیکھنے لگی.....

☆☆☆

ان دنوں میں صبیحہ نے محسوس کیا تھا جیسے ارسلان شاہ کچھ بدل گیا ہو۔ اس سے ذرا بھی بے تکلفانہ گفتگو کرنے سے وہ مکمل طور پر گریز کرنے لگا تھا۔ پہلے تو صبیحہ محسوس کرتی تھی کہ وہ اسے اپنے کمرے میں بلانے کے لیے غیر ضروری ڈکٹیشن کرانے لگتا تھا مگر ان دنوں میں اس نے ایسی کوئی بات نہیں محسوس کی تھی۔ مسکرانا تو شاید وہ بھول ہی گیا تھا۔ عاصم کو دفتر بلانے کے سلسلے میں بھی اس نے دوبارہ کوئی بات نہیں کی تھی۔

ارسلان شاہ کو اگر کوئی کاروباری پریشانی ہوتی تو صبیحہ کے علم میں آ جاتی۔ آخر وہ اسی کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ بہت کچھ اس کے علم میں رہتا تھا۔

تو اب آخر اسے کیا ہو گیا ہے؟ اس سوال میں وہ اکثر اُلجھی رہتی۔

ایک دن دفتر سے واپسی پر اس نے اپنے گھر کے تقریباً سامنے ہی ایک قیمتی کار کھڑی دیکھی۔ اسے ذرا بھی گمان نہیں ہوا کہ اس کار میں کوئی اس کے گھر آیا ہوگا۔ وہ اپنی سوچ میں ڈوبی گھر کے دروازے پر پہنچی اور اسی وقت دروازہ کھلا۔ وہ چونک گئی۔ ساڑی میں ملبوس پختہ عمر کی ایک خوب صورت عورت کے ساتھ صبیحہ کو اپنی ماں ساجدہ بھی نظر آئی تھی۔ ایسا لگا

تھا جیسے ساجدہ اسے دروازے تک چھوڑنے آئی ہو۔

ارسلان شاہ کی بیوی کبھی دفتر نہیں آئی تھی اس لیے صبیحہ اسے پہچان نہیں سکی۔

احمر سلطانہ اسے دیکھ کر مسکرائی اور پھر ساجدہ سے بولی۔ ''یہ یقیناً آپ کی بیٹی صبیحہ ہوگی۔''

''جی ہاں۔'' ساجدہ بہت سنجیدہ نظر آرہی تھی۔

احمر سلطانہ نے بڑی محبت سے صبیحہ کے شانے پر ہاتھ رکھا اور مسکراتی ہوئی بولی۔ ''مجھے امید ہے کہ تم سے بہت جلد ملاقات ہوگی۔'' پھر اس نے ساجدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا بہن، اب اجازت دیں۔ صبیحہ کے والد صاحب سے آپ آج ہی بات کر لیجیے گا۔''

''جی۔'' ساجدہ کی آواز بہت دھیمی تھی۔

''خدا حافظ۔'' احمر سلطانہ نے کہا، پھر صبیحہ کا شانہ تھپک کر کار کی طرف بڑھ گئی۔

شوفر کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے جلدی سے اتر کر کار کی پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور احمر سلطانہ کار میں بیٹھنے لگی۔ صبیحہ کی نظر اسی کی طرف لگی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت چونکی جب اس نے اپنی ماں کی آواز سنی۔ ''چلو اندر آؤ۔''

صبیحہ چونک کر جلدی سے گھر میں داخل ہوگئی اور ساجدہ نے دروازہ بند کر دیا۔

''یہ کون تھیں اماں؟'' صبیحہ نے حیرت سے پوچھا۔

''بیٹھ کر اطمینان سے بات کریں گے۔''

''ابا نہیں ہیں کیا؟'' صبیحہ نے گھر میں سناٹا محسوس کیا تھا۔

''نماز پڑھنے گئے ہیں۔'' ساجدہ نے جواب دیا۔

عاصم کے بارے میں پتا چلا کہ ساجدہ نے اس سے ابھی ذرا دیر پہلے بازار سے کچھ بسکٹ وغیرہ منگوائے تھے اور وہ دے کر جلدی سے چلا گیا تھا۔ ان دنوں وہ محلے کے کچھ بچوں کے ساتھ میدان میں کرکٹ کھیلنے جانے لگا تھا۔

اطمینان سے بیٹھنے کے بعد ساجدہ نے کہا۔ ''اس نے بھی یہی کہا تھا کہ تم اسے نہیں جانتیں اور اس نے بھی تمہیں کہیں نہیں دیکھا۔''

''یہ تھیں کون؟'' صبیحہ نے بے چینی سے پوچھا۔

''تمہارے دفتر کے مالک ارسلان شاہ صاحب کی بیوی۔''

''کیا!'' صبیحہ بڑی شدت سے چونکی تھی۔

''ہاں۔'' ساجدہ نے کہا۔ ''احمر سلطانہ نام بتایا ہے اس نے اپنا۔''

صبیحہ حیرت سے ماں کی طرف دیکھتی رہی۔ یہ جان کر اس کا سارا جسم سننانے لگا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک بہت ہی غیر معمولی بات تھی کہ ارسلان شاہ کی بیوی اس کے گھر آئے۔

''عجیب ہی عورت ہے۔'' ساجدہ نے کہا۔ ''کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ دنیا میں ایسی عورتیں بھی ہوں گی۔''

''آخر بات کیا ہے اماں؟'' صبیحہ کی حیرت اپنی جگہ برقرار تھی۔

''کیا کوئی عورت ایسی ہو سکتی ہے جو اپنے شوہر کی دوسری شادی کرانا چاہے؟'' ساجدہ بولی۔

''کیا مطلب؟''

''وہ اپنے شوہر کا رشتہ لے کر آئی تھی۔''

صبیحہ اب بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''سمجھ میں نہیں آیا تمہاری!'' ساجدہ بولی۔ ''اس گھر میں وہ آخر کس کے لیے رشتہ لے کر آسکتی ہے؟''

صبیحہ چونکی اور اس کا جسم ایک بار پھر سنسنا گیا۔

''ارسلان صاحب تمہیں پسند کرنے لگے ہیں۔ تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' ساجدہ بولی۔ ''تمہارے ابا کا شبہ کسی حد تک ٹھیک ہی نکلا۔''

صبیحہ کی نظریں جھک گئیں۔ اس کے اعصاب بری طرح ہل گئے تھے۔ اس کے سان گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اچانک ایسی کوئی صورت حال سامنے آجائے گی۔

''احمر سلطانہ کہہ رہی تھی کہ وہ شادی کے سترہ سال بعد بھی ماں نہیں بن سکی اس لیے وہ خود بھی چاہتی ہے کہ ارسلان صاحب کی دوسری شادی ہو جائے اور خدا انہیں صاحب اولاد کر دے۔'' ساجدہ نے بتایا۔ ''اور تم نے آج تک چھپائے رکھا کہ ارسلان صاحب تم سے کیا چاہتے ہیں۔''

''میں قسم کھاتی ہوں اماں!'' صبیحہ کی آواز لرز رہی تھی۔ ''مجھ سے کبھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔''

''تمہارے جواب پر میں اس لیے یقین کیے لیتی ہوں کہ احمر سلطانہ بھی یہی کہہ رہی تھی۔ عاصم کی بیماری کے سلسلے میں ایک بڑی رقم ایڈوانس دینے کے بعد وہ ڈر گئے تھے کہ انہوں نے تم سے اس قسم کی بات کی تو تم یہ سمجھو گی کہ پہلے اتنی بڑی رقم دے کر انہوں نے تم پر اسی لیے دباؤ ڈال دیا تھا کہ تم انکار نہ کر سکو۔''

صبیحہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ اپنی شادی کے معاملے میں گفتگو کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ہاں اس پر وہ متعجب ضرور تھی کہ اس بات پر اسے غصہ نہیں آیا تھا کہ ارسلان شاہ

اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

ساجدہ اپنی اور احمر سلطانہ کی باتیں بتاتی رہی۔ صبیحہ نے چپ سادھے رکھی۔

''ہاں ایک بات ضرور ہے۔'' ساجدہ بولی۔ ''تمہارے ابا جو سمجھ رہے تھے، وہ تو غلط نکلا۔ ارسلان صاحب اس قسم کے آدمی نہیں ہیں جو نوجوان لڑکیوں کو پھانس کر انہیں اپنا کھلونا بنائے رکھتے ہیں۔ کسی سے شادی کا خواہش مند ہونا تو کوئی بری بات نہیں ہے۔ احمر سلطانہ کہہ رہی تھی کہ میں تمہارے ابا سے بات کر کے اچھی طرح سوچ سمجھ لوں اور یہ دباؤ ہم ہرگز محسوس نہ کریں کہ تمہیں ایک بڑی رقم ایڈوانس دی جا چکی ہے۔ ہمیں اس شادی سے انکار کا پورا پورا حق ہے اور اگر تم کسی دوسری جگہ ملازمت کرنا چاہو تو ارسلان شاہ صاحب کی طرف سے یہ دباؤ ہرگز نہیں ہوگا کہ پہلے تم ایڈوانس کی رقم ایڈجسٹ کرواؤ۔''

صبیحہ بدستور نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔

☆☆☆

''یہ تم کیا کر بیٹھی ہو احمر!'' ارسلان شاہ نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہی کیا ہے میں نے جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔'' احمر سلطانہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''جب آپ صبیحہ سے خود بات نہیں کر سکے تو اب اس کے علاوہ اور کیا راستہ رہ گیا تھا کہ میں ہی کوئی قدم اٹھاؤں۔''

''یہ ٹھیک نہیں ہوا۔'' ارسلان شاہ بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

''یہی ٹھیک ہوا ہے۔'' احمر سلطانہ نے زور دے کر کہا۔ ''آپ کی جو حالت ہوتی جا رہی ہے، وہ میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ آپ جواب اتنی شراب پینے لگے ہیں، اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ زیادہ تو نہیں لیکن آپ کی صحت کچھ گری ضرور ہے اس ایک مہینے میں اگر ایسا ہی چلتا رہا تو آگے چل کر کیا ہو گا۔''

''لیکن مجھے نظر نہیں آتا کہ وہ لوگ اس شادی کے لیے تیار ہوں گے۔'' ارسلان شاہ نے کہا۔ ''مجھے تو یہ ڈر ہے کہ صبیحہ ملازمت نہ چھوڑ دے پھر تو میں اسے کبھی دیکھ بھی نہیں سکوں گا۔''

''ہو سکتا ہے وہ لوگ فوری طور پر اس کے لیے تیار نہ ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ میں انہیں کسی نہ کسی طرح آمادہ کر ہی لوں گی۔''

ٹہلتے ٹہلتے ارسلان شاہ احمر سلطانہ کے سامنے رکا اور اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر جذباتی لہجے میں بولا۔

''تم بہت گریٹ ہو میری جان!''

''میں تو بہت معمولی عورت ہوں ارسلان!'' احمر سلطانہ نے بھرائی ہوئی آواز اور کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔ ''اپنے جذبات کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی ہوں۔''

''کیا مطلب!'' ارسلان شاہ نے اسے تعجب سے دیکھا۔

احمر سلطانہ چونک پڑی۔ اس وقت اس کے دماغ میں ایسے خیالات تھے جو وہ ارسلان شاہ پر ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''یہ میری جذباتیت ہی تو ہے جو میں آپ کی یہ حالت نہیں دیکھ سکتی اگر میں جذباتی نہ ہوتی تو ایک خودغرض عورت ہوتی جو آپ کی دوسری شادی کرانے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوتی۔''

''یہی تو تمہارا بڑا پن ہے ڈارلنگ! خودغرض لوگوں کو کبھی بڑا نہیں سمجھا جا سکتا۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ بات آپ کی ٹھیک ہے یا میری۔'' احمر سلطانہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

ارسلان شاہ اس کے لیے بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔ وہ بہت کچھ کہتا رہا لیکن اس کی باتیں سننے کے ساتھ احمر سلطانہ کے دماغ میں کچھ اور خیالات بھی چکراتے رہے۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر دو فیصلے کیے تھے۔ ان میں سے پہلا فیصلہ یہ تھا کہ ارسلان شاہ اور صبیحہ کی شادی کرانے کے لیے اپنی کوششوں میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گی اور وہ کامیابی حاصل کرنے کے بعد اسے اپنے بارے میں بھی ایک فیصلہ کرنا تھا۔

☆☆☆

رشید خاں کی آواز کچھ اونچی ہوئی تو صبیحہ جلدی سے اٹھ کر درمیانی دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ عاصم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو صبیحہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''یہ نہیں ہو سکتا ساجدہ!'' رشید خاں سخت لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''ہرگز نہیں۔''

''اس میں حرج کیا ہے، شادی تو کوئی بری بات نہیں۔''

''شادی تو بری بات نہیں مگر ان دونوں کی عمروں میں کتنا فرق ہے۔ دنیا تو یہی سمجھے گی کہ ہم نے دولت کے لالچ میں.....''

''دنیا تو کسی حالت میں بھی چین نہیں لینے دیتی۔'' ساجدہ کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''رہی عمر کی بات تو ایسی مثالیں دنیا میں موجود ہیں۔''

صبیحہ دروازے سے کان لگائے سنتی رہی۔ ساجدہ پوری

پوری کوشش کررہی تھی کہ رشید خاں کو اس شادی پر آمادہ کرلے۔ ان کی بحث خاصی لمبی ہوگئی۔ کھڑے کھڑے صبیحہ کی ٹانگیں دکھنے لگیں لیکن وہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ بحث کس نتیجے تک پہنچتی ہے۔

''اچھا!'' آخر رشید خاں نے شکست خوردہ اور مضمحل لہجے میں کہا۔ ''لیکن میری دو شرطیں ہوں گی۔''

''وہ کیا؟''

''ایک تو صبیحہ سے پوچھ لو۔ کیا وہ اتنی عمر کے آدمی سے شادی کرنے کے لیے اور خاص طور سے کسی کی دوسری بیوی بننے کے لیے تیار ہوگی؟''

''کل کرلوں گی میں یہ بات اور دوسری شرط کیا ہے؟''

''ہم اپنی زندگی کے سلسلے میں یہ گوارا نہیں کریں گے کہ شادی کے بعد صبیحہ ہمارے گھریلو اخراجات اٹھائے۔ ارسلان شاہ کیونکہ مالک ہے اس لیے وہ اپنے دفتر میں مجھ جیسے اپاہج کو بھی نوکری دے سکتا ہے۔'' رشید خاں کچھ جذباتی ہوگیا تھا اور اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ ''میری صرف ٹانگیں بے کار ہیں، ہاتھ تو کام کرسکتے ہیں میرے۔''

رشید خاں کی اس جذباتیت پر صبیحہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور پھر وہ دروازے پر کھڑی نہیں رہ سکی۔

''کیا بات ہے باجی!'' عاصم نے اس وقت پوچھا جب وہ بستر پر لوٹ آئی تھی۔

''کچھ نہیں بھیا! سو جاؤ تم۔'' صبیحہ نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

''واہ!'' عاصم بولا۔ ''جب کوئی بات نہیں ہے تو آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں آگئے؟''

عاصم کو سمجھانے بجھانے میں صبیحہ کو دقت تو ہوئی لیکن کسی نہ کسی طرح وہ اسے ٹالنے میں کامیاب رہی۔

ان حالات میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ صبیحہ کو جلدی نیند آجاتی۔ وہ جاگتی اور سوچتی رہی لیکن یہ فیصلہ کرنا اسے بہت دشوار معلوم ہوا کہ وہ اس سلسلے میں اپنی ماں کو کیا جواب دے گی۔

دوسری صبح وہ ناشتے کے بعد معمول کے مطابق دفتر جانے کے لیے تیار ہونے لگی تو اس کا ذہن خاصا الجھا ہوا تھا۔ وہ پریشان تھی کہ اب وہ ارسلان شاہ کا سامنا کس طرح کرے گی۔

''آج تم دفتر نہ جاؤ۔'' ساجدہ نے اس سے کہا۔

صبیحہ چونکی۔ ''کیوں اماں؟''

''کچھ ضروری بات کرنا ہے تم سے!''

صبیحہ چپ ہوگئی۔ وہ جانتی ہی تھی کہ ساجدہ کو اس سے کیا بات کرنا ہے۔ اس وقت اس نے یہ سکون ضرور محسوس کیا کہ وہ ارسلان شاہ کا سامنا کرنے سے بچ گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد عاصم محلے کے لڑکوں سے ملنے گھر سے چلا گیا تو ساجدہ صبیحہ کے پاس آبیٹھی۔ صبیحہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ ساجدہ نے احمر سلطانہ کا ذکر کرنے کے بعد اپنی اور رشید خاں کی باتیں کچھ اختصار کے ساتھ بیان کرنا شروع کیں۔ صبیحہ اس طرح سنتی رہی جیسے ان باتوں سے بے خبر ہو۔

آخر میں ساجدہ نے کہا۔ ''میں تو اس شادی کے لیے خوشی سے تیار ہوں صبیحہ! یہ سوچ سوچ کر میرا دماغ بہت پریشان ہوگیا ہے کہ ملازمت کرتے کرتے تم تو بوڑھی ہوجاؤ گی اور یہی بات میں نے تمہارے باپ کو بھی سمجھائی ہے اور وہ بھی تیار ہوگئے ہیں مگر ان کی دو شرطیں ہیں۔''

ساجدہ نے شرطیں بھی بتائیں اور بولی۔ ''لیکن پہلے تم یہ بتادو کہ تمہیں تو اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟''

☆☆☆

صبیحہ گیارہ بجے تک دفتر نہیں پہنچی تو ارسلان شاہ نے پریشان ہوکر فون پر اپنی بیوی سے رابطہ کیا۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا احمر کہ تم نے صبیح قدم نہیں اٹھایا ہے۔ اب تو میں صبیحہ کی صورت دیکھنے کو بھی ترس جاؤں گا۔''

''ایسی کیا بات ہوگئی؟'' احمر سلطانہ نے پریشان ہوکر پوچھا۔

''صبیحہ آج ابھی تک دفتر نہیں آئی اور اب تو گیارہ بج چکے ہیں، اب کیا آئے گی۔''

''اس کی وجہ کچھ اور بھی ہوسکتی ہے ارسلان! ممکن ہے وہ لوگ اس شادی کے لیے تیار ہوگئے ہوں اس لیے انہوں نے صبیحہ کو دفتر بھیجنا مناسب نہ سمجھا ہو، یا صبیحہ کی طبیعت کچھ خراب ہوگئی ہو، یا.....''

''ان باتوں سے میری ڈھارس نہیں بندھ سکتی۔'' ارسلان شاہ نے نڈھال سے لہجے میں کہا۔

''اچھا تو میں ابھی صبیحہ کے گھر جاکے معلوم کرتی ہوں کہ قصہ کیا ہے۔ میں کہہ کر تو آئی تھی کہ رات کو آؤں گی لیکن آپ اتنے پریشان ہیں تو میں ابھی چلی جاتی ہوں۔''

''کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' ارسلان شاہ نے اداس اور تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

دوسری طرف سے احمر سلطانہ نے سلسلہ منقطع کردیا۔ ارسلان شاہ نے ریسیور رکھنا چاہا تو وہ اس کے ہاتھ سے

چھوٹ کر میز پر گر پڑا۔ اس نے دوبارہ ریسیور اٹھا کے کریڈل پر رکھا اور کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے چہرے پر گہری اداسی تھی۔

انٹرکام کی گھنٹی بجی تو وہ چونکا۔ اس نے بڑے اکتائے ہوئے انداز میں انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔ ''ہیلو!''

''آئی ایم سوری سر!..... مجھے دفتر آنے میں آج کچھ دیر ہوگئی۔''

صبیحہ کی آواز سن کر ارسلان شاہ اچھل پڑا۔

''کوئی بات نہیں صبیحہ!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''کبھی ہو جاتا ہے ایسا۔''

''کیا میں آپ کے کمرے میں آسکتی ہوں؟''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تو ارسلان شاہ نے بھی ریسیور رکھا۔ صبیحہ کی آواز سن کر وہ خوش تو ہوا تھا لیکن کچھ پریشانی بھی لاحق ہوئی تھی۔ صبیحہ کو ظاہر ہے کہ سب کچھ معلوم تو ہو گیا ہوگا، اب اس کا نہ جانے کیا ردعمل سامنے آئے۔ انٹرکام پر ارسلان شاہ نے اس کی جو آواز سنی تھی، اس سے کچھ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بہت سپاٹ سے لہجے میں بات کی تھی صبیحہ نے!

جب وہ کمرے میں آئی تو ارسلان شاہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرانا چاہتا تھا لیکن صبیحہ کو بے حد سنجیدہ دیکھ کر مسکرا نہ سکا۔

صبیحہ میز کے قریب آ کھڑی ہوئی اور ارسلان شاہ اس کا منہ تکتا رہا۔

''کیا میں بیٹھ جاؤں سر؟'' صبیحہ آہستہ سے بولی۔

''اوہ، ہاں!'' ارسلان شاہ چونک پڑا۔ ''بیٹھو!''

''شکریہ۔'' صبیحہ بیٹھ گئی۔ ''مجھے دیر اس لیے ہوگئی کہ اماں نے مجھے کچھ باتیں کرنے کے لیے روک لیا تھا۔''

ارسلان شاہ نے کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلا اور صبیحہ کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ پھر بولی۔ ''آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ اماں نے مجھے کیا باتیں کرنے کے لیے روکا ہوگا۔''

ارسلان شاہ کچھ نہیں بول سکا۔

صبیحہ کچھ توقف سے بولی۔ ''اماں میری مرضی جاننا چاہتی تھیں۔''

''ہوں۔'' ارسلان شاہ نے پھر پہلو بدلا۔

''سر!'' صبیحہ سنجیدگی سے بولتی رہی۔ ''بہت دن پہلے ہی جب مجھے اپنے گھر کے حالات کا اندازہ ہو چکا تھا۔ میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا کہ لڑکیاں شادی بھی کرتی ہیں اور اس طرح ان کی نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اس لیے جب آج میری اماں نے میری مرضی جاننا چاہی تو میں نے فیصلے کا اختیار ان پر اور ابا پر چھوڑ دیا۔''

''اوہ!'' ارسلان شاہ کچھ پُرسکون ہوا۔ ''تمہاری مرضی جاننے کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمہارے والدین کو اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''جی!'' صبیحہ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ''لیکن ابا کی ایک شرط ہے۔''

''کیا؟'' ارسلان شاہ نے جلدی سے کہا۔ ''مجھے ان کی ہر شرط منظور ہوگی۔''

''لیکن مجھے وہ منظور نہیں ہے۔''

ارسلان شاہ کا چہرہ اتر گیا۔ ''کیوں؟''

صبیحہ نے اسے پہلے تو شرط سے آگاہ کیا، پھر بولی۔ ''میں یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ میرے والد آپ کے دفتر میں کوئی معمولی ملازمت کریں۔''

''معمولی ملازمت کیوں کریں گے وہ!'' ارسلان شاہ نے پرجوش انداز میں کہا۔ ''میں انہیں جنرل منیجر بنا دوں گا۔''

''یہ منصب سنبھالنے کی صلاحیت تو ان میں نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں ہے؟'' ارسلان شاہ کا انداز پرجوش ہی رہا۔ ''پڑھے لکھے آدمی ہیں وہ!..... تم مجھے بتا چکی ہو کہ وہ پہلے کہاں کام کرتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تھوڑی سی تربیت کے بعد اس منصب کے اہل ہو جائیں گے۔''

''ابھی تو آپ مجھ سے شادی کے لیے اس سے زیادہ بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں لیکن بعد میں.....''

''تم کوئی اندیشہ اپنے ذہن میں نہ آنے دو صبیحہ! میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی بات سے پھر جاتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ جو کچھ کہا ہے، وہ کیا بھی ہے۔ ایسا ناممکن ہے کہ میں بعد میں بدل جاؤں۔'' ارسلان شاہ کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا اور شدید جذباتی انداز میں بولا۔ ''میری رفاقت میں اگر میری وجہ سے تمہیں ایک کانٹا بھی چبھا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔ تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں کہ تمہارے لیے میرے جذبات کیا ہیں اور ان دنوں میں مجھ پر کیا گزرتی رہی ہے اگر تم یقین کرو تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ.....''

ارسلان شاہ بولتا ہی چلا گیا۔ صبیحہ کے بارے میں اپنے جذبات، اس کے بارے میں اپنی سوچ، اپنے خدشات، سبھی کچھ بیان کر ڈالا اس نے اور اس رات کی تفصیل تو اس نے بڑی وضاحت سے بیان کی جب اس نے اپنی بیوی احمر

سلطانہ کو صبیحہ سے اپنی محبت کے بارے میں بتایا تھا۔

صبیحہ ہکا بکا سی بیٹھی وہ سب کچھ سنتی رہی۔ یہ اندازہ لگانا اس کے لیے واقعی ناممکن تھا کہ گزشتہ کچھ عرصے میں ارسلان پر جو یہ سب کچھ گزر گیا تھا۔ صبیحہ اس کی حرکات وسکنات اور اس کے لب و لہجے میں سچائی کی چمک بھی دیکھ رہی تھی اور جذبات کی طغیانی بھی.....

سب کچھ بیان کر دینے کے بعد ارسلان شاہ اس طرح اپنی کرسی پر بیٹھا جیسے تھک کر گر گیا ہو۔ اس کی سانس بھی کچھ پھولی ہوئی تھی۔ وہ صبیحہ کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''مجھے تو ہمت ہی نہیں رہ گئی تھی کہ تم سے کچھ کہہ سکوں اور احمر مجھے کچھ بتائے بغیر تمہارے گھر پہنچ گئی تھی۔''

''بہت محبت کرتی ہیں وہ آپ سے۔'' صبیحہ ان باتوں سے شدید متاثر ہوئی تھی۔

''وہ میرے لیے مر بھی سکتی ہے۔'' ارسلان شاہ نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں بھی اس کے لیے اپنی جان دینے سے گریز نہیں کر سکتا۔ میں بہت صاف گوئی سے تمہیں بتا دوں کہ جتنی محبت مجھے تم سے ہے، اتنی ہی محبت مجھے احمر سے بھی ہے اگر تم مجھ سے شادی کرنے سے انکار کرتی ہو تو جو کچھ میں نے ابھی بیان کیا، اس سے تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ باقی زندگی مجھ پر کیا گزرے گی لیکن اگر تم مجھ سے شادی کر لیتی ہو تو یہ خواہش کبھی نہ کرنا کہ میں تمہیں احمر سے زیادہ اہمیت دوں۔ میرے لیے تم دونوں ہمیشہ یکساں رہو گی۔''

صبیحہ کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ بہت دب گئی ہو۔ اتنا بوجھ تو اس پر اس رقم کا بھی نہیں تھا جو اس نے ارسلان شاہ کے دفتر سے ایڈوانس لی تھی۔

ارسلان شاہ جیسا محبت کرنے والا شوہر اپنی زندگی میں اسے شاید مل ہی نہیں سکتا تھا.....

☆☆☆

احمر سلطانہ جب صبیحہ کے گھر پہنچی تھی تو یہ جان کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا تھا کہ صبیحہ کے والدین اس شادی کے لیے تیار ہو گئے تھے اور صبیحہ کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن رشید خاں کی ایک شرط تھی جس کی وجہ سے صبیحہ خود ارسلان شاہ سے بات کرنے دفتر گئی تھی۔

احمر سلطانہ مطمئن ہو کے گھر لوٹ آئی۔ صبیحہ کے دیر سے دفتر جانے کا سبب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا لیکن اس کی وہ تاخیر ارسلان شاہ کی پریشانی کا سبب بن گئی تھی لیکن اب، احمر سلطانہ کے خیال کے مطابق ارسلان شاہ کو اپنے دفتر میں مطمئن ہونا چاہیے تھا۔ گھر پہنچ کے اس نے ارسلان شاہ کو فون کیا اور اسے معلوم ہوا کہ صبیحہ چند ہی لمحے پہلے اس کے کمرے سے گئی ہے۔ ارسلان شاہ نے احمر سلطانہ کو اپنی اور صبیحہ کی گفتگو کے بارے میں بھی بتایا۔

شام کو جب وہ گھر لوٹا تو بے حد خوش تھا۔ اس نے احمر سلطانہ کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے احمر سلطانہ کو گود میں اٹھائے اٹھائے ناچنا شروع کر دے گا۔

''کیا بچوں کی سی حرکت کر رہے ہیں۔'' احمر سلطانہ ہنستی ہوئی بولی۔

ارسلان شاہ نے اسے بستر پر بٹھا دیا اور اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ''شاید دنیا کا کوئی شخص اپنی بیوی پر اتنا ناز نہیں کر سکتا جتنا میں کر سکتا ہوں۔''

''یہ باتیں چھوڑیے۔'' احمر سلطانہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ ''اب اپنی شادی کے بارے میں سوچیے۔''

''ہو سکے تو آج ہی میرا نکاح کروا دو۔'' ارسلان شاہ اس طرح گڑگڑایا جیسے احمر سلطانہ اس کی بیوی نہیں بلکہ اس کی سرپرست ہو۔

احمر سلطانہ ہنسنے لگی۔ ''نہیں جناب! کچھ دن تو آپ بھی اور تڑپیے!''

''بھی؟'' ارسلان شاہ بولا۔ ''کیا مطلب؟''

احمر سلطانہ کا دل دھک سے ہو گیا۔ ''بھی'' وہ اس خیال سے کہہ بیٹھی تھی کہ کسی کی محبت میں تڑپ تو وہ بھی رہی تھی۔

ایک بار احمر سلطانہ پہلے بھی ارسلان شاہ سے ایسی کوئی بات کہہ چکی تھی اور اس نے کسی بہانے وہ معاملہ ٹال دیا تھا۔ اسی طرح اسے اس وقت بھی بات بنانا پڑی اور اس نے اپنی دانست میں ارسلان شاہ کو سوچنے کا موقع نہیں دیا اور بولی۔ ''شادی کی تیاری کے سلسلے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''اس میں سوچنا کیا ہے احمر!'' ارسلان شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میری عمر پینتالیس سال ہو چکی ہے اور میں دوسری شادی کر رہا ہوں۔ کوئی دھوم دھام کرنا تو مضحکہ خیز بات ہو گی۔ میں بس تمہیں اور دو تین دوستوں کو لے کر صبیحہ کے گھر جاؤں گا اور نکاح کے بعد اسے لے آؤں گا۔ ہاں اگر وہ لوگ کوئی دھوم دھام کرنا چاہیں تو غالباً مجھے کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔''

''میں رات کو دوبارہ جاؤں گی صبیحہ کے گھر! انہی سے پوچھوں گی کہ ان کا کیا پروگرام رہے گا۔''

''یہ ٹھیک ہے۔''

''زریاب آپ سے کچھ ناراض ہیں۔ انہیں تو منایئے! کیا نکاح میں انہیں نہیں لے جائیں گے؟''

احمر سلطانہ کی بات پر ارسلان شاہ کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ ''کیوں؟ وہ کیوں ناراض ہے مجھ سے؟''

''وہ اسی گھر میں ہیں لیکن کتنے دن ہو گئے، آپ ان سے نہیں ملے۔''

''تم جانتی ہی ہو ڈارلنگ! میں صبیحہ کے معاملے میں ذہنی طور پر کتنا اُلجھا رہا تھا۔ چلو ابھی چلتے ہیں اس کے کمرے میں۔''

''چلیے!'' احمر سلطانہ کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ ''پچھلے دنوں ان کا ہاتھ بھی جل گیا تھا۔ اب تو خیر ٹھیک ہو گیا ہے۔''

''کیسے جل گیا تھا؟'' ارسلان شاہ نے چونک کر پوچھا۔

احمر سلطانہ نے جواب میں وہی کہہ دیا جو بہانہ زریاب نے سوچا تھا۔

وہ دونوں زریاب کے کمرے میں پہنچے۔ ارسلان شاہ وہاں کافی دیر تک بیٹھا اور تینوں میں باتیں ہوتی رہیں۔ زریاب سارے حالات سے واقف تھا لیکن اس نے اس پر حیرت کا اظہار کیا کہ ارسلان شاہ دوسری شادی کر رہا تھا اور احمر سلطانہ اس پر معترض بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

''کوئی دھوم دھام تو ہمیں بھی نہیں کرنا ہے بہن!'' رشید خان نے کہا۔

رات کا وقت تھا اور احمر سلطانہ ذرا ہی دیر پہلے ان کے گھر پہنچی تھی۔ اس گفتگو کے دوران میں صبیحہ اور عاصم کو اس کمرے سے ہٹا دیا گیا تھا لیکن دوسرے کمرے میں عاصم دروازے سے کان لگائے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے اس سے بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ اس کی باجی کی شادی کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں۔

صبیحہ نے وہ باتیں سننے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ اس نے دو ایک مرتبہ عاصم پر اچٹتی سی نظر تو ڈالی تھی مگر اس سے کچھ کہا نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد احمر سلطانہ چلی گئی تو رشید خاں کے چہرے پر سوچ بچار کے آثار زیادہ گہرے ہو گئے.....

''اب تو تمہیں خوش ہونا چاہیے۔'' ساجدہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''رشید خاں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم خوش ہو؟''

''کیوں؟... میں خوش کیوں نہیں ہوں گی۔ ماں باپ پر بیٹی کا بوجھ کم تو نہیں ہوتا۔''

''ہاں یہ تو ضرور ہے کہ بیٹی کی ایک ذمے داری ہوتی ہے والدین پر، لیکن جو کچھ تمہارے دل میں ہے، وہ تم زبان پر نہیں لا رہی ہو۔ میری طرح تمہیں بھی یہ احساس ضرور ہو گا کہ یہ شادی ہماری غربت کا نتیجہ ہے۔ ہم جیسے لوگوں کی لڑکیاں جب ملازمت کے لیے گھر سے قدم نکالتی ہیں تو ان کی شادیاں کچھ اسی قسم کی ہوتی ہیں۔''

''لیکن ہمیں یہ خوشی تو ہونا چاہیے کہ ہماری بیٹی ایک خوش حال زندگی گزارے گی۔''

''وہ تو گزارے گی لیکن ہم پر کیا بیتے گی۔ ہمیں اپنے اردگرد کیسی کیسی آوازیں سنائی دیں گی۔ یہ تو بہ ظاہر بڑا اچھا لگ رہا ہے کہ میں جنرل منیجر بن جاؤں گا لیکن رہوں گا تو اپنے داماد کا ملازم!''

ساجدہ تھوڑی سی اداس نظر آئی۔ ''اب بیٹی کی خاطر کچھ کڑوی گولیاں تو ہمیں نگلنا ہی پڑیں گی۔ ہم جیسے ماں باپ اس کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔''

رشید خاں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''کاش میں اسی دن صبیحہ کی ملازمت ختم کرا دیتا جب وہ گل دستہ لے کر آئی تھی۔''

''تو اس سے کیا ہوتا۔ احمر سلطانہ تو اس کے بعد بھی ہمارے گھر آتیں۔ ارسلان شاہ اس سے پہلے ہی ہماری بیٹی کو پسند کرنے لگے تھے۔''

''شاید اس وقت تک ارسلان شاہ کے جذبات میں اتنی شدت نہیں آئی ہو گی۔''

''چلو مان لیتی ہوں میں تمہاری بات، لیکن صبیحہ کی ملازمت چھڑانے کے بعد اس گھر کا کیا ہوتا!''

''یہی تو میں نے ابھی کہا تھا۔ یہ شادی، اس کا سبب ہماری لاچاری ہے۔ یہ تو سوچنا ہی پڑے گا کہ میں ارسلان شاہ کی ملازمت سے کس طرح بچ سکتا ہوں۔''

''اگر تم چاہو تو یہ شادی اب بھی رکوائی جا سکتی ہے۔'' ساجدہ نے کچھ ہچکچاہٹ سے کہا۔ ''نکاح نہیں ہوا ہے ابھی..... بیٹی ابھی گھر ہی میں ہے۔''

رشید خاں کچھ نہیں بولا۔ اس کے متفکر چہرے پر بے بسی کی لکیریں کچھ اور گہری ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

نکاح کے لیے ایک ہفتے بعد کی تاریخ طے ہوئی تھی لیکن احمر سلطانہ نے فوراً ہی اس کی تیاریاں اس طرح شروع کی تھیں کہ بنگلے کا ایک کشادہ کمرا جو باقاعدہ کسی قسم کے استعمال

''اب یہی ہونا چاہیے احمر!'' زریاب نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب تک تو میں سوچتا رہا تھا کہ جیسی کشتی میں ہم دونوں سوار ہیں، ویسی ہی کشتی ارسلان کا بھی مقدر بن گئی ہے۔ ہماری طرح اب وہ بھی زندگی بھر تڑپے گا لیکن اب کہانی بدل گئی ہے۔ وہ سکون کی آغوش میں چلا گیا ہے تو اب ہم آخر کیوں ڈوبے رہیں کرب کے اندھیرے میں۔''

''نہیں..... نہیں.....'' احمر سلطانہ کی آواز دھیمی بھی تھی اور لرزتی ہوئی بھی۔ اس کا جسم عجیب سے انداز میں سنسنانے لگا تھا۔ اتنی شدت سے وہ زریاب کے قریب کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس قرب کی آگ میں اس کی قوت ارادی جلنے لگی۔ وہ خود کو پگھلتا ہوا محسوس کرنے لگی تھی۔ اس آگ میں اس کی قوت مدافعت خاکستر ہو سکتی تھی اور شاید ایک کمزور لمحہ اس کی زندگی میں آنے والا تھا۔

''اب مجھ سے گریز نہ کرو احمر!'' زریاب کی آغوش کچھ اور تنگ ہوگئی۔ ''ارسلان تو کہہ بھی چکا ہے کہ اس سے عورت کی جسمانی کیمسٹری میں کوئی فرق نہیں آتا لہٰذا وہ اس سے بے خبر ہی رہے گا۔''

اسی وقت احمر سلطانہ کے دماغ کے اندرونی حصے میں ایک شدید ضرب لگی۔ وہ ضرب اس کے ضمیر کے تازیانے کی تھی جس نے اس کے وجود کو بری طرح ہلا دیا۔ زریاب کے قرب سے اس کا پگھلتا ہوا وجود یک لخت اپنی اصل حالت میں آگیا اور اس کے اندر ایک خوف ناک سی وحشت بھر گئی۔ ایسی شدید وحشت کہ جب اس نے زریاب کو دھکا دیا تو اس طرح جیسے اس کے جسم میں کوئی حیوانی قوت در آئی ہو۔ وہ زریاب کی آغوش سے نکل گئی اور زریاب کینوس سے جا ٹکرایا۔

کینوس یا زریاب کو احمر سلطانہ گرتے ہوئے اس لیے نہیں دیکھ سکی کہ وہ پاگلوں کی طرح دروازے کی طرف دوڑ پڑی تھی۔ دروازے سے نکل کر بھی وہ دوڑتی ہی رہی۔ یہ دوسرا موقع تھا جب وہ زریاب کے کمرے سے اس طرح نکلی تھی۔ پہلے موقع پر اسے ارسلان کی بات کی صداقت کا یقین ہو گیا تھا کہ ماحول اور وقت خارج نہ ہو تو عورت اور مرد کسی بھی وقت کسی کمزور لمحے سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ اس پر یقین کر لینے ہی کے باعث احمر سلطانہ نے زریاب کے کمرے میں جانا چھوڑا تھا لیکن آج اس سے یہ حماقت اس لیے سرزد ہوگئی تھی کہ موت کی آغوش میں جانے سے پہلے وہ ایک مرتبہ اپنے محبوب کو دیکھ لینا چاہتی تھی لیکن اب اسے شدت سے احساس ہوا کہ اس سے حماقت سرزد ہوئی تھی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ بستر پر ڈھیر ہوگئی۔ اس کی سانسیں بری طرح پھولی ہوئی تھیں اور زریاب کے خلاف اشتعال کا لاوا اس کی رگ رگ میں دوڑنے لگا تھا۔ اس نے تو زریاب کو نہایت باکردار اور مضبوط قوت ارادی کا انسان سمجھا تھا اور اس کی محبت میں گرفتار ہوئی تھی لیکن اب اس کے ذہن میں صرف یہ خیال تھا کہ زریاب ایک گھٹیا انسان ہے۔

یکا یک ٹیلے فون کی گھنٹی بجی اور احمر سلطانہ چونک پڑی۔ گھر میں کئی ٹیلے فون تھے جن میں سے ایک زریاب کے کمرے میں بھی تھا اور وہ کال زریاب ہی کی تھی۔

''آئی ایم سوری احمر!'' زریاب کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

احمر سلطانہ نے غصے سے ریسیور، کریڈل پر پٹخ دیا۔ وہ زریاب سے اب کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اتفاقاً اس کی نظر دیوار گیر کلاک پر پڑی اور اسے معلوم ہوا کہ زریاب کے کمرے سے آئے اسے ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ اپنے اشتعال انگیز خیالات میں اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔

احمر سلطانہ کے دماغ سے خودکشی کرنے کا خیال غائب ہو گیا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ دراصل وہ خودکشی اس لیے نہیں کرنا چاہتی تھی کہ صبیحہ اور ارسلان شاہ کی شادی سے پیدا ہونے والی خلش کبھی ختم نہیں ہوتی بلکہ خودکشی کے فیصلے کا سبب یہ خوف تھا کہ زریاب سے اس کی محبت کبھی ارسلان شاہ کے سامنے نہ آجائے..... وہ صورت حال احمر سلطانہ کے لیے اپنی موت سے زیادہ اذیت ناک ہوتی لیکن اب اس کے دل سے زریاب کی محبت ختم ہو چکی تھی اور اب اسے صرف یہ سوچنا تھا کہ زریاب کو اس گھر سے کس طرح رخصت کیا جائے کہ ارسلان شاہ اس سلسلے میں کوئی خاص بات نہ سوچ سکے۔

☆☆☆

صبح ناشتے کی میز پر صبیحہ کچھ شرمائی شرمائی سی بیٹھی تھی۔ ارسلان شاہ بے حد خوش نظر آرہا تھا۔ احمر سلطانہ متفکر ہونے کے باوجود اپنے ہونٹوں پر جبری مسکراہٹ سجائے ہوئے تھی۔

''آج تو زریاب کو بھی ہمارے ساتھ ہی ناشتا کرنا چاہیے۔'' ارسلان شاہ نے احمر سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو پہلے کہتے۔'' احمر سلطانہ بولی۔ ''جب ہم ناشتا کرنے بیٹھے ہیں اس سے پہلے ہی ایک ملازم ناشتا دینے کے لیے زریاب کے کمرے.....

احمر سلطانہ کو ایک دم چپ ہو جانا پڑا۔ ایک ملازم تقریباً گرتا پڑتا ڈائننگ روم میں داخل ہوا تھا اور پاگلوں کی طرح چیخا تھا۔

''لاش..... لاش..... صاحب! زریاب صاحب کی لاش!''

اس بات پر وہ تینوں ہی اپنی اپنی کرسیوں سے حواس باختگی کے عالم میں اٹھے تھے۔ احمر سلطانہ بے تحاشا دروازے کی طرف دوڑی تھی۔ اس کے پیچھے ارسلان شاہ بھی تھا اور صبیحہ بھی اس وقت بھول گئی تھی کہ اس گھر میں دلہن کی حیثیت سے ابھی اس کی ایک ہی رات گزری تھی۔

زریاب کے کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ بوکھلایا ہوا ملازم ہی اسے اس حال میں چھوڑ کر گیا ہوگا۔ ناشتے کی ٹرے اور اس کا سارا سامان دروازے کے قریب ہی بکھرا ہوا تھا جس سے ملازم کی بوکھلاہٹ کی شدت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

زریاب کی لاش اس کے بستر پر تھی۔ اس کی بائیں کلائی کی شہ رگ ایک تیز دھار چاقو مار کر کاٹی گئی تھی اور وہ چاقو بستر پر ایک جانب پھیلے ہوئے زریاب کے ہاتھ میں تھا۔ یہ سچویشن ظاہر کر رہی تھی کہ زریاب خودکشی کا مرتکب ہوا تھا۔ بے تحاشا خون بستر کو رنگین کرتا ہوا فرش پر گر کر جمنے لگا تھا۔ زریاب کے چہرے کی رنگت، اتنی سفید تھی جیسے اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچڑ چکا ہو۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ خودکشی کا یہ عمل کئی گھنٹے پہلے کیا گیا تھا۔

لیکن یہ ساری باتیں بعد کی تھیں۔ زریاب کی لاش دیکھتے ہی صبیحہ کو تو چکر آ گیا تھا اور وہ گرتے گرتے فرش پر بیٹھ گئی۔

احمر سلطانہ کا عالم یہ تھا کہ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے زریاب کی لاش کو تک رہی تھی۔ اسے اردگرد کا کچھ ہوش ہی نہیں تھا لیکن ارسلان شاہ نے خود کو بڑی حد تک قابو میں رکھا تھا۔ اس نے ٹیلے فون پر نمبر ملائے تھے اور پھر ریسیور کے ماؤتھ پیس میں بڑے ہذیانی سے انداز میں بولا تھا۔

''ہیلو!..... پولیس اسٹیشن!''

☆☆☆

پولیس کے لیے یہ انتہائی چکرا دینے والا کیس ثابت ہوا۔ ایسے شواہد نہیں ملے تھے کہ اسے قتل کا کیس سمجھا جا سکتا لیکن یہ بات بھی کسی طرح سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ زریاب نے خودکشی کیوں کی تھی۔ اس کا اندازہ صرف احمر سلطانہ کو تھا لیکن وہ اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھنے پر مجبور تھی۔ پولیس نے ارسلان شاہ، صبیحہ اور احمر سلطانہ کے علاوہ گھر کے ملازمین سے بھی پوچھ گچھ کی تھی اور پوچھ گچھ کا یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا تھا لیکن آخرکار پولیس اس کے سوا کسی نتیجے تک نہیں پہنچ سکی کہ زریاب اپنی بیوی کے انتقال کے بعد ذہنی طور سے بہت بکھر گیا تھا اس نے خود کو ایک اعتبار سے تنہائی کے پنجرے میں قید کر لیا تھا اور گزرتے وقت کے ساتھ زندگی اس پر بھاری ہوتی چلی گئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ زمین پر سے اپنا بوجھ ختم کر دینے کا فیصلہ کر بیٹھا تھا۔

پولیس کی پوچھ گچھ کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد احمر سلطانہ کو چپ سی لگ کر رہ گئی۔ زریاب کی خودکشی نے اسے شدید صدمہ پہنچایا تھا۔

یہ انسانی فطرت کی بوالعجبی ہے کہ اس کی سوچ کسی بھی وقت، کسی بھی وجہ سے اچانک تبدیل ہو جاتی ہے اور ایسا ہی احمر سلطانہ کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ زریاب سے چند گھنٹے نفرت کرنے کے بعد وہ پھر اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ زریاب کی خودکشی نے اس کی روح تک کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق زریاب سے ایک سنگین غلطی ہوئی تھی جس کا احساس بھی اسے بڑی سنگینی سے ہوا تھا۔ ٹیلے فون پر احمر سلطانہ سے ''سوری'' کرنے کے بعد ہی خودکشی کی تھی۔ اس میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ اس واقعے کے بعد احمر سلطانہ سے نظریں ملا سکتا۔

لیکن غلطی تو انسان ہی سے ہوتی ہے، احمر سلطانہ نے سوچا تھا، وہ تو خود ایک غلطی کی مرتکب ہوئی تھی۔ اسے تو ایک واقعہ ہو جانے کے بعد رات کو تو کیا، دن میں بھی زریاب کے کمرے میں نہیں جانا چاہیے تھا اور ایسا وہ کر بھی چکی تھی۔ اس نے زریاب سے تنہائی میں ملنا چھوڑ دیا تھا مگر اس رات کیونکہ اس نے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس لیے جذبات میں بہہ کر زریاب کے کمرے میں پہنچ گئی تھی اور یہ اس کی بہت بڑی غلطی تھی۔ اس رات جب اسے اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا تھا تو زریاب کو اپنے جذبات پر قابو کیسے رہ سکتا تھا۔ وہ رات تو ان دونوں ہی کے لیے ایک خوف ناک رات تھی۔ ایسی رات جو ان دونوں جیسے کسی بھی انسان کے دل میں طوفان لا سکتی تھی، ان کے جذبات سے لاوا اگلوا سکتی تھی۔

ارسلان شاہ کے نظریات ہی کی وجہ سے احمر سلطانہ خود کو بھی مجرم سمجھنے لگی تھی۔ اسے ہر حال میں اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا کہ محبت کے معاملے میں انسان کے اندر چھپے ہوئے حیوانی جذبات کسی وقت بھی سر اٹھا لیتے ہیں جو ایک فطری امر ہے اس لیے اسے جرم نہیں سمجھا جا سکتا۔

جرم کی بات سے احمر سلطانہ کو اختلاف تھا لیکن یہ بات

اس کی سمجھ میں آئی تھی کہ فطری جذبات کو دبانا انسان کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے لہٰذا اگر زریاب کو خود پر قابو نہیں رہا تھا تو اسے اس کی سزا نہیں ملنا چاہیے تھی لیکن وہ خود ہی اپنے آپ کو سزا دے بیٹھا تھا۔ اس کے اندر کے انسان نے اسے مجرم قرار دے دیا تھا اور جب اس نے اپنے ہاتھوں سے سزا پالی تھی تو اس کے لیے احمر سلطانہ کے جذبات پھر بدل گئے تھے۔

احمر سلطانہ کی سوچ کا یہ انداز!

یہی تھی انسانی فطرت کی بوالعجبی!

اور اسی احساس نے احمر سلطانہ کو بیمار ڈال دیا کہ اگر وہ فون پر زریاب کی معذرت قبول کر لیتی تو وہ خودکشی نہ کرتا۔ وہ خود کو زریاب کا، اپنے محبوب کا قاتل سمجھنے لگی تھی۔

ارسلان شاہ نے بڑے سے بڑا ڈاکٹر کھڑا کر دیا لیکن جب انسان اپنی روح کو خود ہی گھاؤ لگا بیٹھے تو کوئی بھی اس کا مسیحا نہیں بن سکتا۔

صبیحہ کے لیے یہ صورت حال دوہری پریشانی کا سبب تھی۔ ایک طرف احمر سلطانہ کی صحت دن بہ دن گرتی چلی جا رہی تھی اور دوسری طرف ارسلان شاہ کی اداسی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

صبیحہ نے احمر سلطانہ کی تیمارداری میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ وہ اس سے اکثر پوچھتی بھی تھی کہ آخر اسے کیا ہو گیا ہے لیکن وہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتی تھی۔ ''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم صبیحہ! لیکن ایک اطمینان مجھے ضرور ہے کہ میرے بعد ارسلان کا خیال رکھنے کے لیے تم تو ہو۔''

اس وقت صبیحہ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔

ایک دن وہ ارسلان شاہ سے کہہ بیٹھی۔ ''آخر آپ باجی سے کیوں نہیں پوچھتے کہ انہیں اندر ہی اندر کیا غم کھائے جا رہا ہے؟''

''کیسے پوچھوں صبیحہ!'' ارسلان شاہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میں تو اپنے ہی اندر گھٹتا چلا جا رہا ہوں لیکن آج تم نے یہ سوال کیا ہے تو سوچ رہا ہوں کہ اپنی اس گھٹن میں تمہیں بھی شریک کر لوں۔ میں نے کم ہی عرصے میں محسوس کر لیا ہے کہ تم مجھے اب پوری طرح قبول کر چکی ہو اور میرا ہر راز اپنے سینے میں دفن رکھ سکتی ہو۔''

صبیحہ کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''میں اس کی بیماری کی وجہ جانتا ہوں۔'' ارسلان شاہ نے اداس لہجے میں کہا۔ ''وہ اور زریاب ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔''

''جی!'' صبیحہ ہکا بکا رہ گئی۔

ارسلان شاہ نے آزردگی سے اثبات میں سر ہلایا اور پھر وہ ساری باتیں دہرانے لگا جو احمر سلطانہ نے اس سے اپنی فرضی دوست فیروزہ کے حوالے سے کی تھیں۔ اس نے اپنے ان خیالات کا اظہار بھی کیا جو اس نے احمر سلطانہ سے کیا تھا۔ صبیحہ دم بخود سی بیٹھی سب کچھ سنتی رہی۔

''اور میرے یہ نظریات بہت پختہ ہیں صبیحہ!'' ارسلان شاہ نے کہا۔ ''مرد ہو یا عورت، یہ جذبہ جب سر اٹھاتا ہے تو انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ احمر بھی بے بس تھی۔ میں نے اسے یا اس کی محبت کو کبھی برا نہیں سمجھا لیکن وہ خود کو مجرم سمجھتی رہی اور زریاب نے غالباً اس خوف سے خودکشی کر لی کہ کسی دن مجھ پر ان دونوں کی محبت کا راز آشکارا نہ ہو جائے۔ اسے شاید یہ اندازہ نہیں ہوگا کہ اس کی موت احمر کے لیے کتنا بڑا صدمہ ہوگی۔'' ارسلان شاہ نے سوچتے ہوئے کچھ توقف سے کہا۔ ''اور اب تم کہہ رہی ہو کہ میں اس سے وجہ پوچھوں، وجہ تو مجھے معلوم ہے صبیحہ لیکن اگر میں نے اس پر یہ ظاہر کر دیا کہ مجھے اس کی اور زریاب کی محبت کا علم ہے تو وہ شدید ترین اذیت میں مبتلا ہو جائے گی۔'' ارسلان شاہ پھر کچھ رکا۔ ''میں اس کو مرتے ہوئے تو شاید دیکھ لوں۔'' ارسلان شاہ کی آواز کانپ گئی۔ ''لیکن اس کی وہ اذیت تو میری ہی جان لے لے گی۔''

صبیحہ کو اس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھا ہوا انسان، غیر معمولی خیالات رکھنے والا انسان کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہے۔ اپنی بیوی کی محبت کے بارے میں اس طرح کی باتیں کرنے والا، صبیحہ کی دانست میں اس دنیا کا انسان ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

ارسلان شاہ نے یہ سب کچھ بتاتے ہوئے صبیحہ پر جس اعتماد اور یقین کا سہارا لیا تھا، اسے صبیحہ نے کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی اور کچھ عرصے بعد احمر سلطانہ اس غلط فہمی کا شکار رہتے ہوئے دنیا سے سدھار گئی کہ اس کا شوہر اس کی اور زریاب کی محبت سے ناواقف تھا۔

انتباہ

سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ادارہ کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

اسماء الحسنیٰ۔کامیابی کا راستہ

دین اسلام کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

ایس۔ایم۔قادری

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ وحق سبحانہٗ کو زیبا ہیں۔کہ جس نے کن فیکون سے اس عالم فانی کو کمال مہربانی سے تخلیق کیا۔اور اس کو اپنی ذات کے نور سے منور کیا ہے۔اس نے بہترین مذہب اور بہترین رسولؐ عطا کیا۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مقدس نے انسانی شعور کو ہدایت کی ان بلندیوں کی جانب گامزن کیا کہ جہاں ذات باری تعالیٰ کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔انسان کیلئے آج بھی راہ ہدایت موجود ہے۔کتاب الٰہی ابد تک ہمارے روشن مستقبل کی جانب رہنمائی کرتی رہے گی۔اور اسی طرح سنت رسول کریم ﷺ آج بھی قائم و دائم ہے۔اور تا قیامت عالم انسانیت کے لئے روشنی کا مینار رہے گی۔تو پھر آیئے ہم اپنی کوتاہ نظری اور بیماری، تفکرات کو اسماء الحسنیٰ اور اسوۂ حسنہ سے تر و تازگی بخشیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام سے اپنی عقل وقلوب کو روشن کریں۔دکھوں پریشانیوں اور مشکلات کے حل کے لئے اس معبود برحق کی جانب رجوع کریں۔جو کل عالمین کا رب ہے۔جس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں جو ملکیت، اقتدار، ترقی، آسائش، شعور وآگاہی اور انسانی ضروریات کے تمام وسائل کا خالق ومالک ہے۔

جناب محترم ایس۔ایم۔قادری صاحب معروف روحانی سکالر، اسماء الحسنیٰ کے محقق ودیگر دینی اور روحانی علوم پر گہری نظر رکھنے والے عرصہ بارہ سال سے اندرون اور بیرون ملک عوام کو اپنے مشوروں سے مستفید فرما رہے ہیں۔انتہائی قابل قدر کتب کے مصنف ہیں۔ان کے کالم ملک کے تمام قومی اخبارات، جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ان کے مداحوں میں ملکی وغیر ملکی معروف اہل علم، دانشور، بیوروکریٹس اور اہم سیاسی شخصیات شامل ہیں۔اندرون اور بیرون ملک ایک وسیع تر حلقہ محترم ایس، ایم، قادری صاحب کے مشوروں سے فیضیاب ہو کر سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہر سال بارہ سے پندرہ ہزار افراد بذریعہ خط وکتابت روحانی تسکین اور جسمانی امراض میں شفا کے حصول کے لئے رہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔یہ طرۂ امتیاز بھی محترم ایس۔ایم۔قادری صاحب کو ہی حاصل ہے کہ وسطی ایشیا، عرب ممالک، کنیڈا، امریکہ اور یورپ میں بسنے والے ہزاروں افراد بھی آپ سے بذریعہ خط وکتابت فیض حاصل کر رہے ہیں۔

ایس۔ایم۔قادری صاحب کی شخصیت اس لحاظ سے بھی ممتاز ومنفرد ہے۔کہ ان کے پروگرام بعنوان اسماء الحسنیٰ 1998ء سے پی ٹی وی ورلڈ پر ٹیلی کاسٹ ہونا شروع ہوئے۔ان پروگرام کی مقبولیت اور افادیت کا یہ عالم ہے کہ نہ صرف یہ کہ پاکستان میں 'ARY ڈیجیٹل' سے آپ کے پروگرام اسماء الحسنیٰ بعنوان ''کامیابی کا راستہ'' ہر جمعۃ المبارک کو نشر ہوتا رہا تھا۔یہ ہی نہیں بلکہ روزانہ دنیا میں کسی نہ کسی چینل کے حوالے سے پروگرام اسماء الحسنیٰ ٹیلی کاسٹ ہوتے رہتے ہیں۔

☆☆----------☆☆

شہناز ریحانہ۔راجن پور

محترم! ہماری شادی وٹے سٹے کے تحت ہوئی ہے میرے بھائی کی بیوی چلی گئی ہے اور اب میرا بھائی مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں بھی واپس گھر آجاؤں جبکہ میرا خاوند بہت اچھا ہے اور اس سارے معاملے میں ہمارا کوئی تعلق بھی نہیں ہے ان دونوں میں شروع دن سے لڑائی تھی کوئی نہ کوئی مسئلہ ہمیشہ ان دونوں کے بیچ کھڑا رہتا تھا لیکن ہمیشہ صلح صفائی زبردستی کرا دیتے تھے لیکن اب دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا ہے ان چار پانچ سالوں میں ان کے بچہ بھی کوئی نہیں ہوا جبکہ میرے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔کوئی ایسا مشورہ دیجئے کہ جس سے یہ معاملہ طے ہو جائے اور بھائی میری زندگی میں زہر نہ گھولے۔آپ کی بہت بہت مہربانی ہوگی کیونکہ میں اپنا گھر برباد کرنا نہیں چاہتی۔

☆عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ آپ کے بھائی کو عقل سلیم عطا فرمائے۔اور آپ کے گھر کو قائم رکھے (آمین) آپ بکثرت ''یا سلام یا جامع

یافتاح" پڑھا کریں نماز کی پابندی کیجئے۔لوح تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے۔اللہ پر بھروسہ رکھیں وہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔

ناز پروین۔کراچی

O محترم! سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنا فسانہ غم کہاں سے شروع کروں۔اپنوں نے لوٹا غیروں نے لالچ سے ساتھ دیا۔کچھ میرے باپ کی چھوڑی ہوئی دولت کے بھوکے تھے اور کچھ میرے بدن کے سودائی تھے بڑی مشکلوں سے دو محبتوں میں دھوکا کھا کر جب میں نے تہیہ کرلیا کہ مردوں سے کبھی متاثر نہیں ہوں گی اور نہ ہی کبھی ان کی کسی بات پر بھروسہ کروں گی اچانک ایک ایسا شخص مل گیا جس نے مجھے لمحوں میں اسیر کرلیا اسے نہ میرے باپ کی دولت کی پرواہ تھی اور نہ ہی میرے حسن کی۔پہلی ملاقات میں اس نے اپنی بیوی کا تذکرہ کچھ اسقدر والہانہ انداز میں کیا کہ میں حیران رہ گئی پہلی ہی ملاقات میں اس نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی میں نے جب اس کے گھر میں اس کی بیوی کو دیکھا تو حیران رہ گئی وہ انتہائی عام سی شکل اور صورت کی عورت تھی لیکن اس کے والہانہ پن وارفتگی نے مجھے حیران کردیا اور میں جو حقیقی محبت کو ترسی ہوئی عورت تھی اس کی اداؤں پر قربان ہوگئی چند ملاقاتوں کے بعد میں نے اس سے شادی کا فیصلہ کرلیا اس نے صاف انکار کردیا اس کے انکار نے میری شدت کو اور بھی بڑھا دیا اور پھر ایک دن میں اس کو پانے میں کامیاب ہوگئی تب مجھے اس کے کھیل پتا چلا۔وہ بہت بڑا اور کامیاب شکاری تھا اس نے مجھے نظر انداز کرکے مجھے نفسیاتی طور پر شکست دی اور پھر ایک دن مجھے چھوڑ کر غائب ہوگیا کافی عرصے کے بعد اس نے مجھے کہا کہ وہ مجھے مل سکتا ہے مگر عارضی طور پر اس نے مجھے جائیداد سے محروم کردیا میرا زیور بہت تھا وہ لے گیا سب سے بڑا دکھ یہ ہے کہ اس نے میری انا میری نسائیت کو مجروح کیا اب میرا مرد ذات پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں کہاں جاؤں مجھے ذہنی سکون کے لئے کوئی اسم الٰہی تجویز کیجئے اور میرے لئے دعا بھی کیجئے۔

☆عزیز بیٹی! جب ماں باپ بزرگوں کا سایہ سر پہ نہ ہو تو پھر زندگی میں بڑے بڑے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کو صبر اور استقامت کی دولت عطا کرے۔(آمین)

"یاغفور یاشکور یالطیف" ہر نماز کے بعد 129 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔لوح اسم ذات ڈپریشن سے نجات اور ذہنی سکون کیلئے ارسال کی جارہی ہے اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی رحمت کے سائے دراز رکھے۔(آمین)

منور جہاں۔حیدرآباد

O محترم! بڑی عجیب سی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔میری بیٹی 18 سال کی ہے اور اس کا سلسلہ ہمارے محلے میں ایک لڑکے سے چل پڑا ہے۔لڑکا غیر مذہب کا ہے کھاتے پیتے لوگ ہیں لیکن ہم اس مسئلے سے بری طرح پریشان ہیں بچی کو مارا پیٹا، ڈانٹا غرض ہر حربہ اختیار کیا ہے لیکن وہ نہیں مانتی ہے کوئی کہتا ہے کہ اس پر جادو کرادیا ہے کوئی کچھ کہتا ہے لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہم کیا کریں اور کہاں جائیں دو مرتبہ خودکشی کی بھی کوشش کر چکی ہے لیکن اللہ کو بہتری منظور تھی جان بچ گئی باپ کہتا ہے کہ کاش مرجاتی تو اچھا تھا اس کی اصلاح کیلئے ہمیں کوئی نقش کوئی اسم تجویز کیجئے پانی سر سے گزرتا جارہا ہے۔آپ کی مہربانی ہوگی۔

☆عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کو صبر و استقامت عطا فرمائے اور بیٹی کو صبر اور راہ ہدایت عطا فرمائے۔(آمین)"یامانع یاحمید یافتاح" ہر نماز کے بعد 141 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اور پانی پر دم کرکے پلائیں۔لوح تسخیر خاص ارسال ہے اللہ تعالیٰ سب کی عزتوں کا محافظ ہے اور عافیت عطا کرنے والا ہے۔

شہزادی نورالصباح۔اسلام آباد

O محترم! قسمت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ اماں نے بڑے شوق سے میرا نام شہزادی نورالصباح رکھا۔اور صحیح یہ ہے کہ جب تک ابا حیات رہے انہوں نے حسب توفیق ہمیں شہزادی بنا کر رکھا۔پھر شادی ہو کر میاں کے گھر آئی تو معاشی مشکلات کا عذاب شروع ہوگیا اب شادی کے بارہ برس گزر چکے ہیں لیکن میرے شوہر دن رات محنت کرنے کے باوجود کچھ فراغت حاصل نہیں کرپاتے چار بچے ہیں مکان خدا کا شکر ہے کہ سر کا ہے ورنہ ان حالات میں شاید ہم کسی فٹ پاتھ پر ہوتے سمجھ میں نہیں آتا کہ معاشی عذاب کب ختم ہوگا۔عید پر جو کپڑے نصیب ہوتے ہیں وہ سارا سال

چلاتے ہیں کھانا ضرور کھاتے ہیں لیکن اچھا کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ آپ یقین کریں کہ ہم کوئی شادی نہیں چھوڑتے صرف اس لئے کہ اس میں اچھا کھانا مل جاتا ہے۔ والدین حیات نہیں ہیں بھائیوں کو پرواہ نہیں رہی سمجھ میں نہیں آتا کہ زندگی کا یہ دکھ بھرا سفر کب ختم ہوگا۔ عمر میری 32 سال ہے اور دیکھنے میں 60 برس کی عورت لگتی ہوں۔ کیا ہم غریب اور مسکین لوگوں کی خدا نہیں سنتا کیا ہم اس کے بندے نہیں ہیں ہمارے لئے کچھ کیجئے۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کو صبر واستقامت عطا فرمائے۔ اپنے شوہر سے کہیں کہ وہ بیرون ملک خصوصاً عرب ممالک کی طرف جانے کی کوشش کریں "یا غنی یا وہاب یا فتاح" ہر نماز کے بعد 129 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 3 مرتبہ درود شریف۔ انشاء اللہ آپ کے دن جلد پھر جائیں گے اور اللہ کی رحمت سے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ لوح مشتری ارسال ہے۔

مہوش قیوم، لاہور

O محترم! میرے نکاح کو تین سال ہو گئے ہیں نہ سسرال والے اور نہ ہی میرے گھر والے رخصتی کے بارے میں سوچتے ہیں مجھے کوئی وظیفہ بتائیں تاکہ میں اپنے گھر کی ہو جاؤں۔

☆ "یا لطیف یا فتاح" بکثرت پڑھا کریں۔

عذرا خان۔ سکھر

O محترم! میں لاہور سے شادی ہو کر یہاں آئی ہوں۔ میری بہن کی کوشش رہی ہے کہ میں سب کو اپنا بناؤں لیکن نجانے کیا بات ہے کوئی میری طرف نہیں ہوتا میری شادی غیروں میں ہوئی ہے جب یہاں کوئی تقریب وغیرہ ہوتی ہے تو مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ سب مجھے نظر انداز کر چکے ہوں۔ ان کی آپس کی باتیں ہی نہیں ختم ہوتی ہیں بعض مرتبہ میں نے دلچسپی لینے کی کوشش کی لیکن دو چار منٹ بعد ہی مجھے کہہ دیا گیا تم جا کر ہانڈی دیکھو بعض اوقات مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید میں گھر میں نوکرانی بنا کر لائی گئی ہوں شوہر کو مجھ سے شدید جسمانی دلچسپی ہے ان کو میرے احساسات کا کوئی علم نہیں اسی وجہ کے باعث وہ مجھ سے الگ نہیں رہ سکتے میں چاہتی ہوں کہ آپ میری راہ نمائی کریں کہ میں کیا کروں میں سب میں گھلنا ملنا چاہتی ہوں محبت اور اپنائیت چاہتی ہوں اس

شرف ستار گان کی الواح

اپنے نام اور ستارے کے مطابق لوح بنوا کر کامیاب زندگی بسر کریں۔

لوح شرف مریخ

دل کی گھبراہٹ، ڈپریشن، مردانہ امراض، خواتین کے امراض، خون کی کمی، آسیب سے نجات، افسران بالا کی توجہ اور رجوع خلق کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرف زہرہ

تسخیر خلق، پسند کی شادی، ڈاکٹر وحکیم، سیاستدان، عورتوں کے امراض، انیٹرنیٹ ڈیکوریشن، مصوروں، خطاطوں اور ادیبوں کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرف عطارد

علمی ترقی، حافظے میں اضافہ تعلیم میں کامیابی، یادداشت میں اضافہ، بچوں کا خواب میں ڈرنا، ٹرانسپورٹ تجارت اور کمیونیکیشن سے منسلک افراد کیلئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرف قمر

پرانی جسمانی بیماریاں، نسوانی امراض، تسخیر، ترقی، زراعت اور باغبانی کے لئے مفید ہے۔ دماغی قوتوں میں اضافہ، روحانی علوم میں کامیابی، تسخیر خلق کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرف شمس

ترقی، عروج، سحر، جادو سے حفاظت، روپے پیسے کی آمد، سماجی مرتبے میں اضافے کے لئے تیار کی جاتی ہے، جن کے زائچے میں شمس کمزور ہے ان کیلئے مفید ہے۔

لوح شرف مشتری

مالی خوش بختی، حصول دولت، آمدنی کے مختلف ذرائع کو ترقی دینا، انعامی اسکیموں میں فائدہ، مستقبل کی بہتری، کیریئر اور ترقی کے استحکام کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرف زحل

کاموں میں رکاوٹ، جائیداد کے تنازعات، پرانے امراض، ضدی امراض، نحوست، جادو، آسیب سے نجات کیلئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرف سبع ستارگان

ساتوں ستاروں کا یکجا نقش

خیر و برکت، مالی خوش بختی، تسخیر خلق، مرد اور عورتوں کے پرانے امراض، شادی میں تاخیر اور رکاوٹ، علمی ترقی، تعلیم میں کامیابی، گھریلو پریشانیاں، جادو آسیب سے نجات کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

اپنی پسند کی لوح بنوانے کیلئے رابطہ کیجئے۔ B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔ پاکستان۔ فون نمبر: 5168036-5167842

سے زیادہ میری کوئی آرزو نہیں ہے۔

☆عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ آپ سب کو محبتوں کے سائے میں رکھے (آمین) ''یا کریم یا عزیز'' ہر نماز کے بعد 100 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں۔ اول آخر 7 مرتبہ درود شریف۔ جب بیٹیاں غیروں میں بیاہی جاتی ہیں تو شروع میں ایڈجسٹمنٹ میں تھوڑی سے طوالت اور پے چیدگی ہوتی ہے لیکن آہستہ آہستہ تمام معاملات ٹھیک ہو جاتے ہیں لوح تسخیر خاص ارسال ہے نماز کی پابندی فرمائیں۔

قسیمہ بانو۔ مانچسٹر۔ یوکے

O محترم! اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ تین بیٹیاں ہیں ایک بیٹا ہے بیٹے نے اپنی مرضی سے شادی کر لی ہے۔ بہت دنوں کے بعد مجھے علم ہوا کہ میری بہو نے صرف دکھاوے کے لئے اسلام قبول کیا تھا ورنہ وہ کسی بھی مذہب یا دین پر یقین نہیں رکھتی۔ میرے اور میرے شوہر کے لئے یہ ایک گہرا شاک تھا۔ میری نسل کا کوئی دین ایمان نہیں رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ مجھے کتنا برا کہیں گے لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا کریں میرا بیٹا کہتا ہے کہ دل کا حال اللہ جانتا ہے۔ مگر میری بہو کبھی مندر جاتی ہے۔ کبھی چرچ جاتی ہے کبھی مسجد چلی جاتی ہے۔ میں علیحدہ شہر میں رہتی ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میرا دل اپنی نسل کے لئے کڑھتا رہتا ہے۔ مگر میرے پوتے پوتیوں کا دین کیا ہوگا؟۔ یقین مانیے خون کے آنسو روتی ہوں۔ لیکن کہیں کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے دعا کے لئے قبولیت کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میرے بچے، میری نسل اپنی شناخت نہ کھوئیں۔ خدا کیلئے مجھے کوئی سکون قلبی کے لئے کچھ تجویز فرمایئے۔ آپ یوکے جلد تشریف لائیں کیونکہ آپ پر ہمارا بھی حق ہے۔

☆عزیز بہن! اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے پیارے دین اسلام پر قائم رکھے اور ہمارا خاتمہ بالخیر ایمان حقیقی پر فرمائے (آمین) درحقیقت ایمان اور یقین کا تعلق ابتدائی تربیت سے بنتا ہے اگر بچے کی تربیت میں ابتداء سے ہی بے اعتمادی، مادیت پرستی اور دینا کو ترجیح دینا شامل کر دیا جائے تو اعلیٰ اخلاقی قدریں یقین ایمان پیدا نہیں ہوتا۔ مشہور شعر ہے۔ صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے عمر یونہی تمام ہوتی ہے اور پھر یہ بچپن کی کیفیت جوانی میں پختہ ہو کر دھریہ پن کو جنم دیتی ہے اللہ تعالیٰ آپ کی بہو پر اپنا خصوصی فضل و کرم فرمائے اور انہیں ہدایت صراط مستقیم عطا فرمائے۔ ہر نماز کے بعد ایک تسبیح ''یاہادی یاقدوس'' پڑھ کر دعا کریں اور بہو کا تصور کر کے دم کر دیا کریں۔ اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ انشاء اللہ جونہی یوکے کا پروگرام فائنل ہوا آپ سب کو انہی صفحات کے ذریعے مطلع کر دیا جائے گا۔

متاع النساء۔ جرمنی

O محترم! دیار غیر میں آپ کا کالم ایک ایسے تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند ہے جس میں وطن کی خوشبو کے ساتھ ساتھ باپ جیسی شفقت اور بھائی جیسی محبت جھلکتی ہے۔ ہم لوگ یہاں طویل عرصے سے مقیم ہیں۔ لیکن اب یوں لگتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے معاشی مسائل بڑھتے جا رہے ہیں بچے بڑے ہو رہے ہیں تعلیمی اخراجات بڑھتے جا رہے ہیں۔ پہلے ہمارا اسٹور بہت اچھا چلتا تھا۔ لیکن اب یوں لگتا ہے کہ جیسے سیل دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ جبکہ ہمارے ایک جاننے والے پاکستان سے یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔ ان کا اسٹور ہم سے معمولی درجے کا ہے۔ اور ورائٹی بھی کم ہے اس کے باوجود ان کی سیل ہم سے زیادہ ہے ہمیں یوں لگتا ہے کہ جیسے ہم کسی بندش میں آ گئے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ ہماری مدد فرمایئے۔ کوئی اسم الٰہی یا لوح عنایت فرمائیں۔

☆عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کے جملہ معاشی مسائل حل فرمائے (آمین) آپ لوگ کسی جادو کا شکار نہیں ہیں بلکہ آپ زحل کی نحوست کے دور سے گزر رہی ہیں۔ اس لئے غیر ضروری اخراجات پر توجہ دیجئے۔ ہر نماز کے بعد سورۂ نصر 13 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ لوح زحل ارسال کی جا رہی ہے دعاؤں کا بے حد شکریہ۔

اسماء پروین۔ جرمنی

O محترم! میری طرف سے ماہنامہ ''اسماء الحسنیٰ'' کی اشاعت پر دلی مبارک قبول کیجئے۔ یہ ہمارے دلوں کی آواز تھی۔ یقیناً آپ ہمارے اور آپ کے رابطے اور بھی زیادہ مضبوط ہو جائیں

انتہائی خوبصورت، معیاری، دینی مضامین اور معلومات سے بھرپور ماہنامہ اسماء الحسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ کا تازہ شمارہ شائع ہوگیا ہے۔
ہر بک سٹال سے طلب فرمائیں

گے۔ اطلاع ملتے ہی میں نے فون کیا تھا معلوم ہوا کہ آپ ریکارڈنگ کے لئے تشریف لے گئے ہیں۔ آپ کے مدیر سے بات ہوئی تھی۔ اور اب 5000 روپے کا بنک ڈرافٹ ماہنامہ اسماء الحسنیٰ کے لئے ارسال کر رہی ہوں۔ قبول فرمائیے گا۔ بہر کیف مسئلہ کچھ یوں ہے کہ ہماری بھابھی جب سے پاکستان سے آئی ہیں۔ ان کی طبیعت مسلسل خراب رہتی ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے کسی نے ان پر کچھ کر دیا ہے۔ رات میں سوتے سوتے اچانک ڈر جاتی ہیں۔ اور کہتی ہیں کہ کوئی سیاہ بالوں والا حبشی آدمی جس کی لمبی سی دم ہے ان کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور بعض نازیبا حرکات بھی کرتا ہے ان کی صحت حد درجہ خراب ہے۔ یہاں ایک عالم دین سے ان کا علاج کروایا تو عارضی طور پر افاقہ ہوا لیکن دوبارہ یہ مسئلہ شروع ہوگیا ہے اور اب شدید پریشانی یوں بڑھ گئی ہے کہ بھابھی کے ہاں خوشخبری بھی متوقع ہوگئی ہے چار سال کے بعد اللہ نے یہ دن دکھایا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بدشگونی ہوگئی ہے۔ ہمارے لئے کوئی لائحہ عمل تجویز فرمائیے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے چیچہ وطنی کی اسماء کا آسیب کا علاج کیا تھا۔ الحمدللہ اب وہ بہت پرسکون زندگی گزار رہی ہے۔ میں اسی کی بند ہوں۔ میری خالہ لاہور سے آرہی ہیں آپ ان کے ہاتھ جو نقش مناسب سمجھتے ہوں وہ ارسال فرما دیجئے اور ہمارے حق میں خصوصی دعا فرمائیے گا۔

☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ آپ کی بھاوج اور تمام بیٹیوں کو ایسے شر اور خباثت سے محفوظ و مامون رکھے (آمین) اول تو اپنی بھابھی کو ہرگز اکیلا نہ سلائیے۔ دن ہو یا رات کسی بھی وقت انہیں تنہا نہ چھوڑیں دوسری احتیاط یہ کریں کہ ٹراؤزر یا شلوار جو بھی استعمال کریں اس میں ازار بند ڈالیں، الاسٹک نہ استعمال کریں سورۂ بقرہ کی گھر میں مستقل تلاوت کا اہتمام کریں۔ نقوش برائے غسل اور پینے کے علاوہ گلے میں ڈالنے کے لئے بھی ارسال ہیں۔ ہمراہ ایک لوح برائے حفاظت اور دیگر امور کے لئے ارسال کی جارہی ہے۔ جونہی بچے کی ولادت ہو حفاظت کا نقش اس کے گلے میں بھی ڈال دیجئے گا۔ انشاء اللہ باری تعالیٰ شفائے کاملہ عطا فرمائے گا۔

انیل افروز۔ ارجنٹائن

O محترم! ہم لوگ اپنے کاروباری مسائل کی وجہ سے امریکا سے یہاں شفٹ ہوئے ہیں شروع میں تو یہاں ہر مسئلہ بہت اچھا رہا۔ ایک گیس اسٹیشن میں پارٹنر شپ کرلی۔ 6 ماہ کے بعد وہ ہمیں گیس سٹیشن ایک معاہدے کے تحت فروخت کر کے بلجیم چلا گیا۔ لیکن کچھ عرصے سے کاروبار میں خاصی کمی واقع ہوگئی ہے۔ یوں تو بہت کوشش کرتے ہیں کہ فضول خرچی نہ کریں بلکہ کوئی بہت ضروری خرچ ہو تو بھی دس مرتبہ سوچ کر خرچ کرتے ہیں مگر اس کے باوجود رزق میں مسلسل بندش کا احساس رہتا ہے۔ پاکستان میں امی نے کسی صاحب سے معلوم کرایا تھا تو انہوں نے بتایا کہ کسی نے جادو کیا ہے۔ آپ مہربانی فرما کر ہماری معاشی خیروبرکت کے لئے کوئی لوح ارسال فرمادیں اور ساتھ ہی گیارہویں شریف میں ہمارے لئے خصوصی دعا بھی فرمائیں۔ آپ کی بہن آپ کے جواب کی منتظر ہے۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام بہن بھائی جو دیارِ غیر میں مقیم ہیں انہیں ہر قسم کے معاشی اور سماجی مصائب سے محفوظ اور مامون رکھے (آمین) آپ ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ "یا وہاب یا رافع یا فتاح" پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ لوح مشتری ارسال کی جارہی ہے۔ دعاؤں کا شکریہ

شگفتہ رانی۔ سندر، لاہور

ملاقات: روزانہ صبح 9 تا مغرب "جمعۃ المبارک تعطیل" (براہِ راست جواب کیلئے جوابی لفافہ بھیجئے۔)
ایس۔ ایم۔ قادری B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔ فون نمبر: 042-5167842,5168036
ختم گیارہویں شریف اور اجتماعی دعا ہر انگریزی مہینے کی پہلی اتوار کو بعد نمازِ عصر تا مغرب منعقد ہوتی ہے

جنات کی حقیقت اور اس کا علاج

تحریر اور تحقیق: ایس۔ایم۔قادری

☆ نیا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے ☆

جادو اور جنات کا وجود قرآن حکیم اور احادیثِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سب سے پہلے اس بات کی تشخیص کی جائے کہ فی الواقعہ ہی مریض جادو اور جنات کا شکار ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کا علاج کیا ہو؟ کتاب جادو اور جنات اسی معاملے سے بحث کرتی ہے اور قرآنِ حکیم کی روشنی میں مریض کا علاج تجویز کرتی ہے۔ اگر آپ بھی کسی ایسے ہی مسئلے سے دوچار ہیں تو یہ کتاب آپ کی بھرپور دینی راہنمائی کرے گی۔

☆ محترم ایس۔ایم۔قادری صاحب کی دیگر کتب ☆
عملیاتِ اسماء الحسنیٰ، خوبصورت نام، دعائیں، خواب اور تعبیر، ہاتھوں میں تقدیر، سیدنا غوث الاعظمؒ، اسماء الحسنیٰ کامیابی کا راستہ

براہ راست منگوانے کیلئے فی کتاب -/175 روپے کا منی آرڈر اور کتاب کا نام اس پتے پر ارسال کریں۔
B-359 فیصل ٹاؤن لاہور فون نمبر: 5168036

O محترم! میری شادی کو چھ سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ ہمارے ٹیسٹ بھی نارمل ہیں ہر طرح کا علاج بھی کروایا ہے لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ میری نند کو آپ نے ایک عمل بتا کر دیا تھا اولاد نرینہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو چاند سے بیٹے سے نوازا ہے مجھے بھی کوئی ایسا نقش

☆ "یا وارث" ہر نماز کے بعد 100

آخر 3 مرتبہ درود شریف۔ اولاد نرینہ کے

ضروری گزارش

☆☆ خط لکھتے وقت اپنا نام اور پتہ معہ شہر کے مکمل لکھئے۔ مخفف نام والے خطوط قابل جواب نہ ہوں گے۔ براہ راست جواب کے لئے پتا لکھا ہوا جوابی لفافہ ارسال کیجئے اور ف، ک، ٹائپ کے لکھنے سے گریز کیجئے۔ اگر آپ اپنا نام نہ شائع کروانا چاہیں تو فرضی نام لکھ کر واضح ہدایت کر دیجئے۔ فون پر مسئلہ ڈسکس نہیں کیا جاتا ہے بہتر ہے کہ جوابی لفافے کے ساتھ خط لکھ دیجئے۔

O آمنہ، میمونہ علی، سائرہ بانو، ثمینہ صدیق، صدیقہ بی بی، شازیہ رانی، مجیب الرحمٰن، عبید اللہ، طارق محمود۔ متفرق شہر

☆ آپ سب نے ختم شریف میں قرآن حکیم، کلمہ شریف، سورۂ ملک، سورۂ یٰسین، آیت کریمہ کی جو پڑھائیاں ایصال ثواب کے لئے تحریر کئے تھے۔ وہ سب محفل ختم شریف میں حضور اکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، انبیاء علیہ السلام صحابہؓ اجمعینؓ، سیدنا غوث الاعظمؒ جملہ مسلمین و مسلمات کیلئے ہدیہ کر دیئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری کاوشوں کو قبول و مقبول فرمائے۔ جو بہن بھائی ایصال ثواب حصول خیر و برکت کیلئے قرآن حکیم، مختلف سورتیں۔ کلمہ شریف، درود شریف پڑھتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ان کی طرف سے ہادی عالمؐ کی بارگاہ میں، بزرگان دین کے لئے پڑھائیوں کے ہدیئے بھیجنا چاہیں وہ بذریعہ خط، ٹیلی فون مطلع فرما دیا کریں۔

☆☆☆

اس مرتبہ ختم گیارہویں شریف اور اجتماعی دعا انشاء اللہ 4 مارچ بروز اتوار کو ہوگی۔ تمام بہن اور بھائیوں اور مریدین سے شرکت کی استدعا ہے۔